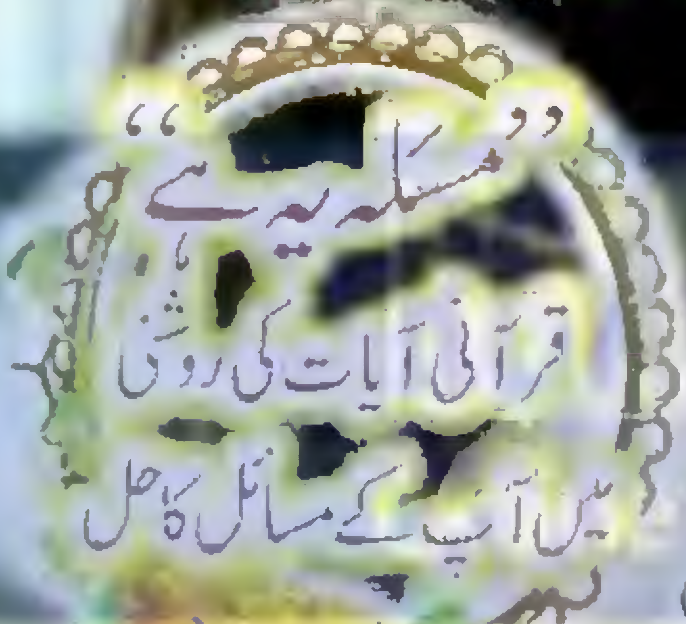
ماہنامہ

# سچی کہانیاں

September 2015

## ڈاٹ کام سوسائٹی




☆ اپنے دیس، اپنے شہروں سے موصولہ 25 سے زائد سچی کہانیاں

☆ ایم اے راحت اور کاشف زبیر کے سلسلے وار ناول









# ماہنامہ سچی کہانیاں کراچی

E-mail pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا




مدیرہ اعلیٰ : منزہ سہام

مدیر : کاشی چوہان/دانیال شمسی

| MEMBER | |
|---|---|
| APNS | رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی |
| CPNE | رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز |

منیجر مارکیٹنگ
زین العابدین

منیجر ایڈمن اینڈ سرکولیشن
محمد اقبال زمان

انکم ٹیکس ایڈوائزر
مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)



فون نمبرز:
021-35893121
021-35893122

خط و کتابت کا پتا: II 88-C فرسٹ فلور خیابانِ جامی کمرشل ڈیفنس فیز-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

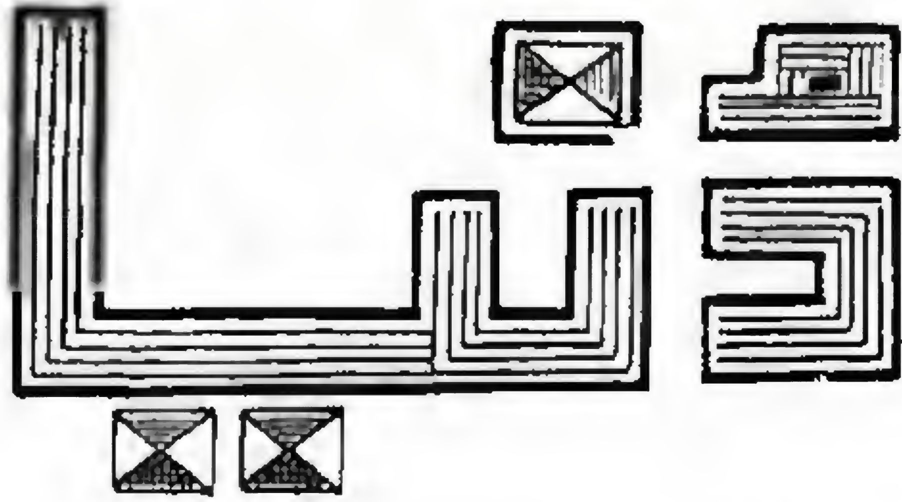


قیمت فی شمارہ: 60 روپے ✲ جلد: 32 - شمارہ: 09 ✲ ستمبر: 2015ء

ایڈیٹر پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

021-35893121-3589312

پاکستان 890 روپے افریقہ 65 ڈالر کینیڈا آسٹریلیا 65 ڈالر ایشیا یورپ 55 ڈالر




# دنیا میں کس جگہ

# سچی کہانیاں کے چرچے نہیں

اِس لیے کہ "سچی کہانیاں" کے مصنّفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے، دیکھتے، محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں "سچی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں

یہی وجہ ہے کہ "سچی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے "سچی کہانیاں" میں آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، اعترافات، جرم و سزا کی کہانیاں، ناقابلِ یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ "سچی کہانیاں" میں ہے۔

## پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا — اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں، پرل پبلی کیشنز : 88-C-II فرسٹ فلور، خیابان جامی کمرشل۔
ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز۔7، کراچی فون نمبر: 021-35893121-35893122
ای میل : pearlpublications@hotmail.com



# "خواب"

بہت دنوں بعد بچوں کے ساتھ اپنی بہت اچھی سی دوست کے گھر جانا ہوا۔ باتوں میں ایسے گم ہوئے کہ وقت کا خیال ہی نہیں رہا۔ وہ بضد تھی کہ رات کا کھانا کھا کر جاؤ بالآخر مجھے ہار ماننی ہی پڑی۔ زبردست کھانا اور پھر قہوے کا دور۔ اسکول کے دنوں کی باتیں، کالج کے مزے دار قصے...... ہم دونوں میں سے کسی کا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا کہ یہ خوبصورت ملاقات ختم ہو۔ بہرحال جلد ہی دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے رات گئے اُس کے گھر سے روانہ ہوئی۔ راستے میں بچوں نے ضد کی کہ آئسکریم کھانی ہے لہٰذا آئسکریم اور میٹھے پان کھاتے گھر لوٹ آئے۔ گاڑی کھڑی کر کے میں گھر کے باہر گھاس پر ننگے پاؤں چہل قدمی کرتی رہی...... رات کا آخری پہر، ہر سو سناٹا، شبنم سے بھیگی گھاس، گیلی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو...... میرے اندر اطمینان سا اتر رہا تھا۔ میرا شہر، میرا کراچی! کس قدر سکون اور اطمینان ہے یہاں۔ یہاں میرا بچپن گزرا، والدین، بہنیں اب سب دور ہیں مگر میرے شہر کی خوشبو بھری ہواؤں میں تمام یادیں بسی ہوئی ہیں بنا خوف خطر میں تب بھی، جب بچی تھی اور سڑکوں پر بے فکری سے سائیکل دوڑایا کرتی تھی اور آج بھی، جب میں ماں ہوں...... سب ویسا ہی ہے اور اللہ کرے میرے شہر کے امن وسکون کو کبھی کسی کی نظر نہ لگے۔

اذان کی آواز پر میں اپنے خیالوں سے باہر آئی تب احساس ہوا کہ وہ سب تو خواب تھا میں تو اپنے کمرے میں ہوں۔ دروازے اور کھڑکیوں پر لگی گرل دیکھ کر میرے دل پر گھونسہ لگا۔ اوہ تو میں خواب دیکھ رہی تھی...... بعض خواب کتنے دلفریب ہوتے ہیں کہ آنکھ کھولنے پر وہ تو کرچی کرچی ہوتے ہی ہیں مگر آنکھ سے آنسو بھی ٹپک جاتے ہیں...... بس اب تو صرف یہی دعا ہے کہ رب العزت! یا تو میرے شہر کا امن لوٹا دے یا پھر میری آنکھ کبھی نہ کھلے۔

منزہ سہام

# احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

پیارے ساتھیو!
لیجیے ساتھیو پتا بھی نہیں چلا اور ماہ اگست رخصت ہوا اور ستمبر کی آمد ہوگئی۔ اکثر احباب بات کرتے ہین کہ آپ اتنا سارا کام کیسے کر لیتے ہیں۔ ساتھیو! میں کوئی پتھر کا مجسمہ تو نہیں کہ میرے پاس دل نہیں۔ میں تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میرے مالک نے مجھے اس قابل کیا کہ میں آپ سب کی محبتوں کے درمیان ہوں، آپ کی محبتیں میرا مان ہیں۔ مجھے آپ ہی سے غصہ کرنا ہے۔ آپ ہی سے شکوہ کرنا ہے اور آپ ہی سے پیار کہ بھئی اتنا تو میرا بھی حق ہے نا۔ میری خواہش بڑی طفلانہ ہے کہ سب 'آپنا' کام کریں۔ سب سے بڑی خوبی انسان کی یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسرے کے کام کو سراہے، حوصلہ افزائی کرے۔ باخدا! اگر مجھے کسی کا ایک لفظ بھی متاثر کرتا ہے تو میں اس کی تعریف کیے بنا رہ نہیں پاتا کہ انسانیت سے پیار یہی تھوڑی ہے کہ ہم مواقع ڈھونڈیں بلکہ انسان سے اصل محبت اُس کی حوصلہ افزائی ہے۔ یقین جانیے میرے دل میں بس ایک بات پناہ گزین رہتی ہے کہ آج جو بھی ہم کام کر رہے ہیں، جو بھی لکھ رہے ہیں کل کو یہ ادب کا حصہ ہوگا۔ آج ہم پچاس سال پہلے کی کوئی تحریر پڑھتے ہیں، کوئی تصویر دیکھتے ہیں تو ہمیں اجنبی سی لگتی ہے۔ مگر سوچیں کہ آنے والی نسلوں تک جب ہمارے یہ 'شہ پارے' پہنچیں گے تو ان کا ردعمل کیا ہوگا...... کیا کیا ہم پہ نکتہ چینیاں ہوں گی۔ ذرا تصور کے کیمرے کو Zoom کریں۔ آنے والے وقت کی تصویر دیکھیں...... کیا ہم خود پر فخر محسوس کریں گے یا خود سے بھی چھپتے پھریں گے۔ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ سوچیں، غور کریں اور پھر عمل کریں۔

آیئے اب ہم اس ماہ آپ کی محبتوں کے طلسم کدے، رابطوں کی محفل، احوال میں چلتے ہیں۔

✉ اس ماہ ہمارے سب سے پہلے احوالی ہیں لڈن ضلع دہاڑی سے منشی محمد عزیز۔ آپ نے تفصیلی تبصرے کے ساتھ لکھتے ہیں۔ پُراسرار کہانیاں نمبر 2 حسب توقع عید کی چھٹیوں کی وجہ سے تین اگست کو ملا۔

تین دن اسے پڑھنے کے لیے دیے۔ اور آج چھ اگست کو خط بھیج رہا ہوں کیونکہ گزشتہ چھ ماہ سے احوال سے غیر حاضری رہی اور اس کی وجہ بلکہ وجوہات محکمہ ڈاک کے ساتھ ساتھ میری ازلی سستی بھی برابر کی حصے دار ہے۔ خیر جناب اگست کے شمارے کا سرورق ایک معصوم صورت سے سجا ہوا تھا۔ میری کہانی شائع کرنے کا بہت شکریہ! باجی منزہ سہام سب ہی کو عید مبارک کہہ رہی تھیں بہت اچھا لگا۔ احوال کے ابتدائیہ میں آپ نے بہت اچھی بات کہی۔ محمد اسماعیل بروہی! السلام علیکم، ماشاء اللہ اس مرتبہ احوال میں کافی سارے نئے دوستوں کے نام نظر آئے۔ سب ہی کو دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید۔ عبدالغفار عابد بہت اچھی باتیں بتا رہے تھے۔ آمین تحسین جونیجو! جناب ہم تو الحمد اللہ ٹھیک ٹھاک ہیں آپ سنا ئیں غیر حاضری کیوں ہو رہی ہے؟ شکریہ پیارے بھائی ممتاز صاحب آپ نے میری کمی کو محسوس کیا۔ اور تھینکس سدرہ انور علی کا بھی کہ انہوں نے مجھے یاد رکھا۔ صائمہ مجید! اجی میں ایک بھٹہ پر بطور منشی ملازمت کرتا ہوں۔ کہانی کی پسندیدگی پر مشکور ہوں۔ احوال میں عبدالغفار عابد، ممتاز احمد، فرح انیس، سدرہ انور علی، صائمہ مجید، مجید احمد جائی، ندیم عباس میوانی اور ریحانہ نسیم کے خطوط بھرپور تھے۔ بھائی ممتاز احمد کو خصوصی طور پر سالگرہ کی مبارکباد (لیٹ کے لیے ویری سوری) اب کہانیوں پر تبصرہ! بہلا، اعجاز احمد نلکرال کی یہ کہانی بالکل ادھوری سی لگی کیوں کہ آخر میں گاڑی جنات کے قبضے میں چلی گئی۔ (یہی اس کا حسن تھا)۔ مسز نوید ہاشمی کی میرا بیٹا میرا ارمان بہت پسند آئی۔ دستگیر شہزاد کی تحریر ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے۔ عنوان تو پسند نہیں آیا مگر کہانی سبق آموز بھی بہت اچھے دستگیر میاں۔ برگد والے مکان کے ہم تو قریب نہیں گئے، موت کا کنواں، شاہد رفیق سہو نے خون کا پیاسا، بھوگ ناتھ کی پیاس، مجید احمد جائی صاحب بھی ایک حیرت انگیز تحریر لائے تھے۔ ممتاز صاحب اس بار پلیٹ فارم سے قدرت کے بھید لائے بہت خوب ممتاز بھیا۔ بے شک اللہ بڑا بے نیاز ہے رضوانہ پرنس اور نیئر شفقت مختصر سی مگر پُر اسرار تحریروں کے ساتھ حاضر تھیں۔ مور شاہد حسین ایک نوجوان کی داستان لائے جو تنہائی میں ڈر گیا۔ محمد سلیم اختر کی پچیسویں قربانی کو اس ماہ بہترین تحریر کہا جا سکتا ہے۔

☆ بھائی منشی! تبصرہ اتنی جلدآیا کہ ہم خود ڈر گئے کہ کہیں...... مگر آپ کی محبت کے کیا کہنے، تبصرہ شاندار ہی نہیں جاندار بھی ثابت ہوا۔



✉ ملتان شریف سے یہ برقی نامہ احوال کی زینت بنا ہے۔ لکھتے ہیں ہمارے بہت پیارے ساتھی لکھاری مجید احمد جائی کا۔ ماہ اگست پُر اسرار نمبر 2 تھوڑا سا لیٹ ملا۔ سرورق پر بیٹھی ڈری، سہمی سی دوشیزہ حیران کر گئی۔ ''عید مبارک'' منزہ سہام نے خوب لکھا۔ احوال کی شروع میں کاشی بھائی! نے رُلا ہی دیا۔ میرے بھائی، میں حیران ہوں ایسے لوگ سستی شہرت کے لیے کیوں کرتے ہیں۔ آپ ایسے لوگوں کو بلیک لسٹ کیوں نہیں کر دیتے۔ تاکہ ان کی کالک ان کے منہ پر پڑے۔ خیر افسردہ دل کے ساتھ احوالیوں کو خوش آمدید کیا۔ اس دفعہ بھی بہت سے نئے لوگ شامل احوال رہے اور پرانے کہیں غائب ہو رہے ہیں۔ کیوں جی محمد اسماعیل بروہی، شعبان کھوسہ، پیارے محمد ممتاز احمد، فریدہ جاوید فری، ندیم عباس میوانی، آپ سب کا بہت شکریہ، بہت مہربانی مجھ ناچیز کو یاد رکھا۔ ندیم عباس میوانی، پیارے آپ نے تو ''بابا'' بنا دیا۔ ''شاندار احوال کے ساتھ سب احوال کی رونق بڑھا رہے تھے، سبھی نے خوب لکھا۔ اسی طرح احوال کی رونق بنتے رہنا۔ آپ کی تازہ نظم بہت پسند آئی۔ اور اکثر میرے لبوں پر رہتی ہے۔ لائف بوائے اسما اعوان کمال لکھ رہی ہیں۔ بہلا، اعجاز احمد نلکرال، میرا بیٹا، میرا ارمان۔ مسز نوید ہاشمی، ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے۔ دستگیر شہزاد، برگد والا مکان، منشی محمد عزیز مئے، فوزی میری ہے، عثمان بلوچ، مجھے چھینی

لادو، فوزیہ فرید احمد، خون کا پیاسا، شاہد رفیق سہو، خالہ بیگم، ایک سربستہ راز، ماسم وقاص، بھوک ناسور کی پیاس۔ معاویہ عنبر ڈو، عقابی حویلی لیلیٰ اقبال مردہ، پریاں لے گئیں مثلی شکور، وہ یکم جنوری، نسرین جونیجو، مالکن کا عاشق، رئیسہ خالد، لندن کی وہ رات، رضوانہ پرنس، مٹھی بھر ریت، محمد یوسف افاری، مجھے ڈر لگتا ہے، مور شاہد حسین، کمال کی کہانیاں تھیں، میں! شیش ناگ، زہر بھری دنیا سے تین شاہکار داستانیں میں شامل کر کے دل جیت لیا۔ بہت شکریہ۔ قدرت کے بھید۔ ممتاز احمد سرگودھا۔ آپ واقعی داد کے مستحق ہیں۔ میری طرف سے بہت ہی مبارکاں، وآپس جاؤ، جاوید راہی، جیل کہانیاں لکھنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ برطانیہ میں خزاں، محمود شام، بہت شکریہ۔ تسبیح کی کرامت، ثنا کنول اللہ دتہ، وہ گھونگھٹ والیاں نیئر شفقت، خوب رہی۔ ہم شکل، کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ کاشی بھائی زہر عشق میں آپ جادو ہی تو کر رہے ہیں۔ لمحہ لمحہ حیران کر دینے والی تحریر۔ کہیں جنگل میں بیٹھ کر تو نہیں لکھتے۔ شکر ہے صنوبر کو امریکہ نہیں بھیجا گیا۔ ورنہ۔ سلیمان کا کیا بنتا۔ ایک جن ہو کر انسانوں میں ذلیل و خوار ہو رہا ہے۔ واقعی عشق کا زہر ہی ایسا ہوتا ہے۔ رگوں میں سرایت کرتا جاتا ہے۔ اور بس۔ خاص نمبر کی خاص پُراسرار کہانی ''چھبیسویں قربانی۔ محمد سلیم اختر، کافی غیر حاضری کے بعد زبردست انٹری دے رہے تھے۔ کمال کی کہانی تھی۔ چوری کی انوکھی سزا، پڑھ کر مزہ آ گیا۔ ہائیڈ پارک، تیر نیم کش، اپنا جادو جگا رہے ہیں۔ کاشی بھائی خصوصی طور پر پُراسرار نمبر کی کامیاب اشاعت پر ڈھیروں مبارک باد قبول کریں۔ آپ کی محنت۔ لگن، چاہت کو سلوٹ پیش کرتا ہوں۔ پُراسرار نمبر نے دل جیت لیا۔

☆ پیارے مجید! دیکھ لو اس بار تمہارا تبصرہ مکمل موجود ہے۔ تم نے اتنا خوبصورت تبصرہ لکھ کر ہمارا دل جیت لیا۔

✉ سرگودھا سے ہمارے بہت پیارے لکھاری ساتھی ممتاز احمد عرض گزار ہیں۔ اسلام علیکم! ماہ اگست کا خاص پُراسرار نمبر اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ ملا۔ ٹائٹل شاندار تھا۔ اداریہ میں منزہ سہام صاحبہ بے ضمیروں کے ضمیر جھنجوڑ رہی تھیں۔ احوال میں کاشی بھائی کی کھری کھری باتیں بہت بھلی لگی۔ اللہ تعالیٰ سچ بولنے والوں کا ساتھی ہے۔ ہمیشہ سچ کا بول بالا ہوتا ہے۔ شر پھیلانے والے لوگ آپنے منہ کی کھائیں گے۔ یہ بھی حقیقت ہے سچ کڑوا ہوتا ہے، سچ بولنے والے کے دشمن بہت ہوتے ہیں۔ مگر کاشی بھائی، آپ نے بالکل نہیں گھبرانا، سچ کبھی نہیں مرتا اور سچے بندے کو اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے سب سے پہلے میں محمد اسماعیل بروہی، فیصل ندیم بھٹی، عبدالغفار عابد، جناب سلیمان شبیر، باجی صائمہ بشیر، راشد لطیف، جناب ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا، صائمہ مجید، سیدہ امامہ علی، سنبل ناہید، حمیرا جبیں، چوہدری فہد سہو اور منعم اصغر کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ سب نے میری کہانی کو آپنی پسندیدگی کی سند سے نوازا۔ محترم مجید احمد جائی اور برادر شاہد رفیق سہو آپ نے میری کہانی کو پسند کرنے کے ساتھ سالگرہ کی مبارکباد دی تو شکریے کے ساتھ آپ کے لیے ڈھیروں محبتیں، خلوص اور دعائیں۔ نہایت قابل صد احترام بڑی آپا رضوانہ کوثر آپ کی دعائیں ہم سب کے لیے انمول اور قیمتی اثاثہ ہیں۔ مسز نوید ہاشمی احوال سے کیوں غائب ہیں؟ محترمہ ریحانہ تسیم کا مختصر مگر جامع تبصرہ اور وضاحت بہت عمدہ تھا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے آپنے پیارے دوست، چھوٹے بھائی، مجید احمد جائی کی 'میں، شیش ناگ' پڑھی، بہت ہی اچھی تحریر لکھی گئی، مبارکاں، چھوٹے کا کا۔ دل خوش کر دیا۔ منشی محمد عزیز مئے کی برگد والا مکان، دیہاتی رسم و رواج کی عکاسی کرتی پُراسرار کہانی پسند آئی، قدرت کے بھید لگانے کا شکریہ قبول کریں۔ چھبیسویں قربانی، محمد سلیم اختر، کافی غیر حاضری کے بعد شاندار انٹری تھی۔ ڈر لگتا ہے، مور شاہد حسین، وآپس جاؤ، جاوید راہی، مٹھی بھر

ریت، محمد یوسف لغاری، تسبیح کی کرامت، ثنا کنول اللہ دتہ، مالکن کا عاشق، پریاں لے گئیں، عظمیٰ شکور، وہ گھونگھٹ والیاں، بخیر شفقت، بہلا، اعجاز احمد فکرال، میرا بیٹا، میرا ارمان، مسز نوید ہاشمی، ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے دستگیر شہزاد، عثمان بلوچ، مجھے چینی لادو، فوزیہ فرید احمد، عقابی حویلی، لیلیٰ اقبال مروہ، بھوگ ناتھ کی پیاس، معاویہ عنبر دٹو، خالہ بیگم، غوثیہ نجیب، خون کا پیاسا، ایک سر بستہ راز حاشم وقاص، شاندار رہی۔ ہم شکل کامیابی کی منزلیں طے کرتے ہوئے آگے بڑھ رہی ہے۔ زہر عشق، کاشی بھائی، کامیابی کے جھنڈے گاڑتے ہوئے منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ برطانیہ میں خزاں، محمود شام، برطانیہ کی مفت سیر کروا رہے ہیں، لندن کی رات، رضوانہ پرنس، زبردست رہی۔ ہائیڈ پارک، اور تیر نیم کش، بہترین سلسلے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے، سچی کہانیاں صدقہ جاریہ کا کام کررہا ہے۔ اس بار تمام کا تمام پرچہ شاندار رہا۔ پُراسرار نمبر دو کی کامیابی پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مبارک باد قبول کریں۔

☆ پیارے بھائی ممتاز! آپ کے تبصرے کا تو اب سچ مچ انتظار رہتا ہے۔ خدا آباد رکھے ان دنوں کو...... کہ جن میں ہر گھڑی ہر پل...... ہماری یاد رہتی ہے۔

✉ ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا، چاہ رجب والا، ملتان سے ہمارے احوالی بن رہے ہیں لکھتے ہیں۔ ماہ اگست کا پُراسرار نمبر دو، ملتان کی مین مارکیٹ سے خریدا۔ ٹائٹل زبردست لگا۔ منزہ سہام، گزشتہ عید، کی مبارک باد دے رہی تھیں اور گلے شکوے تو آپنوں سے ہوتے ہی ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ آپنی جگہ رہتے ہوئے انصاف کریں۔ سبھی نظام خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ احوال میں قدم رکھے تو کاشی بھیا کے سچے لفظوں نے دل جیت لیا۔ ہم تو ابھی نئے نئے آئے ہیں۔ ادیب کیا ہوتا ہے، لکھاری کیسے ہوتے ہیں، قلم کیسے پکڑا جاتا ہے، سیکھنے کے مراحل میں ہیں، آگے بڑھے تو تمام احوالی بڑے خوش اور ہشاش بشاش نظر آرہے تھے۔ آپنا احوال نظروں سے گزارا تو دل سے آپ کے لیے دعائیں نکلیں۔ سدا مولا خوش رکھے آمین۔ مجید احمد جائی، بہت شکریہ آپ نے سچی کہانیاں سے ملوا دیا۔ اب تو مرتے دم تک ساتھ رہے گا۔ (یاد رکھیے گا اپنا وعدہ!) سبھی نئے آنے والوں اور پرانے احوالیوں کا میری طرف سے ویلکم، خوش آمدید اور خلوص بھرا سلام۔ دیکھتے ہیں جی مجھے کون خوش آمدید کرتا ہے۔ کاشی بھائی، آپ کی نظم کمال کی تھی، بہت پسند آئی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے برگدوالا مکان پڑھی، دیہاتی مناظر میں لکھی خوبصورت کاوش تھی۔ قدرت کے بھید، پلیٹ فارم سے جنم لیتی کہانی زبردست رہی۔ ممتاز احمد صاحب مبارک باد، میں، شیش ناگ۔ مجید احمد جائی۔ میرے پیارے ہر دل عزیز لکھاری نے کمال کر دیا۔ مجید احمد جائی، کبھی کبھی دیدار بھی کرا دیا کرو۔ اس کے علاوہ بہلا، اعجاز احمد فکرال، ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے۔ دستگیر شہزاد، مجھے چینی لادو۔ فوزیہ فرید احمد، بھوگ ناتھ کی پیاس، معاویہ عنبر دٹو، مٹھی بھر ریت۔ بس محمد یوسف لغاری، پریاں لے گئیں، عظمیٰ شکور، وہ یکم جنوری، تحسین جونیجو، مالکن کا عاشق، رئیسہ خالد، میرا بیٹا، میرا ارمان، زبردست پیغام دیتی کہانیاں تھیں۔ لائف بوائے شاندار کمرشل تحریر تھی۔ نوزی میری ہے، عثمان بلوچ، خالہ بیگم، غوثیہ نجیب، عقابی حویلی، لیلیٰ اقبال مروہ۔ واپس جاؤ، جاوید راہی، زبردست رہیں۔ پُراسرار نمبر کی خاص کہانی، پچیسویں قربانی، چوری کی سزا انوکھی ملی۔ ہم شکل۔ زبردست چل رہی ہے۔ زہر عشق، کاشی بھائی، کیا کمال ہے۔ کامیابی کی سیڑھیاں عبور کرتی زہر عشق آگے کو بڑھ رہی ہے۔ مبارک باد قبول۔ برطانیہ میں خزاں، بہترین سفرنامہ ہے۔ ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش بہت پسند آئے۔ میرے پاس بہت سی کہانیاں ہیں اگر آپ کہیں تو کاغذ قلم کا رشتہ مضبوط کرلوں۔

## سانحہ ارتحال

ہماری ساتھی اور ایڈیٹر دوشیزہ رضوانہ پرنس کے کزن سید موسیٰ رضا نقوی گزشتہ ماہ انتقال کر گئے ۔اس موقع پر ہم مرحوم کے اعلیٰ درجات اور لواحقین کے لیے صبر کی دعا کرتے ہیں اور قارئین سے بھی دعا کی درخواست ہے۔

☆ ارے ڈاکٹر صاحب! سچی کہانیاں آپ کا اپنا پرچہ ہے، اس میں لکھنے کے لیے اجازت کیسی۔تبصرہ کرکے آپ نے بھی کمال کر دیا۔

✉ کراچی سے یہ آمد ہے ہماری پیاری بہن فرح انیس کی لکھتی ہیں۔اگست کا شمارہ 2 تاریخ کو ملا ارے یہ کیا..... تحریر تو لگی ہی نہیں چلیں کوئی بات نہیں زندگی نے وفا کی تو پھر اگلے پُراسرار نمبر میں انشاءاللہ۔ منزہ سہام کا عید مبارک پڑھا سچ ہے کہ جتنا بھائی بھائی ہوا اتنا اللہ اللہ ہو جاتا تو ثواب بھی ملتا۔احوال میں ماشاءاللہ ہمیشہ کی طرح خوب رونق رہی۔سب ہی کے تبصرے زبردست تھے۔ارم خان آپ نے ایک کان کیوں پکڑا دونوں کان پکڑ لیتیں نا بہنا۔ہا..... ہا..... ہا۔پُراسرار نمبر اس دفعہ شاندار رہا اگر کسی تحریر کی تعریف نہ کی جائے تو یہ دوسری تحریر کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔اعجاز احمد نگرال کی تحریر نے واقعی رونگٹے کھڑے کر دیے مگر آخر میں انہوں نے انگلش مووی کی طرح سین کیوں دیا۔مسز نوید ہاشمی کی تحریر خوبصورت سبق لے کر آئی سچی دعائیں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں۔منعم اصغر کی تحریر بھی ٹھیک تھی۔فوزیہ فرید احمد کی تحریر مجھے چینی لا دو پڑھ کر مزہ آ گیا۔لیلیٰ مروہ اقبال کی تحریر اچھی لگی۔برائی کا انجام ہمیشہ برا ہی ہوتا ہے۔ناگ بیتیوں میں تینوں تحریریں اچھی تھیں۔جاوید راہی ہمیشہ کی طرح بہترین تحریر لے کر آئے، ویلڈن سر جی۔ممتاز احمد کی تحریر بھی ہمیشہ کی طرح منفرد اور عمدہ تھی۔اس کے علاوہ منشی محمد عزیز کی تحریر بھی اچھی رہی۔مختصر تحریروں میں رضوانہ پرنس، عظمیٰ شکور، مور شاہد حسین، تحسین جونیجو، رئیسہ خالد کی بھی بہت اچھی تحریر تھی۔کاشی بھیا کی زہر عشق میں سلمان پر رحم بھی آتا ہے کہ عشق نے اس کو کس قدر بے بس کر دیا ہے۔ماشاءاللہ زبردست جا رہی ہے کہانی۔تیر نیم کش میں سب ہی کے اشعار ہے۔

☆ پیاری فرح! پُراسرار نمبر 3 میں آپ کی تحریر ضرور شامل ہوگی۔تبصرہ ہمیں بہت پسند آیا۔

✉ یاسمین اقبال سنگھ پورہ لاہور سے احوال میں رقم طراز ہیں۔پُراسرار آنکھوں والی حسینہ سے سجا اگست کا پُراسرار نمبر ملا۔عید مبارک کے نام سے منزہ سہام کی تحریر دل کو لگی۔احوال میں سب ہی بہن بھائیوں کے خطوط دلچسپ اور مزے کے تھے۔میں ان سب کی مشکور ہوں جنہوں نے میرے شعر کو پسند کیا۔اس ماہ کی یوں تو سب ہی کہانیاں اچھی تھیں۔اعجاز احمد صاحب کی بہلا، مسز نوید ہاشمی کی میرا ارمان میرا بیٹا، غوثیہ نجیب کی خالہ بیگم، حاسم وقاص کی اک سربستہ راز اچھی تحریریں تھیں۔برگد والا مکان منشی محمد عزیز بھائی نے اچھا لکھا۔منعم اصغر کی کہانی موت کا کنواں کافی عرصے پہلے انڈین ڈرامے پر چلنے والے ایک ڈرامے کی ہو بہو کاپی لگی۔جاوید راہی صاحب کی تحریروں کی میں فین ہوں۔ان کی ہر تحریر لاجواب ہوتی ہے۔سب سے زیادہ پسند آنے والی تحریر محمد سلیم اختر صاحب کی پچیسویں قربانی کچھ مختلف جنوں بھوتوں اور آسیب وغیرہ سے ہٹ کر بڑی اچھی اور عمدہ تحریر تھی۔مجھے یہ کہانی سب سے زیدہ پسند آئی۔ہم شکل اور زہر عشق تو ویسے ہی ہمارے پسندیدہ سلسلے ہیں۔ہائیڈ پارک میں طاہر بزدار کی تحریر شناس اور کاشف مغل کا معجزہ پسند آیا۔مسز نگہت غفار اور فریدہ جاوید فری کے اشعار دل کو بھائے۔

☆ پیاری آپا! آپ کا تبصرہ گو مختصر تھا۔ مگر آپ نے مختصر تبصرے سے بھی آپ کی محبت کے ٹھاٹیں مارتے جذبے ہمارا حوصلہ بڑھا گئے۔ خوش رہیے۔

✉ یہ برقی نامہ ہے ہماری نئی ساتھی احوالی صائمہ مجید کا ملتان شریف سے، لکھتی ہیں، ماہ اگست کا سچی کہانیاں اس دفعہ چار اگست کو جلوہ گر ہوا۔ سرورق پر بیٹھی لڑکی نجانے کیوں اتنی خوف زدہ تھی، بہت خوبصورت ٹائٹل تھا۔ منزہ سہام گزشتہ عید کی مبارکاں دے رہی تھیں اور بے ضمیروں کو جھنجھوڑ بھی رہی تھیں۔ اس دفعہ بھی میری طرح نئے لکھاری شامل احوال تھے، سبھی کو ویلکم، اور خوش آمدید، 148 احوالیوں نے خوب لکھا، میرا پہلا احوال شامل کر کے دل موہ لیا، بہت شکریہ۔ فریدہ جاوید فری، آپی آپ کیسی ہیں؟ ممتاز احمد سرگودھا کی قدرت کے بھید پڑھی، کمال لکھا انکل جی۔ میرے دل کے جانی کی کہانی، میں۔ سیش ناگ! جانے کب لکھے گی انہوں نے۔ اگر آپ کہیں تو برفی کھلا دوں۔ زہر عشق،، چھٹا حصہ خوب رہا۔ پچیسویں قربانی زبردست رہی ویلڈن۔ تمام کی تمام کہانیاں بہت بھلی لگیں، مزہ آ گیا۔ سبھی کو مبارکاں۔ اور کاشی بھیا! کو خلوص نجمہ اسلام، آپ کی محنت رنگ لائی اور پر اسرار نمبر دو، کامیاب رہا۔ ہاں سدرہ انور کی کہانی شامل ہوتی تو...... برطانیہ میں خزاں، ہم شکل، کامیابی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش، شاندار ہیں۔ سچی کہانیاں کی تمام ٹیم اور لکھاری، قارئین کے لیے ہمہ تن دعا گو ہوں، میرا رب سبھی کو خوشیوں بھری زندگی دے اور خوشیاں کبھی نہ ختم ہوں، میرے لیے دعا کرنا۔ اللہ تعالیٰ میری گود ہری کر دے۔ آمین۔

☆ پیاری بہنا! تم ہمارے بہت پیارے مجید احمد جائی کی نصف بہتر ہو مگر ہماری بہن ہو۔ اللہ بہت جلد تمہارے من کی مرادیں پوری کرے گا۔

✉ کراچی سے ہمارے انمول لکھاری قاری اشفاق شاہین لکھتے ہیں۔ کاشی بھائی آداب! یہ ہماری بدقسمتی ہی ہے ڈیئر کہ اکثر ہمیں پرچہ لیٹ ملتا ہے اور ہم کبھی جلد پا کر خط لکھ بھی دیں تو وہ پھر لیٹ ہو جاتا ہے۔ ہم کہاں جائیں اور کیا کریں ہمیں آپنی غیر موجودگی احوال سے خود بھی اچھی نہیں لگتی، آئندہ پہلے سے زیادہ کوشش ہوگی کہ دوستوں کو ہماری کمی محسوس نہ ہو جو ہمیں اکثر یاد کرتے ہیں۔ تحسین جونیجو ہیں، سدرہ انور علی، ارشد وفا، ہیں۔ سرورق شاندار ہے احوال میں تو اس بار رونق ہی رونق تھی۔ سچی دل خوش ہو گیا ہے تمام نئے احوالیوں کو تہہ دل سے خوش آمدید۔ باقاعدگی سے آتے رہیے گا۔ انہی دوستوں میں میرے پرانے دوست شہزاد اشعر بھی احوال کا حصہ بنے ہیں خوش آمدید۔ عابد انجم، یاسر کی جگ جگ جیو اسی دیپال پور سے ہم نے بھی کبھی انٹر کیا تھا۔ ہمارا گھر وہیں ہے حجرے کے پاس۔ ایک ہم ادھر ہیں پردیسی، روزی روٹی کی تلاش میں۔ دل کہیں اُدھر ہی ہے۔ ثمینہ ناز کی عرصے بعد آمد بھلی لگی۔ اور مظفر شکور کا خط سب سے بہترین رہا۔ غفار عابد بہت اونچے جا رہے ہو دوست! آتے ہیں تبصرے کی طرف۔ ہمت کر کے اس بار پر اسرار نمبر پڑھ ہی لیا۔ سب تو کہانیاں اچھی رہیں، پر اسرار نمبر میں۔ تحسین جونیجو، مظفر کی شکور، ممتاز احمد، مور شاہد اور سلیم اختر کی کہانیاں بہت اچھی تھیں، ان سب کو بہت بہت مبارکباد۔ ایم اے راحت کی ہم شکل اچھی جا رہی ہے اور کاشی بھائی کی زہر عشق کے تو کیا ہی کہنے۔ کفر زلل، ہائیڈ پارک میں انتخاب اچھا رہا۔ تیر نیم کش میں انتخاب لاجواب تھا۔ خصوصاً سنبل ناہید، سدرہ انور علی اور شعبان کھوسہ۔ تمام دوستوں کو آداب۔

☆ بھائی اشفاق الیقین ملک آپ کے تبصرے نے دل خوش کر دیا۔ اگلے ماہ کا ابھی سے انتظار ہے۔

✉ ہمارے بہت پیارے ساتھی مظفر جاوید لک موڑ، سرگودھا سے احوال میں ہمارے ساتھ ہیں۔ اس بار طویل انتظار کے بعد پرچہ 4 تاریخ کو ملا۔ 10 تاریخ تک خط آپ کو مل بھی جانا چاہیے۔ تب ہی

## دعائے صحت

ہمارے محترم ساتھی ایم اے راحت گزشتہ ماہ ایک حادثے سے دوچار ہوئے۔ایم اے راحت بھائی کی صحت یابی کے لیے ادارہ دعا گو ہے اور قارئین سے بھی آپ کی صحت کے لیے دعا کی اپیل ہے۔

کہیں جا کر اشاعت پذیر ہوتا ہے اب سمجھ نہیں آ رہا کیا پڑھوں اور کیا لکھوں۔اب دفتر بھی جانا ہے اور اس پر تبصرہ بھی کرنا ہے۔کاشی بھائی اس دفعہ تو آپ نے کافی مشکل میں ڈال دیا ہے۔بہرحال آپ اور سچی کہانیاں سے دلی محبت ہوگئی ہے۔اب تو تبصرہ کرنا پڑے گا۔مصنوعی رنگوں والا دوپٹہ اوڑھے ماڈل کچھ ڈری ڈری سی لگی۔شاید اس کے ماتھے کے ساتھ پر اسرار نمبر 2 لکھا تھا۔اس لیے بہرحال ہیلو ہائے کے بعد آگے بڑھے۔اشتہارات کو نظر انداز کرتے ہوئے منزہ جی کے عید مبارک پر پہنچے پڑھ کر تھوڑی دیر سوچتے رہے۔پھر خاموشی سے آگے بڑھ گئے (واہ نبیل! (شکریہ! کہ کسی نے سوچا تو رُک کر۔یہی لکھنے کا مقصد بھی ہے) منزہ سہام کی جانب سے شکریہ قبول فرمائیے) آگے بڑھے تو کاشی صاحب اپنی خوبصورت محفل سجائے بیٹھے تھے۔کاشی صاحب میں نے تو آپ کی بات پلے باندھ لی ہے۔اب باقی دوستوں کی اپنی مرضی۔جن دوستوں کو میری لکھی ہوئی اسٹوری پسند آئی ان تمام دوستوں کا میں دلی طور پر مشکور ہوں جن میں جناب فیصل ندیم، شعبان کھوسہ، میرے پسندیدہ رائٹر ممتاز احمد، پیاری سی سدرہ انور علی، منعم اصغر۔اس کے علاوہ اس بار احوال میں تمام دوستوں کے لیٹرز کافی اچھے تھے۔نئے آنے والوں کو دل کی گہرائیوں سے ویلکم۔۔جی آیاں نوں۔اب تھوڑا سا تبصرہ شمارے میں شامل کہانیوں کا۔ماشاء اللہ اس دفعہ تمام رائٹرز نے خوب محنت کی۔اعجاز احمد صاحب کی بھلا، مسز نوید ہاشمی کی، میرا بیٹا میرا ارمان، دستگیر شہزادا ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے، منشی عزیز برگد والا مکان، منعم اصغر موت کا کنواں، فوزیہ فرید احمد مجھے چینی لادو، شاہد رفیق خون کا پیاسا، معاویہ وٹو بھوگ ناتھ کی پیاس، لیلیٰ مروہ عقابی حویلی، میں شیش ناگ مجید احمد جائی، جاوید راہی واپس جاؤ، ممتاز احمد قدرت کے بھید، مورشاہد حسین ڈر لگتا ہے، عظمیٰ شکور پریاں لے گئیں، تحسین جونیجو وہ یکم جنوری، مالکن کا عاشق رئیسہ خالد، تمام کہانیاں زبردست تھیں۔سلیم اختر پچیسویں قربانی طویل کہانی پسند آئی۔انکل سلیم You are the best اس کے علاوہ سلسلے وار ناول ہم شکل ایم اے راحت، زہر عشق کاشی چوہان۔دونوں خوب دھوم دھام سے چل رہے ہیں۔اس کے علاوہ خلق خدا کے لیے مسئلہ یہ ہے کافی اچھا سلسلہ ہے۔اس کے بعد ہائیڈ پارک میں تمام دوست چھائے رہے۔اور تیر نیم کش میں تمام دوستوں کے بھیجے ہوئے اشعار پسند آئے۔کاشی بھائی میری 20 ستمبر کو سالگرہ ہے۔(سالگرہ مبارک) اگر زندگی رہی تو اگلے ماہ پھر حاضر ہوں گا۔انشاءاللہ! شعر کے جواب شعر سے دیں۔

مجھ میں بے لوث محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
تم اگر چاہو مرے دل کی تلاشی لے لو

☆ پیارے نبیل پہلے تو شعر کا جواب سنو۔

اب مرے دل کی بات کرتے ہو
اب مرے اختیار میں کب ہے!!

تمہاری بے لوث محبت کو ہم جانتے ہیں پہنچانتے ہیں۔تبصرے کا شکریہ۔کہانی پڑھ کر رائے دیں

گے۔ نئی اقبال احوال میں آپنے خط کا مزہ لو۔

کراچی سے کشاف اقبال احوال میں شریک ہو رہے ہیں آپنی پہلی آمد پر بہت مسرور بھی ہیں اور کچھ سہمے سہمے بھی عرض کچھ یوں کرتے ہیں۔ سچی کہانیاں کے احوال میں پہلی بار شامل ہو رہا ہوں میں یہ ڈائجسٹ کبھی نہیں پڑھتا تھا پر جیسے جیسے اس کی رنگین اور خوبصورت کہانیوں بھرے شمارے مقبولیت کے درجے چھونے لگے تو سوچا کہ اس کو ایک بار ضرور پڑھوں۔ میں نے سچی کہانیاں مئی سے پڑھنا شروع کیا تھا اور اب یہ میرا من پسند ڈائجسٹ بن گیا ہے کچھ ہی دن پہلے میں نے جولائی کا شمارہ پڑھا۔ نمبر ون پر ثمینہ فیاض صاحبہ کی 'سایوں پر نقش' جبکہ دوسرے نمبر پر مومنہ بتول کا 'کفارہ ہوا ادا' رہی۔ زہر عشق کی شروع کی اقساط میں نہ پڑھ سکا۔ پر جب میں نے آپ کا یہ ناول پڑھنا شروع کیا مجھے واقعی بہت مزہ آیا۔ بہت خوفناک اور پراسرار تحریر لگی۔ دعا ہے آپ کا یہ رسالہ اور زیادہ ترقی کرے۔ آمین۔

☆ پیارے کشاف! خوش آمدید! کہانی کے بارے میں تو ہماری بات فون پر ہو چکی۔ باقی انشاء اللہ کہانی پڑھ کر رائے دیں گے۔ احوال میں احوال کہاں گیا مُنّے سیاں؟

کوٹری سے پہلی بار آمد ہے ہماری ساتھی طیبہ مخدوم کی، لکھتی ہیں۔ تقریباً بارہ سال بعد آج پھر ایک کہانی سچی کہانیاں کے لیے بھیج رہی ہوں۔ میں آج سے بارہ سال پہلے سچی کہانیاں کی مستقل قاری بھی تھی۔ اور میری پانچ کہانیاں شائع ہو کر انعامات بھی جیتی ہیں۔ میں نے چھ سات کہانیاں بھیجی تھیں جو کہ شائع نہ ہوئیں نہ مجھے ان کی اطلاع ملی۔ شاید پوسٹ آفس کی نا اہلی کی نذر ہو گئی تھیں۔ پھر تعلیمی مصروفیات اور اس کے بعد پروفیشنل لائف میں کچھ ایسا الجھ گئی کہ موقع ہی نہ ملا۔ اور دلچسپی بھی کم ہو گئی یہ کہانی آدھی تو بارہ سال پہلے کی ہی لکھی ہوئی ہے اور مکمل آج کی ہے۔

☆ اچھی بہن! بارہ سال پہلے اور آج...... درمیان میں بہت تبدیلیاں رونما ہوئیں بس سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ آپ واپس آ گئیں۔ امید ہے اگلے ماہ آپ کا تبصرہ بھی ہمارے روبرو بھرپور ہوگا۔ انشاء اللہ بہت جلد کہانی کے بارے میں مطلع کر دیا جائے گا۔

ڈسٹرکٹ جیل کوہاٹ خیبر پختون خواہ سے پہلی بار سید ملازم حسین نے یاد کیا ہے، لکھتے ہیں۔ میرا نام سید ملازم حسین ہے۔ پورا تعارف پھر کرواؤں گا۔ میں اس وقت ڈسٹرکٹ جیل کوہاٹ میں ایک کیس کی سماعت کے سلسلے میں حوالات میں بند ہوں۔ سچی کہانیاں سے میرا تعلق کافی پرانا ہے۔ 2007ء میں تین ماہ کے لیے دوبئی گیا تھا۔ ڈیرہ دوبئی فراسان ہوٹل میں قیام تھا۔ اپنی کاروباری مصروفیات کے بعد مذکورہ ڈائجسٹوں کو پڑھنا بہترین شغل تھا۔ میں نے ایک سال کے گزشتہ ماہناموں کا انتظام کر لیا تھا اور یہ تین ماہ سچی کہانیاں کو پڑھنے میں گزارے۔ میری زندگی کے حسین اور یادگار ایام تھے۔ میں آپ کی کاوشوں محنت و لگن کا بہت معترف ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے زورِ قلم میں اضافہ کرے۔ منسلکہ کہانی ارسال خدمت ہے۔ اس کہانی کا میں چشم دید گواہ ہوں۔ اگر مناسب سمجھیں تو مہربانی فرمائیں اس کہانی کو نزدیکی اشاعت میں شائع فرما دیں جس کے لیے میں ہمیشہ ممنون و مشکور رہوں گا۔ اگلے ماہ سے باقاعدگی سے احوال میں شرکت کر کے اور تبصرہ کرنے کی سعادت حاصل کروں گا۔ جیل میں قیدیوں کی بہت المناک، دردناک اور عبرت ناک اور دلسوز کہانیاں ہیں اگر آپ نے اجازت دی تو کوشش کروں گا انہیں سپردِ قلم کروں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ شاد اور سکھی رکھے۔ آمین۔

☆ پیارے بھائی ملازم حسین! سچی کہانیاں آپ کا آپنا پرچہ ہے اس کے لیے تحریر بھیجتے ہوئے اجازت

کی ضرورت کس لیے؟؟ اگر آپ نے ہمت کر کے خط لکھ ہی لیا ہے تو ہم چاہیں گے کہ آپ کا اور ہمارا ساتھ اب چھوٹنے نہ پائے۔

✉ کراچی سے ندیا مسعود مختصر ترین آمد کے ساتھ حاضر ہیں لکھتی ہیں محترم کاشی چوہان صاحب! میں ایک تحریر آپ کو بھجوا رہی ہوں۔ اس تحریر کو آپ سچی کہانیاں میں دوشیزہ میں جہاں مناسب لگے چھپوا دیجیے۔ اُمید ہے پسند آئے گی یہ تحریر۔ ''سچی کہانیاں میں میری 'سچی کہانی' چھاپنے پر نہایت شکر گزار ہوں۔

☆ پیاری ندیا! بھئی احوال میں آمد اتنی مختصر...... تفصیلی تبصرہ کیا ہوا؟؟ کچھ تو محبت کا حق آپ بھی ادا کر دیں۔

✉ تیمور عباس، خان پور، مجنوالا سے پہلی بار احوال میں حاضر ہیں۔ سچی کہانیاں سے وابستہ پیارے ماموں ایم یعقوب سے کافی ذکر سنا پھر آہستہ آہستہ ایم یعقوب کو قلم کشائی کرتے دیکھا تو سچی کہانیاں کو باقاعدگی سے پڑھنے لگا۔ ماہ جولائی جامپور کی مارکیٹ سے آپ کا محبت نامہ ملا جس میں نئی دنیا موجود تھی، اچھے اچھے ادبی مصنفوں سے۔ سب سے پہلے منزہ سہام کی تحقیقی دلائل پڑھے اور رب تعالیٰ سے اپنی غلطیوں اور گناہوں کی معافی مانگی اور احوال میں قدم رکھا۔ ایم یعقوب، منعم اصغر، سفیر انجم، ارم ناز، نازیہ، نازش، عظمیٰ شکور، پاکستان کی معروف ماہا ملک، سدرہ علی، شاہد رفیق سہو، عبدالغفار عابد، ندیم میواتی، راشد ملک، راشد لطیف، چوہدری پرویز سہو، حمیرا جبیں، یاسر وکی، ایم وکیل عامر جٹ، اور نئے احوالیوں کی آمد پر دل خوش ہوا۔ سچی کہانیاں کی الگ ہی دنیا ہے۔ جو اس دنیا سے برعکس ہے۔ تحریروں سے اسما اعوان نے لائف بوائے کے ساتھ قلم کشائی کی ویری گڈ۔ ایم یعقوب نے ہوا کی بیٹی کو بے بس اور بے کسی کے درد میں بے اعتباری کی بھینٹ چڑھتے ہوئے قلم کشائی کرتے ہوئے پایا۔ زبردست ماموں جی! بیاہی عورت کو تو ماں کے گھر کا دال دلیہ ہی اچھا تھا۔ بے چاری ظلموں تلے دب گئی۔ طارق محمود آکاش جی گڈ۔ عبدالغفار عابد ویلڈن۔ زبردست ممتاز جی آپ کے جادو نے دل پر نقش گاڑھ دیے۔ اولڈ ہاؤس خدا ایسے بیٹے کو پیدا ہوتے ہی مار دے۔ اللہ بھی انصاف کرنے والا ہے۔ جیسا کرو گے ویسا ہی بھرو گے۔ حنا بشریٰ، ثمینہ فیاض، ثمینہ طاہر بٹ، ہم نے تو وفا کی تھی گڈ۔ ساتویں بہن، اور تماشا تمام ہوا...... اللہ دنیا ہی کیے کی سزا دے سکتا ہے۔ بھاگوں والی کا کوئی آپنا نہ بنا۔ کوئی کب تک سہے اعجاز احمد، محمد کاشف، کفارہ ادا ہوا، جواد احمد کی کٹی پتنگ، سیما گل لہو کے چراغ پسند آئیں۔ اور معنز ایم اے راحت، جاوید راہی، اور زہر عشق قلم کے جادو سے حیرت تجسس سے دل کو موہ لینے والے کاشی صاحب ویری گڈ اللہ آپ کو مزید ترقی دے۔

☆ پیارے اچھے بھیا تیمور عباس! خوش آمدید تمہارا تبصرہ بہت اچھا لگا۔ کیا تم ہمیں ہر ماہ یہ خوشی دے سکتے ہو......

✉ محمد سفیان احمد کی دریا خان، بھکر سے احوال میں اولین شرکت ہے لکھتے ہیں پچھلے 7 مہینے سے سچی کہانیاں پڑھ رہا ہوں۔ یہ میرا پسندیدہ ڈائجسٹ ہے۔ کیونکہ اس میں معاشرے کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ میں نے بہت ہمت کر کے آپنی کہانی لکھی ہے اور امید ہے کہ آپ میری کہانی کو ضرور شائع کریں ہے اور میری تمام رائیٹر سے التجا ہے کہ وہ اس طرح ہی آپنی کہانیاں لکھتے رہیں۔ (ارے......) ایک بار پھر منزہ آپی آپ سے التجا کرتا ہوں کہ میری کہانی ضرور شائع کر دیں۔ (اس طرح......) آپ کی نوازش ہوگی۔

☆ اچھے بھیا! تمہارا تبصرہ ملا۔ پہلے تو احوال میں خوش آمدید! مگر...... تبصرہ کہاں گیا منے بھائی! کہانی کے بارے میں ان ہی صفحات پر مطلع کر دیا جائے گا۔ اگلے ماہ تبصرے کے ساتھ آنا ورنہ...... اب اسے ہماری محبت سمجھو یا حکم۔

✉ کاشف عبید بٹہ موڑی بٹ گرام کافی عرصے بعد احوال کا حصہ بن رہے ہیں۔ شمارہ 2 تاریخ کو ملا

سرورق آپ کی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ ویسے اگر سارے ٹائیٹل پر ریحام خان کی تصویر ہوتی تو اچھا تھا۔ خیر ساتھ حسینہ نے رمضان کے احترام میں سر کو ڈھانپا ہوا تھا مجموعی طور پر سرورق جاذب نظر تھا۔ اور تبصرہ کرنے سے پہلے آپ سب قارئین سے معافی چاہتا ہوں کہ اتنے ماہ غیر حاضر تھا۔ (معاف کیا) اداریہ فکر یہ تھا۔ احوال میں سب قارئین کے خطوط اچھے تھے۔ محمد خالد شاہان کا خط اچھا تھا۔ ممتاز صاحب کیسے ہیں آپ۔ عظمیٰ شکور صاحبہ نے شاید سرگودھا چھوڑ دیا۔ اب دارالحکومت میں رہ رہی ہے آپ نے میری اسٹوری کہانی میں محبت مرگئی کو پسند کیا شکریہ۔ ساتھ ساتھ جس جس نے بھی میری کہانی کو پسند کیا تھا۔ سب کا بہت بہت شکریہ۔ احوال میں سو دوستوں نے اچھا لکھا نئے نئے تبصرہ نگار شامل ہورہے ہیں۔ اچھی بات ہے سب کو اس کارواں میں اظہار خیال کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔ ریحام خان کے بارے میں اچھا لکھا تھا۔ اور کاشی جی آپ کا سلسلے وار کہانی تو کمال کی ہے۔ مبارک ہو جی۔ میرے فیورٹ رائٹر ایم اے راحت کا تو جواب نہیں۔ ہم شکل اچھا ناول ہے۔ سفر نامہ برطانیہ میں ہم گھر بیٹھے وہاں کی سیر کر رہے ہے۔ محمد اقبال زمان نے داستان شہادت لکھ کر دل جیت لیا۔ محمد کاشف مغل کی کہانی اک پہیلی اچھی کہانی تھی۔ ساتھ ساتھ جن رائٹرز نے کہانیاں لکھیں سب ہی آپنی آپنی جگہ پر اچھی تھیں۔ کوشش کروں گا کہ ہر ماہ خط لکھوں۔ آخر میں سب قارئین اور اسٹاف کو عید مبارک ہو۔

☆ پیارے کاشف عبید! اتنے دن غیر حاضری کیوں بھئی! آئندہ غیر حاضر ہوئے تو سزا دی جائے گی۔ تبصرہ بہتر ہے۔

✉ کراچی سے یہ آمد ہے ہماری بہت پیاری آپا مسز نوید ہاشمی کی، لکھتی ہیں۔ دوستو! اور ساتھیو یعنی جولائی میں بہت خوبصورت دن آ کر چلے گئے مگر ہم آپنے دوستوں سے جدا تھے۔ بابرکت رمضان پھر عید آپ سب کو بہت بہت مبارک ہو۔ بچپن سے آج تک یہ کبھی نہیں دیکھا کہ رمضان میں لائٹ کا مسئلہ ہوا ہو۔ اس رمضان میں گرمی، پھر لائٹ نے زندگی برباد کردی۔ اس میں بے چارے غریب نے ہی جان کی بازی ہاری، بہت کم امیر لوگ تھے۔ زیادہ تعداد غریب عوام کی تھی۔ پھر عید کے تیسرے دن آپنی دوست سے ملی۔ اُس سے مل کر واقعی مجھے سچی خوشی ملی میری دوست سچی کہانیاں ڈائجسٹ۔ منزہ سہام کی جنت پڑھ کر ہم احوال میں کود پڑے اور پرانے دوستوں کو دیکھ کر خوشی ہوئی اور بیان نہیں کر سکتی احوال میں 148 افراد نے شرکت کی ماشاءاللہ احوال میں اتنے لوگوں کی آمد میرے بھائی کاشی چوہان کی وجہ سے ہے۔ ان ہی کی محبت کا انداز ہی اس احوال کو بڑھا رہا ہے۔ ندیم عباس بھائی آپ کا شکریہ حسنین تابش صبر سے کام لو ہمت کرو آپنا خیال رکھو۔ یاسمین کے لیے اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ ان کے درجات بلند فرمائے۔ سدرہ انور علی نٹ کھٹ میری پیاری سے بہن کا احوال میں لکھنے کا انداز پسند آیا۔ نازیہ جہانگیر اللہ آگے خیر کرے گا۔ اللہ سب کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ عبدالغفار عابد بھائی آپ کی محبتیں ہمیں پسند ہیں۔ ثناء کنول کو منگنی کی مبارک باد۔ وقاص حسین کی دادی کی مغفرت فرمائیں۔ نفیسہ فضل کی بھی صحت کی دعا کرتی ہوں۔ شازیہ آپ کو بھائی کی شادی کی مبارک باد قبول کرو۔ جولائی کی کہانیاں پڑھیں سب بے حد اچھی تھیں اس وجہ سے وہ سچی کہانیاں ڈائجسٹ کے لیے موجود تھیں۔ لکھنا سب کو آتا ہے لکھنے کا انداز ابتدا اور اختتام ایسا ہو کہ قاری کو آپنی گرفت میں جکڑ لے وہ کہانی ہوتی ہے۔ اور ہم سے زیادہ کمال ہمارے بھائی کاشی چوہان کو جاتا ہے۔ ایک سادہ سی کہانی میں تڑکا لگا کر کہانی کا لطف دوبالا کر دیتے ہیں۔ دیر سویر ہو جاتی ہے مگر کاشی کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتے۔ اسپیشل ممتاز احمد، اعجاز احمد فلکرال، نسیم صدر الدین سرائی، باقی

ستمبر 2015ء

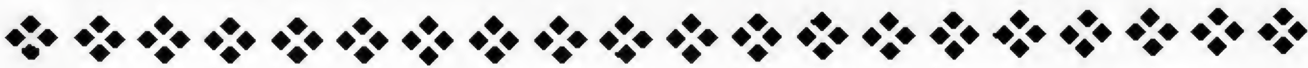



میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کرر ہا/کررہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کرلیں۔

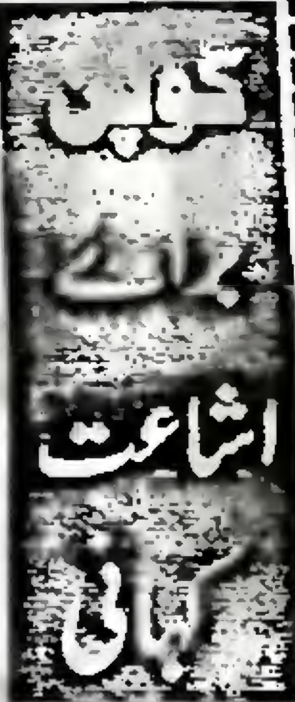
نام: ---------------------------------------------



مکمل پتا: ---------------------------------------------



ستمبر 2015ء




میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا/بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شاملِ اشاعت کرلیں۔

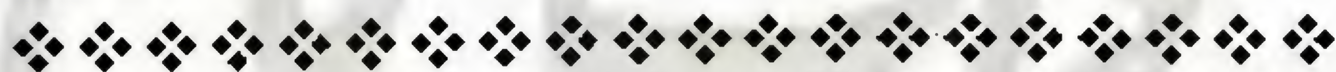
عنوان کہانی: ------------------ تعداد صفحات: ------------

نام: ---------------------------------------------

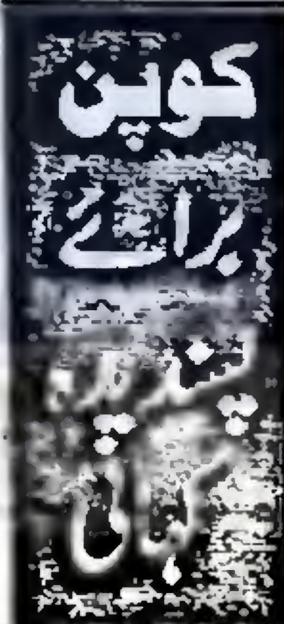
مکمل پتا: ---------------------------------------------

---------------------------------------------

فون/سیل نمبر: ---------------------------------------------



ستمبر 2015ء




میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا/کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اوّل، عنوان: ---------------- مصنف: ----------------

دوم، عنوان: ---------------- مصنف: ----------------

سوم، عنوان: ---------------- مصنف: ----------------

نام: ---------------- شہر: ----------------

سب کی تعریف نہ کرنا ناانصافی ہوگی سیما عروج، ثمینہ فیاض، ایم یعقوب، ڈاکٹر طارق، جنجل متینہ، غازی عباس، نبیل جاوید، ارم ناز آپ کی تحریر بھی مجھے پسند ہے۔ سیما گل، شیخ معظم، مبشر بیگ، جواد احمد، کاشف مغل، الماس فاطمہ، آپ کی تحریر بھی شاندار تھی۔ ثمینہ طاہر بٹ، مومنہ بتول، جاوید راہی، لاجواب تحریر حنا بشریٰ آپ چھا گئیں۔ ندیم عباس، منزہ نصیر، اسماء اعوان، خوبصورت تحریر ہم شکل اور زہر عشق اس ڈائجسٹ کی جان ہیں۔ آپ کی کہانی کے بغیر یہ ڈائجسٹ ادھوری ہے۔ خط بے حد لمبا ہوگیا۔ جون سے جو چلا تو اگست پر رکا پورے مہینے کی باتیں آپ سب سے شیئر کرلیں۔ آپ کو جو پسند آئے لگادیں جو پسند نہ آئے......

☆☆ اچھی آپا! سلامت رہیے۔ احوال میں آپ کی کمی محسوس ہوتی ہے محبت لفظوں کی محتاج نہیں ہوتی۔ ایک سسٹم خدا نے دل سے دل تک بھی لگایا ہے جو صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ آپنا بہت خیال رکھیے گا۔

✉ سدرہ انور علی جھنگ صدر سے احوال میں شامل ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ بتایئے کہ کوئی ڈوبا تو نہیں سیلاب میں...... میرا مطلب ہے جب بھی آتا ہے پُراسرار نمبر تو گویا میں زندہ ہوجاتی ہوں۔ پُراسرار نمبر 2، تین تاریخ کو ملا، سرورق پسند آیا۔ منزہ آنٹی کا عید مبارک، بہت سچ بات کی انہوں نے۔ احوال میں سب سے پہلے محمد اسماعیل بھائی سے ملاقات ہوئی سب نے بہت اچھے تبصرے کیے۔ طاہر بزدار، عبدالغنی، ڈاکٹر خادم اُمامہ علی، ثمینہ شہزادی، سنبل، احمد شہزاد، نعیم اللہ، عابد علی، لاریب، شازیہ محسن، چوہدری فہد خوش آمدید، صائمہ مجید ویلکم اِن احوال ڈیئر ہم سب یہاں فرینڈز ہیں ثمینہ ناز آپی، ملکہ احوال تحسین جونیجو ویلکم بیک، تحسین جی یہ تو وہی بات ہوئی نہ کہ ایک جھلک دکھلائے کبھی، کبھی آنچل میں چھپ جائے۔ میں تھوڑی انجرڈ ہوں 26 جولائی کو ایک چھوٹا سا حادثہ ہوگیا، بٹ آئی ہوپ سو کہ آپ خیریت سے ہوں گی۔ مما جانو، زرینہ آپی سے کہو وہ بھی ایک چکر لگالیں پلیز (کاشی بھیا یاد رہے ملکہ کو تاج ہم نے پہنایا تھا ہا......ہا......) مجید احمد بھیا ویری تھینکس نوازش ہے بھائی کی مگر ہماری برتھ ڈے تو بہت پہلے گزر چکی مارچ میں۔ کمانڈو شعبان بھیا، فرح انیس، شاہد رفیق جی، صائمہ مجید، ثمینہ شہزادی، حمیرا جبیں، چوہدری پرویز، تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ کاشی بھیا آپ کا سندیسہ میرے دل میں اتر گیا۔ زہر عشق میں انی کی جان بچتے دیکھ کر جان میں جان آئی۔ لائف بوائے بچھڑوں کو ملاتا بھی ہے پڑھ کر حیرانگی ہوئی ویلڈن اسماء جی، بھلا اعجاز احمد فکرال کی اچھی ہی لگی۔ مسز نوید ہاشمی کی میرا ارمان اس شمارہ کی بہترین کہانی ہے۔ ارے ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے بہت ہی سنسنی خیز تحریر ہے۔ داؤ ویلڈن۔ منشی عزیز بھیا کی برگد والا درخت بھیا ڈرا ہی دیا۔ فوزی میری ہے ریئلی بہت ہی خوفناک رونگٹے کھڑے کرنے والی تحریر ہے۔ تحسین جونیجو کی وہ یکم جنوری بہت لمبے طویل عرصے بعد آپ کی کہانی پڑھی ہے ویسے وہ بچے کس کے ہیں......؟ مجھے چینی لادو، فوزیہ فرید کی، غوثیہ کی خالہ بیگم، بھوگ ناتھ معاویہ عنبر ڈوگی، عقابی حویلی لیلیٰ مروہ اقبال، مجید بھیا کی شیش ناگ، محمد یوسف منشی بھرپور ہے۔ بس بھیا زلیخا کو بھی لے آئیں، جاوید راہی کی واپس جاؤ، قدرت کے بھید میں ممتاز بھیا، وہ لندن کی رات رضوانہ پرنس، وہ گھونگھٹ والیاں نیئر شفقت سہرے والے کدھر ہیں؟ مور شاہد بھیا کی ڈر لگتا ہے بھئی کیوں؟ ثناء کنول کی تسبیح کی کرامت، عظمیٰ شکور پریاں لے گئیں، شکر کرو کہ...... مالکن کا عاشق رئیسہ خالد بہت ہی اچھی خوف میں ڈوبی رونگٹے کھڑے کردینے والی تحریریں لگیں۔ خصوصی کہانی انکل محمد سلیم اختر کی یہ ابھی تک نہیں پڑھی اور مجھے پتا ہے بہت اچھی ہوگی۔ ہائیڈ پارک میں سب کے انتخاب پسند آئے۔ تیر نیم کش میں شعر معیاری ہونا چاہیے۔ حیات باقی ملاقات باقی سو اللہ نگہبان۔

☆ پیاری سی گڑیا! آفت کی پڑیا۔ تبصرہ شاندار رہا۔ آپنا بہت خیال رکھنا۔ ہمیں تمہارا کا بھیجا گیا رسالہ

فی الحال نہیں ملا۔

✉ کراچی سے ہماری بہت پیاری لکھاری ساتھی ارم ناز لکھتی ہیں۔ زہر عشق مزیدار چل رہی ہے، سدرہ انور علی، تحسین جونیجو، فرح انیس، تجمل مٹیلو، مجید احمد جائی، رضوانہ کوثر، فریدہ جاوید فری، شعبان کھوسہ، منعم اصغر، شاہد رفیق، منشی محمد عزیز مے، عظمٰی شکور چند! تمہاری تعریف کا شکریہ۔ میں کہانی لکھنے میں کوئی خاص محنت نہیں کرتی بس اردگرد کے لوگوں کے حالات محسوس کرتی ہوں۔ نظر دوڑائیے تو ہمارے اردگرد بہت کہانیاں ہیں، ہاں ایک بات ضرور ہے کہ میرا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ نئے لوگوں کو خوش آمدید، بہن ثمینہ ناز اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و تندرستی عطا فرمائے۔ آمین۔ کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں اس لیے ان پر تبصرہ اُدھار جولائی اور اگست کا سرورق بہترین تھا پرچہ دن بدن ترقی پر ہے۔ محنت نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتی۔ کاشی چوہان تو ہمارے بچوں کے چاچو ہیں کیونکہ میرے شوہر بھی چوہان ہیں۔ اب اجازت دیجیے کیونکہ دوپہر کا کھانا بھی بنانا ہے۔

☆ پیاری سی بہنا! تبصرے کا شکریہ۔ کہانی زبردست، تبصرہ زبردست! لنچ ہمیں بھی بھجوادو بھئی آپ۔ ہم بھی دیکھیں کھانا کیسا بناتی ہے ہماری بہن۔

✉ مقصود احمد بلوچ میاں چنوں سے ہمارے احوالی بن رہے ہیں آپ نے جولائی کا شمارہ مارکیٹ میں لا کر یہ ثابت کر دیا کہ آپ واقعی محنت و دل لگی اور محبت سے اس ادارے میں کام کر رہے ہو۔ جولائی کا شمارہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔ اس پرچے کا آپ نے ایک معیار بنا دیا ہے۔ اس کے مقابلے میں میرے خیال میں کوئی اور پرچہ نہیں ہے۔ کاشی بھائی آپ جس لگن محنت و محبت سے کام کر کے سچی کہانیوں کو قارئین تک پہنچاتے ہو میں آپ کی اس محبت کو دونوں ہاتھوں سے سلام پیش کرتا ہوں (ارے......) میں کافی عرصہ سچی کہانیاں سے دور رہا ہوں اس کے لیے معذرت کیونکہ کچھ ذاتی معروفیات ایسی تھیں۔ اب انشاء اللہ ہر ماہ حاضری دیا کروں گا۔

☆ اچھے مقصود! اللہ آپ کی پریشانیاں دور فرمائے۔ ارے بھیا یہ تو بتاؤ کہ تبصرہ کرنا کیوں بھول گئے......؟ اگلے ماہ مکمل تبصرہ میرے ہاتھ میں ہو۔

✉ بھٹ شاہ سے سیدہ کاظمی کی یہ پہلی بار آمد ہے لکھتی ہیں۔ میں بہت سالوں سے سچی کہانیاں کی قاری ہوں اور فین بھی۔ (آہم مم) مجھے اس کا ہر سلسلہ بہت پسند ہے۔ خاص طور پر جو اس میں سچی کہانیاں ہوتی ہیں وہ تو مجھے بہت ہی زیادہ پسند ہیں۔ میں گزشتہ پندرہ سال سے سچی کہانیاں کی قاری ہوں۔ لیکن پہلی بار آپ کو خط لکھ رہی ہوں اس اُمید کے ساتھ کہ حوصلہ افزائی ہوگی۔ اس میں جو کہانیاں ہوتی ہیں وہ زیادہ تر تلخ ہوتی ہیں۔ آپ لوگ معاشرے کے سدھار کے لیے اپنا کام بہت خوبی سے انجام دیتے ہیں۔ آج کل لوگ بہت بے حس ہو چکے ہیں اور اپنے آس پاس کے حالات دیکھ کر جان بوجھ کر انجان بنتے ہیں۔ یقین کریں یہی وجہ ہے کہ میں بھی اپنی کاوش لے کر آپ کی بزم میں شامل ہونا چاہتی ہوں اور آپ سے کاغذ اور قلم کا رشتہ استوار کرنا چاہتی ہوں۔

☆ عزیزی سیدہ کاظمی! خوش آمدید! انشاء اللہ بہت جلد آپ کی کہانی سچی کہانیاں کا حصہ ہوگی۔ اس بار چونکہ آپ کی پہلی آمد ہے اس لیے معافی مگر اگلے ماہ مجھے آپ کا سچی کہانیاں پر تفصیلی تبصرہ چاہیے۔

✉ کراچی سے گلے شکوؤں کے ساتھ یہ آمد ہے ہماری نئی لکھاری دوست نوشین آراء کی، لکھتی ہیں۔ اگست 2014 میں میری کہانی شائع ہوئی تو مجھے بہت خوشی ہوئی 'خبیث روحیں' نام تھا۔ دوبارہ ہمت ہوئی بہت کوشش کر کے ایک اور کہانی بھیجی اس کا کافی انتظار کیا، آپ سے فون پر بات ہوئی، آپ نے کہا آفس

شفٹنگ میں ایسا ہوا کہ وہ کہیں گم ہوگئی ہے، دوبارہ لکھیں۔اس کہانی کو لکھنا اتنا آسان نہیں تھا۔اُسے لکھتے ہوئے میرے آنسو نہیں رکتے تھے۔بہت مشکل سے لکھا تھا۔اب دوبارہ لکھنے میں ٹائم لگے گا اس لیے دوسری چھوٹی سی کہانی بھیج رہی ہوں پلیز شائع کر دیجیے گا۔(جو حکم!) ہماری حوصلہ افزائی کرتے رہیں تو ہر مہینے آپ کو کہانی بھیجتی رہوں گی۔(جی؟؟)

☆ نوشین آراء صاحبہ! سلامت رہیے۔چلیے کسی بھی طرح احوال میں آپ کی شرکت تو ہوئی۔حوصلہ رکھیے۔بہت جلد آپ کی کہانی شمارے کا حصہ ہوگی۔

☒ اسلام آباد سے ہماری مستقل قاری اور لکھاری، نٹ کھٹ عظمیٰ شکور کی احوال میں آمد ہے لکھتی ہیں۔ایڈیٹر صاحب بس ایک بار کہتے عظمیٰ مر جاؤ میں آرام سے مر جاتی۔مگر یوں پُر اسرار نمبر شائع کر کے اور پڑھوا کے تو نہ ماریں۔موت تو سکون کی ہو۔قسم سے ایک تو یہ رسالہ پڑھنا اور پھر تبصرہ بھی لکھنا، قیامت ہے۔پتا تو ہے میں بہت نرم دل کی ہوں۔کسی دن چپ چاپ مر جاؤں گی اور آپ تبصرے کا انتظار کرتے رہیے گا۔چلیں ٹھیک ہے۔اسٹوریاں خوفناک اور اوپر سے ان پر لگی تصویریں، اللہ کی پناہ مرتے کیا نہ کرتے پڑھا رسالہ اور لکھ رہے ہیں تبصرہ۔لائف بوائے اتنا اہم ہوسکتا ہے اور اس کی اتنی افادیت ہے آج ہی تو جانا ہم نے۔اسماء اعوان ویلڈن! اعجاز احمد فکرال کیا کرتے ہیں آپ۔اُف اُف ادھر آپ اسٹوری میں پریشان اور اُدھر میں آیت الکرسی کا ورد کر رہی تھی۔شکر ہے آپ بچ گئے۔مسز نوید ہاشمی سو تھینکس آپ نے ایک اچھے 'جن' کا ذکر کیا۔کمال کر دیا قسم سے 'ارمان' جیسا جن ہر گھر میں ہونا چاہیے تاکہ مہنگائی کہ اس دور میں غریب جی تو سکے نا......زبردست۔دستگیر شہزاد 'میرب' کے عاشق نے ثابت کیا کہ وہ بھی کم نہیں۔فوزی میری ہے عثمان بلوچ صاحب آپ نے بھی عاشق جن کا قصہ خوب بیان کیا۔مجھے چینی لا دو فو یہ فرید احمد کی کہانی شروع کرنا چاہی تو ہاتھ پاؤں پھولنے لگے مگر پھر ایڈیٹر صاحب کے الفاظ یاد آئے "تبصرے کا انتظار رہے گا۔" سو حوصلہ کر کے کہانی اسٹارٹ کر دی۔اُف پڑھ لی مگر سردی میں گرمی اور گرمی میں سردی کا احساس جاگا۔'خالہ بیگم غوثیہ نجیب، یقین جانیے خالہ بیگم کی موت کا بے حد افسوس رہا۔بس ایڈیٹر صاحب! مزید ہمت نہیں میری کہ میں کہانیاں پڑھوں۔جانے آپ کو کیوں مزہ آتا ہے ڈرپوک لوگوں کو مزید ڈرا کر۔احوال میں صائمہ مجید کی آمد بہت اچھی لگی۔صائمہ ملاؤ ہاتھ۔آج سے دوستی پکی۔اور سدرہ انور کہاں ہو؟ بھول گئیں نا مجھے، ایڈیٹر صاحب ہائیڈ پارک میں 'میں' کہاں ہوں بھول گئے نا مجھے کوئی بات نہیں خیر ہے۔اوکے ایڈیٹر صاحب دعا کیجیے گا کہ جن بھوت خواب میں آ کر پریشان نہ کریں۔ویسے میں سوؤں گی تو یہ جن بھوت تنگ کریں گے نا مجھے۔مجھے سونا ہی نہیں۔ایڈیٹر صاحب کس قدر خوش ہیں آپ کہ عظمیٰ ڈر گئی (اللہ نہ کرے...... تم تو ڈراتی ہو) ارے ڈری ہوتی تو تبصرہ نہ لکھتی۔زیادہ خوش نہ ہوں (یہ ہوئی نا بات......) اوکے بائے بائے ٹاٹا ملتے ہیں ستمبر میں جب موسم قدرے بہتر ہو جائے گا۔(آہم م م م م)

☆ پیاری سی عظمیٰ! تم ہنستی اچھی لگتی ہو۔غموں سے دور رکھے تم کو خدا۔ہمیشہ اسی طرح رہنا۔تبصرہ زبردست رہا۔بات ماننے کا شکریہ۔

☒ ڈی جی خان سے یہ آمد ہے ہماری بہت اچھی بہن ارم خان کی۔لکھتی ہیں، بھیا جی اور تمام احوالیو! کیسے ہیں آپ سب دعاؤں کے کئی پھولوں کے ساتھ ایک بار پھر ہم حاضر ہیں۔اور بھیا جی کے حکم پر تبصرہ بھی ساتھ لائے ہیں۔سو پہلے تبصرہ ہی ہو جائے ماہ اگست کا ٹائٹل ٹھیک ہی رہا۔رسالے کے آغاز میں آپی منزہ سہام سے ملاقات ہوئی جہاں وہ عید مبارک دے رہی تھیں اس کے آگے احوالی سلسلہ شروع ہوا۔

احوال کی حویلی کے گیٹ پر ہی محمد اسماعیل بردہی نظر آئے، پھر دوسرے نمبر پر طاہر بزدار کوئٹہ سے آئے تھے۔ وہ بھی پہلی بار خوش آمدید۔ فرح انیس آپنے جنم دن کا تحفہ بھیا جی سے بہنوں کی طرح مانگ رہی تھیں تو ہم بھی کیوں نہ دعاؤں کا تحفہ دیں آپ کو۔ پھر دستگیر شہزاد، سدرہ انور علی، شاہد رفیق، صائمہ مجید، پہلی بار شازیہ محسن۔ اور اپنے شہر سے منعم اصغر، افشاں زریں، بھی باری باری نظر آئے جو اچھے سے تبصروں کے ساتھ شامل تھے۔ کہانیوں میں بہلا، میرا بیٹا میرا ارمان، برگد والا مکان، موت کا کنواں، مجھے چینی لا دو، خون کا پیا سا، ایک سربستہ راز، عقابی حویلی، مٹھی بھر ریت ہے بس، شاندار رہیں۔ پچیسویں قربانی جیسی کہانی لکھ کر محمد سلیم اختر صاحب اس ماہ بازی لے گئے۔ تیر نیم کش میں فریدہ جاوید فری، سدرہ انور علی، واصف نبی خان، نصرت زمان، محب علی کی شاعری، پسند آئی۔

☆ پیاری ارم! سدا خوش رہو! تبصرہ بہت پیارا لگا۔ انشاء اللہ آپ کی تجویز پر غور کریں گے۔

✉ کراچی سے ہماری بہت عزیز ترین ساتھی مسز نگہت غفار آپنے لفظوں کے پھول لیے شامل احوال ہیں لکھتی ہیں۔ بھئی اس ماہ کا رسالہ بڑی بھاگ دوڑ اور بہت ہی مشکل سے ہاتھ لگا۔ ہوا یوں کہ بیٹے کاشی نے تبصرہ لکھنے کے لیے کہا اور بھلا اب ہم نہیں لکھتے یہ ناممکن تھا۔ ہم نے بڑے صاحب زادے کو آواز دی پتا چلا کہ دادا پاپا نماز پڑھ رہے ہیں۔ ہم نے کہا جب پاپا نماز پڑھ لیں تو نیچے بھیج دینا۔ جب مون نیچے آئے میں نے کہا بیٹا بینک جانا ہے پینشن لانا ہے اور پھر وہیں سے بک اسٹال جانا ہے۔ ہم نے اکبر بھائی سے معلوم کر لیا ہے سچی کہانیاں آ گیا ہے۔ چلیں جی بسم اللہ کر کے بائیک پر بیٹھے۔ بچتے بچاتے بینک پہنچے۔ اُف خدایا رش پہلا مرحلہ جس صاحب کے پاس جانے کا تھا لگ رہا تھا مغرب ہو جائے گی افوہ! بھئی مرد حضرات بہت زیادہ تیزی میں تھے۔ ہم نے اسی میں عافیت جانی کہ بینک سے باہر نکل آ ئیں۔ سو ہم باہر کی طرف بڑھ گئے۔ مون سے کہا بیٹا چلو بک اسٹال چلتے ہیں کل پینشن کے لیے آئیں گے۔ یوں آگے بڑھتے قائد آباد کی چورنگی اُف! خدایا! افراتفری کا عالم!! بیٹے نے سائیڈ پر بائیک روکی ہمیں نیچے اتارا اور بولے آپ یہاں رُکیں میں رسالہ لاتا ہوں۔ خیر جی رسالہ لے کر ہم گھر پہنچے کہ اب تبصرہ کریں گے۔ ٹائم بھی اتنا ہو گیا لائٹ بھی چلی گئی۔ اب موبائل کی روشنی میں تبصرہ لکھ رہی ہوں۔ ''احوال'' بے حد خوبصورت اپنی اپنی سی محفل ہے اس میں سب ہی بے حد پیار، اپنائیت اور خلوص سے احوال بتاتے اور پوچھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسی محفلیں سجانے والوں کو آپنی رحمتوں کے سائے میں رکھے۔ بہت ہی جلدی میں تبصرہ کر رہی ہوں فہد بار بار کہہ رہے ہیں مکمل ہوا۔ ہوا...... ہوا، ارے بھئی ہونے والا ہے، ہم کہتے جا رہے ہیں اور لکھتے جا رہے ہیں۔ تمام کہانیاں عنوان کے لحاظ سے ڈراؤنی اور دلچسپ لگ رہی ہیں لیکن ہم نے ساری کہانیوں پر سرسری نظر ڈالی ہے۔ ''ہائیڈ پارک'' میں خوشی اور غم، باتوں سے خوشبو آئے۔ شخصیت، مہکتی کلیاں زبردست تھے۔ اب ختم کرتی ہوں۔ دعا ہے کہ رب العزت بیٹے آپ کو سچی کہانیاں کے اسٹاف کو اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھے (آمین) ہمارے ملک پاکستان کی حفاظت کرے۔

☆ بہت عزیز نگہت آنٹی! تبصرے میں تشنگی...... مزہ نہیں آیا اگلی بار ہمیں آپ کا تفصیلی تبصرہ چاہیے۔

✉ یہ تبصرہ ہمیں موصول ہوا ہے، سینٹرل جیل لاہور سے ہمارے ایک بھائی رانا حبیب الرحمٰن کا لکھتے ہیں السلام وعلیکم سب سے پہلے تو ادارہ سچی کہانیاں اور اس کے رائٹرز و قارئین کو پہلا سلام محبت قبول ہو۔ احوال میں یہ میرا پہلا خط ہے اس لیے کچھ تفصیل سے لکھوں گا سچی کہانیاں کا پُر اسرار نمبر 2 ماہ اگست مجھے 3 اگست کو ملا۔ یعنی میرے ہاتھوں میں پہلی دفعہ آیا ہے اس لیے پہلی دفعہ اس میں کچھ لکھنے کی جسارت کر لی۔

اسے آپ پہلی نظر کی محبت بھی کہہ سکتے ہیں۔اس سے پہلے میں سرگزشت، جاسوسی، سسپنس، ڈر، جواب عرض، آداب عرض، سب رنگ، نئے افق، اخبار جہاں، فیملی میگزین، اور کئی اخبارات کے سنڈے میگزین میں اپنی تحریر کردہ کاوشیں، کہانیاں، گزل واشعار، مراسلہ جات، انتخابات بھیجتا رہا ہوں اور کئی میں ابھی بھی بھیج رہا ہوں لیکن کہتے ہیں نا کہ مفت کی چیز کی قدر نہیں ہوتی ایسا ہی کچھ حال میرے ساتھ ہے۔زیادہ تر تو دولت کمانے کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں یہاں یہ بتادوں کہ میں میں زیادہ بلکہ بہت ہی زیادہ سچ کہہ جاتا ہوں جس پر ہمیشہ گھاٹے میں رہتا ہوں میرے خیالات میں کالا کالا، اور نیلا نیلا ہی ہوتا ہے۔میرا یہ خط بالکل انوکھی طرز کا ہے ایک یا دوبار آپ کو سچ سننے میں پریشانی تو ضرور ہوگی لیکن بعد میں آپ یہ سمجھ جائیں گے کہ میں ایک پاگل اور سر پھرا سا انسان ہوں آپ عادی ہو جائیں گے۔(ارے......) میں پہلی بار نہ ہی تو سچی کہانیاں رسالے کی اور نہ ہی آپ کی تعریف کروں نہ ہی تنقید کیونکہ پتا تب ہی چلتا ہے جب کسی سے واسطہ پڑے۔میں اپنے متعلق پہلے ہی بتا دیتا ہوں کہ میں بہت برا انسان ہوں اور شاید گناہ گار بھی اس وقت ویسے بھی اللہ نے میرے لیے زمین تنگ کی ہوئی ہے یعنی ایک ناکردہ قتل میں لاہور سینٹرل جیل میں سزائے موت کا قیدی ہوں۔میری عمر اس وقت 31 برس ہے اور میں 9 سال پہلے جیل میں آیا تھا۔سچی کہانیاں بھی ایک قیدی کے ہاتھوں میں دیکھا تو اُس سے چھین لیا کہ پہلے میں اس کا مطالعہ کروں گا۔لیکن یہ ہوا اس لیے کہ میں تمام رسالہ جات کا جنونی ہوں۔یہ سب ایک نشہ کی طرح ہو گیا ہے کہ جب رسالہ پڑھ لوں تو کچھ دیر کے لیے افاقہ ہو جاتا ہے۔ورنہ پھر وہی کہ کب کوئی رسالہ ہاتھ لگے اور اپنا نشہ پورا کروں۔ویسے نہ تو میں سگریٹ، نسوار، چرس، ہیروئن، اور نہ ہی کسی اور چیز کا عادی ہوں اور نہ ہی ان چیزوں کے نزدیک جاتا ہوں کسی سے پیار و محبت بھی نہیں کیا۔لکھنے کے علاوہ اور کوئی جنون نہیں۔میں آپ کے ماہنامہ سچی کہانیوں میں اپنی سچی داستان شائع کروانے کے لیے بھیجنا چاہتا ہوں۔اگر آپ کی اجازت ہو تو۔اس کے بعد آؤں گا۔احوال کی محفل میں تو یہاں میرے بہت جاننے والے موجود ہیں۔جن کی دیکھا دیکھی میں نے بھی اس محفل میں شریک ہونے کی جرات کی ہے۔اُمید ہے کسی کو بھی اس پر اعتراض نہیں ہوگا۔اگر کسی کو ہوا بھی تو مجھے ضرور بتایئے گا میں دوبارہ نہیں آؤں گا۔جن دوستوں کی وجہ سے لکھنے کی کوشش کی ہے ان کے نام یہ ہیں۔شاہد رفیق سہو، رانا محمد شاہد، منشی محمد عزیز مئے، قرۃ العین زینب، ابو ہریرہ بلوچ، ندیم عباس میوانی، شاز یہ گل مانسہرہ سواتیاں، وکیل عامر جٹ، راشد لطیف، مجید احمد جائی، سیدہ امامہ علی، رضوانہ کوثر، یاسر و کی، عظمیٰ شکور، بھی جانا پہچانا نام ہے تو اس بارے میں شک ہو رہا ہے۔تیر نیم کش میں بغیر کوپن کے لکھنا میری مجبوری تھی۔اس لیے بغیر کوپن شعر بھیج رہا ہوں اسے شامل اشاعت کرلیں۔ہائیڈ پارک بھی بہترین لگا اس میں بھی کچھ مراسلہ اور انتخاب بھیج رہا ہوں۔شامل اشاعت کرلیں۔کہانیوں میں عظمیٰ شکور کی پریاں لے گئیں بہت خوبصورت انداز میں لکھی گئی تھی، ہمیں پسند آئی۔مجید احمد جائی کی شیش ناگ بھی بہترین تھی۔محمد سلیم اختر کی پچیسویں قربانی میں اچھی تھی لہٰذا مکمل جامع تبصرہ بھر کروں گا اگر دوبارہ سچی کہانیاں ملاتب کیونکہ پکا وعدہ کرتا ہوں تو پورا کرتا ہوں ورنہ وعدہ نہیں کرتا۔آپنی تحریروں کے ساتھ حاضر نا رہوں گا۔میرے لیے جیل سے رہائی کی دعا ضرور کریں۔آپ سب کی محبت کا طلب گار۔

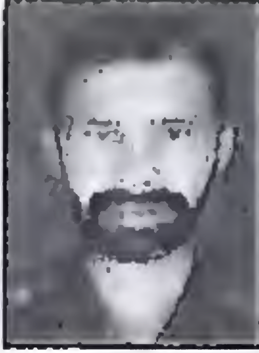
☆ پیارے رانا حبیب الرحمٰن! خوش آمدید، سچی کہانیاں تمہارا اپنا پرچہ ہے۔تم کو بھلا کوئی کیوں آنے سے روک سکتا ہے۔خدا تمہیں قید و بند کی صعوبتوں سے رہائی دے کہ معجزے اسی دنیا میں ہوتے ہیں۔کہانی پڑھ کر جلد رائے دیں گے۔آپنا بہت خیال رکھنا اور ہاں اب مجھے ہر ماہ تمہارا تبصرہ چاہیے۔

# احوال میں شامل ہونے والے نئے احوالی


چوہدری پرویز سعید، خانیوال


رانا حبیب الرحمٰن گوجرہ


محمد سفیان اسلم دریا خان


راشد لطیف صبرے والا


نزاکت افشاں فتح جنگ


طاہر بزدار کوئٹہ

✉ مہورہ فتح جنگ سے نزاکت افشاں کی احوال میں آمد ہے لکھتے ہیں۔ ماہ اگست کا شمارہ 3 تاریخ کو ملا۔ منزہ آپی نے سچ لکھا۔ کہانیوں میں بہلا، برگد والا مکان، فوزی میری ہے، ایک سربستہ راز، میرا بیٹا میرا ارمان اور مجھے چینی لا دو اچھی تھیں۔ ایم اے راحت صاحب کا ناول ہم شکل، زہر عشق کاشی بھائی کا اور محمود شام صاحب کا سفرنامہ بہت اچھا جا رہا ہے۔ کاشی بھائی آپ کا شکوہ بجا ہے کہ میں نے تبصرہ نہیں لکھا پچھلے خط میں دراصل میں طوالت کے خوف سے کم لکھتا ہوں کہ کسی اور بہن یا بھائی کو جگہ مل جائے۔ احوال میں اسماعیل بروہی، فیصل ندیم، تحسین جونیجو آپی، ممتاز احمد سرگودھا، سدرہ انور علی جھنگ، اور فرح انیس کے تبصرے شاندار تھے۔ فرح سسٹر آپ کو سالگرہ مبارک، عمر دراز ہو آپ کی، کاشی بھائی آپ کے لیے اور آپ کی پوری ٹیم کے لیے آپنا شعر حاضر خدمت ہے۔

خدا کرے تیری انجمن رہے قائم
کہ تیرے دم سے ہیں ہم رِند زندہ

☆ پیارے نزاکت تبصرہ اچھا ہے! تمہاری آمد اس سے بھی اچھی۔ اُمید ہے کہ یہ ساتھ ہمیشہ برقرار رہے گا۔

✉ گلابوں کے شہر پتوکی سے ہمارے گلاب، ندیم عباس میواتی کی احوال میں آمد ہے لکھتے ہیں۔ اگست کا پُراسرار نمبر ایک نئی رونق لے کر 5 اگست کو میرے ہاتھوں کی زینت بنا۔ ٹائٹل پر ایک پُراسرار حسینہ براجمان تھی۔ پھر احوال کی پُررونق محفل میں داخل ہوا جس کو میرے ساتھیوں نے اپنے جامع تبصروں کے ساتھ مزین کیا ہوا تھا بالخصوص محترم ذکی وقار کاشی چوہان جی خوبصورت انداز میں جامع مانع بات کہی کہ دوستو! آپ ٹیڑھے میڑھے الفاظ اچھے ہیں سر بازار برہنہ ہونے سے...... اس جملے پر تمام لکھاری خوب غور فرمائیں۔ پھر میں ان دوستوں کا انتہائی مشکور ہوں جنہوں نے میرے تبصرے کو پسند کیا بالخصوص میرے سوہنے ویر شعبان کھوسہ، حمیرا جبیں، سیدہ امامہ اور تبصرے کے لیے میں کاشی بھائی کا مشکور ہوں ورنہ میرا تبصرہ...... خدا جانتا ہے کہاں...... کہانیوں کی طرف سے ہمارے فیورٹ رائٹر، سب کے دلوں کی دھڑکن خوف اور رگوں میں لہو جما دینے والا ناول، زہر عشق، بیسٹ تھا۔ یک دم تبدیلی دیکھ کر مزہ آ گیا۔ پلیز جناب ایڈیٹر جی زہر عشق کے صفحات بڑھا دیں۔ دوسری کہانی فوزی میری ہے۔ ہمارے گروپ کے مایہ ناز لکھاری عثمان بلوچ کی بیسٹ رہی، ویلڈن، بھائی اسی طرح لکھتے رہیں تیسری کہانی میری بڑی آپا مسز نوید ہاشمی کی 'میرا بیٹا میرا ارمان' بہت پسند آئی بابا مجید احمد جائی کی شیش ناگ، خون کا پیاسا بھائی شاہد رفیق سہو، پچیسویں قربانی محترم سلیم اختر کی، برگد والا مکان محترم ذکی وقار محمد عزیز مے کی، ڈر لگتا

ہے، مور شاہد حسین کی، مالکن کا عاشق، واپس جا ؤ اور دیگر لکھاریوں نے بھی بہت اچھا لکھا۔ خط کی طوالت کی وجہ سے نام نہیں لکھ سکا۔ محترم شعبان کھوسہ، ابو ہریرہ بلوچ، ایم یعقوب کو سلام اینڈ بھائی فنا فٹ اسٹوری لائیں بس شدت سے انتظار کررہا ہوں۔ دوستوں سب مجھے اپنی نیک تمناؤں میں یاد رکھنا۔

☆ پیارے ندیم! تبصرہ مزے دار تھا۔ خوش رہو۔ کہانی پڑھ کر جلد رائے دیں گے۔

✉ بہاولپور سے ہمیں یاد کیا ہے ہمارے نئے ساتھی لکھاری عثمان بلوچ نے لکھتے ہیں۔ ہماری دعاؤں میں بسے لوگو! کیسے ہو......؟ اچھا فٹ فاٹ...... چلیں ہمیں بھی یہی اُمید تھی کہ آپ ہنستے مسکراتے ہوں گے...... کہاوت ہے'' انتظار موت سے بھی زیادہ سخت ہوتا ہے لیکن شدت انتظار کے بعد اگر خوشی نصیب ہو جائے تو...... کچھ ایسا ہی ہوا۔ پہلے اگست کے شمارے کا شدت سے انتظار، شدت فرحت میں تبدیل ہوگیا۔ کاشی بھائی آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ نے چاہتوں سے نوازا۔ بھائی ممتاز احمد!! آپ نے ہمیں اپنے خط میں ممتاز رکھا۔ اللہ آپ کو خوش رکھے، بھائی ندیم عباس میوانی......!! آپ کا تبصرہ جاندار رہا۔ بھائی ابو ہریرہ بلوچ آپ کی کوئی کہانی نظر نہیں آئی جلد از جلد کہانی ارسال کریں۔ عظمیٰ شکور کا تبصرہ قلوب و اذہان کو معطر کر گیا۔ منزہ سہام کے نوک قلم نے صدق وسچائی کی شہادت دی۔ ارے...... واہ کاشی بھائی آپ نے لکھاریوں کو میٹھی میٹھی تنبیہ کے ساتھ محنت کا خوب درس دیا۔ ہمیں اچھا لگا۔ کہانیوں میں زہر عشق کاشی چوہان، ہم شکل ایم اے راحت، برگد والا مکان منشی محمد عزیز ہے، لائف بوائے اسماء اعوان، پریاں لے گئیں عظمیٰ شکور، خون کا پیاسا، شاہد رفیق سہو بیسٹ کہانیاں تھیں۔ باقی سلسلے بھی بہت اچھے تھے۔ خوش رہیں، آباد رہیں زندگی باقی ملاقات باقی



☆ اچھے عثمان! تمہاری تحریر زبردست ہے۔ اُمید ہے اب ہر ماہ تم احوال میں شامل رہو گے۔ میری ،اُمید یقین میں بدلے گی نا......

✉ احوال میں یہ پہلی آمد ہے گجرات سے انعم شہزادی کی لکھتی ہیں۔ جی مینوں پتا اے کہ بزم احوال دی پر مسرت خاندان وچ قسم نال تل دھرن دی جگہ کوئی، لیکن مہمانوں نوں تے جگہ دینی پیندی اے...... (اے لو جی! تساں جم جم آجاؤ) تو پلیز تھوڑا سائیڈ پر ہونا تاکہ میں بھی آپنے قدم جما سکوں۔ اگست کا پُراسرار نمبر میری لائف میں ایک نیا رنگ لے کر طلوع ہوا۔ (وہ نیا پن کیا ہے تھوڑا سا قارئین یار خود بھی سوچ لو اب سب باتیں میں ہی بتاؤں کیا......؟ او ہوا ایڈیٹر جی قسم سے آپ کو نہیں کہا ایسے غصے میں کیوں گھور رہے ہیں...... بچی ڈر جائے گی...... پلیز قسم سے آپ کو کچھ نہیں کہا...... رحم کھاؤ اہل زمیں پر خدا تم پر مہربان ہوگا عرش بریں پر، اب تھوڑا سا مسکرا دیں۔ (ریئلی میں) بھیا کاشی جی کیا حال ہیں ننھی سی جان ہوں پلیز ایڈیٹر کو تھوڑا سا ہنسا دونا......'' زہر عشق ایک زبردست ناول ہے ویری ویل ڈن ویسے میں تو ابھی جولائی اگست میں ہی پڑھی ہیں۔ واقعی مزہ آ گیا۔ دوسری کہانی میرے بھائی عثمان بلوچ کی فوزی میری ہے پڑھی وہ بھی بیسٹ تھی۔ باقی پڑھی نہیں ان کے لکھاریوں سے معذرت۔ اس کی وجہ پھولوں کی نگری کے شہزادے ندیم عباس میوانی جی کا حکم جلد بازی میں آ گیا۔ ٹائم صرف 30 منٹ دیے تبصرہ لکھنے کے لیے۔ باقی آئندہ بشرط زندگی ملاقات ہوتی رہے گی، دیکھیں تو میں کب سے آئی ہوں کسی نے بیٹھنے کا بھی نہیں کہا۔ اُف میری ٹانگیں بھی کھڑے رہنے سے درد کرنے لگی ہیں؟ کاشی بھیا! آپ ہی رحم کھالو غریب بے چاری پر...... ایڈیٹر صاحب تو ابھی تک میری بک بک پر تپے بیٹھے ہیں اچھا ایڈیٹر جی جاتی ہوں ۔زیادہ پریشان مت ہوں بس کیا کروں میری پرسنالٹی ہی نٹ کھٹ ہے۔ جہاں جاتی ہوں کچھ دنوں میں

سب کا بیحد شکریہ جنہوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور دعاؤں کا سلسلہ جاری رکھا۔ میں بھی سب کا بیجا فرائی کردیتی ہوں۔ باقی ندیم عباس میواتی بھائی، ابو ہریرہ بلوچ آپنے ٹف شیڈول سے ٹائم نکال کر کہانی لائیں ورنہ اچھا نہیں ہوگا کیونکہ اب میں آ دھمکی ہوں۔ بس بس ایڈیٹر صاحب گئی۔ پلیز قینچی سے میرے پروں کو مت کاٹنا ورنہ یہ شہزادی کراچی تک پھر سے اڑ کر نا آپائے گی۔

☆ لیجیے شہزادی صاحبہ! تشریف رکھیے۔ ارے پہلے خوش آمدید تبصرہ اچھا تھا اب پہلے وعدہ کرو کہ ہر ماہ ہمارے احوال کی بزم میں شریک رہو گی۔ ورنہ پر کاٹ کر کراچی میں ہی رکھ لیں گے۔

⊠ احوال میں یہ آمد ہے ہمارے نئے ساتھی، علی حسنین تابش کی چشتیاں سے لکھتے ہیں۔ ایک طویل انتظار کے بعد بالآخر سچی کہانیاں آپنی پوری آب تاب کے ساتھ موصول ہوا۔ لفافہ کھولا اور ٹائٹل کے درشن کیے۔ پُراسرار نمبر 2 پڑھ کر دل اور خوش ہوا۔ اور ٹائٹل بھی زبردست تھا۔ کیا بات ہے منزہ جی کا ''عید مبارک'' بے حد خوبصورت الفاظ کا ایک مجموعہ تھا۔ پھر احوال کی محفل میں کاشی بھائی سے اجازت لے کر حاضری دی۔ جی بھائی سچ لکھا ہے اور کیا کمال اسٹارٹ لیا۔ آپ نے احوال کا۔ آپنی بات ظاہر بھی کر گئے اور پتا بھی نہ لگنے دیا۔ اور ہاں سمجھ دار کے لیے تو اشارہ ہی کافی ہوتا ہے ناں.....؟ بہت خوب تمام احوال پسند آئے جنہوں نے میرے والد صاحب کی مغفرت کے لیے دعا کی۔ افسوس کا اظہار کیا اور میرے دکھ میں شریک ہوئے ان سب دوستوں کا شکریہ۔ سب کہانیاں آپنی مثال آپ تھیں۔ اور پھر جب پرچہ کاشی بھائی تیار کریں اور خوبصورت نہ ہو یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ کاشی بھائی آپ کی سوچ کی داد دینی پڑے گی۔ کہانیوں میں بہت سے ایسے دوستوں نے حصہ لیا جن سے دوستی کا گہرا رشتہ ہے۔ منشی محمد عزیز مئے، ممتاز احمد، میرے بہت ہی پیارے بھائی مجید احمد جائی، جاوید زاہی صاحب، اور میرے بہت ہی پیارے انکل محمد سلیم اختر صاحب کیا خوب کہانی لکھتے ہیں۔ مجید بھائی کمال کردیا، مزہ آگیا آپ کی کہانی پڑھنے کا۔ اور سلیم صاحب آپ کی کہانی نے تو اتنا سرور دیا کہ بتا نہیں سکتا۔ اتنا خوبصورت لکھتے ہو جی چاہتا ہے ہاتھ چوم لوں اور پھر کاشی بھائی آپ کا ناول تو اپنی مثال آپ ہے۔ کیا خوب الفاظ کا چناؤ ہے جب تک مکمل قسط نہ پڑھ لوں کوئی اور کام سوجھتا ہی نہیں۔ اور ہاں یہ اچھا ہوا کہ سلمان جن نے بے چاری صنوبر کی جان چھوڑ دی۔ کیونکہ محبت کی یہ روایت تو نہیں ہوتی ناں.....؟ انسان آپنے محبوب کو زیادہ تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ میرے پاس آپ کی تعریف کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ اللہ پاک آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ اور کامیابیاں عطا فرمائے (آمین)

☆ منے سے بھائی حسنین! سدا خوش رہو! تبصرہ کرنے کا شکریہ بھی کہوں کیا؟؟ یار اتنا تو حق دو نا کہ تبصرہ فرض سمجھ کر کیا کرو۔

⊠ احوال میں یہ آمد ہے کوئٹہ سے ہمارے بہت پیارے ساتھی، کمانڈو شعبان کھوسہ کی لکھتے ہیں۔ کاشی بھائی پُراسرار نمبر 2 پانچ اگست کو موصول ہوا ٹائٹل نمبرون رہا۔ آگے بڑھتے تو منزہ سہام جی عید مبارک کہہ رہی تھیں۔ 'خیر مبارک' احوال میں کاشی بھائی نے احوالیوں کی خوب کلاس لی۔ میری جانب سے نئے آنے والے تمام احوالیوں کو خوش آمدید اور جو ساتھی احوال سے دور ہیں ان سے گزارش ہے کہ بھائی احوال میں واپس آجاؤ۔ لائف بوائے بچھڑوں سے ملائے اسماء اعوان نے زبردست کہانی تحریر کی۔ اب ہم جہان حیرت واسرار میں لپٹی کہانیوں طرف آگئے عجاز احمد نگرال کی بہلا، مسز نوید ہاشمی کی میرا بیٹا میرا ارمان، دستگیر شہزادی کی ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے، منشی صاحب کا بزگندا والا مکان، عثمان بلوچ کی فوزی اور فوزیہ فرید احمد کی چینی لادو میں واقعی حیرت واسرار میں جکڑ لیا۔ ایم اے راحت کا ہم شکل گیارہویں قسط میں

بھی زبردست رہا۔ پُراسرار نمبر کی خونی کہانیوں میں شاہد رفیق سہو خون کا پیاسا بن کر آئے تو غوثیہ نجیب خالہ بیگم، حاسم وقاص ایک سربستہ راز لائے تو عادیہ عنبر ڈوبھوگ ناتھ کی پیاس اور پھر آخر میں لیلیٰ مروہ اقبال عقابی حویلی میں گم ہوگئیں۔ زہر بھری دنیا سے مجید احمد جائی کی میں شیش ناگ اور محمد یوسف لغاری کی مٹھی بھر ریت ہے بس بہت زبردست رہی۔ شاہد سلیم صرف کہانی کا نام ہی بدلا اور...... اُمید ہے سمجھ گئے ہوگے۔ محمود شام کا سفرنامہ برطانیہ میں خزاں خوب جا رہا ہے۔ جاوید راہی صاحب کی واپس جاؤ اور ممتاز احمد کی قدرت کے بھید زبردست کہانیاں رہی۔ مختصر کہانیوں میں رضوانہ پرنس، نیر شفقت، عظمیٰ شکور، تحسین جونیجو اور رئیسہ خالد نے کوزے میں دریا بند کر دیا۔ محمد سلیم اختر پُراسرار نمبر 2 کی خصوصی کہانی پچیسویں قربانی لے کر حاضر ہوئے۔ سچ پوچھیں تو سلیم بھائی کے قربان جانے کو دل چاہا۔ واقعی نُوطی دیوی کی کہانی زبردست رہی اور خصوصی کہانی کی حق دار ٹھہری ہے۔ کاشی بھائی زہر عشق کی چھٹی قسط بھی چونکا دینے والی ثابت ہوئی خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ باقی مسئلہ یہ ہے، ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش تینوں سلسلے کسی تعریف کے محتاج نہیں۔ انشاء اللہ اگلے ماہ زندگی رہی تو پھر حاضر ہوں گے۔

☆ پیارے شعبان! بھئی اس بار تمہارا تبصرہ باکمال رہا۔ سچ بتاؤ آج کل کن دوستوں کی بیٹھک میں وقت گزار رہے ہو۔ خوش رہو اس بار واقعی تمہارے تبصرے نے دل خوش کر دیا۔

✉ لاہور سے ہماری ہر دل عزیز رضوانہ کوثر اس بار مختصر تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں۔ لکھتی ہیں کاشی بیٹا میری طبیعت ٹھیک نہیں لیکن جب مجھے پُراسرار نمبر 2 موصول ہوا تو میں تبصرہ کرنے پر مجبور ہوگئی۔ ٹائٹل اس بار بازی لے گیا۔ منزہ نے عید مبارک لکھ کر قلم کا حق ادا کیا تو بیٹا آپ نے احوال میں قلم کاروں کو سچ کا راستہ دکھا کر آپنے ایڈیٹر ہونے کا حق ادا کیا۔ پورا پرچہ پڑھ چکی ہوں لیکن جن کہانیوں نے روح جھنجھوڑ دی۔ ان میں بھلا اعجاز احمد فکر ال کی، میرا بیٹا میرا ارمان مسز نوید ہاشمی کی، غوثیہ نجیب کی خالہ بیگم، محمد یوسف لغاری کی مٹھی بھر ریت ہے بس، حاسم وقاص کی ایک سربستہ راز، ممتاز احمد کی قدرت کے بھید، جاوید راہی کی واپس جاؤ، رضوانہ پرنس کی لندن کی وہ رات، نیر شفقت کی وہ گھونگھٹ والیاں، عظمیٰ شکور کی پریاں لے گئیں، تحسین جونیجو کی وہ یکم جنوری، رئیسہ خالد کا مالکن کا عاشق، اور سلیم اختر بھائی کی پچیسویں قربانی، پُراسرار نمبر 2 کی نمبر 1 کہانیاں رہیں۔ سلسلے وار ناول ہم شکل اور زہر عشق ٹاپ کلاس جا رہے ہیں۔ جبکہ بھائی محمود شام کا سفرنامہ بھی آپنے ساتھ ساتھ لیے لندن کی سیر کرا رہا ہے۔ میری تمام بھائی بہنوں سے گزارش ہے کہ میری صحت کی دعا کیجیے۔

☆ رضوانہ آپی! سچ پوچھیے تو آپ کی محبت کی گواہی ہر قاری اور لکھاری دیتا ہے اور یقین جانیں آپ نے آپنی محبت سے جو یہ کارواں بنایا ہے اس کے تمام ہم سفر آپ کے لیے ہمیشہ دل سے دعاگو رہتے ہیں۔ میں آپ کے تبصرے پر ایک نئی انرجی حاصل کرتا ہوں۔ تو بھلا سوچیے میں آپ کے لیے کتنی دعا کرتا ہوں گا۔

✉ کراچی سے یہ آمد ہے ہماری بہت پیاری لکھاری ساتھی شاہانہ احمد کی، لکھتی ہیں پُراسرار نمبر 2 کا ٹائٹل ذرا ہٹ کر تھا اور مجھے ہمیشہ ذرا ہٹ کر اور منفرد سی چیزیں بہت پسند ہیں۔ سچی کہانیاں کا آنے والا ہر شمارہ پچھلے کی یاد بھلا دیتا ہے۔ یقین جانیے ہر ماہ سچی کہانیاں کا دل سے انتظار کرتی ہوں اور ہمیشہ پرچہ پڑھ کر پہلے سے زیادہ انتظار کرنے لگ جاتی ہوں۔ احوالی بھی کہہ رہے ہوں گے کہ میں آپنا ہی احوال لے کر بیٹھ گئی۔ ساتھیو! آیئے اب آتی ہوں تبصرے کی طرف۔ ٹائٹل تو ہٹ کر تھا ہی اس بار پُراسرار نمبر بھی بہت ہٹ کر تھا پچھلے پُراسرار نمبر کی یاد بھلا دی۔ منزہ سہام جی کا اداریہ نمبر ون تھا۔ اداریہ پڑھ کر میں سوچتی رہی

کہ میں بھی تو ٹی وی کے آگے بیٹھ کر یہی دعائیں کرتی تھی کہ کاش! ہمیں بھی پاس مل جائے اور اُن بھائی بھائی پکارنے والوں میں ہم بھی شامل ہو جائیں...... منزہ جی آپ نے تو ہمیں سرِعام ڈھیٹ کر دیا۔لیکن ہم بے حس ہو چکے ہیں۔ میں دل میں شرمندہ ہونے کے بجائے سینہ تان کر آگے بڑھ گئی۔آگے پہنچی تو احوال میں کاشی صاحب نے کلاس لے لی، پُر اسرار نمبر واقعی پُراسرار ثابت ہو رہا تھا۔ بھلا، میرا بیٹا میرا ارمان، فوزی میری ہے، مجھے چینی لادو، برگد والا مکان، خالہ بیگم، بھوک ناتھ کی پیاس، عقابی حویلی، مٹھی بھر ریت ہے بس، شیش ناگ، واپس جاؤ، قدرت کے بھید، گھونگھٹ والیاں، لندن کی رات، مالکن کا عاشق، پچیسویں قربانی اور پریاں لے گئیں زبردست کہانیاں ثابت ہوئیں۔بس اب مجھے ڈر لگ رہا ہے اگر زندہ رہی تو اگلے ماہ پھر حاضر ہوں جاؤں گی۔

☆ اچھی شاہانہ! تم اور اتنی ڈرپوک...... اگلا پُراسرار نمبر اس سے زیادہ خوفناک کہانیاں لیے ہوئے ہوگا۔کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم کہیں ''شاہانہ تمہاری آواز تو آرہی ہے مگر تت تت تت تم ہو کہاں؟'' تبصرہ شاندار کیا اور ہاں ایک کہانی لکھی، ایوارڈ لیا اور غائب۔جلدی سے دوسری کہانی بھیجو۔

✉ احوال میں یہ پہلی پہلی آمد ہے بورے والا سے انیس الرحمٰن کی لکھتے ہیں ''سچی کہانیاں'' کی محفل میں پہلی بار حاضری کی جسارت کر رہا ہوں، امید ہے خیر مقدم کریں گے پاکستان خصوصاً سچی کہانیاں کے نئے لکھاری اور قارئین کو میری طرف سے جشن آزادی مبارک ہو۔عزیز برادر......!! بچپن ہی سے مطالعے کا بہت شوق ہے۔بے شمار ڈائجسٹ دمیگزین کا مطالعہ کیا لیکن ترقی کی کہکشاں میں دمکتا ستارہ...... احباب کے دلوں کا سہارا...... لاکھوں قارئین کا پیارا ڈائجسٹ ''سچی کہانیاں'' کا مطالعہ کیا تو گویا عزیمت مسکرانے لگی، حوصلے جاگ اٹھے...... ڈوبتی امیدیں ساحل سے ٹکرانے لگیں۔رگوں میں سرسراتے خوف کی جگہ فطری جوش وتہور رقص کرنے لگے...... جذبات کے سمندر میں طلاطم خیز موجیں بھرنے لگیں (ارے......) سرورق پر نظر پڑتے ہی دل ودماغ پر عجیب سی حالت طاری ہوگئی، عیار ذہن حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوگیا، اس لیے سرورق پر براجمان پرستان کی پری ''پُراسرار نمبر'' کے مطابق نہ لگی۔اس سے پہلے کے حیرت کے سمندر بلائے بے درماں کی طرح چڑھ دوڑتے جلدی سے ورق الٹ دیا۔آپی منزہ سہام کا قارئین کو عید مبارک کہنا بہت اچھا لگا۔احوال کی پہلی حاضری اور پہلا قدم رکھتے ہی ایسے محسوس ہوا کو یا گل دیا سمیں کے درمیان آ پہنچا۔احوالیوں کی بے شمار اداؤں اور باریک باریک موشگافیوں نے محفل کو معطر کر دیا تھا۔ہر طرف عود وعنبر کی خوشبو سلگ رہی تھی۔احوال میں محمد اسماعیل بروہی، شاہد رفیق سہو، راشد لطیف، ڈاکٹر خادم حسین، عظمیٰ شکور اور ریحانہ نسیم کے تبصرے دلچسپ لگے...... دیگر احوال بھی بھرپور تھے لیکن پھولوں کی نگری سے آئے ہوئے گلاب (ندیم عباس میوانی) نے تو ماحول کو معطر اور پُرکشش بنا ڈالا۔کہانیاں پڑھ کر ایسا لگا جیسے ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہوں۔ایم اے راحت کی کہانی اچھی لگی۔عثمان بلوچ کی کہانی 'فوزی میری ہے' بہت دلچسپ اور پُراسرار تھی۔زہر عشق نے تو کمال کر دیا...... ایک ایک لفظ میں کرب تھا...... سنسنی خیز اور حیرت انگیز تھی۔محترم کاشی بھائی ڈائجسٹ کی ترتیب عنیق دیکھ کر اندازہ ہوا کہ آپ کی نگاہ مردم شناس شاہین کی طرح تیز ہے۔آپ آپنی ذمہ داری کو جس حسنِ خوبی اور چابک دستی سے ادا کر رہے ہو لگتا ہے اس معاملہ میں بہت کریزی ہو۔میری دعا ہے اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے ہم نشینوں کو مزید ترقیاں نصیب فرمائے (آمین) میرے لیے بھی دعا کرنا (BSC) کا رزلٹ آنے والا ہے۔اللہ تعالیٰ اعلیٰ نمبروں سے پاس فرمائے۔

☆ پیارے بھائی انیس! خوش آمدید۔کیا کمال اسلوب ہے تمہارا۔یار اب ہمیں ہر ماہ اس اردو کی عمدہ

تحریر سے سرفراز کرنا۔ پرچے پر تبصرے کا شکریہ۔

✉ کراچی سے یہ آمد ہے عرصہ دراز بعد ہمارے محترم لکھاری ساتھی عبدالرؤف تاجور کی لکھتے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا سال بھر پہلے ہمارے جادوگر وزیر خزانہ نے معجزاتی طور پر کہیں سے دو ارب ڈالر لا کر قومی خزانے میں ڈال دیا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ ڈالر کا ریٹ راتوں رات 110 روپے سے کم ہو کر صرف 99 روپے پر آ گیا۔ جہاں عوام نے اس خوشی میں بغلیں بجائیں وہیں ڈالر کا ناجائز کاروبار کرنے والے بیمار ہو کر خون تھوکنے لگے۔ اسی مناسبت سے میں نے حضرت فیض کی ایک نظم تنہائی میں، پیروڈی کی تھی جسے چھپوانے کا خیال نہیں آیا۔ اب آپ نے لکھاری بننے کی دعوت دی ہے تو یہ پیروڈی آپ کو بھیج رہا ہوں پسند آئے تو چھاپ دیجیے ورنہ۔

اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی

آپ کے پاؤں کے نیچے BIN ہے

☆ واہ واہ تاجور بھیا! کمال کرتے ہو آپ بھی۔ لکھاری لکھا تھا آپ تو شاعر بن گئے۔ سلامت رہیے اور ہاں احوال کو آپ کا انتظار آج بھی ہے۔

✉ لیجیے ساتھیو! ہوشیار باش! اب احوال میں آمد ہے پری زاد جہاں کی سیالکوٹ سے لکھتی ہیں۔

ہماری اک خوشی سے کیا آ جاتا ہے طوفان؟

کہتے ہیں سب ...... کہ آفت ہیں ہم......

آداب ایڈیٹر بھیا بہت دنوں سے یہاں ساون کی بارشیں برس رہی ہیں۔ مگر ساون کے پکوڑے بن کے نہیں دیئے۔ (تو ہمت کرتیں نا آپ......) خیر، پچھلے کچھ دنوں سے بڑی مصروفیت رہی، کالج کی پڑھائی بھی نہ بہت زیادہ ہے۔ اکیڈمی کے Test Papers الگ کھٹے دینے پڑے۔ مگر، پُراسرار شمارے کے لیے وقت نکالا ہے۔ اس بار بہت مزیدار کہانیں تھیں نمبر 1 پر برگد والا مکان، نمبر 2 پر عقابی حویلی نمبر 3 پر خالہ بیگم اور ایک سربستہ راز شاندار تھیں۔ عقابی حویلی میں بچی کو زندہ دفنا دینے والے منظر نے ہلا دیا تھا۔ اس کے علاوہ 'گھونگھٹ والیاں' مزے کی تھی۔ اس کہانی میں وہ گھونگھٹ والی عورتیں زمیں پر سے آتی ہیں یا کہیں اوپر سے؟؟ اور اس کے علاوہ سب بہت اچھا تھا۔ ایک بات معلوم کرنی تھی کہ آخر میں جو انعامی سلسلہ ہے اس کا انعام کس ملتا ہے یا کس کو ملے گا؟ کیا سین ہے بتائیے گا؟؟ (ارے اچھا شعر آپ بھی بھیجو پری جی) میری دو کچی کہانیاں مکمل ہونے والی ہیں (تو بھیجو جلدی)۔ احوال میں صائمہ مجید، امامہ علی، عارف شہزاد، سدرہ، اور افتخار بھٹی سب کے خط بہت ہی اچھے تھے۔

☆ پیاری پری! سلامت رہو، گڑیا احوال میں آمد مستقل بناؤ۔ تبصرے کا شکریہ۔

✉ احوال میں اب حاضر ہو رہے ہیں ہمارے پیارے ساتھی فیصل ندیم بھٹی چک نمبر 58 شمالی، سرگودھا سے لکھتے ہیں احوال میں نئے آنے والے معززین کو خوش آمدید کہتا ہوں جن میں طاہر بزدار، عبدالغنی، ڈاکٹر خادم، صائمہ مجید، سیدہ امامہ علی، سنبل ناہید، ثمینہ شہزادی، شہزاد احمد ساحر، عابد علی انجم، لاریب علی، شازیہ محسن، نزاہت افشاں، افشاں زریں، امید ہے ہر ماہ آپ احوال میں ملیں گے۔ شازیہ گل مانسہرہ احوال سے غائب ہیں پتا نہیں کہاں مصروف ہیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں پر تبصرے کی طرف بہلا اعجاز احمد فکرال کی کہانی میں جنات کا اثر بہت دکھائی دیا۔ مسز نوید ہاشمی میرا بیٹا میرا ارمان زبردست کہانی۔ ایک جن کا آپنا بیٹا ایک انسان کی ماں کو دینا کمال کی محبت ہے۔ دستگیر شہزاد ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے۔ سبق آموز کہانی کہ رشتوں میں غلط فہمیوں کو دور کرنا ہی عقل مندی ہے۔ منشی عزیز مئے برگد والا مکان زبردست کہانی

ہے۔۔عثمان بلوچ نوزی میری ہے اچھی کہانی ہے۔فوزیہ فرید احمد مجھے چینی لادوا اثر انگیز کہانی ہے۔ایم اے راحت کا ہم شکل دلچسپ مراحل میں ہے۔خون کا پیاسا، خالہ بیگم، ایک سربستہ راز، بھوگ ناتھ کی پیاس، عقابی حویلی، ناگن یا دھنوان، میں شیش ناگ، اچھی کہانیاں ہیں۔ممتاز احمد کی اسٹیشن سے جڑی کہانی، قدرت کے بھید ایک لاش کا زندہ ہو جانا پھر اس کا مدد کرنا زبردست کہانی رہی۔لندن کی وہ رات، تسبیح کی کرامت میں سبق ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے انسان مصیبتوں کو ٹال دیتا ہے۔مور شاہد، ڈر لگتا ہے، عظمیٰ شکور، پریاں لے گئیں، تحسین جونیجو کی کیم جنوری، مالکن کا عاشق بھی اچھی کہانیاں تھیں۔سلیم اختر کی پچیسویں کہانی بے مثال ہے۔کاشی چوہان کا ناول زہر عشق بہترین ادوار میں داخل ہے۔اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔کاشی بھائی آپ کا حکم سر آنکھوں پر تبصرہ ہر ماہ آئے گا۔تمام اسٹاف اور قارئین کو سلام اور دعا انہی الفاظ کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں۔

☆ اچھے فیصل! جُگ جُگ جیو! ہمارا محبت بھرا حکم ماننے کا شکریہ۔بس تم سب کی محبت ہی ہماری طاقت ہے۔

✉ ہماری بہت سینئر قاری قمر سلطانہ پہلی بار احوال کا حصہ بن رہی ہیں۔لکھتی ہیں! بھیا میں سچی کہانیاں ایک طویل عرصے سے پڑھ رہی ہوں بلاشبہ سچی کہانیاں ایک معیاری اور جامع پرچہ ہے۔اس پرچے نے اب تک اپنا معیار برقرار رکھا ہوا ہے اور ہر ماہ شامل ہونے والے نئے قاری اس بات کا ثبوت ہیں کہ سچی کہانیاں آج بھی روزِ اول ہی کی طرح اپنی مقبولیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔کیونکہ سچی کہانیاں دنیا میں ہر جگہ پڑھا جاتا ہے اس لیے میں اس پرچے کے توسط سے ایک اہم پیغام بھی سب کے گوش گذار کرنا چاہتی ہوں۔میرا اشارہ ان میرج بیوروز کی طرف ہے جو عوام سے پیسہ لے کر رشتوں کی آڑ میں کہیں لڑکیوں کو اور کہیں لڑکوں کو عذابِ مسلسل میں دھکیل دیتے ہیں۔میری تمام پڑھنے والوں سے گزارش ہے کہ خدارا نام نہاد میرج بیوروز کی آڑ میں عوام کے جان و مال سے کھیلنے والے ان نوسربازوں سے بچیے۔جب بھی آپ اپنی اولاد کے مستقبل کا فیصلہ کریں تو خدارا آپنے ان جان پہچان والوں پر ہی توکل کیجیے۔جن کو آپ ذاتی طور پر جانتے ہوں اور ان کے کچھ حسب نسب کے بارے میں بھی آپ کو واقفیت حاصل ہو۔اُمید ہے آپنی نازوں پلی اولاد کے مستقبل کا فیصلہ کرتے ہوئے آپ آپنے دماغ کا استعمال ضرور کریں گے۔پلیز میرے اس پیغام کو میری التجا سمجھیں یا گذارش مگر شائع ضرور کریں اور اگر رشتے کے لیے میرج بیورو جانا لازمی ہی ہو تو آپنے اعتماد والے میرج بیورو کا رُخ کریں۔

☆ بہت پیاری قمر آنٹی! سلامت رہیے۔آپ کا پیغام من وعن شائع کیا جارہا ہے۔خدا کرے آپ کے پیغام کی رو سے پڑھنے والے بھی فیض اٹھا کر آپنے بڑے بڑے نقصانات سے محفوظ رہ سکیں۔

✉ احوال میں یہ مختصر ترین آمد ہے ہمارے نئے ساتھی نعیم اللہ کی ہڈالی سے۔لکھتے ہیں، کیا حال ہیں آپ کے؟ امید کرتا ہوں کہ سچی کہانیاں کا تمام اسٹاف اور قارئین خیریت سے ہوں گے۔اگست کا شمارہ پُراسرار نمبر 2 بہت اچھا لگا۔میں ایک نئی کہانی ارسال کر رہا ہوں۔اُمید کرتا ہوں کہ آپ ضرور حوصلہ افزائی کریں گے۔آخر میں ڈائجسٹ کے تمام قارئین اور اسٹاف کو دعا۔

☆ پیارے نعیم! تمہاری مختصر آمد بھی ہمیں قبول ہے۔پچھلی دو کہانیاں ہم نے جس طرح پڑھتے ہی مطلع کر دیا تھا اسی طرح نئی کہانی کے بارے میں بھی بتا دیں گے۔اب ذرا صبر کا دامن بھی تھام کر رکھو۔

✉ احوال اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا کہ ڈاکیا بابو ایک چٹھی دے گیا۔اور چٹھی میں بند محبت تھی، بہاول نگر سے ہمارے نئے لکھاری ساتھی ابو ہریرہ بلوچ کی۔لکھتے ہیں اگست 2015 کا پُراسرار نمبر 2 اپنی پُرکشش وجاہت لیے میرے ہاتھ پر نشست پذیر ہے ٹائٹل پر موجود حسینہ کچھ افسردہ تھی۔جس کی وجہ شاید

کاشی بھائی جانتے ہوں۔ پھر احوال کی محفل میں حاضری دی تو نئے اور پرانے احوالیوں کی سجائی رنگا رنگ محفل دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ ہر ماہ نئے احوالیوں کی آمد رسالے کی ترقی میں بہتر پیش خیمہ ہے۔ میں ان دوستوں اور احوالیوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے ویلکم کرتے ہوئے حوصلہ افزائی کی۔ سب سے پہلے محترم کاشی چوہان صاحب! میری احوال کی شمولیت ان ہی کی مرہونِ منت ہے بہت شکریہ۔ آپ نے اس قابل سمجھا۔ پھر شاہد رفیق سہو، محترم ممتاز احمد، میڈم سیدہ امامہ علی، چوہدری پرویز سہو، میڈم حمیرا جبیں، بھائی ندیم عباس میوالی، آپ سب کا تہہ دل مشکور ہوں۔ سب ہی کے تبصرے جاندار تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے محترم کاشی چوہان صاحب کی زہر عشق پڑھی جس کی ہر ایک لائن خوف اور تجسس کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھی۔ ویلڈن سر! پھر عزیز بھائی شاہد رفیق سہو کی خون کا پیاسا پڑھی زبردست لگی۔ عثمان بلوچ کی 'نوزی میری ہے' نظر سے گزری جو کہ فصاحت سے لبریز تھی۔ آپ کے ادبی مطالعے کو داد۔ خالہ بیگم غوثیہ نجیب، عظمیٰ شکور صاحبہ کی مختصر مگر جامع اسٹوری پریاں لے گئیں، زکیہ خالد کی مالکن کا عاشق زبردست تھی۔ ایم اے راحت کی ہم شکل کی تو کیا بات ہے۔ باقی کہانیوں پر تبصرہ اُدھار..... خط کی طوالت کے پیش نظر تبصرے کو اختصار کے دامن میں چھپانا مناسب ہے۔ زندگی رہی تو اگلے ماہ نئے تبصرے کے ساتھ ملاقات ہوگی۔

☆ اچھے ابو ہریرہ! خوش رہو، ذرا یہ تو بتاؤ یہ دیر کس لیے ہوئی۔ تبصرہ بہترین تھا۔

ساتھیو! اس ماہ تک ہماری ملاقات اپنے اختتام کو پہنچی۔ انشاء اگلے ماہ ان ہی صفحات پر پھر سے ملاقات ہوگی۔ جاتے جاتے اتنا کہنا ہے کہ خود سے محبت کرنا سیکھو، خود اپنی ہستی کو پہچانو...... میرے پیارو! جس دن تم نے خود سے محبت کرکے، اپنی ہستی کو پہچان لیا اس دن دیکھنا، دنیا جنت نہ لگے تو کہنا۔ جنت کا دوسرا نام بے فکری بھی تو ہے نا۔ اپنا بہت خیال رکھو۔ محبت کے ساتھ۔ اجازت لینے سے پہلے ایک تازہ ترین نظم آپ کی محبتوں کی نذر۔

## محبت

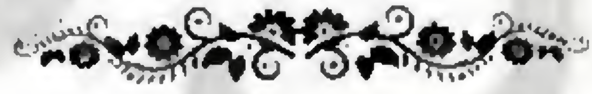
محبت کے دن
سیکڑوں بار گنے ہاتھوں پہ
نہ میں تھکا نہ ہی دن ختم ہوئے
لمحوں پہ بیٹھی ہیں
پات پات محبتیں
نفرتوں کے پَر سب کاٹ دیے میں نے
اور
محبتوں کو 'البم' میں
Pin کر لیا میں نے
زیست کی چوکھٹ پہ کبھی کبھی
اس ناانصافی پہ
مسیاتی ہیں نفرتیں مگر......
محبتوں کے رنگ بہت پکے ہیں
نہیں چھوڑ سکتے ساتھ مرا

آپ کا اپنا
کاشی چوہان

# Life Bouy... اصلی ہیروز کی کھوج لائے

اسماء اعوان

## حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں




Best Style Awards کی تقریب گزشتہ دس برس سے منعقد کی جا رہی تھی۔ گوری ناتھا خان کا خواب آج پورا ہونے جا رہا تھا۔ اُس نے تو بس ایک خواب دیکھا تھا لیکن اُسے کیا خبر تھی کہ وہ ایک دن خود خواتین کا خواب بن جائے گی۔ وقت پلٹتے دیر تو نہیں لگتی تو بھلا وقت سے آگے کون جا سکتا ہے اور وقت کس کے سر پر 'ہما' بٹھا دے کون جانے۔ گوری ناتھا خان کا شمار بھی اُن ہی شخصیات میں ہوتا تھا۔ وہ ہاتھوں میں تقریب کا انویٹیشن کارڈ پکڑے مسلسل کارڈ پر اپنے کمپوزڈ نام کو تکے جا رہی تھی۔ آنسو کارڈ پر گرتے اور اُس کی چکنی سطح سے لڑھکتے اُس کے دامن میں جذب ہو رہے تھے۔ اچانک موبائل کی بیل بجی اور دوسری جانب سے آتی آواز اُس کے ماتھے کی شکنوں پر جال بناتے، بتا رہے تھے کہ اُس کو ناپسندیدہ باتیں سننے کو مل رہی ہیں۔ گوری نے غصے سے تیورا کر موبائل آف کیا اور صوفے پر اچھال دیا۔

''کس کا فون تھا؟ کیا ہوا بٹیا؟ کس سے باتیں کر رہی تھیں؟'' چندا بوا فوراً ہی اُس کے قریب آ گئی تھیں۔

''یہ تمہارے چہرے کو کیا ہوا ہے؟ ارے بات کیا ہے؟ کیوں اتنی پریشان لگ رہی ہو۔ خیر تو ہے نا؟'' چندا بوا ماتھے پر آیا اپنا پسینہ صاف کرتے ہوئے بولی تھیں۔

وہ ان سے بھلا اپنی پریشانی کیسے چھپا سکتی تھی۔ فوراً ہی اُن کے کاندھے سے لگ کر آنسو بہانے لگی۔ مگر منہ سے کچھ بول کر نہ دی۔

''ارے بٹیا...... کیوں رونے لگیں۔ ابھی یہ کارڈ آیا تو تُو اتنا خوش تھی پھر یکلخت کیا ہوا کہ یوں چہرہ ہی اُتر گیا؟'' وہ ان کے پاس سے اٹھی اور دراز میں رکھے پھول پھر سے ترتیب سے رکھنے لگی۔

''کچھ نہیں ہوا بوا! بس وہ میری ایک فرینڈ مجھ سے بہت زیادہ ناراض ہے۔'' وہ اتنا بول کر واپس صوفے پر آ بیٹھی۔

''ائے ہے تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ تم نے تو میرا کلیجہ ہی جلتے توے پر رکھ دیا تھا۔ بٹیا! دیکھ لینا کسی دن اس طرح کے تمہارے واویلے سے میں مروں گی بس...... پھر تم رہنا موج مستی میں گم اور دیکھوں گی کہ پھر تم کسے ڈراتی ہو۔''

''بوا اللہ نہ کرے کہ خدا آپ کو اپنے پاس بلا لے۔ ارے ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے۔'' گوری نے ستر سالہ بوا کو دیکھ کر جھٹ سے ٹکڑا اچھالا اور مسکرانے لگی۔

''ہاں یہی کوئی سولہ برس کی بالی عمریا ہوگی بوا کی۔''

اچانک سے علی شان کمرے میں نمودار ہوا اور گوری کا جملہ اچک لیا۔
"تم بہت بدمعاش ہو بوّا۔ اُس دن جو شام کو کہا تھا کہ باہر جا رہے ہو تو ایک چھٹانک سری لنکا کی چھالیہ اور سانچی پان آدھا پاؤ لا دینا مگر ناں بھئی۔" بوا نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔
"ارے میری پیاری ڈارلنگ بوا! بس آج میں آدھا پاؤ چھالیہ اور ایک پاؤ سانچی پان آپ کو لا دوں گا۔" علی شان نے بوا کے گلے میں بازو حمائل کیے۔ انہوں نے جھٹکے سے اُس کے ہاتھ دور کر دیے۔
"اے بس بس رہنے دو اپنے منہ دیکھے کے چاؤ چونچلے...... تم کو بوّا پتا چلے گا جب بالی عمریا والی کو سولہ باز و قبرستان لے جا رہے ہوں گے۔"
"بوا بس بھی کریں ناں...... ہر وقت مرنے مارنے کی باتیں کرنا اچھا لگتا ہے کیا؟" گوری نے بوا کو خاموش کرایا اور اپنے کمرے کی جانب چل دی۔
☆......☆......☆
"کیا ہوا؟"
"وہ...... دیکھو نا۔ کیسے بال لہرا رہی ہے۔"
ندیم شان نے اُس کی اشارہ کرتی انگلی کی سمت دیکھا تھا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات جانچے اور پھر ٹھنڈے لہجے میں پوچھا۔
"ہوا کیا تھا آخر۔" سویرا کے منہ سے زیادہ الفاظ نہ نکل سکے بس واش روم کی طرف ہی اشارہ کرتی رہی۔
"آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ وہ چڑیل یہاں بھی آ گئی ہے۔"
"واٹ ربش یار! کیا بکواس ہے۔ کہاں ہے گوری؟ تم ہر وقت اسے کیوں سوچتی ہو؟"
"میں سوچتی نہیں ہوں ندیم! وہ خود بخود اپنے بال لے کر میرے سامنے آ جاتی ہے۔ مجھے کہتی ہے کہ میں آ گئی ہوں؟ میں زندہ نہیں چھوڑوں گی تمہیں۔ میں نہیں چھوڑوں گی تمہیں۔" وہ کہتی جا رہی تھی اور ندیم شان سُن سُن کر ہلکان ہوتا جا رہا تھا۔ اور پھر وہ چپ ہو گئی اور سر جھکا کر اپنے ہاتھوں کو گھورنے لگی۔
"بس یا کچھ اور......" ندیم کی بات پر اُس نے سر اٹھا کر شکوہ کناں نگاہوں سے اُسے دیکھا اور پھر تیزی سے کھڑی ہو گئی۔
"چلتی ہوں۔"
ندیم نے اُسے روکا نہیں۔ ایک ایک سیڑھی اترتے ہوئے سویرا کو لگا کہ وہ پاتال میں اُتر رہی ہے۔ آنکھوں میں گوری کا عکس ٹھہرا تھا اور اکلاپے کا گولہ حلق میں پھنس کر سارے الفاظ گونگے بہرے کر گیا تھا۔
اُس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا کہ شاید ندیم شان اُس کے پیچھے آیا ہو...... مگر...... اُس کے پیچھے سناٹا ناچ رہا تھا۔ اس کی امید بھی دم توڑ گئی۔ آج پھر اُسے لگا تھا کہ سب کچھ ہار گئی ہو۔ اُس نے اپنے بالوں کو ہاتھ لگایا تو لگا جیسے یہ نرم نرم سلکی بال نہ ہوں بلکہ برق بھری تاریں ہوں اور آج یہی تاریں اُسے زندگی کی بازی ہارنے میں معاون ثابت ہونے والی ہوں۔
☆......☆......☆
اِک عمارت
ہے سرائے شاید
جو میرے سر میں بسی ہے
سیڑھیاں چڑھتے اُترتے ہوئے جوتوں کی دھمک
بجتی ہے سر میں
کونے کھدروں میں کھڑے لوگوں کی سرگوشیاں
سنتا ہوں کبھی
سازشیں پہنے ہوئے کالے لبادے سر تک
اڑتی ہیں...... بھوتیا محلوں میں اڑا کرتی ہیں
چمگادڑیں جیسے
اِک محل ہے شاید......
ساز کے تار چٹختے ہیں فسوں میں
کوئی کھول کے آنکھیں
پتیاں پلکوں کی جھپکا کے بلاتا ہے کسی کو!
چولہے جلتے ہیں تو مہکی ہوئی گندم کے دھوئیں میں
کھڑکیاں کھول کے کچھ چہرے بجھے دیکھتے ہیں
اور سنتے ہیں، جو میں سوچتا ہوں
ایک مٹی کا گھر ہے
اک گلی ہے جو فقط گھومتی ہی رہتی ہے
شہر ہے کوئی، مرے سر میں بسا ہے شاید......

بہت عرصہ نہیں گزرا، بس یہی کوئی پانچ برس پہلے کی بات ہے۔ وہ بھی گاؤں کی الہڑ مٹیار کی طرح گھڑا سر پر لیے پانی بھرنے جارہی تھی۔ اُس کے گاؤں میں ڈاکومینٹری فلم بنانے کے لیے کچھ لوگ اپنے سازوسامان سمیت آئے تھے۔ ایک بہت گریس فل سی خاتون جینز ٹی شرٹ پہنے سر پر اسکارف لپیٹے پانی بھرنے والی دوشیزاؤں کے پاس کھڑی مختلف سوالات کررہی تھیں۔ جب وہ اپنی دھن میں مگن اپنا گھڑا بھرنے لگی تو خاتون کی نگاہ خود بخود اُس کے ریشمی سیاہ چمکدار بالوں کی طرف اٹھی تو اُن زلفوں میں کھو کر جیسے رستہ ہی بھول گئی۔

''واؤ! لگتا نہیں ہے یہ لڑکی گاؤں کی ہے۔'' اُس نے دل میں کہا اور اُس کی سادگی پر قربان ہوتی اُس کے قریب ہوگئی۔

''ہیلو! بیوٹی کوئن!'' اُس خاتون کے پکارنے پر وہ جھجک کر پیچھے ہوئی۔

''کیا ہوا لڑکی! کیوں ڈر رہی ہو۔ میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

اُس نے اُس خاتون کی طرف دیکھا اور گھڑا سائیڈ پر رکھ دیا۔ اور مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''جی باجی!'' اُس کی سادگی نے خوش بخت کو متاثر کیا۔

''کہاں رہتی ہو۔''

''باجی بس یہیں قریب ہی میرا گھر ہے۔''

''پڑھی لکھی ہو!''

''مڈل تک پڑھا ہے باجی۔''

''اور آگے کیوں نہیں پڑھا؟''

''باجی! بہت ہے اتنا ہمارے لیے۔'' وہ نرم مسکراہٹ سجائے بولی تھی۔

''تم گاؤں کی نہیں لگتی ہو؟'' خوش بخت کے منہ سے نکل ہی گیا۔ اس بات کے جواب میں وہ پھر سے مسکائی تھی۔

کیسی مسکراہٹ تھی۔ دل موہ لینے والی، پتھروں میں دراڑ ڈال دینے والی۔

''میں تمہارے گھر آنا چاہتی ہوں۔'' خوش بخت نے آخر اپنی خواہش کا اظہار کر ہی دیا۔

''بالکل باجی! شوق سے آئیں۔ آپ ایسا کریں۔ فارغ ہوکر 'قمری منیار' کا گھر کسی سے بھی پوچھ لیں، وہ آپ کو بتادیں گے۔ باجی آنا ضرور! میں انتظار کررہی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ گھڑا اٹھائے اپنے گھر کی طرف چل دی اور خوش بخت اُس کی پنڈلیوں تک آتی ریشمی چمکدار زلفوں کو دیکھتی رہ گئی۔

☆......☆......☆

''آ گئی بندیا!'' قمری منیار نے بیٹی کو خوشی خوشی گھڑا چوکی پر رکھتے دیکھا تو پوچھ بیٹھا کیونکہ آج کا دن کوئی عام دن نہ لگتا تھا۔ بندیا کی آنکھوں میں خوش کن اُجالا پھیلا تھا۔ جیسے وہ کسی جوتش سے اپنی قسمت کا حال سُن کر آئی ہو اور اُس نے کہا ہو کہ تیری قسمت میں اچھا دور شروع ہوا چاہتا ہے۔ جا اور اپنے آنے والے کل کے لیے تیاری کرلے۔''

''بڑی خوش لگ رہی ہے بیٹی؟'' آخر وہ پوچھ ہی بیٹھا۔

''ہاں بابا! بابا آج شہر سے ایک باجی آئی ہے۔ پنگھٹ پر لوگوں کے انٹرویو لے رہی ہے۔ باجی نے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہتی ہے تیرے گھر آؤں گی۔ بتا بابا! کیا میں خوش نہ ہوؤں۔ بابا مہمان تو خدا کی رحمت ہوتے ہیں اور اگر رحمت خود راستہ روک کر بولے کہ میں تیرے گھر آؤں تو......''

''تُو تو جھلی ہے!''

بابا! میرے لائف بوائے شیمپو کے ساشے لائے نا۔''

''ہاں ہاں پتر! میں پوری ایک چھڑی لے آیا ہوں۔''

''بابا! تم یہ شیمپو کی لڑی کو چھڑی کیوں کہتے ہو۔''

''ارے پگلی! دکاندار بھی اِس گولڈ لائف بوائے لڑی کو چھڑی ہی کہتا ہے۔ سمجھی کہ نا......''

''ٹھیک ہے! لاؤ بابا میری لائف بوائے شیمپو کی لڑی...... ارے چھڑی۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا اور قمری منیار نے اُس کے ہاتھ میں شاپر سے نکال کر لائف بوائے شیمپو کے ساشوں کی 24 ساشے والی لڑی دے دی۔ جسے پا کر بندیا کی خوشی دیدنی تھی۔

☆......☆......☆

خوش بخت اپنی ٹیم کو Stay کرانے کا کہہ کر قمری منیار کے گھر چلی آئی تھی۔ اُس کے ساتھ بس اُس کا بھائی تھا جو اس ٹیم میں کیمرہ مین کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔

قمری منیار نے شہری مہمانوں کو عزت سے بٹھایا اور بندیا نے مہمانوں کے لیے تازہ بٹیرے بھون دیے تھے۔

کھانا اتنا لذیذ تھا کہ خوش بخت حیران رہ گئی تھی۔ کئی فائیو اسٹار ہوٹلوں سے بڑھ کر Taste قمری منیار کی بیٹی کے ہاتھ میں تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر خوش بخت نے اپنے پرس میں ہاتھ ڈالا اور ایک پانچ ہزار کا نوٹ نکال کر بندیا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''باجی! یہ کیا ہے؟'' بندیا حیران ہو کر بولی تھی۔

''یہ تم جیسی پیاری اور نمبرون لڑکی کے لیے ہماری طرف سے ایک Gift ہے۔'' خوش بخت مسکراتے ہوئے بولی۔

''باجی! کیسا گفٹ ہے یہ...... میں یہ نہیں لے سکتی۔ آپ نے ہماری غربت کا مذاق اڑایا ہے۔'' وہ تن فن کرتی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''کول ڈاؤن پلیز! بندیا یہ کیا بات کہہ دی تم نے۔ تم غریب کب ہو بیوٹی کوئن! تم کو خدا نے جو حسن کی دولت دی ہے تو بڑے بڑے قارون کا خزانہ رکھنے والے رؤسا کے پاس بھی نہیں۔ یہ احساس کمتری تم جیسی پیاری لڑکی کے دل میں آیا کیسے بے بی!'' خوش بخت نے اُسے پاس بٹھایا۔

''لیکن باجی......'' وہ کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ خوش بخت نے اُسے خاموش کرایا اور اُس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''دیکھو سب سے پہلے تو مجھے یہ بتاؤ کہ ایک لڑکی کا سب سے بڑا ہتھیار کیا ہوتا ہے؟'' بندیا نے حیران نظروں سے خوش بخت کو دیکھا۔

''پتا نہیں باجی!''

''ارے پگلی! یہ جو تمہارا معصوم حسن، کٹورا آنکھیں ہیں اور یہ پیارا سا چہرہ۔ یہ سب بے کار ہو جاتے اگر اس چہرے کے ساتھ یہ خوبصورت ریشمی زلفیں نہ ہوتیں۔ سچ بتاؤ تمہاری ماں نے تمہارے بالوں میں کیا جادو کیا ہے جو یہ اتنے حسین اور نفیس، ملائم گھٹاؤں جیسے ہو گئے ہیں۔''

یہ بات سن کر ایک سایہ سا بندیا کے چہرے پر لہرایا۔ قمری منیار مہمانوں کے استقبال کے بعد جا چکا تھا۔ اب صرف بندیا ہی خوش بخت کے پاس موجود تھی۔

''باجی! میری ماں نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر اُس کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ خوش بخت نے اُسے ساتھ لگا کر پیار کیا۔

''آئی ایم سوری بندیا!''

''کوئی بات نہیں باجی! میں آپ لوگوں کے لیے چائے بناتی ہوں۔'' وہ اُٹھ کر جانے لگی لیکن خوش بخت نے اُسے روک دیا۔

''نہیں بیوٹی کوئن! پھر بھی...... ہم تمہارے ہاتھ کی چائے پی کر جائیں گے۔ اپنے بالوں کا خیال رکھا کرو۔ یہ تو پھر God Gifted ہوئے نا۔''

''نہیں باجی! بال تو خدا کا تحفہ ہیں مگر ان کا اصل حسن نکھارنے کے لیے انسان ہی خدا کی دی ہوئی عقل کا استعمال کرنے کے لیے محنت کرتا ہے۔''

''کیا مطلب۔''

''ارے باجی! مطلب یہ ہے کہ میرے بال پہلے ایسے نہ تھے۔ ہم غریب لوگ ہیں۔ بالوں کی آرائش پر کتنا خرچ کر سکتے ہیں۔ میرے خوبصورت حسین بالوں کا حسن ہے میرا لائف بوائے شیمپو، باجی یقین کریں میں نے تین سال سے مستقل لائف بوائے شیمپو کا استعمال شروع کیا۔ تو میرے بال خوب سے خوب تر ہوتے چلے گئے۔ دو موہے بالوں کا مسئلہ، بالوں کا روکھا پن اور بالوں کی بے رونقی سب کچھ ختم ہو گیا۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ شیمپو نہیں کوئی جادو ہے، جو ماں سے بڑھ کر بالوں کی Care کرتا ہے۔'' بندیا اپنے بالوں کو سہلاتے ہوئے بولی۔

''مگر یہ لائف بوائے شیمپو تم افورڈ کر لیتی ہو۔'' خوش بخت کا سوال اس دیہی ماحول اور غربت کے لحاظ سے فطری تھا۔

''ارے پیاری باجی! سب سے کم قیمت میں، اصل معیار کے ساتھ صرف لائف بوائے شیمپو ہی ہر ایک کی جیب میں سما سکتا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' خوش بخت چونکی۔

''مطلب یہ ہے کہ باجی اپنی جیب کے حساب سے ہر ماہ لائف بوائے شیمپو ہم بہت آسانی سے افورڈ کر سکتے ہیں۔ آپ ہمارے گاؤں پر نہ جائیں۔ اب اس پسماندہ گاؤں کی ہر ہٹی (دکان) پر لائف بوائے شیمپو موجود ہوگا۔ کیونکہ آج ہی چاچا رحیم بخش نے گاؤں کے دکانداروں کو تنبیہ کی ہے کہ دو نمبر شیمپو سے بہتر ہے اُس قیمت میں ایک نمبر شیمپو بیچو۔ میرا بابا خود بھی اپنی ہٹی (دکان) پر صرف لائف بوائے شیمپو ہی رکھتا ہے۔ جس کی جیب میں گنجائش ہو وہ بوتل لے لے ورنہ ساشے تو ہے ہی۔ میری جیب میں فِٹ صرف ساشے آتا ہے کیونکہ اس ساشے میں شیمپو کی ایک خاص مقدار موجود ہوتی ہے۔ نہ کم نہ زیادہ بالکل پرفیکٹ سو اس لیے باجی میں کہتی ہوں۔

لائف بوائے شیمپو ہٹ۔ ہر ایک کی جیب میں فٹ۔''

اس نے جوش سے کہا تو خوش بخت مسکرا کر رہ گئی۔

اُس نے ہر ایک شیمپو استعمال کیا تھا۔ امپورٹڈ شیمپو کی بات ہی اور ہوتی ہے لیکن اب...... بندیا اُسے ایک نئی دنیا دکھا گئی تھی۔ بندیا کے مقابلے میں اُس کے بال کچھ بھی نہ تھے۔

خوش بخت نے لمحوں میں ایک بہت بڑا فیصلہ کر لیا تھا۔ بلیک ہیئر بیوٹی باہر نہیں اپنے گاؤں میں......

اچانک ہی ایک نئی ڈاکومینٹری فلم بنانے کا منصوبہ طے پا گیا تھا۔

خوش بخت بندیا سے بڑے تپاک سے مل کر رخصت ہوئی تھی اور بہت جلد اُس سے گاؤں میں دوبارہ ملنے کا وعدہ کر گئی تھی۔

☆......☆......☆

آج پورے دو ماہ بعد خوش بخت ایک نئے عزم اور کامیابی کے نئے منصوبوں کے ساتھ بندیا کے گاؤں میں داخل ہوئی تھی۔ قمری منیار سے مل کر سب سے پہلے اُسے اپنی آمد کا مقصد بتانا تھا۔

قمری منیار سے ملاقات کے بعد خوش بخت نے بتا دیا تھا کہ وہ کیوں اور کس مقصد کے تحت دوبارہ اس کی دہلیز پر موجود ہے۔ قمری نے سب سے پہلے بندیا سے پوچھا کہ اُس کی کیا رائے ہے۔ اسکرین پر آ کر گاؤں والے بندیا کو کبھی اس گاؤں میں قبول نہ کرتے کیونکہ قمری منیار کھلے دل اور ذہن کا انسان تھا۔ بیوی داغ مفارقت دے گئی تو بندیا سات سال کی تھی۔ مگر قمری نے کسی کے دباؤ میں آ کر دوسری شادی نہ کی تھی کہ وہ اکیلا اپنی بیٹی کو پال سکتا ہے۔

آج پھر سے وقت اُسے دوراہے پر لے آیا تھا۔ خوش بخت نے بندیا کے مستقبل کی ذمہ داری اُٹھا کر قمری منیار کی ساری سوچیں اور فکریں ختم کر دی تھیں۔ مگر...... وہ کیسے بھول جاتا کہ وہ ایک بن ماں کی بیٹی کا باپ ہے۔

ڈاکومینٹری فلم کا نام رکھا گیا تھا۔ ''لائف بوائے ...... اصلی ہیروں کی کھوج لائے۔''

اس فلم میں مرکزی کردار بندیا ادا کر رہی تھی۔ مگر بندیا کا اصل نام یہ نہ تھا۔ وہ تو گوری ناتھا خان تھی اور قمری منیار...... قمر ناتھا خان تھا۔

خوش بخت نے فلم کا آغاز ریشمی کالی گھٹاؤں سے بالوں والی گوری کی خوبصورت زلفوں سے ہی کیا تھا۔ تیزی سے کام جاری تھا۔

گاؤں والے عجیب عجیب طرح کی باتیں بنا رہے تھے۔ ندیم شان جو کہ خوش بخت کا بھائی تھا۔ کیمرہ مین کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ جیسے جیسے فلم اختتام کی جانب بڑھ رہی تھی اُس کے دل میں گوری کی محبت کا پودا جڑیں پکڑتا جا رہا تھا۔

یہ دنیا بہت Materialistic ہو گئی ہے۔ سب اپنا فائدہ دیکھتے ہیں لیکن کچھ لوگ اسمِ بامسمیٰ ہوتے ہیں جیسے خوش بخت...... خوش بخت نے اس گاؤں کی سیدھی سادھی لڑکی کے لیے بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ اس کنول کو وہ پوری دنیا کے سامنے دکھانا چاہتی تھی کہ ابھی خدا بندوں سے ناامید نہیں ہوا۔ بس تھوڑی سی Car بہت کچھ بدل سکتی ہے۔''

یہی اُس کی فلم کا سلوگن تھا۔

انٹرنیشنل فلم فیسٹیول میں منتخب ہونے والی اس ڈاکومینٹری فلم نے Best Film کا ایوارڈ جیت کر گوری کو راتوں رات اسٹار بنا دیا تھا۔ آج گوری کامیابی کے مینار پر کھڑی تھی۔ اُسے سب کچھ بہت عجیب لگ رہا تھا۔ اُس کا محبت کرنے والا بابا اُس کی اتنی بڑی خوشی کو برداشت نہ کر پایا تھا اور جس روز اُسے بین الاقوامی طور پر سراہا گیا ایک ہارٹ اٹیک اُسے بیٹی کی آسمان چھوتی

کامیابی کے ساتھ محوِ سفر کر گیا تھا۔

گوری کو Life Buoy Diamond Girl کے لقب سے پکارا گیا تھا۔ کیسی انہونی تھی کہ اس خوشی نے اُسے عظیم دکھ سے بھی دوچار کر دیا تھا۔ ماں کے بعد اس کا واحد سہارا اُس کا باپ، اس کا بابل اُسے بھری دنیا میں تنہا چھوڑ گیا تھا۔

ایسے موقع پر جب گوری اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہی تھی، خوش بخت نے اُسے بڑھ کر تھام لیا تھا۔ اب وہ مکمل طور پر خوش بخت کے اختیار میں تھی۔ وہی اس کی سرپرستی کے فرائض انجام دے رہی تھی۔

☆......☆......☆

رات جب وہ بستر پر لیٹی تو جانے کہاں سے اماں اور بابا خواب میں آ گئے۔

وہ پانی سے بھرا مٹکا اٹھائے بمشکل گھر میں داخل ہوئی تھی۔ سات برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ گھر کچا تھا مگر صاف ستھرا تھا۔ گھر میں داخل ہوئی ہی تھی کہ اُس نے سامنے چارپائی پر پڑی تڑپتی ہوئی ماں کو دیکھا تھا۔ اور اس حالت میں اُسے تڑپتا دیکھ کر اُس کے حواس معطل ہو گئے تھے۔

''اماں......اماں......'' وہ چلانے لگی تو اُس کی درد ناک چیخوں سے کچے در و دیوار ہل گئے۔ آس پڑوس والے جمع ہو گئے مگر نور فاطمہ درد کی شدت سے بے حال تھی۔ اچانک ہی اپنڈکس کے درد نے اُسے اَدھ موا کر دیا تھا۔ گاؤں میں سہولیات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ چھکڑا گاڑی میں بیٹھ کر تو اچھے سے اچھا مریض بھی اپنی موت کو دعوت دے دیتا ہے۔ تو بھلا تڑپتی، بلکتی نور فاطمہ کیسے زندگی کا گوہر پا سکتی تھی۔

قمر شہر کے لیے نکل گیا تھا۔ شام کے دیوں میں روشنی کی رمق جاگی تو قمر کی واپسی ہوئی تھی۔ مگر...... یہ کیسی اُداس اجڑی شام تھی۔ جس میں دن کی تھکن اُتر رہی تھی۔ رات کے اندھیرے شام کو دیوں کو کھا رہے تھے۔ اندھیرا اور گہرا ہوتا جا رہا تھا اور پھر جلد ہی قمر پر اس بھیانک عفریت کی حقیقت واضح ہو گئی۔

نور فاطمہ اس کی اور گوری کی زندگی سے اپنی روشنی کا دیا دو گز زمین کے اندر روشن کرنے کو لے گئی تھی۔

''اماں......ابا! اماں!!'' وہ چیخ مار کر اٹھی تھی۔

''اماں......ابا......ابا......کہاں ہو تم؟'' پسینے سے شرابور وہ بھانبڑ بھانبڑ جل رہی تھی۔

خوش بخت اُس کی چیخ سُن کر دوڑی چلی آئی تھی۔

''کیا ہوا؟ میری جان بتاؤ نا......کیا بات ہوئی؟''

خوش بخت کے پیچھے چندا بوا بھی کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ اُن کے ہاتھ میں دم کیا ہوا پانی کا گلاس تھا اور وہ مسلسل پڑھ پڑھ کر گوری پر پھونک رہی تھیں۔ گوری کی حالت پانی پی کر بحال ہو گئی تھی۔ اب وہ بہتر محسوس کر رہی تھی۔

''میں ہوں نا تمہارے پاس۔ چلو شاباش! Cheer Up'' وہ اُسے سینے سے لگائے ہوئی بولی تھی۔

''بٹیا......تم ڈر گئیں۔ یہ درگاہ کا دھاگہ ہم تمہارے ہاتھ پر باندھ رہے ہیں۔ انشاء اللہ اللہ کرم کرے گا۔'' چندا بوا نے لال دھاگہ اُس کی کلائی پر باندھ دیا تھا۔ علی شان بھی منہ بسورتا کمرے میں آ گیا تھا۔

خوش بخت کے دو ہی بھائی تھے۔ ایک علی شان ایک ندیم شان...... ندیم شادی شدہ تھا۔ سویرا سے اس کی ارینج میرج تھی۔ مگر دونوں میں ذہنی ہم آہنگی مفقود تھی۔ کیونکہ ازدواجی زندگی کو لگنے والی دیمک شک ہوتا ہے اور سویرا کے اندر شک کا دیمک کھرچ کھرچ کر اس کی روم روم میں اپنی جگہ بنا چکا تھا۔ وہ فطرتاً ایسی ہی تھی اس لیے کیا کرتی۔ میاں خوبصورت ہو تو بیوی کو لاکھ دھڑکے ویسے ہی لگے رہتے ہیں۔

جانے کس وقت اُس کی نیا میں سوت کا پاؤں آ جائے اور ازدواجی کشتی ڈوبنے لگے...... سوچ پر پہرے نہیں بٹھائے جا سکتے۔ مگر سویرا ندیم کے لاکھ لاکھ یقین دلانے کے باوجود بھی اس 'خوفِ سوتن' سے چھٹکارہ نہ پا سکی تھی۔

سویرا بھی کم حسین نہ تھی مگر ندیم شان کے آگے اُس کا حسن دب جاتا تھا اور بس وہ اپنے احساسِ کمتری میں مبتلا ایک جانب ہو جاتی اور اُس کا جی چاہتا کہ وہ ندیم شان کو اپنی مٹھی میں بند کر لے۔

وہ یہ نہ جانتی تھی کہ مٹھی زیادہ دیر بند رہے تو تنفس کی کمی انسان کی جان لے لیتی ہے اور محبت کو ہر دم تازہ آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے، جو محبت کے حسن کو قائم رکھتی ہے اور محبت کا پھول ہر دم اپنی مہکار سے تر و تازگی اور فرحت بخشتا رہتا ہے۔

دوسرا بھائی علی شان بھی پچیس برس کا تھا اور بی ایس سی فائنل کا ایگزام دے کر میڈیکل کے شعبے پر احسانِ عظیم کرنے جارہا تھا۔

ندیم جتنا سوبر، بردبار تھا علی شان اتنا ہی چلبلا اور شریر تھا۔

ندیم شان نے جب پہلی بار گوری عرف بندیا کو دیکھا تو اُس کے چمکیلے بال اُسے اپنی زلفِ گرہ گیر کا اسیر بنا گئے تھے۔ وہ چاہ کر بھی ان گھنیری زلفوں کی قید سے نہ بچ پایا تھا۔ سویرا سے شادی، اس کو زندگی کا بھیانک سچ لگنے لگا تھا۔ اس سے وہ گھر والوں کے آگے مجبور تھا۔ شادی مجبوری نہیں تھی کیونکہ اُسے نہیں معلوم تھا کہ سویرا کی شکی عادت اُس کی زندگی عذاب بنادے گی۔ مگر اب وہ سویرا سے فرار چاہتا تھا۔ وہ اس کی تھانیدار خصلت کو ناپسند کرتا تھا۔ اُس نے جو فیصلہ گوری کو دیکھ کر کیا تھا۔ اُس پر عملی جامہ پہنانے کا وقت قریب آرہا تھا۔ اب وہ سویرا کو جھیل نہیں رہا تھا بلکہ اُس سے جان چھڑانے کے لیے دن گن رہا تھا۔

☆......☆......☆

پہاڑوں کی گپھاؤں میں
کسی نے جستجو جلا کے رکھی تھی
اور انتظار کے لیے
سے کی انتہا بٹھا کے رکھی تھی
عبادتیں تراشیں پتھروں پر اور گھر بنا لیے خیال کی پناہ کے لیے
بس اِک امید کے گناہ کے لیے

آج بہت اہم Even تھا۔ خوش بخت کی فلم کو بیسٹ ڈاکومینٹری فلم کا ایوارڈ مل رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک لاکھ ڈالر کا کیش پرائز بھی تھا۔ خوش بخت نے کیش پرائز اپنے اور گوری کے ساتھ ففٹی ففٹی بانٹ لیا تھا۔

''گوری...... تم ملنے والی اس رقم کا کیا کرو گی۔'' خوش بخت نے دلار سے پوچھا تھا۔

''باجی! میں اس رقم سے اپنے گاؤں میں ہیلتھ سینٹر تعمیر کراؤں گی تاکہ صحت کا حصول ہر انسان کے لیے اُس کی دسترس میں ہو۔ کسی اور کو گوری کی ماں اور باپ کی طرح صحت کی بنیادی سہولیات میسر نہ ہونے کی صورت میں موت کو گلے نہ لگانا پڑے۔'' یہ کہہ کر گوری پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ چندا بوا اور علی شان بھی اُسے چپ کرانے لگے تھے۔

''گوری بٹیا...... اللہ خیر کرے، تیری یہ خواہش بھی ضرور پوری ہوگی۔ تُو بس جی چھوٹا نہ کر بٹیا۔'' اتنے میں ہال کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور سویرا کسی طوفان کی طرح کمرے میں داخل ہوئی۔

''کیا سمجھتی ہے تُو لمبے بالوں والی چڑیل۔ میرے میاں کو اپنے بالوں کے جادو میں پھانس لے گی۔ میں تیرا خون پی جاؤں گی۔ آوارہ...... اپنے گھروں کو چھوڑ کر دوسروں کے گھروں کو خراب کرنے آجاتی ہیں بے غیرت عورتیں۔''

اِس افتاد کے لیے تو کوئی بھی تیار نہ تھا۔ نہ ہی کبھی کسی نے ایسا سوچا تھا۔ یہ اچانک کیا ہوگیا تھا؟ خوش بخت تو زمین میں گڑی جارہی تھی۔ ایسے میں چندا بوا نے اپنے حواس بحال کیے۔

''ارے چندا! میری بچی! سویرا بٹیا ہوش میں آؤ۔ کیا واہی تباہی بکے جارہی ہو بٹیا...... کیا ہوگیا ہے ایسا کہ تم تو علی علی کرتے ہم پر چڑھ دوڑیں۔'' بوا نے سویرا کو اپنے ہاتھوں میں بھرا۔

''خوش آپا! میں اپنے میاں کو اس ناگن کا نہیں ہونے دوں گی۔'' سویرا دھاڑی۔

''ارے بھابی! بات کیا ہے۔ پتا تو چلے۔'' علی شان بھی بول پڑا۔

''پوچھو اپنی اس چہیتی سے۔ کیا گھول کر پلا رہی ہے میرے میاں کو...... رات کہہ رہے تھے کہ تم دن گن لو۔ میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا جلد ہی Divorce دے کر جان بخشی کرالوں گا۔ ارے بتاؤ اتنے عرصے کا ساتھ اس چڑیل کے آتے ہی برا لگنے لگا۔'' اس سے پہلے کہ سویرا مزید بکواس کرتی خوش بخت بول پڑیں۔

''بس سویرا! ختم کرو یہ ڈرامہ...... میں ندیم سے بات کروں گی۔ اور ہاں...... آئندہ یہاں آتے ہوئے دھیان رکھنا کہ یہ تمہارا گھر نہیں ہے۔ یہ گھر میرا ہے۔ اور تمہارا گھر وہ ہے جس میں تم رہتی ہو۔ ایٹی کیٹس سیکھو۔ میرے ہی گھر میں تم نے مجھے ذلیل کردیا۔ اس یتیم مسکین

بچی پر اتنے الزام لگاتے تمہیں شرم نہ آئی۔ اب میں تم سے یہ بات بانگ دہل کہہ رہی ہوں کہ اگر تم نے اپنا رویہ چینج نہ کیا تو تمہاری کوئی حیثیت نہ رہے گی اور نہ ہی تم 'اپنے' گھر کا سکون پا سکو گی۔ او کے...... اچھی طرح اپنے ذہن میں یہ بات بٹھا لو...... امید ہے آئندہ تم اپنی حدود کراس نہیں کرو گی۔ اب تم جا سکتی ہو۔ آئندہ اِس طرح' اِس گھر میں قدم رکھنے کی تم کو اجازت نہیں۔''

خوش بخت نے فیصلہ کیا اور بغیر یہ دیکھے کہ سویرا پیر پٹختی باہر جا رہی ہے۔ گوری کو لے کر اپنے کمرے میں آ گئیں۔

☆......☆......☆

گوری نے رقم ملتے ہی علی شان، ندیم شان اور خوش بخت کی پشت پناہی پر گاؤں میں ہاسپٹل کی تعمیر شروع کرا دی تھی۔ خوش بخت کی فلم نے ایوارڈ پاتے ہی گوری کے مشن کی تکمیل کا سُن کر دیگر این جی اوز کو بھی اس جانب متوجہ کر لیا تھا۔ تیزی سے اسپتال کی تعمیر جاری تھی۔ ایک چھوٹا سا منصوبہ اب ایک بہت بڑے پراجیکٹ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ وہ دن بھی جلد ہی آ پہنچا جب اسپتال کا افتتاح ہونا تھا۔

آج ہی اُسے Best Style Awards کے لیے Nominate ہونے کا انویٹیشن کارڈ بھی موصول ہوا تھا۔ وہ کارڈ ہاتھوں میں لیے اپنے آنسو بہا رہی تھی۔

کل 14 اگست بھی اور گوری اپنے اس ہاسپٹل جیسے عظیم مقصد کی تکمیل اور بیسٹ ایکٹرا ایوارڈ کی کامیابی پر آنکھوں میں آنسو لیے اپنے والدین کو یاد کر رہی تھی کہ اچانک ہی موبائل بجنے لگا۔

اُس نے موبائل اٹھایا تو دوسری جانب سویرا تھی۔ جو اُسے بڑے بڑے القابات سے نواز رہی تھی اور اس کی باتیں سن کر گوری کے ماتھے پر شکنوں کا جال پھیلتا جا رہا تھا۔ تنگ آ کر اُس نے موبائل آف کر کے صوفے پر اچھال دیا تھا۔

اُسے اب اپنی دراز زلفوں کو لائف بوائے شیمپو سے مزید نکھارنا، سنوارنا تھا۔ اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ بھی ندیم شان کی ہم قدم بن کر، ہم سفر بن کر اپنے ہاسپٹل میں رکھے گی۔ اُس کے قدم اپنے کمرے کی جانب تھے۔ بڑے ابو اور علی شان مسکراتے ہوئے اُس کے عزم کو سلام کر رہے تھے۔

☆......☆......☆

پورا ہال بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ ہر چہرہ روایتی چمک لیے موجود تھا۔ اور اُن سب کے درمیان گوری ناتھا خان اپنے اعتماد کے ساتھ براجمان تھی۔

اب باری ہے بیسٹ کریٹک ایوارڈ کی۔ جس کے لیے ہم بہت احترام سے پکاریں گے اپنی ''لائف بوائے ڈائمنڈ گرل'' میں ''گوری ناتھا خان'' کو...... پنڈال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ ساری لائٹس کے جھماکے گوری پر تھے۔

اس کے ساتھ ہی لائف بوائے شیمپو کے ذریعے گاؤں میں اپنے سیاہ بالوں سے اجالا کرتے ہوئے گوری کو اسکرین پر دکھایا جا رہا تھا۔ گوری خوش بخت اور ندیم شان کی معیت میں اسٹیج پر آئی۔

''تھینک یُو خوش بخت آپا! تھینک یو ندیم! آئی لو مائی لائف بوائے...... تھینک یُو لائف بوائے شیمپو! آج میں تمہاری ہی وجہ سے اس جگہ کھڑی ہوں۔ اگر تم نے ہوتے تو یہ بال......'' گوری نے ایک جھٹکے سے اپنے بال لہرائے۔

''تو یہ بال نہ ہوتے اور بال نہ ہوتے تو میں اِس ڈاکومینٹری فلم کا حصہ نہ بنتی اور نہ ہی میرا گاؤں ایک بہترین ہاسپٹل اپنے نام کرا پاتا۔ آج میں بہت خوش ہوں کہ میرے لائف بوائے شیمپو نے میرا اور میرے والدین کا نام فخر سے بلند کر دیا ہے۔'' کمپیئر نے سوال کیا۔

''گوری جی! آپ کے ہاسپٹل کا نام کیا ہے۔''

''میرے ہاسپٹل کا نام ہے Life Buoy Apna Hospital...... جس طرح لائف بوائے شیمپو سب کی دسترس میں ہو سکتا ہے، اس طرح لائف بوائے اپنا ہاسپٹل بھی سب کا ہے۔''

پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا تھا اور اس پُرعزم لڑکی کے اعتماد پر فخر کر رہا تھا۔ سویرا کا آسیب ندیم شان نے کل طلاق کی صورت اتار پھینکا تھا اور آج وہ گوری کا ہاتھ تھامے مطمئن تھا کہ دونوں کی رضامندی کو خوش بخت نے شادی کے بندھن میں باندھنے کی حامی بھری تھی۔

اسٹیج پر لگی اسکرین پر خوب چمک رہا تھا۔

''لائف بوائے...... اصلی ہیروں کی کھوج لائے۔''

☆☆......☆☆

پہلی سچ بیانی

اپنے دیس سے، اپنے شہروں سے موصول، وہ سچ بیانیاں جن کو پڑھ کر، اپنی مٹی کی خوش بُو، آس پاس محسوس ہوتی ہے

# شو... بزنس



محمد سلیم اختر

راولپنڈی سے ایک دوشیزہ کی کتھا، وہ ماڈلنگ کے شوق میں گھر سے ہی بھاگ گئی تھی مگر پھر......

فیشن میگزین کے سرورق پر کسی ماڈل کی تصویر دیکھ کر میں چونک گئی۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے وہ میری دوست شینا ہے۔ میں نے جلدی جلدی ورق پلٹے۔ تاکہ پتا چلے کہ اس ماڈل کا نام کیا ہے۔ اس نے اتنا

بناؤ سنگھار کیا ہوا تھا کہ پہچانی ہی نہ جارہی تھی۔ اندرونی صفحات میں کراچی میں منعقد ہونے والے 'فیشن ویک' کی جھلکیاں اور تصاویر تھیں۔ ان میں بھی سرورق والی ماڈل سب سے نمایاں تھی۔ وہاں اس کا نام شینا ہی لکھا تھا۔ شینا رزاق میری کلاس فیلو اور دوست تھی...... جب مجھے یقین ہوگیا کہ وہ شینا ہی ہے۔ تو میرے لبوں سے بے اختیار ہو کر الفاظ نکلے۔

''شینا! تم ارادے کی اتنی پکی نکلی ہو کہ اپنا کہا سچ کر دکھایا۔ اور میں وہیں کھڑی ہوں۔'' میں نے ایک آہ بھر کر کہا۔ اور میرا دھیان دو برس قبل کی طرف مڑ گیا۔



☆......☆......☆

میرے ابا جان ایک سرکاری ادارے میں گریڈ سولہ کے ملازم تھے۔ وہ مذہبی احکامات کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ امی اور باجی سائرہ بھی ان ہی کے نقش قدم پر چلتی تھیں۔ سائرہ باجی مجھ سے تین برس بڑی ہیں۔ انہوں نے قرآن پاک حفظ کیا ہوا ہے۔ اسکول کی تعلیم انہوں نے پانچویں تک حاصل کی تھی۔ امی ابو سائرہ باجی کے 'حافظہ' بننے پر بہت خوش تھے۔ کیونکہ وہ پکی نمازی ہیں اور پردہ کی بھی پابندی کرتی ہیں۔ ان کی شادی ہو چکی ہے اور وہ اپنے گھر میں پُرسکون زندگی گزار رہی ہیں۔ جبکہ ان کی تصویر کا دوسرا رُخ میں ہوں اور اُن سے بالکل ہی مختلف...... مجھے بچپن ہی سے بننے، سنورنے کا شوق تھا۔ امی ابو نے بہت کوشش کی کہ میں بھی سائرہ باجی کے نقش قدم پر چلوں۔ مگر میں نے اُن کی بات نہ مانی اور اپنی من مانی کرنے لگی۔

چھوٹی ہونے کے ناتے میں لاڈلی تھی۔ جس بنا پر وہ میری ہر بات مانتے تھے۔ مجھے نت نئے ڈیزائن کے کپڑے پہننے کا بہت شوق تھا۔ میں ہر ماہ ایک نیا سوٹ ضرور خریدتی تھی، اور ضد کر کے اپنی جائز و نا جائز بات منوالیتی تھی۔

دسویں کا امتحان پاس کر کے جب میں کالج میں آئی۔ تو وہاں ایک نئی دنیا دیکھ کر میں دنگ رہ گئی۔ امیر لڑکیوں کے رنگ روپ اور اطوار نے تو مجھے احساس کمتری میں مبتلا کر دیا۔ ان کے تو ٹھاٹ باٹ ہی نرالے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ کالج نہیں بلکہ کسی فیشن شو میں مقابلہ کرنے کے لیے آئی ہیں۔ میں نے ان میں سے کئی کے ساتھ دوستی کرنا چاہی تاکہ میں ان کے رنگ ڈھنگ میں ڈھل جاؤں۔ مگر مجھے کسی نے لفٹ ہی نہ کرائی۔

ان ہی دنوں ایک نئی لڑکی کسی دوسرے کالج سے مائی گریشن کر کے ہماری کلاس میں آئی۔ اس کا نام شینا تھا۔ اس کا باپ کسی سرکاری ادارے میں کلرک تھا۔ اس کی تبدیلی ہمارے شہر میں ہوئی تھی۔ شینا کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ اس کی تین بہنیں اور تھیں۔ ایک کلرک کی تنخواہ سے گھر کا نظام کیسے چل سکتا تھا۔ جلد ہی میری اور شینا کی دوستی ہوگئی۔ اور ہم میں گاڑھی چھننے لگی۔ شینا کا مزاج بھی میرے ہی جیسا تھا۔ اُسے بھی فیشن کرنے اور ماڈرن بننے کا بہت شوق تھا۔ مگر اس کی غریبی اس کی راہ میں دیوار بنی ہوئی تھی۔ وہ بہت اونچے خواب دیکھا کرتی تھی ایسے جن کی تعبیر ناممکن لگتی تھی۔ ہم دونوں ان امیر لڑکیوں سے دُور ہی رہنے لگیں۔ جو ہمیں انسان ہی نہ سمجھتی تھیں۔

شینا نے بتایا تھا کہ اس کے باپ کی کوشش ہے کہ اس کی تبدیلی کراچی ہوجائے کیونکہ کراچی میں ان کے کافی رشتے دار رہتے ہیں۔ جب بھی اس کے باپ کی تبدیلی ہوگئی تو وہ لوگ کراچی شفٹ ہوجائیں گے۔ مگر یہ ذرا مشکل کام ہے کیونکہ گورنمنٹ کے قوانین کے تحت ایک اسٹیشن پر تین سال گزارنے لازمی ہوتے ہیں، اس کے بعد ہی دوسرے اسٹیشن پر تبدیلی ہوتی ہے۔

ہم دونوں ہی ٹی وی ڈرامے دیکھنے کی شوقین تھیں۔ کالج میں فارغ وقت میں ہم ڈراموں اور اداکاروں کی ہی باتیں کرتی تھیں۔ ہم دونوں کو ہی شوبز میں آنے کا شوق تھا بلکہ ایک جنون تھا۔ اس جنون نے ہماری توجہ پڑھائی سے چھین لی تھی۔ شینا غریب تھی۔ مگر حسن اور رعنائی میں وہ اپنی مثال آپ تھی۔ وہ خوبصورتی کا ایک مکمل شاہکار تھی۔ اس کی

موٹی موٹی روشن آنکھوں میں ایک جادو تھا۔ مسکراتی ہوئی خمیدہ پلکیں، گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح نازک ہونٹ سیاہ بادلوں کی اوٹ میں اس کا نکھرا نکھرا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح دمکا کرتا تھا۔ اس کا معصوم چہرہ، اکہرا بدن وہ ہر لحاظ سے حسین تھی۔ مگر وہ غریب تھی۔ مگر وہ اپنی غربت کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ اسے منزل ملنے کا یقین تھا۔

☆......☆......☆

ماہا اور زویا بھی ہماری طرح ایک دوسرے کی دوست تھیں۔ ان دونوں کا تعلق امیر خاندانوں میں سے تھا۔ وہ گاڑی پر کالج آتی اور جاتی تھیں۔ ہم نے اکثر کالج بکس کے ساتھ اُن کے ہاتھوں میں مہنگے قسم کے فیشن میگزین بھی دیکھے تھے۔ لگتا تھا اُن کو پڑھنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے وہ نت نئے فیشن کر کے اپنی امارات کا رعب جمانے آتی تھیں۔ ہم جیسی لڑکیوں کو تو وہ نزدیک نہ آنے دیتیں۔ جیسے ہم کوئی اچھوت ہوں۔ میں ایسی باتوں کو شدت سے محسوس کرتی تھی۔ مگر شینا کو ان کی پروا نہ تھی۔

ایک دن انگلش کا پیریڈ ختم ہوا تو وہ دونوں جلدی میں کلاس روم سے باہر نکلیں۔ میں اور شینا آخری قطار میں تھیں۔ ہم تھوڑا آگے بڑھیں تو دیکھا کہ ماہا اور زویا فیشن میگزین کا تازہ شمارہ ڈیسک پر ہی بھول گئی تھیں۔ شینا نے بڑھ کر میگزین اٹھالیا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔ اتنی دیر میں وہ دونوں واپس کمرے میں آگئیں۔ انہوں نے شینا کے ہاتھوں سے میگزین چھینا اور غصہ سے بولیں۔

''شینا صاحبہ! یہ تمہارے کام کا نہیں ہے۔ اس کی قیمت اتنی ہے کہ تم اس کو خرید بھی نہیں سکتیں۔ بندہ اپنی اوقات میں رہے تو بہتر ہے۔'' شینا کا چہرہ غصے اور دکھ درد کی کیفیت سے سرخ ہوگیا اور وہ بولی۔

''میری اوقات کیا ہے۔ یہ تمہیں تب پتا چلے گی جب ایک دن اسی میگزین کے سرورق پر میری تصویر چھپے گی۔'' بات آئی گئی ہوگئی تھی۔

☆......☆......☆

بی اے کا امتحان ہوا تو ان ہی دنوں شینا کے باپ کی تبدیلی کراچی ہوگئی۔ اور وہ مجھ سے مل کر کراچی چلی گئی۔ چند ماہ تو ہمارا ایک دوسرے سے رابطہ رہا اور پھر آہستہ آہستہ رابطہ کم ہوتا گیا۔ میں بھی ایف اے کا امتحان پاس کر کے گھر بیٹھ گئی۔ امی ابو کی خواہش تھی کہ میں مزید تعلیم حاصل کروں۔ مگر مجھ پر تو ماڈل بننے کا جنون سوار تھا۔ اس لیے میں نے مزید پڑھائی سے انکار کردیا۔

میری ایک سہیلی آسیہ مجھے فلمی اور فیشن میگزین لا دیتی تھی۔ بس ان کو پڑھ کر میں دن گزار لیتی تھی۔ آسیہ کا ایک کزن کسی اشتہاری کمپنی میں کام کرتا تھا۔ اس نے کئی لڑکیوں کو ماڈل بنوایا تھا۔ لہٰذا میں آسیہ سے کہتی رہتی تھی کہ وہ اپنے کزن سے کہہ کر مجھے بھی ماڈل بنوا دے۔ اس نے یقین دلایا تھا کہ وہ اس سلسلے میں میری مدد کرے گی۔ یوں مجھ پر ماڈلنگ کا بھوت سوار ہوگیا تھا۔

میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار امی سے کردیا تھا کہ میں ماڈلنگ کرنا چاہتی ہوں۔ میری دوست آسیہ نے میری اس سلسلے میں مدد کرنی ہے۔ کیونکہ وہ کہتی ہے کہ میں بہت ہی پیاری ہوں...... بلند قامت، گوری رنگت، بڑی بڑی آنکھیں، نازک اندام اور اٹھارہ بیس سال کی عمر...... بس ماڈلنگ کے لیے یہی کچھ تو چاہیے ہوتا ہے۔ سب کچھ میرے پاس۔ پہلے تو میں نے انکار کیا تھا مگر جب آسیہ نے میری خوبصورتی کی تعریفیں کیں اور کہا کہ تم بہت خوبصورت اور باصلاحیت ہو۔ تمہیں ماڈلنگ ضرور کرنی چاہیے۔ تو میں بھی بہک گئی۔ اور ایک روز اس کے بلانے پر اس کے کزن سے ملنے اس کے گھر چلی گئی۔ میری اس کے کزن ندیم سے ملاقات اچھے انداز میں ہوئی۔ اس نے مجھے دیکھا تو کہنے لگا۔

''میں تمہیں ضرور چانس دلواؤں گا۔ تم جتنے حسین خدوخال کی مالک ہو۔ تمہارے چہرے کا نکھار آنکھوں کی جگمگاہٹ اور ہونٹوں کی مسکراہٹ اور تمہارا دلکش سراپا...... تم راتوں رات چھا جاؤ گی۔''

ندیم کی باتیں سن کر تو میں ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔ میں نے گھر آکر امی سے بات کی اور ان کی

منت سماجت کرنے لگی کہ وہ مجھے ماڈلنگ کی اجازت دے دیں......لیکن ان کا ایک ہی جواب تھا۔

''یہ نہیں ہوسکتا۔''

''کیوں امی! ہزاروں لڑکیاں اس شعبے میں آچکی ہیں۔ میں تعلیم حاصل کرچکی ہوں اور ماڈلنگ کو میں ایک پیشے کے طور پر اپنانا چاہتی ہوں۔'' میں نے التجائیہ لہجے میں کہا۔

''جہاں اپنی مذہبی روایات پر آنچ آئے۔ ان کی اقدار کا سودا کیا جائے۔ وہ پیشہ اپنانا گناہ ہے۔'' امی نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''امی! مجھ میں ماڈل بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔ میں ان کو کیسے زنگ آلود کردوں۔'' میں نے کہا۔

''واہ! بڑی آئی صلاحیتیں دکھانے......اس سے تو بہتر ہے تم سائرہ کی طرح حافظہ بن جاؤ۔ کیا ٹی وی میں اور چوراہوں پر بڑی بڑی تصویریں آویزاں کروا کر ہی اپنی صلاحیتوں کا اظہار ہوسکتا ہے؟'' امی نے مجھے لاجواب کرتے ہوئے کہا۔

''میں تو ایک میگزین کے لیے کپڑوں کی نمائش کروں گی اور بس۔'' لیکن امی جان نہ مانیں۔

اسی شام ندیم کا فون آگیا کہ ایک ڈیزائنر تم سے ملنا چاہتا ہے۔ ''میں نے مایوسی کے عالم میں کہا۔

''امی نہیں مان رہی ہیں...... میں کوشش کررہی ہوں کہ ان کو منالوں۔ تم ڈیزائنر کو منع نہ کرنا۔''

☆......☆......☆

میں نے سائرہ باجی سے بھی امی کو کہلوایا مگر وہ نہیں مان رہی تھیں۔ انہوں نے تو اب میری شادی کے بارے میں سوچنا شروع کردیا تھا اور وہ اس مسئلے میں سنجیدہ دکھائی دیتی تھیں۔ کچھ عورتیں مجھے دیکھنے کے لیے ہمارے گھر بھی آچکی تھیں۔ مگر میں نے عہد کرلیا تھا کہ میں فی الحال شادی نہیں کروں گی۔ میں عجیب اُلجھن اور کشمکش میں مبتلا تھی۔ آسیہ بھی میرے گھر آکر میری امی کو منانے کی کوشش کرچکی تھی۔ مگر امی نے اس کو بھی جھڑک دیا تھا۔

ایک روز میں باجی کے ہمراہ بازار گئی ہوئی تھی۔ اس دوران میں نے ایک بک اسٹال سے کوئی فلمی میگزین خریدنا تھا کہ میری نظر اس فیشن میگزین پر پڑگئی جس کے سرورق پر شینا کی تصویر تھی۔ میں وہ میگزین خرید کر گھر لے آئی۔ شینا کی دل موہ دینے والی خوبصورت تصویریں دیکھ کر مجھے اس کی قسمت پر رشک آیا اور اپنی تقدیر پر رونا......

میں نے اس میگزین کے ٹیلی فون نمبر پر کال کرکے شینا کا ٹیلی فون نمبر مانگا۔ مگر ان لوگوں نے اس کا نمبر نہ دیا۔ تو میں مایوس ہوگئی۔ مگر میں نے دل میں عہد کرلیا کہ اب خواہ کچھ بھی ہوجائے۔ میں ماڈل بنوں گی اور کبھی میری تصویر بھی کسی فیشن میگزین کے سرورق پر چھپے گی۔ کیونکہ حسن اور رعنائی میں......میں بھی شینا سے کچھ کم تو نہ تھی۔ آسیہ میرے حسن کے قصیدے پڑھتی تو میں ہواؤں میں اڑنے لگتی۔

میں نے جب آسیہ کو شینا کے بارے میں بتایا کہ وہ مفلس لڑکی بھی ماڈل بن گئی ہے اور اس کی تصویر ایک میگزین کے سرورق پر شائع ہوئی ہے تو وہ بولی۔

''تو کیا ہوا...... تمہاری تصویر ایک نہیں دس میگزینوں کے سرورق پر شائع ہوں گی۔ اور ہاں وہ ندیم روزانہ ہی پوچھ رہا ہے کہ تم کب آؤ گی؟''

''امی کو کیسے مناؤں؟'' میں نے اُداسی بھرے لہجے میں کہا۔

''ہاں ہاں......مگر منانا کوئی مشکل کام ہے۔ ماؤں کو منانے کے سو طریقے ہوتے ہیں...... آسیہ مجھے کچھ کرگزرنے پر اکساتے ہوئے بولی۔

''تم مجھے کل تک بتا دینا...... میں نے ندیم کو روکا ہوا ہے ورنہ ایک اور لڑکی بہت بے چین ہے ماڈلنگ کرنے کے لیے۔''

☆......☆......☆

کئی دن گزر گئے۔ امی کو مناتے مناتے میں تنگ آگئی۔ ایک روز میں ان سے ناراض ہوکر بیٹھ گئی۔ میں نے صبح کا ناشتا بھی نہ کیا اور نہ ہی دوپہر کا کھانا کھایا۔ امی نے مجھے روٹھے دیکھا تو بولیں۔

''میری جان! تم میری سب سے قیمتی شے ہو۔ مجھے جان سے بڑھ کر عزیز ہو۔ میں کیسے اپنی متاع

عزیز کو یوں نمائش کے لیے رکھ دوں؟''
''امی جان! ویسے تو آپ بڑی روشن خیال بنتی ہیں کہ آپ نے اپنے بچوں پر کبھی پابندی نہیں لگائی مگر اب؟ میں ہی ہوں۔ جو آپ کی ہر بات مان لیتی ہوں۔'' میں نے گستاخی بھرے انداز میں کہا۔
''سعدیہ۔'' امی غصہ سے بولیں۔
''روشن خیالی کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم اپنے آپ کو عیاں کر کے جو مرضی میں آئے کرتی پھرو...... نہ جانے آسیہ نے تمہیں کون سے سبز باغ دکھا دیے ہیں کہ تمہیں اچھے برے کی تمیز ہی نہیں رہی۔ چلو اٹھو کھانا کھالو...... یہ بعد کی باتیں ہیں۔''
''مجھے بھوک نہیں ہے۔ میں اس وقت تک کھانا نہیں کھاؤں گی جب تک آپ مجھے ماڈلنگ کی اجازت نہ دے دیں۔'' میں نے ناراضگی بھرے لہجے میں کہا۔
''نہ کھاؤ مگر وہ ہرگز نہیں ہوگا جو تم چاہ رہی ہو۔'' امی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور میرے کمرے سے نکل گئیں۔ مگر دو گھنٹے بعد وہ پھر آ گئیں اور مجھے کھانا کھانے پر راضی کرنے لگیں۔ وہ مجھے جتنا مناتیں میں اتنی ہی سر چڑھتی گئی...... میں نے رات کا کھانا بھی نہ کھایا اور اپنے کمرے میں بیٹھی رہی۔
میں نے وقت گزارنے کے لیے ٹی وی آن کیا اور ڈرامہ دیکھنے لگی۔ جب وقفہ ہوا اور کمرشل شروع ہوئے۔ تو ایک موبائل کے کمرشل میں میں نے شینا کو دیکھا تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ اس کے حسن نے اسے کامیابی کے اگلے زینے پر چڑھا دیا تھا۔ اور پھر ٹی وی پر بھی اس کا کمرشل چلنے لگا۔ تو میرے شوق کی آتش اور بھی بھڑک اٹھی۔ اس کمرشل میں شینا کا حسن دوبالا ہو گیا تھا۔ اور وہ دلوں پر قیامت ڈھاتی نظر آ رہی تھی۔ اس ڈرامے کے وقفوں میں وہ کمرشل چھ بار دکھایا گیا تھا۔
میں نے تمام رات جاگ کر، احساسِ کمتری کی آگ میں جل کر گزار دی۔ اپنے حسنِ لازوال کے جلوے بکھیرتی شینا میرے حواس پر سوار ہوگئی۔
اس کمرشل نے شینا پر مزید کامیابیوں کے

## ڈینگیں

ایک آدمی کو اپنی خاندانی وجاہت پر بڑا ناز تھا، اور اکثر ڈینگیں مارتا رہتا تھا۔
ایک دن اُس نے ایک آدمی سے پوچھا'' جانتے ہو، میرا باپ کون تھا؟''
جواب ملا:'' جی نہیں! ویسے، آپ پہلے آدمی ہیں، جنھیں اپنے باپ کے متعلق بھی کچھ معلوم نہیں، اور لوگوں سے پوچھتے پھر رہے ہیں۔''
مرسلہ: ریاض حسین تبسم چوہان۔ فیصل آباد

دروازے کھول دیے۔ اس کو دو ڈراموں میں مرکزی کردار میں کاسٹ کر لیا گیا۔ اور میری آتشِ شوق بھڑکتی ہی گئی۔

☆......☆......☆

میں نے اِدھر اُدھر فون کر کے بالآخر شینا کا ٹیلی فون نمبر حاصل کر ہی لیا تھا۔ یہ شینا کی محبت اور اعلیٰ ظرفی تھی کہ اس نے مجھے یاد رکھا اور پہچان لیا۔ میں نے اسے ترقی اور کامیابی پر مبارک دی اور اس سے التجا کی کہ وہ مجھے بھی ماڈل بنوا دے۔ اس نے وعدہ کیا اور لاہور کے ایک پروڈیوسر کا پتا بھی دیا کہ میں اس سے مل لوں۔ وہ اسے فون بھی کر دے گی۔ وہ آڈیشن لے کر تمہیں منتخب کر لے گا۔''
میں بہت ہی خوش ہوگئی کہ اب منزل نزدیک آ گئی ہے۔ میں نے شینا سے پوچھا کہ وہ کیسے اتنی بڑی اور مشہور ماڈل بن گئی ہے؟''
جواب میں اس نے اتنا کہا۔ ''کبھی ملاقات ہوگی تو بتاؤں گی کہ میں نے کیسے اپنی منزل پائی ہے۔ تم بھی اس مقام تک پہنچ سکتی ہو...... مگر......!''
''مگر...... کیا؟'' ...... شینا......!'' میں نے استفسار کیا۔
''اس کا مطلب بھی ملاقات پر ہی بتاؤں گی۔'' شینا کا لہجہ میں نہ جان پائی تھی۔
میں نے شینا کے دیے ہوئے ٹیلی فون نمبر پر شینا

کے حوالے سے بات کی تو اس نے کہا کہ وہ خود مجھے فون کر کے بلالے گا۔ کیونکہ کل وہ ایک کمرشل کی شوٹنگ کے سلسلے میں سنگاپور جارہا ہے۔ وہ واپس آ کر مجھے کال کر کے بلالے گا۔ میں اس کی بات چیت کے انداز سے میں مطمئن ہوگئی تھی۔

☆......☆......☆

مگراب مسئلہ یہ تھا کہ جب وہ مجھے لاہور بلائے گا۔ تو میں کیسے جاؤں گی۔ اُدھر میں دن رات امی سے یہی بات کرتی تھی کہ وہ مجھے ماڈلنگ کی اجازت دے دیں۔ ''ایک روز وہ کہنے لگیں۔

''اگر تم باز نہ آئیں تو میں تمہارے باپ کو بتادوں گی۔ وہ خود تمہیں ٹھیک کرلیں گے۔ کیونکہ میں نے ابھی تک انہیں کچھ بھی نہیں بتایا ہے۔''

''مگر میرا فیصلہ بھی اٹل تھا کہ میں ماڈل بن کر ہی رہوں گی۔''

ایک روز تنگ آ کر امی کہنے لگیں۔ ''تمہارے ابو کو محلہ اور دفتر میں ہر جگہ عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ لگتا ہے تم ہمیں شریف لوگوں کی فہرست سے نکلوا کردم لوگی۔ تمہارا نمازی اور پرہیزگار باپ یہ کیسے برداشت کرے گا کہ اس کی بیٹی ماڈلنگ کرے اور اس کی عریاں تصویریں چوراہوں میں آویزاں ہوں۔''

''امی! یہ آپ کی انیسویں صدی کی دقیانوسی سوچ ہے۔ یوں بھی یہ زمانہ سات پردوں میں چھپ کر رہنے کا نہیں ہے۔''

میری اس بات کا امی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ان کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔

☆......☆......☆

عمروں کے اس جذباتی اور لاابالی دور میں کبھی کبھی دوستی خون کے رشتوں پر حاوی ہوجاتی ہے۔ میں بھی ان دنوں ایسے ہی حالات سے دوچار تھی۔ شینا اور آسیہ مجھے ماں باپ سے زیادہ عزیز لگ رہی تھیں۔ میری راتیں ایسے ہی جیسے تیسے گزر رہی تھیں۔ میں سوتی جاگتی رہتی۔ جب بھی آنکھ لگتی۔ میں خوابوں کی حسین دنیا میں پہنچ جاتی اور خود کو ایک مشہور ماڈل کے روپ میں دیکھنے لگتی۔

میں نے لاہور جانے کا آسیہ کو بتا کر اعتماد میں لیا کہ جب بھی لاہور سے مجھے بلاوا آئے گا۔ تو وہ میری مدد کرے گی اور میرے ساتھ چلے گی۔ آسیہ نے مجھے اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا تھا۔ اب میں لاہور سے آنے والی کال کی منتظر رہنے لگی۔ میری بے تابی اور بے چینی دن بدن بڑھتی جارہی تھی۔ میں نے شینا کو فون کردیا اور پوچھا کہ وہ پروڈیوسر کب سنگاپور سے واپس آئے گا۔

شینا نے بتایا کہ وہ کل واپس آرہا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ میں بھی کل لاہور آرہی ہوں۔ میرا ایک کمرشل لاہور میں شوٹ ہونا ہے تم میرے پاس آجانا میں خود تمہیں اس سے ملواؤں گی۔''

میری خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ میں ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔ مگر امی سے میں کیسے اجازت لوں گی۔ ان کو کیا بتاؤں گی کہ میں لاہور کیوں جارہی ہوں۔''

میں نے آسیہ سے بات کی تو اس نے میرے گھر آ کر میرا مسئلہ حل کردیا۔ اس نے میری امی کو بتایا کہ ہم دونوں کی ایک مشترکہ دوست کی شادی ہے۔ اُس کی بارات لاہور سے آئی ہے۔ اس کی ضد ہے کہ ہم بارات کی واپسی پر اس کے ہمراہ چلیں۔ اگلے دن ہم اس کے گھر والوں کے ہمراہ لوٹ آئیں گی۔ نہ جانے امی نے کیسے آسیہ کی باتوں کا یقین کرلیا اور ہمیں شادی میں جانے کی اجازت دے دی۔

اگلے ہی دن شینا کا فون آگیا وہ جس ہوٹل میں ٹھہری تھی۔ اس کا ایڈریس مجھے لکھوادیا اور جلد آنے کی تاکید کی۔ آسیہ کو سب بات معلوم تھی۔ گاڑی کی سیٹیں اس نے ریزرو کرائی تھیں۔ وہ پروگرام کے مطابق مجھے لینے آگئی۔ میں بھی تیار بیٹھی تھی۔ میں نے امی سے کہا کہ میں آسیہ کے ساتھ جارہی ہوں۔ واپسی پر یہ مجھے چھوڑ جائے گی۔ آپ کسی قسم کا فکر نہ کرنا۔''

امی نے آگے بڑھ کر مجھے یوں گلے سے لگایا جیسے کوئی مجھے ان سے چھین رہا ہو۔ کہنے لگیں۔

''بیٹی! جب کوئی چیز اپنی حد سے آگے نکل جائے تو اس کا اثر منفی ہو جاتا ہے۔ جہاں تم جا رہی ہو وہاں عورت کی عزت کی کوئی قدر نہیں ہوتی بلکہ تکریم کے پردے میں توہین ہوتی ہے۔ جب تمہیں یہ احساس ہونے لگے کہ تمہاری توہین ہو رہی ہے تو لوٹ آنا۔ گھر کے دروازے تمہیں کھلے ملیں گے۔''

میں جان گئی کہ امی کو یقیناً پتا چل گیا ہے کہ میں کہاں جا رہی ہوں۔ مگر میں نے ان کی پروا نہ کی اور آسیہ کے ہمراہ ریلوے اسٹیشن آ گئی۔ آسیہ نے مجھے ڈبے کے اندر لے جا کر میری سیٹ پر بٹھایا اور کہنے لگی۔

''دوست! میں تمہارے ساتھ نہ جا سکوں گی۔ میری کچھ مجبوری ہے۔''

''آسیہ! یہ کیا بات ہوئی۔ میں اکیلے سفر کروں گی؟'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''پریشان کیوں ہوتی ہو۔ دو گھنٹے کا تو سفر ہے۔ تم شینا کو فون کر دینا کہ وہ تمہیں اسٹیشن سے لے لے۔''

یہ کہہ کر آسیہ گاڑی سے اُتری اور بھیڑ میں گم ہوگئی۔ میرا جی چاہا کہ میں بھی اُتر جاؤں۔ مگر ماڈل بننے کے شوق نے مجھے روک دیا۔ میں نے اپنے آپ کو تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ اتنے میں گاڑی رینگنے لگی۔ تو میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ دل میں ایک خوف سا محسوس ہو رہا تھا کیونکہ میں لاہور پہلی بار جا رہی تھی۔

میں نے شینا کو فون کیا اور اسے کہا کہ مجھے اسٹیشن سے لینے آ جانا۔ اس نے میری پریشانی کا اندازہ لگا لیا اور کہنے لگی کہ تم اسٹیشن پر پہنچ کر فون کرنا میں آ جاؤں گی۔ اور تمہیں ساتھ لے جاؤں گی۔''

☆......☆......☆

خدا خدا کر کے سفر تمام ہوا۔ شینا مجھے لینے آ گئی تھی۔ وہ مجھے گلے لگا کر ملی۔ جب میں اس کے ساتھ ایئر کنڈیشنڈ گاڑی میں بیٹھی تو مجھے اس پر رشک آنے لگا۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی جبکہ میں اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ اس مقام تک کیسے پہنچی تو اس نے مجھے ٹال دیا اور کہنے لگی۔ اب تم آ گئی ہو تو خود ہی سمجھ جاؤ گی۔

اس کا قیام ایک معیاری ہوٹل میں تھا۔ ہوٹل میں ہی اس نے میری ملاقات ڈیزائنرز اور پروڈیوسر سے کرائی معاہدہ بھی کروا دیا۔ ان لوگوں نے میری خوبصورتی کو جانچا اور پرکھا اور کہنے لگے۔

''تم ہمارے معیار پر پوری اُتری ہو کل تمہارا فوٹو سیشن ہوگا۔ اس کے بعد ہی فیصلہ ہوگا کہ تم ماڈلنگ کر سکو گی یا نہیں۔''

اس کا فیصلہ سن کر میں خوش ہوگئی۔ شینا نے بھی خوشی کا اظہار کیا اور مبارک باد بھی دی۔ اگلے دن شینا کی کراچی کے لیے واپسی تھی کیونکہ اس کے کمرشل کا باقی حصہ کراچی میں شوٹ ہونا تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ شینا اتنی جلدی واپس جائے۔ یوں میں اکیلی رہ جاؤں گی۔ مگر اس کی مجبوری تھی کہ اسے جانا تھا اس نے مجھے تسلی دی اور کہنے لگی۔

''میں نے دو دن کا ہوٹل کا کرایہ دے دیا ہے۔ تم دو دن یہاں رہ سکتی ہو۔ اس کے بعد پروڈیوسر تمہیں گھر بھجوا دے گا۔'' شینا میرا حوصلہ بڑھا کر چلی گئی۔

☆......☆......☆

اگلے دن میں تصویریں بنوانے گئی تو پہلے مجھے مشق کرائی گئی کہ دوپٹا کیسے اوڑھنا ہے۔ کیسے آستین کی نمائش کرنی ہے اور گلے کے نمونے کیسے دکھانے ہیں۔ مجھے ایسے زاویے سے بٹھا کر تصویریں بنائی گئیں کہ کپڑوں کی نمائش کم اور میرے جسم خاص کر سینے کی نمائش زیادہ ہو رہی تھی۔ میں ذرا سی گھبرائی اور پھر ان کی ہدایات پر عمل کرنے لگی۔ پھر مجھے تیار کرنے کے لیے ایک دوسرے کمرے میں لے جایا گیا۔ ایک نوجوان لڑکا میرا اسنگھار کرنے لگا۔ اور دوسرے مختلف قسم کے سوٹ لے آیا جن کو پہن کر میں نے ان کی نمائش کرنی تھی۔ میں نے سوٹ دیکھے تو حیران ہوگئی۔ ان میں کوئی نہایت ہی باریک تھا کوئی نہایت ہی مختصر اور کوئی بہت تنگ اور چست......

''میں یہ کپڑے پہن کر ماڈلنگ کروں گی۔'' میں نے سوچا۔ اور پھر دل نے ہاں کہہ دی کہ ماڈل بننے

کے لیے ایسے کپڑے تو پہننے پڑتے ہیں۔ شینا بھی تو ایسے ہی کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ میں اگر اس جیسی بننا چاہتی ہوں تو پھر یہ سب کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ ایسے کپڑے تو یہاں ہی پہننے ہوں گے۔ گھر میں تو اپنی مرضی کے پہنوں گی۔ جب مجھے کمرشل کی پوری رقم مل جائے گی تو پھر دوسرے کا معاہدہ بھی کرتی جاؤں گی دولت کے آگے تو ہر چیز ہیچ نظر آتی ہے۔ میں نے وہ کپڑے پہن لیے تو ان میں میرے جسم کا انگ انگ نمایاں نظر آنے لگا۔ پروڈیوسر نے مجھے دیکھا اور سنگھار والے کو بلایا کہ میرے لبوں پر گہرے رنگ کی سرخی لگائی جائے۔ لہٰذا اس نے ایسا ہی کیا۔ لڑکا چلا گیا۔ اب کمرے میں، میں اور پروڈیوسر رہ گئے۔ وہ میرا میک اپ چیک کرنے کے لیے میرے قریب آ گیا اور میرے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنا چہرہ میرے چہرے کے نزدیک کر لیا کہ اس کی بدبودار سانس میرے نتھنوں میں سما گئی۔ میں جان گئی کہ وہ میرا بوسہ لینا چاہتا ہے۔ پھر اس کے بعد وہ جانے میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ اس وقت مجھے شینا کا 'مکر' سمجھ آ گیا اور یہ بھی کہ ماڈل بننے کے لیے اپنی عزت کا سودا بھی کرنا پڑتا ہے۔

مجھے احساس ہو گیا کہ میں ضد میں آ کر غلط راستہ اپنا بیٹھی ہوں...... غصے سے میرا خون کھولنے لگا۔ میں نے اس کو پرے ہٹایا اور اس کے منہ پر تھوک دیا۔

''ذلیل اور کمینی۔'' وہ اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے بولا۔

''تم کیا سمجھتی ہوں۔ اتنی آسانی سے ماڈل بن جاؤ گی۔ نہیں ایسا کبھی ہوا ہے اور نہ ہو گا۔''

میں اٹھی اور بھاگ کر دوسرے کمرے میں گئی۔ وہ کپڑے اتارے اور اپنے کپڑے پہنے۔ ایڈوانس کا چیک اس کے منہ پر مارا اور وہاں سے بھاگ نکلی۔ میں گھر پہنچی تو وہاں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ امی کا رو رو کر برا حال تھا۔ میں بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں گئی اور بستر پر اوندھے منہ لیٹ کر سسکنے لگی۔ کافی دیر بعد امی میرے کمرے میں آئیں اور انہوں نے مجھے کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور مجھے سیدھا کر کے پوچھا۔

''بتاؤ...... کہاں گئی تھی تم؟ اور اب رو کیوں رہی ہو؟''

''امی میں بہت بری ہوں۔'' میں نے روتے روتے کہا۔

''کوئی انسان برا نہیں ہوتا۔ ہاں برے راستوں پر چلنے والے برے ہوتے ہیں۔ اگر تم بھی ان راستوں پر چلنے لگی ہو تو پھر اس گھر میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ باپ کے آنے سے قبل اس گھر سے نکل جاؤ ورنہ قیامت آ جائے گی۔'' امی میری بات کاٹ کر بولیں۔

''اور امی جو بھٹک جائے اور پھر راہ راست پر آ جائے؟'' میں نے امی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''اگر وہ شبنم کی طرح پاک اور شفاف ہو تو اسے صاف کر دیا جاتا ہے۔'' امی نے نرم لہجے میں کہا۔ امی کا نرم لہجہ دیکھ کر میں اٹھی اور امی کے قدموں میں بیٹھ گئی اور پھر ان کو چومنے لگی۔ انہوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور میرے ماتھے پر بوسہ دیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ان کی آنکھیں بھیگ گئی ہیں۔ میری آنکھیں بھی برسنے لگیں۔ میں نے ان کے گھٹنوں پر سر رکھ دیا اور بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔

''امی! سیپ سے موتی نکل جائے تو وہ کوڑی کی بھی نہیں رہتی۔ عورت کا موتی تو اس کی حیا ہوتی ہے۔ میں نے اپنے اس موتی کو کھونے نہیں دیا۔ نیلام نہیں ہونے دیا۔ میں نے اپنی قدر نہیں کوئی۔ میں بھٹک گئی تھی۔ مگر میں مریم کی طرح پاک ہوں امی! آپ میری بیوقوفی اور نادانی کو خواب سمجھ کر بھلا دیں۔'' امی نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرے اور آنسوؤں بھری آواز میں بولیں۔

''ہاں بیٹی! صبح کا بھولا شام کو لوٹ آئے تو اس کو اپنے دامن میں اپنی بانہوں میں بھر لینا چاہیے۔''

یہ کہہ کر امی نے مجھے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ اور ہم دونوں ماں بیٹی سسکنے لگیں۔ آنسوؤں نے سارا غبار دھو ڈالا۔ اور مطلع صاف ہو گیا۔

☆☆......☆☆

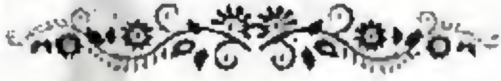
# سوگِ زندگی



مجید احمد جائی

حجلۂ عروسی میں بیٹے اور بہو کو قتل کر دینے والی ماں کا دلخراش واقعہ، ملتان سے





بہار کی رت ہر طرف اپنے پر پھیلائے نکھری تھی۔ پھولوں کی مہکار، بھینی بھینی خوشبو دل کو لبھا رہی تھی۔ ٹنڈ منڈ درختوں پر جوانی چلی آئی تھی۔ بدلتے موسم میں جہاں طرف رونق ہی رونق چھا

جاتی ہے۔ وہاں اشرف المخلوقات میں بھی تبدیلیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ عاشقانہ موسم میں شادیاں کی جاتی ہیں۔ نئے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ پریمی بندھن میں بندھ جاتے ہیں۔ اُمیدیں برآتی ہیں۔ عاشقوں کی منتیں پوری ہوتی ہیں۔ الہڑ مٹیاروں کے سپنے پورے ہوتے ہیں۔

☆......☆......☆

میرے ہمسائیوں کے ہاں شادی تھی، دن بھر کے ہنگاموں سے فراغت پا کر ڈھلتی رات میں، میں اپنے کمرے میں سونے چلا آیا تھا۔ ہمسائیوں کی شادی میں مجھے میزبانی کے فرائض سونپ دیے گئے تھے۔ آخر ہمسائے بھی والدین جیسے ہوتے ہیں۔ رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ شادی والا گھر برقی بتیوں سے جگمگا رہا تھا۔ رنگ برنگے لباس میں عورتیں اپنے اپنے بچوں کو محفوظ کرتی نظر آئیں۔ چڑھتی جوانی کے نشے میں دوشیزائیں دوپٹے گردن میں لٹکائے، میک اپ سے گال چمکائے۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک کی پالش کیے، لہراتی کالی گھنی سیاہ زلفیں، اٹھرا اٹھرا کر تیتلیوں کی طرح ادھر اُدھیرا رتی، گھومتی پھرتی تھیں۔

نرم و ملائم بستر پر پڑتے ہی دن بھر کے سارے منظر ایک ایک کر کے میری آنکھوں کی اسکرین پر فلم کی طرح چل رہے تھے۔ سجی سنواری مرسڈیز سے دلہن شرماتی ہوئی۔ لہنگا سنبھالتے ہوئے خراماں خراماں باہر کو نکل رہی تھی۔ سبھی باراتیوں کی نظریں دلہن پر مرکوز تھیں۔ دُلہن کی سہیلی، دُلہن کا لال موتیوں سے سجا، لہنگا سنبھالنے میں مدد کر رہی تھی۔ دُلہا بھی شیروانی زیب تن کیے، ملتانی کھسہ پیروں میں پہنے، لبوں پر مسکراہٹ سجائے، دُلہن کے ساتھ چپکنے کے انداز میں کندھے سے کندھا ملانے کی سعی کر رہا تھا۔ دیکھنے والی ہر آنکھ خوشی کے لحات محفوظ کر رہی تھی۔ چاند نیلے آسمان پر کھڑا خاموش تماشائی بنا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ چپکے چپکے سلامی دے رہا تھا۔ نئے سفر کی شروعات کی جیسے مبارک باد دے رہا ہو۔ ستارے بھی پھولوں کے ہارے لیے آنکھیں مار رہے تھے۔ دلہن، دلہا مرسڈیز سے اترتے ہوئے خراماں خراماں چلتے ہوئے عروسی والے کمرے کے سامنے کھلے صحن میں بنے ہال میں اسٹیج پر آن بیٹھے۔ رشتے دار، دوست احباب سہیلیاں، وقفے وقفے سے آتے جاتے تحفے، سلامیاں، ہرے نیلے نوٹوں کے ساتھ مٹھائی کے ڈبے پیش کر رہے تھے۔ جوشیلے لڑکے ان لمحوں کو موبائل میں قید کر رہے تھے۔ لڑکیاں دلہن دلہا کے ساتھ تصویریں بنوا رہی تھیں۔ مووی میکر یہ لحات ہمیشہ کے لیے قید کر رہا تھا۔ دولہے کی کزنز شرارتیں کر رہی تھیں۔ ہنسی مذاق ہو رہا تھا۔ ہر چھوٹے بڑے لے لبوں پر مسکراہٹ ہی مسکراہٹ تھی۔ دل خوشی سے ناچ رہے تھے۔ بوڑھے بزرگوں کے لبوں پر نئے سفر شروع کرنے والے جوڑے کے لیے دعائیں ہی دعائیں تھیں۔

☆......☆......☆

رات ڈھلنے لگی تو دلہن، دولہے کو تمام رسومات کے بعد آزادی ملی اور وہ اٹھ کر حجلۂ عروسی میں چلے گئے۔ مہمان سونے کے لیے بستر لینے لگے، آوارہ لڑکے مورچے لگانے میں لگ گئے۔ قریبی رشتے دار، ہمسائے اپنے اپنے گھروں کی راہ لینے لگے۔

میں بھی اپنے گھر آ گیا۔ تھکن سے چور چور تھا۔ ہمسائے کی شادی تھی اور وہ میرا قریبی دوست بھی تھا۔ میزبانی کے فرائض بھی میرے حصے میں آئے تھے۔ سو چند گھنٹے ستانے کی غرض سے گھر چلا آیا تھا۔ بیڈ کی آغوش میں آتے ہی دن بھر کے تمام مناظر فلم کی طرح آنکھوں میں چل رہے تھے۔ میں انہی مناظر کی قید میں نیند کی وادی سیر کو نکل گیا۔ ویسے بھی صبح بہت کام ہونا تھا۔ نیند نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔ شادی کے ہنگامے۔ دھماکے، پردہ اسکرین پر کب تک چلے، خبر نہیں رہی۔ میں پُرسکون سو گیا تھا۔

☆......☆......☆

رونے، چلانے کی ملی جلی آوازوں سے میری آنکھ کھل گئی۔ سورج کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ سورج کی نظریں روح زمین پر لگی تھی، اس کی آنکھیں قہر برسا رہی تھی۔ میں ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ آنکھیں مسلتے ہوئے رونے، چیخنے چلانے کی

آواز کی طرف متوجہ ہوا۔ پہلے پہل تو سمجھا دوسرے کمرے میں بچے رو رہے ہیں۔ اکثر صبح سویرے میرے بچوں سے گھر کا صحن میدان جنگ بن جاتا تھا۔ ایک دوسرے سے کاپیاں کتابیں، چھینتے لڑتے جھگڑتے تھے۔

''ماما! دیکھو ناں، آنچل کی بچی پنسل نہیں دے رہی۔''

میری بیوی ایمان توے پر روٹی ڈالتے ہوئے ان کی طرف ظاہری جلاد اور من سے محبت کی نظر ڈالتی۔

بھلا اولاد کسی کو بُری لگتی ہے۔ ''آنچل بیٹے، کائنات کی پنسل دے دو۔ میں تمہیں پاپا سے پیسے لے دیتی ہوں، تم اسکول سے جا کر لے لینا۔''

میری بیوی جج بن کر ثالث کا کردار نبھاتی۔ یہ چھوٹے چھوٹے جھگڑے روز میرے آنگن میں ہوتے۔ کبھی میں جلاد بن جاتا اور ڈرا دھما کا کر بچوں کو اسکول وین کے حوالے کر دیتا۔

کہتے ہیں بچے تو دشمن کے بھی پیارے ہوتے ہیں۔ گھر میں بچوں کی قلقاریاں نہ ہوں تو گھر گلشن نہیں قبرستان لگتا ہے۔ بچوں کے بغیر زندگی کے رنگ ادھورے ہوتے ہیں۔ اگر میرے بچے نہ ہوتے تو میں کیسے خوش ہوتا۔

یہی خیال آتے ہی پاپا کا ٹھاٹھیں مارتا پیار و محبت کا سمندر امڈ آتا۔ آنچل کو کندھے پر بٹھاتا، کائنات کو بازوؤں کے حصار میں لیتا، ننھے حسیب کو دائیں ہاتھ سے پکڑتا اور میٹھی میٹھی باتیں کرتا، معصوموں کی ننھی ننھی خواہشیں سنتا، ان کو اسکول کی وین میں بیٹھا کر بائے بائے کرتا، واپس اپنے روم میں آ جاتا۔ جہاں میری بیوی ناشتا ٹیبل پر سجائے میرے انتظار میں نظریں بیرونی دروازے پہ مرکوز کیے ہوتی۔ یہ میری روز کی روٹین تھی، میرے چھوٹے سے آنگن میں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔

☆......☆......☆

میں بیڈ سے اترتے، چپل پاؤں میں پھنساتے مسلتے کمرے سے صحن کی طرف آیا۔ جہاں میرے خیال کے مطابق بچوں کی جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ لیکن یہ کیا؟ ہر طرف خاموشی کے پہرے ہیں۔ درودیوار خاموش ہیں۔ ہر چیز سلیقے سے رکھی ہوئی ہے اور پالتو میاں مٹھو بھی پروں میں چونچ چھپائے گم صم ہے۔ میری بیوی بچے کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔

''ایمان، ارے او ایمو......'' پیار سے میں اپنی بیوی کو ایمو ہی کہتا تھا۔ ایمان کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ کلائی پہ بندھی گھڑی پر نظر پڑی تو دن کے گیارہ بجنے کو تھے۔

اُف میرے خدایا! یہ کیا ہو گیا۔ میں حیرانی کے عالم میں گم صم سوچوں کی کشتی میں سوار تھا۔ بچے تو اسکول جا چکے ہوں گے مگر یہ ایمان کہاں گئی ہے؟ ابھی یہ سوچ میرے ذہن پر ابھری ہی تھی کہ اچانک رونے پیٹنے کی آوازیں میری سماعتوں سے ایک بار پھر ٹکرائی۔ کوئی عورت کہہ رہی تھی۔ ہائے میں مر گئی۔ میں لٹ گئی میرے لال کو کس کی نظر کھا گئی۔ میری خوشیوں کو کیا ہو گیا۔ کسی کی ماں بین کر رہی تھی۔ یہ تو آنٹی سلیمہ کی آواز ہے۔ میں نے آواز پہچانتے ہوئے ذہن پر زور دیا تھا۔ جلدی جلدی اپنا حلیہ درست کیا اور شادی والے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ یہ شور، چیخنا چلانا ساتھ والے گھر سے تھا۔ جہاں رات خوشیاں ناچتی رہی تھیں۔ رقص کا سماں تھا، تیتلیاں اڑتی پھرتی تھیں، جگنو چمکتے، چہکتے پھرتے تھے۔ رات کیا رخصت ہوئی صبح کے اُجالے میں سارے منظر بدل گئے۔ خوشیاں ماتم میں بدل گئی، مسکراتے چہرے حیرت، اداسی کا مجسمہ بنے ہوئے تھے۔ مسکراہٹیں اداسی کا لبادہ اوڑھ چکی تھیں۔ تیتلیاں، گھٹنوں پر سر ٹیکے آنسوؤں میں نہا رہی تھیں۔ ان کا میک اپ کب کا رخساروں کو چھوتا ہوا دامن گیلا کرتے، زمین بوس ہو گیا تھا۔ آنسوؤں سے آنکھیں تر بتر تھیں اور بچے سہمے ہوئے تھے، نوجوان آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے۔ بوڑھی عورتیں ایک دوسرے کے کانوں لگ رہی تھیں۔ ڈھول باجے والے مجسموں کے رُوپ دھار چکے تھے۔ ڈھول دور کونے

میں پڑے تھے، گھر کے در و دیوار اُداسی کی بُکل مارے کھڑے تھے۔ پرندے خاموش تھے، بنیرے پر کالے کوے گم صم ماحول کو بھانپ رہے تھے۔ تقدیر نے کیا عجیب کھیل کھیلا تھا۔ خوشیوں بھرا گھر ماتم میں بدل گیا تھا۔ مسکراہٹیں آنسوؤں میں بدل گئیں تھیں۔ جیسے ہر سوں کوئی زہریلا سانپ سونگھ گیا ہو۔ دلہے کی ماں سینہ کوبی کر رہی تھی۔ ہائے یہ کیا ہو گیا ۔میرے لال تجھے کیا ہو گیا۔۔ پل بھر میں خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے علاقے میں پھیل گئی۔ دلہن والے بھی آ چکے تھے۔ رشتے دار، دشمن، دوست احباب، جمع ہو چکے تھے۔ دلہے کی ماں کی حالت پاگلوں جیسی ہو گئی تھی۔ کبھی بالوں کو نوچتی کبھی سینہ پر ہاتھ مار کر بین کر رہی تھی۔ محلے کی عورتیں اسے سنبھال رہی تھیں۔

☆......☆......☆

مائیں تو مائیں ہوتیں ہیں۔ 9 ماہ بطن میں اٹھائے تکلیفیں سہتی رہتی ہیں۔ پھر جب بچے کو جنم دیتی ہیں تو زچگی کے دردناک لمحوں، اذیتوں سے گزرتی ہیں۔ جب نظر ننھی جان پر پڑتی ہیں تو ساری تکلیفیں بھول جاتی ہیں۔

☆......☆......☆

کہتے ہیں ماں انسان کی پہلی درسگاہ ہوتی ہے۔ ننھی انگلیاں پکڑ کر آنگن میں پاؤں پاؤں چلنا سکھاتی ہے۔ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی ہے۔ سالہ سال پال پوس کر گھبرو چٹان سا نوجوان بنا دیتی ہے۔ خوابوں کے تانے بانے بنتی رہتی ہے۔ اور جب ان خوابوں کو تعبیر ملنے والی ہوتی ہے اپنے لعل کے سر پر سہرا سجاتی ہے۔ تب اگر تقدیر کھیل کھیل کر بازی ہی الٹ دے تو مائیں بے موت مر جاتیں ہیں۔ اس ماں کا تصور کریں جس نے رات کو بیٹے کے سر پہ سہرا سجا دیکھا ہو اور صبح چڑھتے سورج کے ساتھ اُسے حجلۂ عروسی میں مردہ پایا تو موت سے پہلے مر نہیں جائے گی۔ قیامت سے پہلے قیامت نہیں ٹوٹ پڑے گی۔

یہاں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ نئی نویلی دلہن اور دُلہا ہنستے مسکراتے، پھولوں کی طرح مہکتے رات ڈھلتے حجلۂ عروسی میں گئے تھے اور پھر...... پھر صبح انہونی ہو گئی دن چڑھے جب وہ باہر نہ نکلے تو دروازہ توڑ کر ان کی خیریت جاننا چاہی۔ جب اندر گئے تو حیرت کا جھٹکا لگا دونوں بیڈ پر ایک دوسرے کو بانہوں میں لیے بے جان پڑے تھے۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا، ناگہانی موت...... انہونی ہی تو ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

شادی والا گھر تھا، برقی بتیاں اب بھی روشن تھیں مگر...... صف ماتم بچھ چکا تھا۔ عورتوں مردوں کا ہجوم امڈ پڑا تھا۔ جیسے پورے شہر کے لوگ اٹھ دوڑے ہوں۔ اتنے میں سائرن بجاتی پولیس وین دروازے پر آن رکی۔ کسی نے پولیس کو اطلاع کر دی تھی۔''

''پیچھے ہٹو،، ہٹو...... راستہ دو۔ پیچھے ہٹو، پیچھے ہٹو کی آوازیں میرے سماعتوں سے ٹکرائیں۔ کوئی سپاہی ہجوم میں راستہ بنوا رہا تھا۔ میں آنسوؤں میں ڈوب گیا تھا۔ مورتی بنا کمرے کی بیرونی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا گیا تھا۔

میرے حواس کھو سے گئے تھے۔ مجھے بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ رب رحمان نے کیسا نصیب بنایا تھا۔ ارمان پورے بھی نہ ہوئے اور اس دیس سے اُس دیس لوٹ گئے۔ ابھی نئی زندگی کی شروعات کی پہلی رات ہی تو تھی۔ دونوں پریمی نئے سفر کے شروعات کے پہلے دن ہی امر ہو گئے تھے۔ موت نے ان کو آن گھیرا تھا۔

اُف میرے خدایا۔ میرا ذہن ماؤف ہو گیا۔ میرا دماغ شل ہو گیا تھا۔ پولیس حجلۂ عروسی میں داخل ہو چکی تھی۔ پولیس ثبوت ڈھونڈ رہی تھی۔ نہ خون کا نام و نشان، نہ کوئی زخم، پُراسرار موت تھی۔ تصویریں کھنچی جا رہی تھیں۔ جس بیڈ پر دونوں کی موت ہوئی تھی۔ اس کی تلاشی لی گئی مگر کچھ برآمد نہ ہوا۔ آخر پولیس نے لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے ہسپتال بھیج دیا۔

ابتدائی کاروائی کا آغاز ہو چکا تھا۔ آخر ہوا کیا دونوں ایک ساتھ کیسے موت کے منہ میں چلے گئے۔ کیوں اور کیسے؟ ہر کوئی اس راز کو جاننا چاہتا

تھا۔اس پُراسرار موت کے پیچھے کون تھا؟

عزیز و اقارب دانتوں میں انگلیاں دبائے، آنکھوں کے سمندر میں غوطہ زن تھے۔ماں کی حالت تو غیر ہو چکی تھی۔لمحہ بھر کے لیے ہوش آتا تو بین شروع کر دیتی اور دوسرے لمحے پھر بے ہوش ہو جاتی۔آخر ماں تھی۔

بھائی ایک کونے کا ہو کر رہ گیا تھا۔چپ کی مہر لگ گئی تھی۔جیسے غم اس کے اندر ٹھاٹھیں مار رہا ہو، جیسے اچانک کسی لاوے کی طرح اُبل پڑے گا۔گم صم، چپ چاپ، لال آنکھوں سے پاگلوں کی طرح آتے جاتے لوگوں کو گھور رہا تھا۔

باپ زندہ لاش کی مانند تھا۔بے جان جسم لیے ماتم کناں تھا۔ہمسائے برادری والے نزدیک دور کے کبھی آنے والے ہمدردی جتا رہے تھے۔ہر کوئی افسوس کے دو بول، بول کے ایک طرف ہو جاتا۔اجڑے باپ کو خبر ہی نہیں تھی کون کیا کہہ رہا ہے۔

☆......☆......☆

پولیس ایمبولینس میں لاشوں کو کب کی لے جا چکی تھی۔ڈھلتے سورج کے ساتھ لاش واپس کر دی گئی۔ابتدائی رپورٹ میں بتایا گیا کہ دونوں کی موت کسی زہریلی چیز سے ہوئی ہے۔معاملہ تھانے میں تھا۔تھانے دار اس کیس کی کڑیاں ملانے میں مگن ہو گیا۔ادھر سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے دونوں کے جنازے اٹھائے گئے اور بدنصیب دلہن اور دولہے کو ساتھ ساتھ کچے مکانوں میں منوں مٹی تلے دفن کر دیا گیا۔پچھلی رات دونوں کے گردنوں میں پھولوں کی مالائیں لٹک رہی تھیں اور آج دونوں کی قبروں پر پھول پڑے تھے۔تازہ پھولوں کی مہکار سے پورا قبرستان خوشبو سے مہک اُٹھا تھا۔

دلہن اور دولہے کو زہر دے کر مارا گیا ہے۔ابتدائی رپورٹ نے حیرت کی فضا قائم کر دی۔زہر......

بیچارے باپ نے ایک دم سر اوپر اٹھایا۔

''زہر......مگر کس نے دیا؟ میرے بیٹے کی دشمنی تو کسی سے بھی نہیں تھی۔ہنس مکھ تھا، بااخلاق تھا۔پھر اس کے دشمن کیسے ہو سکتے ہیں۔دشمن اتنی بھیانک سزا کیسے دے سکتا ہے۔خوشیوں کا گلا گھونٹ سکتا ہے۔ایسی سفاک حرکت آخر کس نے کی؟''

ایک پُراسرار قتل۔کس نے زہر دیا، کس نے زہر پلایا۔کون ہو سکتا ہے۔پولیس جانکاری میں کر رہی تھی اور اجڑا باپ بھی حیرت میں ڈوبا ہوا تھا۔

☆......☆......☆

گل شیر دولہے کے روپ میں دشمنی کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔عین اس دن جب ارمان پورے ہونے والے تھے۔خوابوں کو تعبیر ملنے والی تھی۔سہاگ رات اتنی بھیانک ہو جائے گی، کس نے سوچا تھا۔ارمانوں کا خون یوں بھی بہتا ہے۔خواب یوں بھی بکھرتے ہیں۔گل شیر اور علی نواز دو بھائی تھے۔بڑا بھائی شادی شدہ تھا اور اپنی بیوی کے ساتھ خوش تھا۔گل نوران کی اکلوتی بہن تھی۔جس کا پچھلی سہ ماہی میں انتقال ہو گیا تھا۔اس کے دو ننھے بچے ان کی کفالت میں تھے۔چھوٹا سا خاندان، زیادہ امیر بھی نہیں تھے۔نہ ہی گئے گزرے تھے، اچھا گزر بسر ہو رہا تھا۔

تینوں بہن بھائیوں کا بچپن شرارتیں کرتے، اٹھکیلیاں کرتے، ہنستے مسکراتے، روتے لڑتے جھگڑتے گزر گیا۔جوانی کی سیڑھیاں چڑھے تو اسکول کو الوداع کر کے کالج پہنچ چکے تھے۔علی نواز ایف اے کرنے کے بعد ایک فرم میں منشی لگ گیا۔گل شیر نے ایم ایس سی امتیازی نمبروں سے پاس کر لی تھی۔علی نواز سب سے بڑا تھا اور اسے اس کی کلاس فیلو ہما پسند آ گئی۔یہی پسند محبت میں بدلی اور پروان چڑھتے چڑھتے شادی کا سندیسہ دے گئی۔

پھر ایک دن ہما، نواز کی محبوبہ سے بیوی ہما نواز بن کر اس کے آنگن میں خوشیاں لے آئی۔آنگن میں بہار کی رُت آ گئی تھی۔خوشیاں ہی خوشیاں تھیں، اس خوشیوں نے یکے بعد دیگرے دو ننھے معصوم پھول دے کر اضافہ کر دیا۔علی نواز بہت خوش تھا۔دادی اور دادا بھی خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔

اب ماں باپ کو گل شیر کی فکر ستانے لگی تھی۔اس کے سر پہ سہرا سجنے کے خواب دیکھنے لگے۔اس سے

پہلے گل نور کی وفات نے ان کو مایوس کر دیا تھا۔لیکن خدا کے آگے کس کا زور چلا ہے۔گل نور کے بچے نانی کے ساتھ شرارتیں کرنے لگے تھے۔شام کو جو لہے کے اردگرد محفل سج جاتی۔رشتے کی باتیں ہونی لگتیں۔گل شیر کے والد کی خواہش تھی کہ اپنے بھائی کی بیٹی کو بہو بنا کر لائے۔اور گل شیر کی ماں اپنی بھانجی لانے کے خواب دیکھ رہی تھی۔کئی بار بہن کو کہہ بھی چکی تھی، اور ادھر سے بھی ہاں ہی تھی۔گھر میں سرد جنگ چھڑ چکی تھی۔مسکراہٹوں سے محفل کا آغاز ہوتا اور جھگڑے پر اختتام ہوتا تھا۔محفل برخواست ہو جاتی اور سبھی اپنے اپنے کمروں میں گھس جاتے۔سرکاری اجلاس کی طرح بغیر نتیجے کے اجلاس کل تک ملتوی ہو جاتا۔کئی مہینے گزر گئے۔آخر کار گل شیر کا رشتہ طے ہو گیا۔ہاں گل شیر کا شتہ طے ہو گیا۔

☆......☆......☆

پولیس مجرم کی تلاش میں سر توڑ کوششیں کر رہی تھی۔ابتدائی رپورٹ میں تو موت زہریلی مشروب یا کھانے سے ہوئی تھی۔دلہن اور دلہے نے دیسی گھی کی بنی چوری تو کھائی تھی۔جو دیہاتوں میں اکثر لڑکی والے اسپیشل بناتے ہیں اور دلہے کو پیش کرتے ہیں۔دلہے کے ساتھ ساتھ اس کے دوست بھی مزے لیتے ہیں اور اس دوران شرارتیں بھی ہوتی ہیں۔چوری تو لڑکی کی سہیلیوں اور لڑکے کی طرف اس کے دوستوں نے بھی کھائی تھی۔اگر اس چوری میں زہر ملا ہوتا تو سبھی پر اثر ہوتا۔دوست، سہیلیاں سبھی ٹھیک ٹھاک تھے۔کہا جا سکتا ہے کہ چوری میں زہر نہیں تھا، چوری میں زہر نہیں تھا تو پھر کس میں تھا۔

پولیس نے شک کی بنا کر بھائی اور دلہے کے باپ کو شامل تفتیش کر لیا۔اُدھر دلہن کی خالہ اور ماں اور بہن سے پوچھ گچھ کی گئی لیکن معاملہ بگڑتا چلا گیا۔سبھی تھانے میں سر جوڑے بیٹھے تھے، اسی دوران تفتیشی افسر کی عقل نے کام کیا اور فوراً بول پڑا۔

''رکو......رکو۔شادی میں ایک رسم دودھ پلائی بھی ہوتی ہے ناں......'' تھانیدار نے سر کو کھجلا اور اُس کو داد دی۔

کیس الجھتا جا رہا تھا۔تھانیدار کڑی سے کڑی ملانے میں لگا تھا۔

''دلہن اور دلہے کو دودھ کس نے پلایا تھا؟ لڑکی والے گھر تو صرف دلہے کو دودھ پلایا گیا تھا۔اور دودھ دلہن کی بہنوں اور بھتیجیوں نے پلایا تھا۔''

''توبہ توبہ ہم ایسا کیوں کر کریں۔میری بہن اور بھائی سہاگ رات کو ہی مارے گئے اور الزام بھی ہم پہ......'' دلہن کی بہن جو دودھ پلائی میں شامل تھی، تھانے میں بیٹھی تھی فوراً بول پڑی......

''دودھ تو بھائی نے پیا ہی نہیں تھا۔وہ......وہ......تو سالے نے پیا تھا۔سالے نے؟'' تھانیدار نے پوچھا اور پھر سالے صاحب کو بھی شامل تفتیش کر لیا۔

سالا صاحب کسی کام کے سلسلے میں شہر گیا ہوا تھا۔جب واپس آیا تو پولیس نے گاڑی میں بیٹھایا اور تھانے لے آئے۔اس کے رنگ اڑ گئے۔

''مجھے کیوں لایا گیا ہے۔'' اس نے تھانیدار سے پوچھا۔

''جانتے ہو دولہا اور دلہن پہلی رات کمرے میں مردہ پائے گئے اور ان کی موت زہر دینے سے ہوئی ہے۔دلہن کے گھر دودھ پلائی کی رسم ہوئی تھی، کیا دودھ آپ نے پیا تھا یا دلہے نے پیا تھا؟''

''صاحب جی! گل شیر نے سارے کا سارا دودھ مجھے پلایا تھا۔اسی خوف سے کہ کسی نے شرارت کر کے اس میں موشن والی گولیاں نہ ملا دی ہوں۔کہیں کام گڑبڑ نہ ہو جائے اور باراتیوں کے سامنے شرمندگی نہ ہو۔وہ تو دودھ سے بھرا پورا گلاس میں نے پیا تھا۔''

تھانیدار، ماتھے پر ہاتھ رکھے گہری سوچوں میں کھو سا گیا۔اس کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔آخر یہ قتل کیسے ہوئے؟ جب سے اس نے اس علاقے میں چارج سنبھالا تھا، اس نوعیت کا پہلا کیس تھا اور وہ بھی الجھتا جا رہا تھا۔جس کا سر پاؤں ہی نہیں مل رہا تھا۔اس سے بھی مشکل مشکل کیس لمحوں میں نمٹ گئے تھے۔اور یہ......؟

☆......☆......☆

گل شیر کا کردار بھی ٹھیک تھا۔ کسی سے کوئی دشمنی بھی نہیں تھی۔ گل شیر کے کالج یونیورسٹی کا ریکارڈ بھی طلب کیا جا چکا تھا۔ کوئی اس کا افیئر بھی نہیں تھا۔ کسی سے فلرٹ بھی نہیں کیا تھا۔

تھانیدار کی سوچ نے رُخ بدلا۔ جدید دور ہے عاشقی معشوقی کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ ہوسکتا ہے دلہن کا کسی لڑکے کے ساتھ افیئر چل رہا ہو...... اور اس کی شادی گل شیر کے ساتھ زبردستی کر دی گئی ہو۔ عاشق نے بے وفائی کا بدلہ لیا ہو، اور اس مد میں دُلہن کو اس کے ہم سفر کے ساتھ موت کا تحفہ دیا ہو۔ مگر کیسے؟



لیکن گل شیر اور دلہن کا افیئر سامنے آیا تھا دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ یونیورسٹی میں اکھٹے پڑھتے تھے اور گھر سے اکھٹے جاتے آتے تھے اور دونوں کزن بھی تھے۔

تھانیدار نے تمام کوششیں بروکار لائیں مگر...... کسی نتیجے پر نہ پہنچ پایا تھا۔

دن گزرتے جا رہے تھے۔ معاملہ جوں تا توں تھا۔ تھانیدار کے پاس ایسے قتل کا کیس پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ اس کے لیے کسی چیلنج سے کم نہیں تھا۔ تفتیشی افسر بھی سر توڑ کوشش کر چکا تھا۔ کسی پہ شک نہیں رہا تھا۔ جن پہ شک تھا شامل تفتیش ہو چکے تھے۔ کوئی ایسا سراغ بھی نہیں ملا تھا، نہ ہی کوئی ثبوت تھا۔ نہ خون، نہ زخم۔ جیسے کسی آسمانی طاقت نے بھی ثبوت مٹا دیے ہوں۔

☆......☆......☆

گل شیر کے والد کا سکہ پورے گھر پر چلتا تھا۔ مہینوں پہلے چھڑی سرد جنگ ختم ہو چکی تھی اور گل شیر اپنی کزن علیزہ کو اپنا بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ آخر کئی سالوں سے ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ گل شیر نے باپ کا ساتھ دیا اور اپنے دل کی بات بلا خوف باپ کو کہہ دی۔ باپ بھی خوش ہو گیا۔ اسی طرح دو پریمیوں کا رشتہ طے ہو گیا۔

مٹھائیاں بانٹی گئیں۔ جب یہ مٹھائی گل شیر کی خالہ کے گھر پہنچی تو وہ آگ بگولہ ہو گئی۔ اس نے نہ تو [illegible] نہ ہی مبارک باد کے دو بول پیش کیے

۔ اسے تو شدید جھٹکا لگا تھا۔

''میری بہن نے مجھے دھوکہ دیا۔ مجھ کو دھوکہ دیا۔ اپنوں کا خون اس طرح سفید ہو جائے گا۔ اپنے یوں بھی ذلیل کرتے ہیں۔ میری بہن نے میری بیٹی کو برباد کر دیا۔ ہمیں بے عزت کر دیا۔ میری بیٹی کسی سے کم تو نہیں تھی۔ اب میں ماتھے پہ لگا داغ کیسے دھو پاؤں گی۔''

اس کے من میں جو آیا۔ لفظوں میں آگ کے گولے بنا کر اُگل دیا۔ اُس نے بہن کو بلوا بھیجا۔ شام دھیرے دھیرے اتر رہی تھی۔ پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں جا چکے تھے۔ سورج آرام کرنے کے لیے میٹھی نیند کے مزے لینے چلا گیا تھا۔

گل شیر کی ماں ناراضگی ختم کرنے اپنی بہن کے ہاں چلی گئی۔ علیک سلیک تو ہوئی، مگر نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ بہن نے بہن کو قائل کرنا چاہا۔

''میں مجبور ہو گئی تھی۔ بہت زور لگایا مگر ناکام رہی۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا بہن کو کہہ ڈالا۔ نفرت کی آگ ذرا کم ہوئی۔

پھر دونوں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ دونوں راضی ہو گئی۔ ایسا فیصلہ کہ روح کانپ اٹھے۔ آسمان خاموش سروں پر کھڑا سن رہا تھا۔ رنجشیں ختم ہو گئیں اور گل شیر کی خالہ شادی میں ہنسی خوشی شادی کی تیاری میں جت گئی۔ گل شیر کی ماں فیصلہ کر چکی تھی اور اب اس پر عمل کرنا باقی تھا۔

اُس نے آنے والی نئی نویلی بہو کو تسلیم نہ کرنے کی ٹھان لی۔ اندر ہی اندر اپنے پلان کو پایہ تکمیل پہنچانے کی تگ و دو کرنے لگی۔

گھر آ کر اپنے بڑے بیٹے کو ساتھ ملایا۔ پھر انسان ہی انسان کا دشمن بن گیا۔ رشتوں کی پہچان جاتی رہی۔ دولت کی خماری نے اندھا کر دیا۔ زمیں پھٹی نہ آسمان رویا۔ نہ تقدیر کو ترس آیا۔ کاتب تقدیر...... قسمت کا حال لکھ چکا تھا۔ فرشتے خاموش تھے۔ خلقت خاموش تماشائی بنی ہوئی تھی اور ایک ماں نے اپنے بیٹے کو شادی کی پہلی رات، ارمانوں کی رات، خوابوں کے تانے بانے بُننے کی رات کو موت کے

گھاٹ اتار دیا۔ اور ڈرامائی انداز میں بین کرنے لگی۔

☆......☆......☆

تھانیدار سر توڑ کوشش کر چکا تھا۔لیکن کوئی خاطر خواہ نتائج سامنے نہیں آئے تھے۔

ہر شہر، گلی محلے میں خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل چکی تھی کہ شادی کی پہلی رات دلہن اور دلہے کو زہر دے کر مار دیا گیا۔سالے صاحب ابھی تک تھانے میں موجود تھے۔گہری سوچوں میں غوطہ زن تھا۔پھر اچانک بول پڑا۔

صاحب ٹھہریئے۔یہ زہر......اور......دودھ......

ہاں ایک منٹ۔دلہن اور دلہے کو دودھ دیا گیا اور اس میں زہر ملا ہوا تھا۔یہ دودھ پھر رات گئے گل شیر کی ماں نے پلایا تھا۔پلایا نہیں بلکہ ان کے کمرے میں رکھا تھا۔ہاں جب دلہن اور دلہا باراتیوں کے جھرمٹ میں صحن میں بیٹھے سلامیاں وصول کر رہے تھے۔میں اٹھ کر ان کے کمرے میں آیا۔اس وقت مجھے اماں جی دروازے میں ملیں، جو کچھ اندر رکھ کر واپس پلٹ رہی تھیں۔میں بیڈ کے ساتھ رکھی اپنی کتاب اٹھانے گیا تھا جو چند لمحے پہلے وہاں رکھ کر بھول گیا تھا۔بیڈ کے ساتھ جگ اور گلاس رکھا تھا اور دودھ سے ہاف بھرا ہوا تھا۔شاید یہی دودھ انہوں نے پیا ہوگا اور یہ دودھ اماں جی نے ہی رکھا ہوگا۔کوئی اور کمرے میں نہیں جا سکتا تھا۔''

سالے صاحب کی باتوں میں دم تھا۔اس سے کیس کا رُخ تبدیل ہوا اور تھانیدار بھی ششدر رہ گیا۔ایک ماں بھلا اپنے جوان لخت جگر کو کیسے زہر دے کر مار سکتی ہے۔وہ بھی جب خوابوں کو تعبیر ملنے والی تھی، سہرے سجے تھے۔میں کھڑا سوچ رہا تھا۔

تھانیدار نے اماں جی کو علیحدہ کمرے میں لے جانے کو کہا اور لیڈی کانسٹیبل نے اسے اندر لے جانا چاہا ہی تھا کہ اماں جی سینہ کوبی کرنے لگی۔آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے اور وہ کہہ رہی تھی۔

ہاں میں نے اپنی خوشیوں کا گلا خود ہی گھونٹ دیا ہے۔میں نے اپنے بیٹے کو مار دیا ہے۔میں نے ان کو زہر دیا ہے۔میں نے اپنی انا کا بدلہ لیا ہے۔لیکن مجھے خبر نہیں رہی کہ اپنی خوشیوں کا قتل بھی کر رہی ہوں۔میں اپنی بہن کے ساتھ وعدہ کر چکی تھی اور یہ زہر مجھے میری بہن نے ہی لے کر دیا تھا۔میری آنکھوں پر حسد کی پٹی بندھ گئی تھی۔میں ضمیر فروش ہو گئی تھی۔مجھے میری انا نے مار ڈالا اور میں نے اپنے ہی ہاتھوں اپنے ہی نشیمن کا آگ لگا دی۔میں نے اپنے ہی ہاتھوں، اپنے ہی خون کو، اپنے بیٹے کو مار ڈالا۔میں مجرم ہوں۔مجھے سزا ملنی چاہیے۔مجھے سزا دو۔ہاں مجھے سزا دو۔''

☆......☆......☆

اماں جی نے سبھی کارروائی من وعن سنا دی تھی۔اُس کے بعد علی نواز، اس کی ماں اور خالہ کو سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا گیا۔گل شیر کا باپ اپنے اجڑے آشیانے کو حسرت بھری نظروں سے تکے جا رہا تھا۔سب کچھ انا کی بھینٹ چڑھ گیا۔اپنا آشیانہ جل گیا۔

میں گل شیر کے باپ کے ساتھ کھڑا سوچ رہا تھا کہ بھلا ایک ماں اپنے بیٹے اور بہو کو کیسے مار سکتی ہے۔جس نے بچپن سے لے کر جوانی تک نازوں سے پالا ہو۔اُس کے نخرے اٹھائے ہوں، انگلی پکڑ کر صحن میں پاؤں پاؤں چلنا سکھایا ہو، جس نے بولنا سکھایا ہو۔جس نے آنکھوں میں سہرے باندھنے کے خواب سجائے ہوں، گھر میں بہو لانے کی تمنا کی ہو وہ بھلا اپنے ہاتھوں اپنی خوشیوں کا گلا کیسے گھونٹ سکتی ہے۔جس نے قتل کیا وہ ماں نہیں تھی۔ایک عورت تھی۔عورت ہی عورت کی دشمن ہے اور ہر فساد کی جڑ عورت ہی ہے۔کبھی حسد کی آگ میں جل جاتی ہے۔کبھی نفرت کے لاوے میں بہہ جاتی ہے۔کبھی دولت پر مرمٹتی ہے۔ماں کبھی بھی بے رحم نہیں تھی۔دورِ جاہلیت میں بھی ماں نے اپنے بچوں کو نہیں مارا تھا اب اتنی ترقی کر کے کیسے مار سکتی ہے۔ہاں ماں کبھی قاتل نہیں ہو سکتی ہے۔یہ قتل حسد کی آگ میں جلی بھنی نفرت کی چکی میں پسی، انا کی غلام عورت نے کیا ہے۔ماں تو اپنے بچوں پر جان نچھاور کرتی ہے، جان نہیں لیتی، آپ کا کیا خیال ہے۔ضرور بتایئے گا۔

☆☆......☆☆

# سیاہ نصیب

اُمِ مناہل

ایبٹ آباد سے، ایک حرماں نصیب کی داستانِ الم

ہمارے گھر دادا دادی کے زمانے سے ہی ایک ماسی کام کرنے آیا کرتی تھیں۔ اُن کا نام نصیبن تھا۔ ہم سب بچے انہیں 'نصیبن بوا' کہا کرتے تھے۔ پھر وہ ہمارے بچوں کی بھی نصیبن بوا بن گئیں مگر نصیب کے معاملے میں بہت بدنصیب ثابت ہوئیں۔

نصیبن بوا کے ابا نے ہماری امی کو بہن بنایا ہوا تھا اور یہ رشتہ اُن کے ابا نے مرتے دم تک نبھایا۔

نصیبن بوا کی کہانی سننے سے پہلے نصیبن بوا کے ابا کا مختصر حال سن لیں۔ نصیبن بوا کے ابا ذات کے فقیر تھے مگر گلی گلی گھوم کر ہاتھ پھیلا کر مانگنا انہیں سخت ناپسند تھا۔ وہ صرف ان خاص لوگوں کے گھر جاتے تھے، جو اپنی زکوٰۃ وغیرہ دینے کے لیے انہیں بلاتے تھے۔ ہمارے گھر بھی وہ رمضان میں زکوٰۃ اور جمعرات کی نیاز لینے آیا کرتے تھے۔ فقیر خاندان میں پیدا ہونے کے باوجود وہ عام فقیروں سے بالکل مختلف تھے۔ صاف ستھرے کلف لگے سفید شلوار قمیض پر اعلیٰ قسم کے کھوسے پہنے، تیل لگے ہوئے سلیقے سے کنگھا کیے ہوئے بال، گلے میں موٹے موٹے موتیوں کی مالا پہنے، ہاتھوں میں عقیق اور زمرد کی انگوٹھیاں، نہائے دھوئے کہیں سے بھی فقیر ہونے کا گمان نہ ہوتا تھا۔

نصیبن بوا کے ابا نے چار شادیاں کی تھیں مگر چاروں بیویوں میں سے ایک نصیبن بوا ہی اپنے باپ کی واحد اولاد تھیں۔ پہلی شادی اپنے چچا کی بیٹی سے کی مگر اُس کی زندگی نے صرف سال بھر وفا کی اور معمولی بخار کے باعث نصیبن بوا کے ابا کو اس بھری دنیا میں اکیلا چھوڑ کر دارِ فانی سے کوچ کر گئی۔ اس کے بعد ہندوستان میں ہی دوسری شادی کی مگر وہ اُن کے ماحول میں رچ بس نہ سکی اور لڑائی جھگڑوں کے بعد طلاق لے کر الگ ہوگئی۔ ان ہی دنوں ہندوستان میں آزادی کی تحریک شروع ہوگئی۔ پاکستان بننے کا اعلان ہوتے ہی ہر طرف ہندو، مسلم فسادات شروع ہو گئے، تب نصیبن بوا کے خاندان نے پاکستان کی طرف ہجرت کی۔ پاکستان پہنچ کر نصیبن بوا کے والد نے تیسری شادی اِس لاوارث بیوہ عورت کو سہارا دینے کی خاطر کی جو ہجرت کے دوران زخموں سے چُور اپنی آٹھ سالہ یتیم بیٹی کے ساتھ ملی تھی۔ اس کا شوہر بلوائیوں کے ہاتھوں شہید ہوگیا تھا مگر وہ بھی ڈھائی تین سال ہی زندہ رہی کیونکہ آزادی کی خاطر اٹھائے گئے زخموں میں سے ایک زخم ناسور بن کر اس کی موت کا سبب بن گیا۔ اس طرح تیسری بیوی بھی چند سال

کی وفا کر کے داغِ مفارقت دے گئی اور جاتے جاتے غیر کی بیٹی کو نصیبن بوا کے ابا کی جھولی میں ڈال گئی۔ جس کی پرورش میں اُن کے ابا نے کوئی کسر نہیں رکھی اور اس بچی کو بھی سینے سے لگا کر اُس کی پرورش میں لگ گئے۔ کچھ عرصہ حالات بہتر چلے مگر پھر وہی دنیاوی مسائل۔ ابا کو تلاشِ روزگار کے لیے گھر سے نکلنا پڑتا۔ پیچھے بچی کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ ہوتا۔ لہٰذا برادری والوں کے سمجھانے پر نصیبن بوا کے ابا نے ایک بار پھر شادی کا کڑوا گھونٹ پینے کی حامی بھرلی۔ کیونکہ شادی کا لڈو تو ان کے ابا کے لیے کڑوا ہی ثابت ہوا تھا۔ چوتھی عورت جو ان کی زندگی میں آئی وہ نصیبن بوا کی ماں تھیں۔ مگر شاید بیوی کا سکھ دیکھنا اُن کی قسمت میں لکھا ہی نہیں تھا۔ یہ بیوی بھی نصیبن بوا کو دنیا میں لانے تک زندہ رہیں اور نصیبن بوا کی پیدائش کے بیسویں دن اپنے شوہر اور بچی کو حالات کے دھارے پر تنہا چھوڑ کر سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئیں۔

اس کے بعد نصیبن بوا کے ابا نے پانچویں شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر کے اپنی بچیوں کی پرورش میں دن رات ایک کر دیا۔ بڑی بیٹی پندرہ، سولہ سال کی ہو چکی تھی۔ اپنی برادری میں انہوں نے لڑکا تلاش کر کے اس کی شادی کر دی۔ اسے اپنے گھر میں خوش دیکھ کر اُن کے ابا مطمئن ہوگئے۔ اس کے بعد نصیبن بوا کے ساتھ ابا تھے اور اُن کی تنہائی۔

ابا جب روزگار کی تلاش میں نکلتے تو نصیبن بوا کو محلے کی عورتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ جاتے۔ چھوٹی عمر میں ماں کا سایا سر سے اٹھ جانے کی وجہ سے نصیبن بوا کڑی دھوپ میں آ گئیں۔ اُن کے ابا نے ماں اور باپ دونوں بن کر انہیں پالا اور انہی کی خاطر مزید شادی نہیں کی کیونکہ وہ اپنی معصوم اکلوتی بیٹی پر سوتیلی ماں کا سایا ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔

نصیبن بوا اپنے ابا کے بالکل برعکس تھیں۔ گھر میں کسی عورت کی سرپرستی انہیں ملی نہیں جو کوئی انہیں زمانے کا چلن اور گھریلو زندگی کے طور طریقے سکھاتا



اور محلے والے وہی بس اپنے کام سے کام رکھنے والے تھے۔ تعلیم کے زیور کے بغیر نصیبن بوا شعور کی سیڑھی پر قدم رکھنے کے باوجود بے شعور رہیں۔ نہ کپڑے پہننے کا ڈھنگ، نہ بناؤ سنگھار کا طریقہ نہ کام کرنے کا سلیقہ۔ ہم لوگوں نے انہیں تمیز شعور سکھانے کی بہت کوشش کی مگر وہی لکیر کی فقیر۔ یہ سب شعور تو انسان کے اندر بچپن سے ہی آتا ہے یا پھر تعلیم حاصل کرنے سے، جب عمر گزر جائے تو کوششیں لاحاصل ہوتی ہیں۔

محلے کی سہیلیوں کے ساتھ ان کا جھنجھٹ نہیں تھا جو سہیلیوں کے ساتھ بیٹھ کر وہ کچھ سیکھتیں۔ یونہی بے کیف زندگی میں بچپن اور لڑکپن کی حدود کو پار کرتے ہوئے نصیبن بوا نے عمر کے چودھویں سال میں قدم رکھا ہی تھا کہ ان کے ابا نے اپنی ہی برادری میں لڑکا تلاش کر کے اُن کی شادی کر دی۔

☆......☆......☆

چھوٹی عمر میں ماں کی ممتا سے محروم ہو جانے اور کم سنی میں ہی شادی کے بندھن میں بندھ جانے سے ان کے ناتواں کندھوں پر ذمہ داریوں کا ایسا بوجھ پڑا جس نے ان سے ان کے بچپن کی حسین یادوں کو چھین لیا تھا۔

اُن کا بچپن شادی کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا۔ باپ کے گھر سے ذمہ داریوں اور لاتعداد مصائب کا بوجھ لے کر جانے والی نصیبن بوا شوہر کے گھر میں بھی وہ خوشیاں نہ پاسکیں جس کی وہ ازل سے حقدار تھیں۔ پھر تلے اوپر چار بیٹوں کی پیدائش نے انہیں پیس دیا۔ چار بیٹے پیدا کرنے کی باوجود انہیں سسرال میں وہ مقام نہ مل سکا جو بیٹے پیدا کرنے پر بہت سی عورتوں کو ملتا ہے اور چار بیٹے پیدا کر کے بھی نصیبن بوا کے اندر وہ غرور و گھمنڈ نہیں آیا جو ایک ہی بیٹا پیدا کر کے بعض عورتوں میں آجاتا ہے اور اپنے آپ کو ہواؤں میں اُڑتا ہوا محسوس کرتی ہیں۔

یہاں تو نصیبن بوا ان عورتوں کے لیے مثال بھی ہیں اور سبق بھی جو بیٹے پیدا کرنے پر گھمنڈ کرتی ہیں اور بیٹیوں کی پیدائش پر بہوؤں اور بھاوجوں کا جینا حرام کر دیتی ہیں۔ نصیبن بوا تو بیٹے پیدا کر کے بھی خوشیوں سے محروم رہیں۔

ساس ان کی جلادوں سے کم نہیں تھی۔ میاں شراب اور جوئے کا عادی۔ وہ ان مردوں میں سے تھا جس کو غیر عورتوں کی بانہوں میں بہت سکون ملتا ہے مگر وہی حقوق اپنی بیویوں کو دینے میں شرم و عار محسوس کرتے ہیں۔ گھر میں گالی گلوچ اور مار کٹائی کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اول درجے کا ہڈحرام اور کام چور، اپنی کمائی کو تو جوئے اور شراب کے نشے میں اڑا دیتا اور جب نشہ پورا کرنے کے لیے مزید پیسوں کی ضرورت ہوتی تو نصیبن بوا کو تنگ کرتا اور پیسے نہ ملنے کی صورت میں نصیبن بوا کو مارتا، گھر میں ظلم اور بربریت کا میدان گرم کر کے رکھتا۔

نصیبن بوا تو خود اس کے رحم و کرم پر تھیں، وہ کہاں سے پیسے لاتیں۔ ابا اُن کی جھولی میں جو چند روپے ڈال آتے اس سے وہ اپنا اور بچوں کا گزارہ کرتیں مگر کب تک...... قارون کا خزانہ تھوڑی تھا جو ختم ہی نہ ہوتا اور ویسے بھی کسی کے لیے دیے سے کب پورا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شوہر کی کمائی میں جو برکت رکھی ہے وہ کسی کے دینے سے کب پوری ہوتی ہے۔

اسی کسمپرسی کی حالت میں گزارہ کرتے ہوئے وہ چار بیٹوں کی ماں بن گئیں۔

مناسب خوراک اور صحیح دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے چوتھے بچے کی پیدائش پر ان کی جان کے لالے پڑ گئے۔

بچہ پیدا تو ہو گیا مگر صحیح نشو ونما نہ ہونے کی وجہ سے انتہائی لاغر اور کمزور ہوا اور زندگی کی چند سانسیں لینے کے بعد اس ظالم دنیا سے منہ موڑ گیا۔ جس کا سارا الزام ساس نے نصیبن بوا پر ڈال کر انہیں ڈائن اور ناگن جیسے القاب سے نوازا اور پوتے کی موت کا بہانہ بنا کر نصیبن بوا کو طلاق دلوا دی۔

بڑا بیٹا بارہ سال کا ہو چکا تھا اس کو چھین کر اپنے پاس رکھ لیا۔ یوں اسپتال سے شوہر کے گھر جانے کی بجائے صرف چھبیس برس کی عمر میں طلاق کے داغ کے ساتھ ساتھ دو کم سن بچوں کا بوجھ اٹھائے واپس

باپ کی دہلیز پر آگئیں۔ حالانکہ بچے کی پیدائش کا سارا خرچہ اُن کے ابا نے ہی برداشت کیا تھا۔ ازدواجی زندگی میں وہ بھی اپنے باپ کی طرح بدنصیب ثابت ہوئیں۔

ان کے ابا نے ان پر دوسری شادی کرنے کے لیے بہت زور دیا۔ مگر ان کی ناں ہاں میں نہ بدل سکی۔ لہٰذا ابا بھی ہار مان کر چپ ہوگئے۔

ایک بیٹے کے مر جانے اور دوسرے بیٹے کے چھن جانے کے غم نے انہیں اُدھ موا کر دیا۔ مگر اتنے غم اٹھانے کے باوجود ان کے ماتھے پر کبھی شکن نہ آئی۔ نہ انہوں نے کبھی تقدیر سے شکوہ کیا اور ایک کمرے کے گھر میں پوری زندگی گزار دی۔

ان کے گھر کی کل کائنات چالیس گز زمین پر بنا ہوا چھوٹا سا مکان، جس میں ایک کمرہ زینے کے نیچے کچی مٹی کا لیا ہوا چولہے کے نام کا باورچی خانہ، اس کے ساتھ ہی غسل خانہ وغیرہ۔ ایک پلنگ کے نام کا آنگن ضرورت کے مطابق استعمال کی اشیاء۔

زندگی کی آسائشوں سے محروم گھر میں انہوں نے بچپن سے لے کر جوانی کی حدود پار کرتے ہوئے بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ لیا۔

مگر کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائیں۔ ہزاروں لاکھوں روپے کمانے والے لوگ مہنگائی کا رونا روتے نظر آتے ہیں، عالیشان بنگلوں اور عیش و عشرت میں زندگی گزار کر بھی ہمیشہ ناشکرے ہی رہتے ہیں۔



نصیبن بوا کے غم کو دیکھتے ہوئے ایک دن ان کے ابا نے ہماری امی سے کہا کہ بہن میری ایک بیٹی ہے اسے طلاق ہوچکی ہے۔ ہر وقت گھر میں پڑی روتی رہتی ہے۔ تم اسے اپنے گھر کام پر رکھ لو۔ وہ تمہارے گھر کا کام کر دیا کرے گی۔ اس طرح اس کا دل بھی بہل جائے گا اور تمہارے گھر کا کام بھی ہوجائے گا۔''

یوں نصیبن بوا کا داخلہ ہمارے گھر ہوا تھا۔ وہ دن تھا اور آج کا دن! نصیبن بوا ہمارے گھر کی ایک فرد بن گئیں۔ جس وقت انہوں نے ہمارے گھر آنا شروع کیا انہیں طلاق ہوئے چار سال ہوئے تھے۔ اس وقت نصیبن بوا جوان تھیں اور ہم سب بچے۔ پھر انہوں نے پوری جوانی ہمارے گھر گزار دی۔

نصیبن بوا کو ہمارے گھر میں کبھی بھی اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ وہ ہمارے گھر میں نوکرانی ہیں۔ اس بات کا اظہار وہ ہمیشہ اپنی باتوں میں کیا کرتی تھیں کہ آپا آپ کے گھر میں کبھی مجھے اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ آپ تو میری بڑی بہن ہو۔''



دکھوں کی آبیاری جانتی ہوں
حضور! اختر شماری جانتی ہوں

میرا چہرہ ہے یوں نکھرا ہوا سا
غموں کی تابکاری جانتی ہوں

ستارے روشن ہیں کتنے آسماں پہ
میں یہ انجم شماری جانتی ہوں

ملے گا کیا کشید عشق کر کے
ہے اس میں بُردباری جانتی ہوں

کسی قیمت تو آ کے چاک سی دے
ہے کتنا بیوپاری جانتی ہوں

نمک اس واسطے ہو مجھ کو میسر
ہے کتنا زخم کاری جانتی ہوں

سحری طاری کروں گی لفظوں کا اپنے
فنِ نامہ نگاری جانتی ہوں

شاعرہ: صفیہ سلطانہ مغل۔ جیکب آباد

نصیبن بوا فقیر خاندان میں پیدا ہونے کے باوجود فطرتاً فقیر نہیں تھیں۔ وہ اکثر ایک بات کہا کرتی تھیں جو تعلیم یافتہ لوگوں کے منہ پر طمانچہ ہے۔

اللہ ذات کا فقیر بنادے مگر نیت کا فقیر نہ بنائے۔''

اور واقعی یہ بات درست بھی تھی۔ لین دین کا معاملہ ہوتا یا نذر، نیاز وہ کھلے ہاتھوں خرچ کرتیں۔

نصیبن بوا لوگوں کے گھروں میں کام کر کے اپنا اور بچوں کا پیٹ پالتی رہیں۔ تھوڑا بہت ابا کا لایا ہوا کیونکہ ابا تو انتہائی ضعیف ہو چکے تھے اور باہر نہ نکلنے کی وجہ سے ان کی کمائی میں کمی آ گئی تھی۔

☆......☆......☆

ہمارے ابو اور تایا دادا دادی کی صرف دو ہی اولادیں تھیں۔ ہم لوگ دادا کے گھر میں جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت رہا کرتے تھے۔ ہمارے گھر کی محبت کی مثال پورا محلہ اور ہر آنے جانے والا دیا کرتا تھا۔ آنے والے مہمانوں کو اس بات کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ ہم دو بھائیوں کی فیملی ایک ساتھ رہتے ہیں۔

چند سال آگے سرکے ہماری بڑی بہنوں کی شادیاں ہوگئیں۔ گھر میں بہوؤں اور دامادوں کا اضافہ ہوگیا۔ گھر کے افراد کے عہدے بدلنے سے گھر کے ماحول میں بھی تبدیلی آ گئی۔

نئے لوگوں کی آمد ہوئی تو نئی سوچ کے دروازے بھی کھل گئے۔ کیونکہ سب کی اپنی اپنی سوچ ہوتی ہے، کسی کی ذہنیت پر پہرے نہیں بٹھائے جاسکتے۔ گھر کے ماحول میں تبدیلی آئی تو حالات بھی بدل گئے۔ آئے دن گھر میں مختلف قسم کی لڑائی جھگڑوں نے گھر کے اُن در و دیوار کو ہلا دیا، جس کی بنیاد محبت کی اینٹوں سے رکھی گئی تھی۔ پھر ان ہی لڑائیوں کے درمیان ایک دن چوری کا حادثہ ہوگیا۔ جس کا سارا الزام نئے لوگوں نے نصیبن بوا پر ڈال دیا۔ گھر کی نوکرانی جس کی حیثیت گھر کے فرد جیسی تھی۔ جب اس پر چوری کا الزام لگا تو وہ مہینوں ہماری ماں کے پاس بیٹھ کر روئیں کہ آپا اتنے سالوں میں کبھی بھی میرے اوپر اس گھر میں کوئی الزام نہیں لگا نہ کسی نے مجھ سے غلط زبان میں بات کی۔ مگر آج چوری کا اتنا بڑا الزام لگ گیا مگر ہماری ماں سوائے تسلی کے دو بولوں کے علاوہ کیا کہہ سکتی تھیں کیونکہ ہماری ماں کا قول ہے بُرے انسان سے نہیں اس کے برے فعلوں سے ڈرا جاتا ہے اور یہ بات سو فیصد درست بھی ہے۔ حالانکہ نصیبن بوا تو برسوں سے ہمارے گھر کام کرنے آ رہی تھیں کبھی کوئی چیز اِدھر اُدھر نہیں ہوئی لیکن وہی نئے لوگ نئی سوچ نئے حالات سب کچھ نیا ہی تھا۔

☆......☆......☆

کہتے ہیں عروج کو زوال ضرور ہوتا ہے۔ گھر کے یہ جھگڑے ایسے بڑھے کہ ان ہی جھگڑوں کے درمیان ہمارے گھر کے عروج کو بھی زوال لگ گیا اور ہماری محبت کی بنیادوں پر کھڑی وہ عمارت گر گئی جس کی مثال دنیا دیتی تھی۔

ہمارے بڑے بھائی کا انتقال ہوگیا اور کچھ اپنوں کی سازش کے تحت ہمیں اپنا وہ گھر چھوڑنا پڑا جس گھر سے ہماری بچپن کی یادیں منسوب تھیں۔ اس کو خیر باد کہتے ہوئے ہمارا بہت دل دُکھا۔ مگر تقدیر کے اس فیصلے کو اللہ کی مصلحت جانتے ہوئے دل سے قبول کرلیا۔ جب ہم نے دادا کا وہ گھر چھوڑا تو نصیبن بوا بھی یہ کہہ کر کام چھوڑ گئیں کہ جب تم ہی نہ ہوگی آپا تو میں کس کے سہارے آؤں گی۔''

پھر ہمارے گھر چھوڑنے کے دو سال بعد تائی امی دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ تب تایا نے کام کی پریشانی دیکھ کر دوبارہ نصیبن بوا سے کام پر آنے کے لیے کہا۔ اس وقت نصیبن بوا کی وفاداری کا حال دیکھیے پہلے انہوں نے ہماری ماں سے اس بات کی اجازت لی۔ جب ماں نے اجازت دے دی تب انہوں نے اس گھر میں کام پر آنا دوبارہ شروع کیا۔''

☆......☆......☆

زندگی کے دن یونہی گزرتے رہے۔

جب دونوں بچے بڑے ہوئے تو نصیبن بوا نے انہیں مکینک کے کام پر بٹھا دیا۔ یوں گھر کے حالات میں کچھ بہتری آئی۔ جب بچوں نے کمانا شروع کیا

اور آمدنی کے ذرائع بڑھے تو ان کی دادی سے یہ بات ہضم نہیں ہوئی۔ کماؤ پوت بچوں کو دادی نے چھیننا چاہا۔ مگر چھوٹے بیٹے نے تو یہ کہہ کر دادی کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا کہ میں اپنی ماں کا سہارا بنوں گا۔ میری ماں نے انتہائی مشکل اور کٹھن حالات میں مجھے پالا پوسا ہے۔ مجھ پر تم سے زیادہ میری ماں کا حق ہے۔

البتہ بڑے بیٹے کو شادی کا جھانسہ دے کر دادی لے جانے میں کامیاب ہو گئیں۔ ان حالات میں نصیبن بوا کہا کرتیں جب سر کا سائیں وفادار نہ نکلا تو اس کی اولاد سے کیسا شکوہ!!

اب نصیبن بوا کے پاس چار میں سے صرف ایک چھوٹا بیٹا رہ گیا۔ اور وہ مثال سامنے آ گئی کہ جائیداد کے حصے کے وقت ماں ہمیشہ چھوٹے بیٹے کے حصے میں آتی ہے۔

☆......☆......☆

چھوٹے بیٹے کو مکینک کے کام پر جاتے ہوئے چند سال ہی ہوئے تھے کہ ایک دن ان کا یہ واحد کفیل فرمانبردار بیٹا گھر سے ایسا کام پر نکلا کہ شام تک اسے پلٹنا ہی نصیب نہیں ہوا۔ جانے اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ وہ نہ زندہ ملا نہ مردہ، انسان مر جاتا ہے تو اس کے پیارے اس کو دفن کر کے رو لیتے ہیں۔

پھر جب نصیبن بوا کے دونوں بڑے بچوں کی شادی کا وقت آیا تو اُن کی برادری کے رواج کے مطابق نصیبن بوا کو اپنے ہی بچوں کی شادی میں بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ اُن کے بچوں کی شادی اُن کی دادی کے گھر سے ہو رہی تھی اور ان کی برادری میں یہ رواج تھا کہ جس عورت کو طلاق ہو جائے یا کوئی عورت بیوہ ہو جائے تو اسے برادری کی کسی خوشی میں شریک ہونے کی اجازت نہیں ہوتی۔ چاہے وہ اُس کی اولاد کی شادی ہی کیوں نہ ہو۔

یہ کون سا قانون ہے کہ جس عورت نے انتہائی تکلیف دہ مراحل سے گزر کر جن بچوں کو جنم دیا ہو۔ اُن کی شادی میں اسی ماں کو شریک ہونے کی اجازت نہ ہو۔ کے گھر کی روٹی پانی کھانا اور اس سے تحائف لینا جائز ہو اور نہ دینے پر اسے طعنے مارے جائیں؟ نصیبن بوا کو بھی اپنے بچوں کا سہرا دیکھنے کا تو حق نہیں تھا مگر بہوؤں کی دعوت کرنا اور سلامی دینا اُن پر فرض تھا۔ اب وہ اکیلی عورت جس کا کوئی کمانے والا نہیں تھا۔ کہاں سے اس نے قرض لیا؟ کیسے اس نے دعوتوں کا خرچہ اٹھایا اس بات سے کسی کو کوئی سروکار نہیں تھا کھانے والے آئے، کھایا پیا عیش کر اور چل دیے۔ پیچھے کی کچھ خبر نہیں مگر یہ تو اس عورت کے دل کی کشادگی تھی جس نے خوشی خوشی یہ سب کچھ کیا اور کیوں نہ کرتی جس کے گھر میں غیر آ کر کھاتے رہے وہ اپنی اولاد کے لیے کیوں نہیں کرتی۔

اس کے بعد پوتا پوتی کی آمد ہوئی پھر لین دین کا معاملہ، پھر پیسے کی ضرورت پھر نصیب کا رونا۔ پھر اس جنجال میں پھنسی ہوئی نصیبن بوا اور اُن کا صبر۔

☆......☆......☆

نصیبن بوا نے زندگی کے پچیس برس ہمارے گھر گزارے۔

1960ء کے عشرے میں پیدا ہونے والی نصیبن بوا اپنی زندگی کی پچپن بہاریں دیکھ چکی ہیں۔ مگر ان پچپن بہاروں میں ایک بہار بھی اُن کی زندگی میں ہریالی نہ لا سکی۔

ان پچپن سالوں میں انہوں نے ہر رشتے کو پرکھ بھی لیا، ہر رشتے سے دھوکہ بھی کھایا اور ہر قسم کا دکھ بھی دیکھا۔ برے سے برے دور سے گزریں، سختیاں بھی جھیلیں، مصیبتیں بھی اٹھائیں پھر بھی اپنے رب کی رضا پر ثابت قدم رہیں۔

آج نصیبن بوا تن تنہا زندگی گزار رہی ہیں اور اس حال میں بھی اللہ کا لاکھوں بار شکر ادا کرتی ہیں کہ اگر بیٹیاں ہوتی تو کہاں تک ان کی رکھوالی کرتیں کیسے اُن کے بیاہ کرتیں صبر اور شکر کا دامن ہاتھ میں تھامے زندگی کی گاڑی کھینچ رہی ہیں۔

نصیبن بوا اکلوتی بھی تھیں، چار بیٹوں کی ماں بھی تھیں۔ پھر بھی وہ ''وہ'' سکون کیوں نہ پا سکیں۔ جس کی وہ ازل سے حقدار تھیں۔ آہ......اُن کے نصیب!!

☆☆ ☆☆

# خوددار تھے وہ...

عارف شہین روہیلہ

حیدر آباد سے اُس شخص کا قصہ، جس نے ذلت کی زندگی سے عزت کی موت کو ترجیح دی

تحریم باجی کا فون سنتے ہی عادل علی کے اوسان خطا ہوگئے تھے۔ اُس نے بڑے تحمل سے اپنے بابا اور دونوں تایا کو بتادیا تھا۔ دکان پر کھانے کے لیے دسترخوان بچھادیا گیا تھا بس ابا جی کے آنے کی فکر تھی مگر وہ ابھی تک مسجد سے نہیں آئے تھے۔ پھر بڑے تایا ابو کے کہنے پر عادل علی ابا جی کو لینے کے لیے مسجد چلا گیا جبکہ دونوں تایا پریشان حال گھر چلے آئے۔ عادل علی کو مسجد کے گیٹ پر دیکھتے ہی ابا جی کو بھی حیرت ہوئی۔ انہوں نے خیریت پوچھی تو عادل علی نے انہیں صرف اتنا بتایا کہ اماں نے گھر بلوایا ہے۔

عادل علی کا اُترا ہوا چہرہ دیکھتے ہی ابا جی کچھ نہ سمجھ سکے اور حیرت زدہ کیفیت میں عادل علی سے بار بار پوچھتے رہے مگر ہر بار وہ انہیں مطمئن نہ کرسکا خیر دکان آنے کے بجائے وہ انہیں سیدھا گھر لے آیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی ابا جی مزید پریشان ہوگئے کیونکہ دادی اماں سمیت سبھی کے چہرے افسردہ اور لٹکے ہوئے تھے۔ انہوں نے عادل علی کی دادی سے پوچھا۔

''آپ ہی بتایئے، کیا ہوا ہے، خیریت تو ہے؟''

آپ بیٹھ جایئے...... تحمل سے سنیے۔'' پہلو بدلتے ہوئے لق دق، پریشان وہ بیٹھ تو گئے مگر کسی پل بھی وہ اطمینان میں نہ تھے۔ اتنے میں عادل علی کی امی ان کے لیے پانی کا گلاس لے کر آئیں تو انہوں نے ایک گھونٹ پی کر گلاس ایک طرف رکھتے ہوئے پھر اضطرابی کیفیت میں پوچھا تو عادل علی کے ابا آگے بڑھے اور اپنے بابا کے قدموں میں بیٹھتے اور ان کے پیروں کو چھوتے ہوئے بولے۔

''بابا وہ...... خیرو کے کسی دوست نے کسی راہگیر کا موبائل چھیننے کی کوشش کی تھی کہ......'' عادل علی کے ابا نے مختصر کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''آگے بولو۔'' ابا جی نے اپنا دل تھامتے ہوئے کہا۔

''بابا...... وہ پکڑے گئے ہیں...... اور ہمیں تھانے بلوایا ہے۔'' عادل علی کے بابا بلی کو تھیلے سے باہر لائے۔

''اوہ میرے خدا، پھر ایک اور سانحہ...... میں نے اسی لیے منع کیا تھا کہ لڑکے کو موٹر سائیکل نہیں دلواؤ' نجانے کیا گل کھلائے گا...... اب دیکھ لیا۔''

''دیکھیں۔'' پھر وہ اپنی بیگم کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بہت غصے سے بولے۔

''دیکھ لیے اپنے لاڈلے کے کرتوت...... آپ ہی نے اس کی حمایت کی تھی...... اب انجام...... اب اس عمر

میں ہمیں تھانے کوٹ کچہری کا منہ دیکھنا ہوگا۔ خاک کردی ہماری عزت۔'' عادل کے بابا نے خون کے آنسو روتے ہوئے کہا۔

''بابا...... ہمت سے کام لیں...... آپ چلیں گے تو کوئی سبیل نکل آئے گی۔'' عادل علی نے اپنے بابا کو چلنے کے لیے ہمت بڑھائی تو وہ جیسے مردار قدموں اور جسم کے ساتھ اُٹھے۔ جویریہ آپی نے انہیں واسکٹ لا کر دی جو نہ چاہتے ہوئے بھی انہوں نے پہن لی اور اپنے تینوں لڑکوں کے ساتھ باہر چلے آئے۔

☆......☆......☆

تھانے کے لاک اپ میں خیرو کے ساتھ دو لڑکے اور بھی تھے جو کہ شاید اس کے کلاس فیلو اور اسی کے ساتھ پکڑے گئے تھے۔ وہ تینوں بری طرح سے زخمی تھے۔

چاروں سہمے ہوئے دل اور خوف زدہ سی کیفیت میں آفس میں داخل ہوئے۔ اس وقت بڑے صاحب کسی کے ساتھ خاص میٹنگ میں مصروف تھے۔ اسی لیے ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگے، پھر تھوڑی دیر بعد ہی ان دونوں لڑکوں کے والدین بھی پریشان حال آفس میں داخل ہوئے۔ ان سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور ان کی ماؤں کی آنکھوں میں سے آنسو بھی چھلکنے ہی والے تھے۔ شاید وہ بھی اپنے بچوں کی حالتِ زار لاک اپ میں دیکھ آئی تھیں۔ آنے والے سب ہی بھلے ایک دوسرے سے انجان تھے مگر سبھی کے دکھ سانجھے تھے۔ سب کے دل ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھے۔ کافی دیر بعد بڑے صاحب فارغ ہوئے تو ان سب کو اندر آنے کی اجازت ملی۔ سب بیچارے بوڑھے اور شرمسار ٹوٹے



ہوئے دلوں کے ساتھ کسی مجرم کی طرح بڑے صاحب کے سامنے پیش ہوئے۔
ایس ایچ او کلیم ان کے لٹکے اور زرد چہروں کو دیکھتے ہی اپنی کرسی سے اُٹھ کر ان سے ملے اور انہیں عزت کے ساتھ بیٹھنے کے لیے کہا۔ جب آنے والے سبھی حق وق بیٹھ گئے تو کلیم احمد نے بیل بجائی تو فوراً ہی چپڑاسی حاضر ہوا انہوں نے کہا۔
''انور کو بلائیں...... اور تینوں لڑکوں کو بھی لے آئیں۔'' پھر اپنی نشست پر بیٹھتے ہی انہوں نے دھیمے سے لہجے میں کہنا شروع کیا۔
''محترم! یہ تینوں لڑکے شاید پیشہ ور چور نہ ہوں مگر انہوں نے جو کچھ کیا اور کالج ڈریس میں کیا۔ اس سے تو یہی لگتا ہے کہ یہ پیشہ ور ہیں۔'' دوسرے ہی لمحے تینوں لڑکے منہ لٹکائے ہوئے کلیم احمد کے آفس میں روبرو پیش ہوئے۔ انسپکٹر انور بھی ان کے ساتھ تھے۔
''سر......'' انور نے ادب سے کہا۔
''ہاں بھئی ان کی کارگزاری تو بتاؤ۔''
''سر کالج واپسی پر انہوں نے پیدل چلنے والے راہ گیر سے موبائل چھینا یہ...... خیر محمد گاڑی چلا رہا تھا۔ جب یہ موبائل چھین کر بھاگے تو اس راہ گیر نے شور مچا دیا۔ لوگ چوکنا ہو کر ان کی طرف لپکے، گھبراہٹ میں ان کی موٹر سائیکل گر گئی۔
یہ سجاد اور یہ رمضان ڈر کر بھاگے تو لوگوں نے ان دونوں کو بہت دور جا کر پکڑ لیا جبکہ یہ خیر محمد نہ بھاگ سکا کیونکہ اس کے پیر گاڑی میں پھنس گئے تھے۔ ''موبائل ان سے برآمد ہوئے ہیں جو کہ ان میں سے کسی کے بھی نہیں ہیں۔ سر اس وقت ہم گشت پر ہی تھے۔ اگر ہم بروقت نہیں پہنچتے تو مشتعل لوگ ان پر پیٹرول چھڑک کر ان تینوں کو زندہ جلا دیتے۔''
پھر انور نے وہ دونوں موبائل کلیم احمد صاحب کی ٹیبل پر رکھے اور دو قدم پیچھے ہٹ گئے پھر صاحب کے اشارہ کرتے ہی وہ کمرے سے چلے گئے۔
''جی...... سن لی آپ نے ان کی کارگزاری۔'' پھر وہ بچوں کے والدین کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔
''محترم ہم بھی بال بچوں والے ہیں۔ اگر ہم اپنے بچوں کو یونہی کھلی چھوٹ دے دیں گے اور جو کچھ وہ لا رہے ہیں اس کے متعلق پوچھیں گے نہیں تو پھر یہی سب کچھ ہوگا۔
شکر ہے کہ آپ کی ہی پولیس نے ان تینوں کو اپنی جان پر کھیل کر بچا لیا۔ اس اشتعال انگیزی میں پولیس پر بھی جان لیوا حملہ ہو سکتا تھا۔
یہ تینوں مجرم ہیں اور انہوں نے ناقابلِ معافی جرم کیا ہے اور انہیں ان کے کیے کی سزا ضرور ملے گی۔ پہلے ان کے خلاف پرچہ کٹے گا۔ پھر ریمانڈ، جیل، سزا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کالج سے ان کا نام Black List کرایا جائے گا تاکہ زندگی بھر انہیں کسی کالج میں داخلہ نہ ملے۔''
''رحم جناب!'' بڑے تایا ابو ہاتھ جوڑ کر بولے۔ ''یہ ان کی پہلی غلطی ہے، پردہ پوشی فرمائیں۔ ہم اپنے بچوں کے کرتوت پر بہت پشیمان ہیں۔ آپ جو چاہیں انہیں سزا دیں، آپ کو اختیار ہے...... مگر اپنا بچہ جان کر رحم بھی کریں۔'' پھر سجاد و رمضان اور ان کے والدین بھی عاجزی کرتے ہوئے آنسو بہاتے ہوئے التجائیں کرنے لگے جبکہ ابا جی منہ لٹکاتے ہوئے دل ہی دل میں آنسوؤں کا سمندر لیے کرسی پر بیٹھے غم سے گڑے جا رہے تھے۔
''حضور......'' پھر ایس ایچ او کلیم احمد ابا جی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے۔
''کہیے۔ آپ اپنے بچے کی ضمانت لیں گے۔''
''جناب! ہم اپنی پولیس کے مشکور ہیں کہ آپ کی بدولت انہیں دوسری زندگی ملی۔ یہ اتنی جگ ہنسائی کرا کے یہاں سے جائیں گے تو شاید پھر ایسا نہیں کریں گے، مزید احسان فرمائیں اس بار انہیں معاف فرما دیں۔''
''اگر ہم مجرموں کو یونہی چھوڑتے رہے تو معاشرے میں بگاڑ پیدا ہو جائے گا۔
آپ انہیں لے جائیں پیار سے سمجھائیں یا سختی سے، یہ آپ کا مسئلہ ہے اور اگر آئندہ یہ کسی فعل میں پائے گئے تو آپ سب کے گھر تھانے سے دور نہیں ہیں،

جائے۔ ان کی ضمانت دے کر انہیں لے جائیں۔'' پھر انہوں نے بیل بجا کر چپڑاسی کو بلا کر کہا۔

''انور کو بھیجیں۔'' ان سب کے کمرے سے جانے کے بعد انسپکٹر انور، بڑے صاحب کے کمرے میں گئے اور ضروری ہدایت لے کر واپس آئے اور ان تینوں کی شخصی ضمانت لے کر ان کو چھوڑ دیا۔

☆......☆......☆

تھانے سے نکلتے ہوئے وہ آبرو لٹے ہوئے لوگوں کی طرح تھانے سے نکلے۔ شرم وندامت سے ان سب کی نظریں زمین سے نہیں اُٹھ رہی تھیں یہ سب تھانے میں پہلی مرتبہ ملے تھے مگر اپنے بچوں کی وجہ سے یوں ملیں گے کسی نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

جس قدر ان تینوں کو مشتعل افراد نے زدوکوب کیا تھا اسی طرح خیرو کی موٹر سائیکل کو بھی نقصان پہنچایا تھا۔ جو ابھی بھی چلنے کے قابل تھی۔ دونوں تایا ابو اپنی موٹر سائیکل پر سوار ہوگئے۔ جبکہ ابا جی خیرو اور اس کے بابا جان خیرو کی موٹر سائیکل پر سوار ہوگئے اور پھر ٹوٹے ہوئے دلوں کے ساتھ تھانے سے نکل کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔

خیرو کی گاڑی (موٹر سائیکل) اس کے بابا چلا رہے تھے۔ خیرو پیچھے تھا جبکہ ابا جی بیچ میں بیٹھے ہوئے تھے دونوں تایا تو دکان کی طرف چلے گئے جبکہ بابا جان گھر کی طرف آنے لگے۔ راستے میں ہی کوٹری بیراج پڑتا تھا، جب گاڑی بالکل بیچ میں پہنچی تو ابا جی نے خیرو کے بابا سے کہا۔

''ٹھہرو گاڑی روکو۔'' وہ بیچارے کچھ سمجھے نہیں انہوں نے نا چاہتے ہوئے بھی گاڑی روک دی۔

''خیرو اُترو۔'' ابا جی کے کہتے ہی خیرو اُترا تو اس کے ساتھ ہی ابا جی بھی اُتر گئے۔ پھر انہوں نے دو قدم چل کر اپنے ساتھ خیرو کو بلایا اور زمین پر سے ایک پتھر اُٹھا کر بیراج کی گرل کے پاس کھڑے ہو کر بولے۔

''یہ دیکھو۔'' یہ کہہ کر انہوں نے وہ پتھر دریا میں پھینک دیا پھر وہ بولے۔'' وہ پتھر اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ فنا ہوگیا۔ اسی طرح ہم سب فنا ہیں۔ مجھے تو بڑا مان تھا اور اپنی اولاد کی تربیت پر بھی...... میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ زندگی میں، میں اتنا برا وقت بھی دیکھوں گا۔ مجھے تم سے، تمہاری شخصیت سے اور اپنے آپ سے نفرت ہوگئی ہے۔ اتنی بے شرمی کی زندگی گھر لے جانے سے بہتر ہے کہ تم اسی پانی میں ڈوب مرو۔ ہم نے اپنے والدین کی موت پر صبر کرلیا۔ تمہاری موت پر بھی صبر کرلیں گے۔'' ابا جی نے روتے ہوئے خیرو کو بھی رُلا دیا۔

''مجھے معاف کردیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے دوست اتنے برے ہیں۔'' خیرو نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتے ہوئے اپنے دادا سے کہا تو اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

''تم نے خیرو...... ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا۔ تم اس ذلت آمیز زندگی کے ساتھ جی سکتے ہو...... اور ڈوب کر مر بھی نہیں سکتے مگر میں...... میں نہیں۔'' یہ کہتے ہی خیرو کے دادا نے ایک ہی جست میں دریا میں چھلانگ لگادی۔ یہ سب کچھ صرف لمحے بھر میں ہوگیا۔ خیرو کی چیخ نکل گئی اس کے بابا موٹر سائیکل پھینک کر اپنے بابا کی طرف لپکے بھی مگر پانی کی سطح پر ایک زور کے چھپاکے کی آواز آئی اور خیرو کے دادا پانی میں غرق ہوگئے، البتہ ان کی ٹوپی چند لمحوں تک پانی پر بہتی رہی اور پھر وہ بھی دریا برد ہوگئی۔

خیرو کے دادا ایک انتہائی حساس انسان تھے۔ انہوں نے جو کچھ کیا، نجانے غلط تھا یا صحیح تھا۔ مگر خیرو نے جو کیا...... وہ غلطی نہیں تھی...... اس کی کوتاہی کی وجہ سے اس سمیت اس کے تمام گھر والے عمر بھر کے قیدی بن گئے تھے کہ جن کی سزا کبھی بھی ختم نہیں ہوسکتی تھی۔

خیر محمد کے دادا نے عزت پر خود کو قربان کردیا تھا۔ یہ سانحہ ہر برس ماہ جون میں آکر پورے خاندان کو لہو کے آنسو رلاتا ہے۔

اس واقعے کو گزرے پندرہ برس بیت چکے ہیں۔ آج خیر محمد گورنمنٹ کا ملازم ہے اور اپنے دادا کی قربانی کو روز اول کی طرح یاد رکھے ہوئے ہے۔

اس دن کے بعد سے یہ خاندان بھی اپنی نیک نامی اور شرافت کے باعث آج اور زیادہ عزت دار مشہور ہے۔

☆☆......☆☆

# بڑی اماں

تحریر: نگہت غفار

کچھ لوگ اپنے بعد، بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھا جاتے ہیں

بڑی اماں نے بھی اپنے بعد ایسے ہی چراغ روشن کر دیے تھے



جب رات کو میں سارے دن کی تگ و دو اور مصروفیت میں لگی رہی تو کچھ خیال نہ آیا مگر جیسے ہی بستر پر آئی تو اماں ایک دم یاد آ گئیں۔ ہمیں چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے روٹھنے والوں کے لیے ہم ہمیشہ، ہر لمحہ دُکھی ہوتے ہیں۔ اُن کی باتیں یاد کرتے ہیں، روتے ہیں اور پھر خود ہی سنبھل جاتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ زندگی کی گہما گہمی روز و شب کے معمولات سب کچھ تو ویسا ہی رہتا ہے۔ کچھ نہیں بدلتا بس ایک اپنا پیارا کم ہو جاتا ہے۔ آنکھوں سے دور ہو جاتا ہے لیکن دل سے، روح سے دور نہیں ہوتا۔ اسی طرح اماں بھی آج ہمیں چھوڑ کر افق کے اُس پار چلی گئیں، جہاں سے آج تک کوئی لوٹ کر نہیں آیا۔

اچانک میں اٹھی کچھ قریبی رشتہ دار رُک گئے تھے۔ تدفین کے بعد سب نے اپنے اپنے کام کر لیے اب تو عشاء کا وقت ہو چکا تھا۔ میں نے نماز پڑھ کر بستر کا رُخ کیا تو پھر شدت سے اماں نظروں میں آ گئیں۔ میں اکثر جھنجھلا جاتی کہ اماں خدا کے لیے نماز کے وقت کوئی نماز پڑھ رہا ہو...... تو پلیز آپ اپنے قصوں یا کہانی کو تھوڑی دیر کے لیے موقوف کر دیا کریں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ میں اکثر دعائے قنوت میں گڑبڑا جاتی ہوں۔"

مگر آج...... آج میں نے کیسے نماز پڑھی مجھے پتا ہی نہ چلا...... میں نے اپنے گالوں پر بہتے آنسو پلو سے خشک کیے اور اماں کی پیٹی کی طرف بڑھ گئی۔

آج پہلی بار اماں نے صبح مجھے بلا کر یہ چابی دی تھی۔

"بیٹا اسے اپنے پاس سنبھال کر رکھنا۔ جب اس کا وقت آئے گا تب کھولنا۔" میں چابی ہاتھ میں لیے ملول اور افسردہ کھڑی تھی۔ میں کتنی بار اماں سے چابی کے بارے میں پوچھتی تھی اور اماں ہر بار ٹال دیتیں۔

میں اُن سے کہتی اماں سرما کے گرم کپڑے پہلے دھوپ کھلایا کریں۔ پھر استعمال کریں۔" مگر اماں ہر دفعہ خوبصورتی سے ٹال دیتیں۔ کبھی کبھی میں جھنجلا جاتی اور کہتی۔

"پھر آپ یوں کریں اس پیٹی کو اٹھائیں کسی بہو یا بیٹی کے گھر رکھوا دیں۔ آپ تو پیٹی کو ہاتھ لگانے نہیں دیتیں۔ کہیں سے ہو کر آئیں گی تو اس کے زاویے اور سمتوں کی پیمائش کرنے لگتی ہیں۔ میں اسے یوں رکھ گئی تھی۔ یہ یوں ملا۔ کس نے چھیڑا تھا اسے۔"

سب کی شامت آ جاتی۔ سوالات کی بوچھاڑ



ہوتی۔ باری باری سب کو اماں کے دربار میں حاضری دینی پڑتی۔ بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوتا۔

لیکن آج...... آج صبح تو اماں نے مجھے بلا کر چابی دی مگر وقت مقرر کیا کہ ابھی نہیں کھولنا۔

میں نے روتے ہوئے پیٹی کھولی۔ اس قدر سلیقے سے اماں کے کپڑے رکھے تھے دیکھ کر بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ایک بڑا سا چمڑے کا بیگ رکھا تھا، اُس پر ممتاز لکھا تھا۔ کچھ چیزیں اپنی بہوؤں اور بیٹیوں اور نواسیوں اور پوتیوں کے لیے ناموں کی چٹ لگا کر رکھی تھیں۔ میں نے اپنے نام کا بیگ نکالا۔ میں دنگ رہ گئی۔

بیگ میں ایک چھوٹا خوبصورت سا ڈبہ تھا۔ جس میں گولڈ کا بڑا قیمتی سیٹ تھا۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اُس ڈبے میں میری بیٹی ساحرہ کا زیور تھا۔ باقی کپڑے اور کچھ چیزیں میرے لیے تھیں۔ ایک لفافہ جس میں بھاری رقم تھی اس پر

'ساحرہ' کا نام تھا۔
وہ جگ کی اماں تھیں۔ سفید براق جیسے سر سفید بے داغ کرتا شلوار اور سفید بڑا سا دوپٹا۔ اماں پر اس عمر میں بھی نکھار تھا۔ خاص طور پر جب جمعہ ہوتا ان کی تیاریاں صبح ہی شروع ہو جاتیں۔ خاص طور پر ملازمہ کو ہدایت دیتیں کہ ایک بار پھر غسل خانہ دھوا اچھی طرح۔ دیواروں پر بھی خوب پانی مارنا...... بٹیا صفائی نصف ایمان ہے تو بھی جب اپنے گھر نہانے لگے تو غسل خانے کو خوب صاف کرلیا کر، اللہ میاں خوش ہوتے ہیں۔'' اماں کی دو بیٹیاں اور تھیں دو بہوئیں تھیں مگر کوئی بھی ان کو نہیں رکھتا تھا، وجہ صرف اُن کا مسلسل بے مقصد بے لگام بولنا، لوگوں کی ٹوہ میں رہنا، ہر ایک کے بیچ میں بولنا...... ہر بات پوچھنا...... ستم بالائے ستم سنتی بھی کم تھیں۔ اُس پر پنچایت کرنا اور تفصیلی معلومات لینا۔ سمجھانے اور بولنے والا ایک ایک بات کو دو دو تین تین دفعہ زور زور سے دہرائے تب سنتی تھیں اور ایک لمبا سانس لے کر اپنے کاموں میں لگ جاتیں۔

اماں سو سے اوپر کی ہوگئی تھیں مگر اب بھی جوانوں سے بہتر تھیں۔ وقت پر مناسب خوراک لیتیں وقت پر سوتیں۔ اپنی زندگی اور زندگی کے معمولات کے لیے انہوں نے ٹائم ٹیبل بنایا تھا۔

صبح کا ناشتا 8 بجے، دوپہر کا کھانا ظہر کی نماز کے بعد، شام کی چائے پورے پانچ بجے، رات کا کھانا 8 بجے باقی گھر والے کبھی بھی کھائیں انہیں کوئی سروکار نہیں ہوتا تھا۔

ابا جی ایک سرکاری دفتر میں ملازم تھے۔ معقول آمدنی تھی۔ انڈیا کے پڑھے ہوئے تھے اماں بھی مڈل پڑھی تھیں۔ کافی سمجھدار اور سلجھی ہوئی تھیں مگر اکثر کچھ ایسے جملے بول جاتیں کہ آج کل کی یہ ایڈوانس نسل بے ساختہ ہنس پڑتی تو اماں کبھی تو خود بھی ہنس پڑتیں اور کبھی خوب خوب صلواتیں سناتیں۔

تین بیٹیوں اور دو بیٹوں کو اچھی تعلیم و تربیت دی، سب کی شادیاں کیں اماں ابا دونوں نے اپنے فرائض پورے کیے مگر ابا جی کی اچانک موت پر گھر کا شیرازہ بکھر گیا۔ دونوں بیٹوں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ یہ گھر اب ہم دونوں بھائیوں کے استعمال میں رہے گا، جب بکے تب بکے گا پھر بیٹیوں کو اُن کا حصہ دے دیں گے...... اماں پاگلوں کی طرح کبھی ایک تو کبھی دوسرے بیٹے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ بہویں تو سامنے تھیں نہیں طے شدہ پروگرام کے تحت اُن کے شوہروں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا جب ہم اماں سے بات کررہے ہوں گے تم لوگ سامنے نہ رہنا۔ گویا اس معاملے میں، اس فیصلے میں تم لوگ شامل نہیں ہو۔ جبکہ یہ فیصلہ دونوں بہوؤں کا تھا۔ اماں کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ بے حد خوددار اور غیرت مند خاتون تھیں۔ بولیں۔

''تم لوگوں نے میری زندگی میں مجھ سے پوچھے بغیر، مجھ سے مشورہ لیے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کرلیا۔''

''تو کیا ہوا اماں! ہم اب بچے تو نہیں ہیں کہ ہر بات آپ سے پوچھ کر کریں۔'' دونوں نے یک زبان ہو کر جواب دیا تو اماں نے دھیرے سے اقرار میں سر ہلایا۔

''چلو بیٹا کل ہمارے دن تھے، آج تمہارے ہیں اور پھر آنے والے کل تمہارے بچوں کے دن ہوں گے۔'' اماں نے بڑے ہی دُکھ سے اپنی ذہنی کیفیت اور کشمکش کا اظہار ان چند لفظوں میں کیا اور پھر......

دن ایک کے بعد ایک گزرتے رہے لیکن ہر گزرنے والا دن اُن کی تکلیفوں اور دکھوں میں اضافہ کررہا تھا۔ اسد' صمد دونوں بیوی کے محکوم تھے۔ ہر ہر چال اور تیر بہوؤں کے اشارے پر پھینکتے ہر چال اُن کے اشاروں پر چلتے۔

پوتا پوتی بھی اماں سے بدتمیزی کرتے مگر والدین بچوں کو بالکل نہیں ٹوکتے۔

اماں کی عدت ختم ہونے میں ابھی چند دن باقی تھے ایک روز اسد اور صمد نے...... اماں سے کسی فائل پر دستخط کروالیے۔ اماں سے کہا کہ ابا جی کی کچھ رقم ہے وہ رُکی ہوئی ہے اس لیے آپ کے دستخط کی ضرورت ہے۔ اماں انگریزی تو نہ پڑھ سکیں اور یوں بڑی خوبصورتی اور نہایت آسانی کے ساتھ پچاس لاکھ کا

مکان اماں کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔

بھولی بھالی اماں اتنی پنچایت کرنے والی، اتنی جرح کرنے والی، بات کی تہہ تک پہنچنے والی یہاں کچھ بھی نہ کرسکیں۔ اپنی اولاد، اپنے جگر گوشوں پر کیسے بھروسہ نہ کرتیں، خوش تھیں کہ چلو کچھ رقم مل جائے گی۔

اماں کو ٹی وی کا بہت شوق تھا۔ انڈین ہر ڈرامہ دیکھتی تھیں اور دیکھنے والوں کا دیکھنا حرام کرتی تھیں۔

''بس اب شروع ہوگئی اماں کی کمنٹری سن لو...... دیکھ لو...... خاک پلے نہیں پڑے گا۔'' پوتی نے اماں کے قریب سے اُٹھ کر دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اری بٹیا کیا...... کیا کہہ رہی ہے۔ تیری ماں نے کھچڑی بنائی ہے۔ کیوں کیا کسی کو دست ہورہے ہیں۔ آج تو اُس کا پروگرام قیمہ بھرے کریلے بنانے کا تھا۔ مگر ہے کس کی طبیعت خراب۔ میں کل چھوٹی سونی کو منع کررہی تھی ابھی بارشیں نہیں ہوئیں آم نہ کھا مگر نہ جی...... اگر بڑوں کی بات سن لیتی تو اُن کے پیٹ نہ خراب ہوجاتے۔ دیکھو اب بات نہیں سنی پیٹ خراب ہوگیا۔''

''اُفوہ! اماں خدا کے لیے زبان بند رکھیں۔ سب ٹھیک ہے ڈرامہ دیکھیں۔'' دُعا نے چڑتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

ان ہی دنوں میں رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ شروع ہوگیا۔

اماں نماز روزے کی بڑی پابند تھیں۔ اتنی منحنی سی، دبلی پتلی سی، نازک سی گڑیا جیسی اماں میں ماشاء اللہ اسٹیمنا بلا کا تھا۔ ماشاء اللہ پورے تیس روزے رکھتیں۔ خوب خوب عبادت کرتیں۔ ساری رات سوتیں نہ سونے دیتیں۔

''اری چھوکریوں اُٹھ جاؤ! دیکھو تو کیا وقت ہوا ہے؟ دیکھو سحری نہ گزر جائے...... اری بٹیا...... اری شمیم، نسیم کس کی باری ہے. آج سحری پکانے کی۔''

رات دو بجے سے اماں کی آوازیں شروع ہوجاتیں۔

دوپہر میں ظہر کی نماز پڑھ کر قرآن پاک کی تلاوت کرتے کرتے بار بار ٹائم پوچھتیں۔

شمیم اور نسیم جھنجلا جاتیں۔ ''اماں آپ کو افطار

میں ہر چیز وقت پر مل جائے گی۔ آپ قرآن پاک پڑھیں۔'' کچھ دیر کے لیے خموشی ہو جاتی پھر...... قرآن پاک کو چوم کر ریک پر رکھتے ہوئے پلٹتیں۔ سوتی ہوئی پوتیوں کے سرہانے کھڑی ہو جاتیں۔

''اری چھوکریوں اٹھو چلو یہ کیا نحوست ہے۔ روزہ رکھ کر اس طرح منہ لپیٹے سوتے رہنا۔ نہ نماز پڑھنا، نہ قرآن کی تلاوت یہ روزہ تو نہ ہوا فاقہ ہوا۔ یہ تو جانور کو بھی سحری کروا کر ایک درخت سے باندھ دو اور کچھ بھی کھانے پینے کو نہ دو...... تو بھیا اس کا بھی روزہ ہو جائے گا۔ یہ تو نحوست ہے ٹانگ پھیلائے پڑے رہنا۔''

''بس آپ کی کمنٹری ختم ہوئی تو سنیے ہم دونوں نماز پڑھ کر ابھی لیٹے تھے۔'' پوتی بولی۔

''اچھا تو پھر قرآن کیا میں پڑھوں گی بھلا۔'' اماں کہاں چپ رہتیں۔

''نہیں آپ پڑھ چکیں یہی کافی ہے۔'' مہک نے چادر منہ پر تان لی۔ اماں غصے میں بڑبڑاتی آگے بڑھ گئیں۔

''آج کل کی چھوکریاں گز گز بھر کی زبان لیے پھرتی ہیں۔ اے بوا! ایک ہم بھی جوانی سے بڑھاپے تک آئے مگر ایسے ہٹ دھرم تو نہ تھے۔''

☆......☆......☆

ممتاز بیگم اماں سے ملنے آئی ہوئی تھیں، بھاوجوں نے زبردستی روک لیا تھا۔ ویسے بھی ممتاز بیگم سب بہن بھائیوں میں بڑی تھیں۔ سب ان کی عزت کرتے تھے۔ وہ خود بھی بہت اچھی عادات واطوار کی تھیں۔ ہر ایک کو اچھے اور پُرخلوص مشورے دیتیں۔ اماں بھی ان سے زیادہ مانوس تھیں۔ زیادہ تر وہ ممتاز بیگم کے پاس رہتی تھیں۔ آج جیسے ہی ممتاز بیگم پہنچیں وہ بچوں کی طرح اُن کے ساتھ جانے کو تیار تھیں۔

اماں کو ابا کی پنشن ملتی تھی۔ رقم کہاں جاتی ہے...... ہر کسی کو شکوہ رہتا۔ کبھی کبھی ممتاز بیگم بھی پوچھ لیتی تھیں۔ مگر اماں کوئی مناسب جواب نہیں دیتیں بس ایک دفعہ یہ کہا تھا کہ اپنی موت مٹی کے لیے اٹھا کر رکھے ہیں۔

''مگر اماں...... آپ تو بڑی سخی تھیں۔ ہر کوئی آپ کے اس عمل سے نالاں تھا کہ اماں کی پنشن ہر ماہ کہاں جاتی ہے؟ لیکن آج...... آج پتا چلا کہ...... اماں اُن پیسوں کا کیا کرتی تھیں۔ انہوں نے اپنے بچوں اور پوتا پوتی، نواسا، نواسی سب کے لیے کچھ نہ کچھ رکھا تھا۔ آج اماں نے سب کو شرمندہ اور نادم کر دیا۔ سب کے سر ندامت سے جھکے ہوں گے اور لبوں پر اماں کی بخشش کی دعائیں ہوں گی۔ اُن کے اعلیٰ درجات کی دعائیں ہوں گی۔ اماں زبان کی سیدھی اور کھری تھیں مگر دل کی بے حد نرم اور مزاج کی بُردبار تھیں۔

''پچھلے رمضان میں اماں میرے ہی پاس تھیں اور اس رمضان میں......'' ممتاز بیگم نے صندوق بند کیا۔ ہر چیز جوں کی توں ویسے ہی رکھ دی کہ فاتحہ والے دن سب کے سامنے کھولوں گی۔ تاکہ کسی کو کوئی شک نہ ہو۔ کوئی شکایت نہ ہو۔

''آپی اس بار رمضان کتنی خموشی سے گزر رہے ہیں، نہ سحری کی رونق ہے نہ افطار کا مزہ...... اماں کا ٹوکنا، اور کسی کام کو کرنے کے لیے اصرار کرنا، ہمارے فائدے کے لیے ہی تو ہوتا تھا...... اور ہم...... اُن کی باتوں کو کبھی سیریس نہیں لیتے تھے۔''

''آج...... آج...... پچھتانے سے کیا حاصل ہے۔ چلو...... اُٹھو اذان ہو گئی ہے۔ نماز پڑھو میں نے تو پڑھ لی۔'' نواسیاں ایک دوسرے سے اُن کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں۔

''اماں بے چاری مرتے مر گئیں مگر آج تک یہ معمہ حل نہیں ہوا کہ اماں وہ رقم کہاں رکھتی تھیں، کیا کرتی تھیں۔'' نسیم نے کہا تو شمیم بول پڑی۔

''ارے کرنا کیا تھا، سب کو پتا ہے سب دیکھتے تھے کہ وہ زیادہ تر ممتاز آپا کے پاس رہتی تھیں۔ اُن کو چاہتی تھیں۔ سب سے زیادہ اُن ہی سے پیار تھا انہیں۔''

''ہاں سچ کہہ رہی ہو تم...... ممتاز آپا بھی بڑی اونچی چیز ہیں۔ ہمیں ہوا تک لگنے نہ دی۔'' اسد نے کہا تو صفدر نے بھی بولنا فرض سمجھا۔

''اب دیکھنا اپنے بچوں کی شادیاں کیسے کریں

گی۔ آخر اماں کا پیسہ کہیں تو کام آئے گا۔" بیٹے اور بہوئیں دل کے پھپھولے پھوڑ رہے تھے۔

☆......☆☆......☆

ممتاز آپا نے اماں کی فاتحہ میں سب کو بلایا اور اُن کے سامنے صندوق کھولا سب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ سب نے اپنی اپنی چیزیں اٹھالیں مگر ممتاز آپا کے حصے میں آنے والی چیزیں کچھ ضرورت سے زیادہ اور قیمتی تھیں۔ رقم بھی معقول تھی جس پر سب سے زیادہ اعتراض اسد اور صفدر اور ان کی بیویوں کو ہوا۔

"چلیں اماں کا آپ کے پاس زیادہ رہنا آپ کے لیے فائدہ مند ثابت ہوا۔ سب سے زیادہ حصہ آپ کا ہے۔ مزے آگئے آپ کے۔" نسیم اور شمیم طنزاً جملے کس رہی تھیں۔ ممتاز بیگم مسکرائیں اور بڑی دیر تک دونوں کو دیکھتی رہیں۔

"تم لوگوں نے خود ہی یہ ذکر چھیڑا ہے تو سنو تمہاری ساس...... میری ماں تھیں اور ماں کا احترام کرنا، اُن کا خیال رکھنا، اُن کی ہر ضرورت پوری کرنا تم سب کا فرض تھا۔ جہاں تک میرا فرض تھا میں نے اُسے بہ خوبی نبھایا۔ تم سب نے کیا فرض نبھایا، کیا دیا اور کیا کمایا۔ اس کا علم تم سب کو اچھی طرح ہے۔ یہ پچاس لاکھ کا مکان تم لوگوں نے دھوکے سے اپنے نام کروالیا۔ تم خدا اور رسول ﷺ کو بھول گئے۔ ساری بہنوں کو بھول گئے۔ سب کو بے وقوف بنایا۔ کیسے دھوکہ دیا سب کو...... تم لوگوں کو شرم نہیں آئی تھی اپنوں سے اور خاص طور پر بیوہ ماں کے ساتھ ایسا گھناؤنا اذیت ناک مذاق کیا۔"

ہماری ماں بہت ہی نیک، شریف، بُردبار، صابر اور معاف کرنے والی خاتون تھیں۔ انہوں نے اتنا بڑا صدمہ، اتنا بڑا دھوکہ، اتنا بڑا دکھ اور فراڈ کیسے سہ لیا...... منہ سے کچھ نہ بولیں اور سب کچھ دل پر لے لیا۔ ارے انہوں نے تم لوگوں کو معاف کیسے کیا ہوگا، یہ بھی سوچا تم لوگوں نے۔ اُس عظیم ماں کی عظمت کو سلام کرو کہ تم سب کو معاف کر دیا۔ جب ہی تو تم سب کو وہی کچھ ملا جو دوسرے لوگوں کو ملا۔ تمہارا سب سے بڑا حصہ تو تمہاری معافی ہے۔ جو تم کو اتنی آسانی سے انہوں نے دے دی۔ وہ مجھے اپنا راز دار سمجھتی تھیں۔ مجھے اپنی ہر بات سے آگاہ کرتی رہتی تھیں۔" دونوں بھائیوں اور دونوں بھاوجیں سر جھکائے بیٹھے تھے۔

"نسیم اور صفدر کان کھول کر سُن لو، جب بھی یہ گھر بکے گا۔ تینوں بہنوں کا حصہ قانون اور شریعت کے مطابق ہمیں ملنا چاہیے۔ تم کیا سمجھتے ہو۔ ہم تم لوگوں کو معاف کر دیں گے...... نہیں ہمارا ظرف ہماری مرحومہ اماں کی طرح نہیں ہے۔ اب تم اماں سے کسی صورت معافی نہیں مانگ سکتے۔ روؤ، تڑپو، مچلو کچھ بھی کرو...... وہ لوٹ کر نہیں آسکتیں۔ گزرا وقت پیچھے نہیں آسکتا...... اب ساری زندگی کا پچھتاوا ہے۔ اشکِ ندامت ہوں گے اور تم ہو گے۔ اب بھی وقت ہے دونوں اماں کی قبر پر جاؤ رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور معاف کر دیں گی۔ جائے نماز پر بیٹھ کر رب العزت سے عجز و انکساری کے ساتھ رو رو کر ندامتِ اشک بہا بہا کر گڑگڑاؤ۔ وہ خالقِ کائنات بڑا غفورالرحیم ہے۔ ضرور معاف کر دے گا۔"

ممتاز بیگم نے اپنے گالوں پر بہتے آنسو صاف کیے دونوں بھائی بڑی بہن کے سامنے شرمندہ تھے۔ شمیم اور نسیم کے آنسو نکلنے لگے تو انہوں نے دونوں کو گلے سے لگالیا۔ اشکِ ندامت بہتے رہے ان اشکوں کے بہہ جانے سے سب کے دل صاف ہوگئے چہرے خباثت سے پاک ہوگئے تھے۔ سب نے مل کر رات کا کھانا کھایا۔ اچھے ماحول میں گھروں کو رخصت ہوئے۔

ممتاز بیگم آج بہت پُرسکون نظر آرہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے مدتوں سے کوئی الاؤ ان کے اندر دہک رہا تھا آج ٹھنڈا ہوگیا تھا۔ وہ بے حد پُرسکون تھیں۔

آج رات انہوں نے خواب میں دیکھا اماں بھی بے حد خوش اور پُرسکون نظر آرہی تھیں۔ وہ جاگتے ہوئے مسکرائیں۔

اے پروردگار صراطِ مستقیم اور راہ سے بھٹکے ہوؤں کو راہِ راست پر لے آ...... بھٹکے ہوؤں کو اُن کی منزل دلادے آمین۔"

☆☆......☆☆

# جیون ہار دیا

حنا اصغر

لودھراں سے ایک ایسی دوشیزہ کی کتھا، جسے وقت کی بے رحم چکی نے پیس دیا تھا

وہ اپنے ہاتھوں پر رکھے لڈو کو بے یقینی سے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے آنسو اس لڈو پر گر رہے تھے۔ اس کے گرم گرم آنسوؤں سے تقریباً لڈو ایک دم بھیگ چکا تھا، پھر حقارت سے وہ لڈو اپنے قریب بیٹھے جنٹو کے قریب لڑھکا دیا تھا۔ جنٹو منہ لٹکائے جوں کا توں بیٹھا تھا جس لڈو نے اس کی ملکہ کو رُلا دیا تھا، تو وہ کیسے اس لڈو کو کھا سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے بہتے زاروقطار آنسو اس کے دل کی ترجمانی کر رہے تھے۔ جبکہ دوسری جانب اس کے گاہک اس کو بلا رہے تھے۔ تندور پر رش بڑھ رہا تھا۔ اس نے اپنے آنسو پونچھے اور تندور پر روٹیاں لگانے میں خود کو مگن کرنے لگی۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اس کا ہاتھ کئی بار جلا تھا اور وہ زخم خوردہ ہو گیا تھا، اب تو آبلہ پائی کا نہ ختم ہونے والا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

اللہ وسائی کے شوہر جمال الدین کا اپنا ہوٹل تھا۔ اللہ وسائی کی شادی کو چار سال ہونے کو آئے تھے لیکن اس کی گود ابھی تک ہری نہ ہونے پائی تھی۔

جمال الدین اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ اس کے باپ کا بہت عرصے پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ اس کی ماں جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی تھی۔ اسی بیوگی کی چادر اوڑھے اس نے اپنی ساری جوانی گزار دی۔ کئی رشتے دار اس سے شادی کے خواہش مند تھے۔ لیکن اس نے محنت مزدوری کو دوسری شادی پر ترجیح دی۔ اس نے محنت مزدوری کرتے جمال الدین کو پڑھایا تھا جس نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ میٹرک کرنے کے بعد اس نے اپنے مقامی ہوٹل میں بیرا گیری اختیار کر لی تھی کیوں کہ وہ اپنا ہوٹل کھولنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ تین سال مقامی ہوٹل میں بیرا گیری کرنے کے بعد اس نے اپنے دوست کو ہوٹل کھولنے کے لیے آمادہ کر ہی لیا تھا۔

جمال الدین نے اپنی پانچ مرلے زمین جو کہ اس کی اور اس کی ماں کی کل جمع پونجی تھی، بیچ دی تھی اور اپنا سارا جمع جتھا کاروبار پر لگا دیا تھا۔ اس دونوں دوستوں نے اس کے کاروبار کو چلانے کے لیے دن رات ایک کر دیا تھا۔ وہ اپنی کوششوں میں کسی حد تک کامیاب بھی ہو چکے تھے۔ ہوٹل کا کاروبار اچھا چل نکلا۔ ماں بیٹے اچھی زندگی گزار رہے تھے۔ جمال الدین کے دوست بھی اس کے سچے اور سلجھے دار ثابت ہوئے تھے۔ اب اماں کو صبح شام جمال الدین کی شادی کی فکر لگی رہتی۔ انہوں نے اپنے بھائی کی بیٹی اللہ وسائی کا رشتہ جمال الدین کے لیے مانگا تھا جو کہ ان کے بھائی نے بغیر کسی پس و پیش کے قبول کر

لیا تھا اور یوں اللہ وسائی جمال الدین کی زندگی میں شامل ہو گئی تھی۔

اس کی شادی کو محض ایک سال ہی ہوا تھا کہ جمال الدین کی ماں داغ مفارقت دے گئی اور گھر کا سارا انتظام اللہ وسائی کے ہاتھ میں آ گیا۔

جمال الدین اور اللہ وسائی کی شادی کو چار سال ہو گئے تھے۔ لیکن ان کی گود میں ابھی تک کوئی کھلونا نہیں آیا تھا جو ان کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دیتا۔ اللہ وسائی کے صبح و شام اسی فکر میں گزر رہے تھے، لیکن جمال الدین اس کو سمجھاتا۔

''وسائی سوہنے رب پہ بھروسا رکھو، رب سوہنا ہمیں ضرور اولاد دے گا۔'' وہ اپنی پُرامید باتوں سے اس کو کسی حد تک مطمئن کرنے میں کامیاب ہو جاتا اور جب وسائی رب سوہنے سے دعائیں مانگ مانگ کر تھکنے لگی تھی تو شادی کے آٹھویں سال میں رب نے اس کو ایک بیٹی سے نوازا۔

عام سے نقوش والی بچی ان کو کسی ملکہ سے کم نہ لگی تھی۔ وہ ان کی آنکھوں کا تارا تھی۔ اس لیے باہمی رضامندی سے دونوں نے اس کا نام ملکہ رکھ دیا۔

جمال الدین کو اپنی بیٹی سے بہت محبت تھی۔ وہ دن رات اس کے لیے طرح طرح کے منصوبے بناتا کبھی کہتا......

''وسائی میں اپنی دھی کو ڈاکٹر بناؤں گا......'' تو کبھی کہتا......

''میں ملکہ کو یونیورسٹی کی تعلیم دلواؤں گا۔'' اور وسائی محض مسکرانے پر اکتفا کرتی تھی لیکن زندگی نے جمال الدین کو مہلت ہی نہ دی تھی۔

ایک دن وہ صبح سویرے خوش باش گھر سے نکلا تھا اور



شام کو کچھ لوگ اس کو مردہ حالت میں لائے تھے۔ کوئی ٹرک جمال الدین کو بے دردی سے کچل کر گزر گیا تھا۔

اس ناگہانی حادثے نے اللہ وسائی کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس کا گھر چھن چکا تھا، سامان بک چکا تھا، قرض داروں کا تانتا بندھ گیا تھا۔ ہوٹل جمال الدین کے دوستوں نے ہتھیا لیا تھا۔ وہ جیسے سورج کے نیچے آ کھڑی ہوئی تھی، تن تنہا ایک بچی کے ساتھ، اب وہ اس بات کے لیے فکر مند وہ اس کو ویسا مستقبل دے پائے گی۔ جس کے خواب جمال الدین نے دیکھے تھے؟؟ کئی سوالیہ نشانات تھے جن کے گرد اس کی زندگی منڈلانے لگی تھی۔

وہ پکے گھر سے نکل کر ایک پرانے بوسیدہ کچے مکان میں آ چکی تھی۔ اب وہی اس کی کائنات تھی۔

اس کے لیے گوشت سے دالوں کا سفر بہت کٹھن تھا۔ پیٹ کا جہنم بھرنے کے لیے اسے بڑے جتن کرنے پڑ رہے تھے۔ اسے خود سے زیادہ اس بچی کی فکر تھی۔ جو اس کی زندگی کا واحد مقصد تھی۔

ایسا لگنے لگا جیسے طویل آبلہ پائی میں اللہ وسائی نے زندگی گزاری ہو، جسے آرام و سکون کی چھاؤں کبھی میسر ہی نہ آئی ہو۔

☆......☆......☆

اللہ وسائی نے طویل عرصے کی غربت و افلاس سے تنگ آ کر گھر کے باہر ایک تندور سا بنا لیا تھا۔ جتنا پیسا اس کے پاس رہ گیا تھا وہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ اب وہ 12 سے شام تک تندور پر روٹیاں پکاتی تھی، کبھی کبھار بچت ہو جاتی تو سبزیاں اور دالیں پکا کر بیچا کرتی تھی۔ اللہ وسائی نے ملکہ کو سرکاری اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ اب اس کی زندگی کا مقصد صرف اپنے شوہر کی اس خواہش کو پوری کرنا تھا جس کے خواب اس نے ملکہ کی پیدائش پر دیکھے تھے۔ اس کی ساری توجہ ملکہ پر مرکوز تھی۔

وہ جمال الدین کے دیکھے گئے خوابوں سے ہرگز سرتابی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے ملکہ کو آٹھ جماعتیں کرا دی تھیں۔

اللہ وسائی اب ملکہ کا جہیز بنا رہی تھی۔ وہ جلد از جلد اس کی شادی کرنا چاہتی تھی۔ کچھ عورتوں سے اس کے ملنے کہہ بھی رکھا تھا۔ کئی رشتے دار بھی ملکہ کو اپنے گھر کی بہو بنانا چاہتے تھے۔ عارف لوہار، اور بشیر ارابڑی نے تو باقاعدہ ملکہ کا رشتہ مانگا تھا لیکن ہر آنے والے رشتے کا سن کر ملکہ ہتھے سے اکھڑ جایا کرتی تھی۔ وہ اکھڑے لہجے میں کہتی۔

”دیکھ اماں کان کھول کر سن لے۔ میں ان چماروں، کمہاروں میں ہرگز بیاہ نہ کروں گی۔ میں ساری زندگی کنواری رہ جاؤں گی۔ لیکن ایسی گندی شکلوں کو دیکھ کر میرا جی اوب جاتا ہے، ہرگز بیاہ نہ کروں گی۔ میں ملکہ ہوں تو ملکہ ہوں۔ تو مجھے ویسا ہی شوہر ملنا چاہیے۔“

”ملکہ اتنی مزاج دار نہ بن میری رانی، شکلیں تو رب کی دین ہیں۔ دین سے کون انکار کرتا ہے میری بچی، اصل تو سیرت ہے، کردار ہے۔ جس کے پاس یہ دونوں چیزیں نہ ہوں وہ غریب ہے۔ میری بچی تُو، تو خوش نصیب ہے جو گھر بیٹھے اتنے سارے خواہشمند آتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں جہیز زیادہ نہ دے پاؤں گی۔“

اللہ وسائی نے اپنی خوبرو بیٹی کو سمجھاتے ہوئے کہا جو اپنے روپ کے جھولے میں پینگیں لے رہی تھی۔

”اماں تُو کچھ بھی نہ کہہ، میں ہرگز شادی نہیں کروں گی۔ سن لے تو میری۔“

وہ کہہ کر اندر کمرے میں چلی گئی۔ اور وسائی تو جیسے سکتے کی سی کیفیت میں آ گئی تھی۔ وہ کس طرح ملکہ کو زمانے کی اونچ نیچ سمجھائے گی۔ وہ اسی کشمکش و پیچ میں کھڑی اپنے شوہر کو یاد کر بیٹھی اور دو آنسو اس کی آنکھ سے ٹپک پڑے۔

☆......☆......☆

ایک دن ملکہ راستے میں سے کتے کے ایک بچے کو اٹھا کے گھر لے آئی۔ اللہ وسائی اس کو دیکھ کر بھڑک اٹھی۔

”ملکہ اس کو گھر میں کیوں لائی ہے...... ارے گھر میں فرشتے نہیں آتے، برکت نہیں ہوتی۔ جا واپس...... جلدی جا اور چھوڑ کر آ اس کو......“

”اماں رہنے دے پہلے ہمارے گھر میں بہت برکت پڑ رہی ہے نا۔ تیرے تندور کے دوسری جانب بنے چھجے کے نیچے بیٹھا تھا۔ دو دن اس کو روٹی ڈالی ہے میں نے، آج میرے پیچھے آ گیا تھا۔ اماں میں نے اس کا نام

چنٹو رکھا ہے۔ دیکھ کتنا پیارا ہے یہ..... ایک دم گول مٹول۔ مجھے تو بہت اچھا لگ رہا ہے۔ یہ میرا دوست ہے۔اماں ..... دوست..... میرا چنٹو۔'' ملکہ نے کتے کو گود میں لیے پیار کرتے ہوئے اماں سے خوش ہوکر کہا۔

''ملکہ اس کو واپس چھوڑ کر آجا دیکھ تیرے کپڑے خراب ہوگئے ہیں، اب تو تیرا وضو بھی نہ ہوگا۔'' ماں نے سختی سے ڈانٹتے ہوئے ملکہ سے کہا۔

''اماں میں کون سا نماز پڑھتی ہوں۔ جب پڑھوں گی تو نہالوں گی۔ میں اس کو اندر لے جارہی ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر اپنے والد کے کمرے میں چلی گئی اور اللہ وسائی اسے آوازیں دیتی رہ گئی۔ لیکن اس کی آوازوں کا ملکہ نے کوئی خاطر خواہ اثر نہ لیا تھا۔

''رب سوہنے کرم کر اس پر۔ نادان ہے میری بچی۔ مولا اس کے نصیب کھول دے تا کہ میں سکون سے مر سکوں۔'' اللہ وسائی نے وہیں کھڑے کھڑے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر رب کی بارگاہ میں دعا مانگی۔ اس کے بعد گہرا سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی مغرب کی اذان ہورہی تھی اس نے تاسف سے سامنے ملکہ اور اس کی گود میں چنٹو کو بیٹھے دیکھا اور وضو کرنے چل پڑی۔

☆......☆......☆

''ملکہ آخر کیا برائی ہے نور جمال میں۔ ٹرک چلاتا ہے۔ اچھا کما لیتا ہے، کب سے اس کی ماں رشتے کے لیے کہہ رہی ہے۔'' ماں ملکہ کے سامنے بیٹھی ایک اور رشتے کے بارے میں بتا رہی تھی۔

''ماں اس کی شکل دیکھی ہے تو نے، دو فٹ کا تو ہے منہ اس کا۔ اوپر سے کالا سیاہ رنگ ہے۔ پوری پانچ بہنوں کا بھائی ہے۔ گھر بھی ٹوٹا پھوٹا ہے۔ اماں مجھے اس سے شادی نہیں کرنی۔'' ملکہ نے جھٹ سے منہ پھیر کر اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

''ملکہ اتنی مزاج دار نہ بن میری بچی۔ یہ دنیا بہت خراب ہے اور تو نا سمجھ ہے۔ شکلوں سے عشق کرنا چھوڑ دے، کردار کو اپنا لے، وہ بہت اچھا ہے۔ دیکھ تیری کتنی عمر ہوگئی ہے، مجھے ڈر لگتا ہے ملکہ کسی دن میری آنکھیں بند ہو گئیں تو یہ زمانہ تجھے نگلنے میں دیر نہ لگائے گا۔ میری عمر جتنی تھی، جب میری گود میں تو آگئی تھی۔ رحم کر میرے حال پر، میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی، آنکھوں کے سامنے اندھیرا آجاتا ہے، ہر پل ہوکے میرا دل ہولا دیتے ہیں۔''

اللہ وسائی نے اپنے دل کے سارے وسوسے اس کے گوش گزار کر دیے تھے۔ لیکن وہ نخوت سے سر جھٹکتی اندر چلی گئی تھی۔ اور چنٹو بھی اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ اور اس کی ہر بات میں ہاں میں ہاں ملاتا تھا۔ وہ کہتا کچھ نہ تھا لیکن ساری باتیں سمجھتا تھا۔

اللہ وسائی کے خدشات درست ثابت ہونے لگے۔ ایک دن تندور پر روٹیاں پکاتے پکاتے وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔ ملکہ جیسے تیسے کر کے اس کو سرکاری اسپتال لے گئی تھی۔ وہاں اس کے مختلف ٹیسٹ ہوئے تھے۔ اللہ وسائی کے پھیپھڑے جواب دے گئے تھے۔ جمع جتھا سارا دوائیوں پر لگ چکا تھا۔ اللہ وسائی اسپتال سے گھر آگئی تھی۔ لیکن غنودگی کے زیر اثر تھی۔ ڈاکٹروں نے دبی زبان میں اسے جواب دے دیا تھا۔ ملکہ کی دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔

''ملکہ شادی کر لے نور جمال سے خوش رہے گی۔'' اماں کے کہنے پر اس نے سر جھکا لیا۔ اماں نے نور جمال کی ماں کو بھی بلاوا بھیجا لیکن وہ نہیں آئی۔ کیوں کہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اب خالی خولی ملکہ اس کے سر پر منڈھ دی جائے گی۔ یہ دیکھ کر وسائی کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔

گھر کے حالات سے تنگ آ کر ملکہ نے اماں کی جگہ دوبارہ تندور ٹکا لیا۔ عجیب وغریب آدمیوں کے ہجوم اس کے چھکے چھڑا دیتے تھے۔ لیکن وہ دل کڑا کر کے ایک دو کو گالیاں دے ڈالتی، کچھ دست درازی پر اتر آتے تو کچھ آنکھوں سے کام چلاتے اور کچھ دبی زبان و اشاروں کنایوں سے اس کو مفہوم سمجھانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ ایک دن اماں اس کو مفارقت دے گئی۔ یہ دن ملکہ کی زندگی میں تاریکی ذیے کر چلا گیا تھا۔ اس کے عزیز رشتے دار جو کبھی کبھار ملنے آجایا کرتے تھے اب کنی کتراتے تھے۔ گھر میں اپنے چنٹو کے ساتھ تنہا رہ گئی تھی۔ اس کے سر کوئی سائبان بھی نہ تھا۔ مردوں کو شہہ مل گئی تھی۔ وہ کھلم کھلا اس سے گندی باتیں کرتے، اس کو

چھیڑتے لیکن کچھ عرصہ قبل ملکہ نے برداشت کیا پھر ملکہ ان باتوں کی عادی اور حرکات میں ماہر ہوگئی۔ وہ غلیظ باتوں کا جواب ان ہی کے انداز میں دینے لگی تھی۔ کچھ کو بیوی کے طعنے دیتی تو کسی کو محبوبہ سے ڈراتی۔ پھر آہستہ آہستہ جیسے سب ٹھیک ہونے لگا۔

☆......☆......☆

اس کی ہنستی جوانی کا رنگ اب سیاہی مائل ہو چکا تھا۔ جسم کے کسے ہوئے بل نکلنے لگے تھے۔ جوانی جو کبھی کپڑے پھاڑ جھلکتی تھی اب قمیض کے اندر دب گئی تھی۔ اس کے چہرے پر جا بجا چھائیاں پڑ گئی تھیں۔

غربت نے اس کا چہرہ مردہ کر دیا تھا۔ چاند کملا کر بادلوں کی اوٹ میں ہو رہا تھا۔ کسمپرسی و افلاس کی پرچھائیاں اس کے طور اطوار سے با آسانی جانچی جاسکتی تھی۔

ابھی اُن دنوں محلے میں نئے کرائے دار آئے تھے نہ تو وہ محلہ داروں کے ہم پلہ تھے اور نہ ہی میل جول پسند کرتے تھے۔ ان کا ایک نو جوان خوبرو بیٹا ملکہ کے پاس روٹیاں لگانے اور سالن لینے اکثر آجایا کرتا تھا۔ وہ کم سے کم بھی دس سال ملکہ سے چھوٹا تھا۔ لیکن اس کے طور اطوار ملکہ کو بہت بھاتے تھے۔ وہ انتہائی تمیز سے کہتا۔

''ملکہ جی پہلے میری روٹیاں بنا دیں، میں نے کوچنگ کلاسز اٹینڈ کرنے جانا ہے۔'' تو ملکہ سب کے تسلے ایک جانب کو سرکا کر پہلے اس کی روٹیاں بناتی اور ہر روٹی کو پکانے میں اتنی دیر لگاتی، جتنی دیر میں وہ آٹھ روٹیاں بنا لیتی تھی۔ اور وہ جب دوبارہ آتا تو اس کی روٹیوں کی تعریف کیے بنا نہ رہتا تھا، وہ کہتا۔

''ملکہ جی آپ کی بنی ہوئی روٹیاں ہمارے پورے گھر والوں کو پسند ہیں۔ میں کہتا ہوں آخر میری ملکہ جی کی روٹیاں ہیں پسند کیوں نہ آئیں گی۔ اوپر سے سالن کیا لذیذ بنایا تھا مت پوچھیں......''

وہ کہہ کر ایک بار پھر سے چٹخارا لینے لگتا تھا اور ملکہ تو خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرنے لگی تھی۔ انتہائی توجہ سے آج بھی سبزیاں بنائی تھیں۔ اور اس کو تو خاص طور پر زیادہ ڈال کر دی تھیں۔ وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

''پہلے پہل سلمان سے سے روٹیاں پکواتا تھا سالن لیتا اور چلا جاتا تھا۔ لیکن اب دانستاً وہ بیٹھا رہتا تھا۔ اور کن اکھیوں سے ملکہ کو دیکھتا رہتا تھا۔ اس کا اس طرح چوری چوری ملکہ کو دیکھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ ایک سنسنی سی اس کے پورے جسم میں دوڑ جایا کرتی تھی۔ اور اس کے بعد وہ گھنٹہ گھنٹہ اس سے باتیں کیا کرتا تھا، حتیٰ کہ اس کا سیل بجتا گھر والے بلاتے، پھر وہ مارے باندھے جاتا تھا۔

ملکہ نے خود پر خصوصی توجہ دینی شروع کر دی۔ اب وہ روزانہ منہ دھوتی تھی، گھنٹوں شیشہ دیکھتی حتیٰ کہ شیشہ اس کا جھریوں زدہ چہرہ آئینہ کر دیتا یا وہ خوش فہمیوں کے سمندر میں غوطہ زن تھی کہ سب کچھ نظر آنے کے باوجود بھی نظر انداز کر رہی تھی۔

اب اس کے دل میں جینے کی ایک کرن پیدا ہوئی تھی۔ اس عمر میں اسے شدید خواہش محسوس ہو رہی تھی کہ کوئی اس کا ہاتھ تھامے اور اسے بھرپور پیار کرے۔ وہ زندگی کہ جس لمس سے نا آشنا تھی، اسے بھرپور طور پر آشنا کر دے۔

☆......☆......☆

سلمان کی دست درازیاں دن بدن بڑھتی جا رہی تھیں وہ اب بغیر جھجک کے اس کا ہاتھ پکڑ لیتا تو کبھی چھیڑنے لگتا۔ اس حرکت کے باوجود ملکہ خود کو کسی ریاست کی ملکہ تصور کرنے لگی تھی۔ وہ اب سلمان کو اکساتی تھی کہ وہ اس کو اپنانے کے لیے آگے قدم بڑھائے تاکہ ملکہ کی مشقت بھری زندگی سے جان چھوٹ جائے۔ آخر ایک دن اس کو سلمان نے کہہ دیا کہ کل وہ اس کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی اور اہم خبر سنائے گا۔'' وہ جانتی تھی کہ وہ کیا خبر سنانے والا ہے۔

☆......☆......☆

اگلے دن وہ معمول سے زیادہ بناؤ سنگھار میں مگن تھی۔ اس نے گھنٹہ بھر اپنے کھردرے روکھے بالوں کو بہت پیار سے سنوارا تھا۔ چھائیوں بھرا چہرہ بہت پیار سے دھویا تھا۔ اس پر کریم لگائی تھی آنکھوں میں کاجل ڈالا تھا۔ ہونٹوں کو لپ اسٹک سے مزین تھا، کیوں کہ آج اس کی زندگی بدلنے والی تھی۔

وہ بڑی بے تابی سے اس کا انتظار کرنے لگی تھی آج تو وہ نقاب کر کے روٹیاں لگانے لگی تھی تاکہ اس کا میک

اپ خراب نہ ہو جائے۔ دو پہر کے دو بج چکے تھے، تندور پر بہت رش تھا۔ کہ سامنے سے سلمان آتا دکھائی دیا۔ اب اس کی زندگی بدل جائے گی اس نے سلمان کو آتے دیکھ کر دل میں سوچا۔

طویل راتوں کی وہ ڈر کہ مارے جاگتی رہتی تھی اور چنٹو باہر صحن میں جاگتا رہتا تھا تاکہ ملکہ کی حفاظت کر سکے۔ لیکن اب اس کی حفاظت کرنے والا آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا، یعنی سب گھر والے مان گئے تھے۔ دلِ خوش گمان نے خوشی کا عندیہ سنایا تو وہ آپ ہی مسکرا دی تھی۔

''آج میں روٹیاں نہیں لگاؤں گی، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، تم جاؤ سب......'' یہ کہہ کر سب کے تسلے لے کر ایک جانب کو سرکا دیے تھے۔

''لیکن باجی ابھی تو تم بالکل ٹھیک تھیں۔'' ایک بچہ بولا۔

''تجھے بتا کر خراب ہوگی میری طبیعت حرام زادے، چل بھاگ یہاں سے۔'' اس نے جھڑکا یا اس کی زبان کے جوہروں کا کمال تھا کہ سب بچے بگٹٹ بھاگ گئے۔ پھر وہ سلمان کی جانب متوجہ ہوئی اس نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹا دیا۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر سلمان ایک لمحے کو ٹھٹکا پھر ہنستے ہوئے بولا۔

''گویا یہ میری خوشی نہیں ہماری ہے......'' وہ اس کی جانب جھکا تھا اور شرم کی لپیٹوں نے اس کا چہرہ سرخ کر دیا تھا۔

''اور نہ تو ہم کوئی الگ ہیں۔'' ...... ملکہ نے شرما کر کہا تو وہ ہنس دیا اور بولا۔

''بالکل...... بالکل...... اچھا...... یہ لو، یہ کھاؤ...... منہ میٹھا کرو......'' سلمان نے زبردستی ایک لڈو اس کے منہ میں ڈال دیا۔

''کیا تمہارے گھر والے مان گئے......؟'' ملکہ نے خوشی سے لبریز لہجے میں پوچھا۔

''بڑی مشکل سے مانے ہیں۔'' سلمان نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اب شادی کب ہوگی......؟'' ملکہ نے بے صبری

''زینب کے پیپروں کے بعد انشاء اللہ ہو جائے گی۔ اب ملکہ جی تم بھی شادی کر لو، کب کرو گی، اتنی عمر تو ہوگئی ہے تمہاری۔'' سلمان نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب......'' اس کی باتیں ملکہ کے سر کے اوپر سے گزر گئی تھیں۔

''مطلب یہ کہ میری منگیتر کے پیپرز کے بعد نکاح ہوگا ہمارا پھر شادی ہوگی۔''

''کس کا نکاح ہوگا......'' ملکہ کو اب بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

''اوہو...... بھئی ملکہ تم بھی بہت کوڑھ مغز ہو بھئی میر اور زینب کی شادی، اور کس کی۔ کیا تم اپنی اور میری شادی سمجھی ہو؟'' وہ تمسخرانہ لہجے میں بولا تھا۔

خفت سے ملکہ کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ اس کے الفاظ ملکہ کے دل پر آرے چلا رہے تھے۔ اس کو لگا تھا جیسے زمین اپنے مدار سے ہٹ گئی ہو اور آسمان سوا نیزے پر آ گیا ہو۔ اس کی تپش نے اس کا جھائیوں زدہ چہرہ مزید بدصورت بنا دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوابوں کے گرد اڑ رہی تھی۔ وہ ایک لڈو اور اس کے ہاتھ میں تھما کر گنگناتا ہوا چلا گیا۔ جب کہ وہ بے یقینی سے اس کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

آج اس کے ارمانوں کا خون ہو گیا تھا لیکن یہ ارمان اس نے خود جگائے تھے۔ سلمان نے تو صرف ایک بات کہی تھی تو غلط فہمی میں ارمان بن گئی تھی۔

اس کی آنکھوں سے آنسو زار و قطار بہہ رہے تھے۔ اسے اماں کے وہ الفاظ یاد آ رہے تھے۔ اماں کہتی تھی۔

''ملکہ چہروں کے پیچھے نہ بھاگا کر، کردار کو تلاش کر، چہرے دھندلا جاتے ہیں، سنولا جاتے ہیں، مرجھا جاتے ہیں، بدہیئت ہو جاتے ہیں، مگر اگر کردار مضبوط ہو تو ٹوٹتا نہیں، مرجھاتا نہیں ہے، سنولاتا نہیں، بدہیئت نہیں ہوتا، سفید رنگ کی طرح رہتا ہے پاکیزہ، معطر چمکتا ہوا۔'' یہ سوچتے سوچتے لڈو اس کے ہاتھ سے پھسل گیا۔ جس طرح اس کے آئیڈیل کا بت پھسل کر چکنا چور ہوا تھا، بھلا پھسلی ہوئی چیزیں بھی ہتھیلی میں سماتی ہیں وہ زمین پہ بیٹھتی چلی گئی۔ تہی دامن، تہی دل، کیا پاس تھا کچھ بھی تو نہیں......؟ ایک آس تھی وہ بھی ٹوٹ چکی تھی۔

☆☆......☆☆

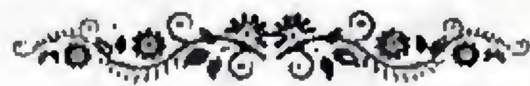
# یقین محکم



بابر نایاب

ساہیوال سے، اُس دوشیزہ کے عزم کی داستان

جس نے عذاب جھیل کر بھی اپنی منزل پالی

''امی جلدی سے ناشتا بنا دو اگر آج مجھے کالج جانے میں دیر ہوگئی نا تو میری خیر نہیں۔'' ثمرین نے اپنے خوبصورت گھنے بالوں پہ کنگھی کرتے ہوئے اونچی آواز میں اپنی امی کو کہا۔

''ثمرین آج تیرے لیے میں نے دو آلو کے پراٹھے بنائے ہیں۔ یہ تو کھا کے ہی کالج جائے گی تو نے اپنی صحت دیکھی ہے۔ کتنی دبلی پتلی ہوگئی ہے ،چل اب آرام سے بیٹھ اور کھا۔ تیرے کالج کو دیر ہوتی ہے تو ہو جائے۔'' ثمرین کی امی فرحت نے محبت اور مٹھاس سے اپنی اکلوتی بیٹی ثمرین کو ناشتا دیتے ہوئے کہا۔

''افوہ امی آپ بھی نا مجھے موٹی بھینس بنا کے ہی چھوڑو گی۔'' ثمرین نے بادل ناخواستہ ایک ہی پراٹھے پہ اکتفا کیا اور جلدی جلدی اپنی کتابیں بیگ میں ڈالیں، بلیک گاؤن پہنا اور امی کو خدا حافظ کہ کر گھر سے نکل پڑی۔

ثمرین کا سٹاپ گھر سے تقریباً دس منٹ کے فاصلے پر تھا آج ثمرین کو کالج سے بہت دیر ہوگئی تھی لہذا ثمرین نے اپنے قدموں کی رفتار تیز کر لی۔ راستے میں نازش بھی مل گئی جو کہ ثمرین کی کلاس فیلو تھی آج تو مس نبیلہ مجھے کالج سے ہی نکال دیں گی۔'' چلتے چلتے ثمرین نے نازش کو کہا۔

''ارے گھبرایا نہ کرو یہ جو ٹیچرز ہوتی ہے نا صرف جھاڑنے کے لیے ہوتی ہیں۔ میری طرح ایک کان سے سنا کرو اور دوسرے کان سے باہر نکال دیا کرو۔'' نازش نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''ہاں ہاں تجھ جیسی ڈھیٹ کا کیا مگر مجھے تو اپنی عزت بہت پیاری ہے۔ مجھے تو زرا بھی ڈانٹ پڑ جائے تو لگتا ہے میری جان ہی نکل جائے گی۔''

''لو جی ابھی تم نے ڈاکٹر بننا ہے کافی کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ابھی سے تمہاری یہ حالت ہے سچ میں تو واقعی ہی بہت ڈرپوک ہے۔ نازش نے ہنستے ہوئے ثمرین کا مذاق اُڑایا۔ جب ثمرین نے غصے کی نگاہ نازش پر ڈالی تو نازش کی بولتی بند ہوگئی۔ اتنی دیر میں سٹاپ بھی آچکا تھا۔ ثمرین اور نازش نے جلدی سے بس میں اپنی جگہ بنائی۔ بس کالج کی طرف روانہ ہوگئی۔

☆......☆......☆

سید طلعت احمد کے گھر جب ثمرین نے آنکھ کھولی تو طلعت احمد خوشی سے جھوم اُٹھا۔ آٹھ سال بعد سید طلعت احمد کو اولاد جیسی نعمت ملی۔ طلعت احمد خدا کا شکر



ادا کرتا نا تھکتا تھا۔ طلعت احمد محکمہ تعلیم میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اور معاشرے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ طلعت احمد نے زندگی بھر سوائے نیک نامی کے کچھ نہیں کمایا تھا۔ زندگی کی کل یہی جمع پونجی تھی جس پر انہیں ہمیشہ فخر رہتا تھا، اسی بنا پر معاشرے میں ایک عزت کا مقام بھی حاصل تھا۔ فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا اور دوسروں کے دکھ درد میں کام آنا طلعت احمد کی خوبیوں میں ایک بہت بڑی خوبی تھی۔

طلعت احمد کا ایک ہی بھائی تھا جس کا نام سید افتخار احمد تھا جو کہ طلعت احمد سے بڑا تھا اور گاؤں میں زمینداری کرتا تھا۔

افتخار احمد کے تین بیٹے تھے سب سے چھوٹے بیٹے کا نام راجو تھا جو کہ افتخار احمد کا بہت لاڈلا تھا اسی بے جا لاڈ پیار نے بچپن سے ہی راجو کو کافی سرکش بنا دیا تھا۔

جب طلعت کے ہاں ثمرین پیدا ہوئی تو افتخار احمد نے اپنے چھوٹے بھائی کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ طلعت یہ آج سے تیری بیٹی نہیں میری بھی بیٹی ہے۔ یہ میں نے اپنے چھوٹے بیٹے راجو کے لیے پسند کر لی ہے۔

''طلعت احمد کو اپنی بھائی کی یہ بات بہت ناگوار گزری چونکہ خوشی کا موقع تھا لہذا طلعت احمد نے اپنے بڑے بھائی کی اس بات کو نظرانداز کر دیا۔ ثمرین کو جب طلعت احمد نے اپنی گود میں اٹھایا تو ایسا لگا جیسے چھوٹی سی پیاری سی ایک ڈول کو اٹھالیا ہے تبھی طلعت احمد کے دل سے دعا نکلی کہ اے پروردگار میری بیٹی کو میری زندگی بھی دے دینا اسے کبھی میری نظروں سے دور نہ کرنا۔ طلعت احمد کو اپنی بیٹی پہ بے انتہا پیار آ رہا تھا طلعت احمد کو لگا جیسے اُس نے کوئی بہت بڑا خزانہ پا لیا ہے۔ ایک منٹ کے لیے بھی وہ ثمرین کو اپنی نگاہوں سے دور نہیں ہونے دیتا تھا۔

وقت پر لگا کر اُڑنے لگا طلعت احمد نے اپنی بیٹی کی پڑھائی پر خصوصی توجہ دی۔ طلعت کا خواب تھا کہ ثمرین بڑی ہو کر ڈاکٹر بنے یہ طلعت کا صرف خواب ہی نہیں بلکہ جنون بھی تھا۔

جیسے جیسے ثمرین بڑی ہوتی جا رہی تھی طلعت کو اپنے خواب کی تعبیر بہت نزدیک محسوس ہو رہی تھی۔ طلعت احمد اپنی بیٹی سے دیوانہ وار محبت کرنے لگا۔ جب ثمرین دس سال کی ہوئی تو شدید بیمار ہو گئی۔ طلعت احمد دو مہینے دفتر نہیں گیا اور ثمرین کی دن رات دیکھ بھال کی اور بہتر سے بہتر علاج کروایا اور خوب صدقہ خیرات دیے اور پھر ثمرین صحت یاب ہو گئی تب جا کر طلعت کے دل کو قرار آیا۔

طلعت کی بیوی فرحت اکثر طلعت احمد کو چھیڑتے ہوئے کہتی تھی کہ لگتا ہے ثمرین کی ماں میں نہیں آپ ہیں، میں تو صرف نام کی ہی ماں ہوں۔'' اس بات پر طلعت مُسکرا دیتا۔

جیسے جیسے ثمرین بڑی ہوتی جا رہی تھی حسن و جمال کا پیکر ہوتی جا رہی تھی۔ ثمرین اپنی خوبصورتی کی وجہ سے اپنے پورے کالج میں مشہور و معروف تھی مگر اتنی خوبصورتی نے بھی ثمرین کو گھمنڈی نہیں بنایا تھا بلکہ ثمرین اپنے باپ کی طرح شفیق اور انتہا درجے کی ہمدرد اور نیک سیرت تھی۔ ثمرین کے لیے بڑے بڑے گھروں سے رشتے آئے مگر طلعت احمد اپنی بیٹی کی جلدی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا جب ثمرین نے میٹرک میں ٹاپ کیا تو طلعت نے پورے محلے میں دل کھول کر مٹھائی بانٹی۔ اب ثمرین سیکنڈ ائیر میں تھی اور دن رات محنت کر رہی تھی تا کہ اچھے سے اچھے نمبرز بن جائیں اور میڈیکل کالج میں آسانی سے داخلہ مل جائے۔

☆......☆......☆

ثمرین کالج سے تھکی ہاری گھر واپس آئی تو اپنے کزن راجو کو گھر کے صحن میں کرسی پر اکڑ کر بیٹھے دیکھا، راجو اکثر و بیشتر بہانے بہانے سے ثمرین کے گھر آ جاتا تھا۔ ثمرین جب راجو کو دیکھتی تو اُس کے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی کیونکہ راجو ایک نمبر کا آوارہ تھا۔ راجو نے آٹھویں کے بعد اسکول چھوڑ دیا تھا اور باپ کی زمینوں پر عیاشی کر رہا تھا۔

ثمرین کی امی نے بھی خاص طور پر راجو کی اوچھی حرکتوں کو محسوس کیا مگر وہ اُسے اپنے گھر آنے سے منع نہیں کر سکتی تھی کیونکہ یہ حق صرف طلعت کو حاصل تھا جو کہ اُس کا چچا تھا۔

''ثمرین کو کالج سے میں لے آیا کروں چچی! دیکھو تو سہی بیچاری بس کے دھکے کھا کھا کر کتنی تھک جاتی ہے۔ میرے پاس تو کار ہے آرام سے لے آیا کروں گا۔''، راجو نے اپنی چچی فرحت کو کہا۔

''نہیں بیٹا ثمرین اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہی جانا پسند کرتی ہے اور اُن کے ساتھ ہی واپس آتی ہے۔ ویسے بھی تمہارے چچا طلعت کبھی کبھی دفتر سے گاڑی بھیج دیتے ہیں ثمرین کو پک اینڈ ڈراپ کے لیے مگر وہ خود ہی پبلک ٹرانسپورٹ میں آتی جاتی ہے۔'' ثمرین کی امی نے راجو کو تفصیلی جواب دیا

''اچھا چچی اب میں چلتا ہوں۔ آپ تو کبھی ہمارے گھر آتی نہیں۔'' راجو نے اپنے لہجے میں مصنوعی سی معصومیت لاتے ہوئے کہا۔

''بس بیٹا گھر کے کام کاج سے فرصت نہیں ملتی، ہاں اب کبھی طلعت کو دفتر سے چھٹی ملی تو ضرور آئیں گے۔'' فرحت نے راجو کو جواب دیا اور پھر راجو چلا گیا۔

''امی یہ اِدھر لینے کیا آتا ہے۔ اس کی بیہودہ نظریں اور خباثت والا چہرہ مجھے زرا پسند نہیں۔'' ثمرین نے غصے سے اپنی امی کو کہا۔

''بیٹا خود پہ کنٹرول کرو۔ وہ تیرا کزن ہے مجھے خود یہاں آنا جانا اچھا نہیں لگتا مگر اب تو ہی بتا میں اُسے کیسے منع کروں۔''

''آپ ابو کو کہیں کہ وہ راجو کو گھر آنے سے منع کریں۔'' ثمرین کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو رہا تھا راجو نے ایک دو دفعہ حد ہی کر دی تھی کالج سے واپسی پر ثمرین کے ہاتھ میں ایک کاغذ کا ٹکڑا پکڑا دیا تھا جو کہ یقیناً راجو کی طرف سے اُس کا محبت نامہ تھا جسے ثمرین نے پڑھے بغیر پھاڑ دیا تھا۔ پھر اُس دن کے بعد راجو نے خط تو نہیں دیا مگر ثمرین کے گھر چکر لگانا اُس کا معمول بن گیا تھا۔

☆......☆......☆

ثمرین نازش کے ساتھ اسٹاپ کی طرف پیدل جا

رہی تھی کہ ایکدم ایک پجارو ثمرین کے بالکل سامنے آ کر رکی جس میں راجو بیٹھا صاف نظر آ رہا تھا اور اُس کے ہونٹوں پہ ایک مکارانہ سی مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ ''آؤ ثمرین تمہیں گاڑی میں کالج چھوڑ دوں۔'' راجو نے ثمرین پر ایک بھرپور نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''نہیں مجھے آپ کی گاڑی کی ضرورت نہیں اور آیندہ کبھی میرے سامنے بھی مت آنا ورنہ میں ابو کو بتا دوں گی۔'' ثمرین نے غصے سے جواب دیا اور آگے بڑھ گئی، پیچھے سے راجو نے جو کچھ کہا اُسے سن کر ثمرین لرز کر رہ گئی۔

''اگر تم میری نہ ہوئی تو میں تمہارے حسن کو جلا کر رکھ دوں گا۔'' یہ راجو نے کہا تھا، یہ صرف ایک جملہ نہیں ایک دھمکی آمیز واضح پیغام تھا۔

پھر جس طرح ثمرین نے کالج تک سفر کیا وہی جانتی تھی۔ یہ تو نازش ساتھ نہ ہوتی تو شاید ثمرین کو اپنے قدموں پر چلنا مشکل ہو جاتا وہ تو ایک نازک سے دل کی مالک تھی۔ اتنی خوفناک دھمکی نے ثمرین کو بری طرح خوفزدہ کر دیا تھا۔

کالج پہنچ کر ثمرین نے اپنے ابو کو کال کی کہ اُس کی طبیعت خراب ہے اور اُسے کالج سے آ کر لے جائیں۔ طلعت احمد جلد ہی کالج پہنچ گیا اور ثمرین کو لیکر گھر آ گیا۔

ثمرین نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اُس سے پہلے راجو کی بدمعاشی مزید بڑھے اپنے ابو کو راجو کے بارے میں سب بتا دے۔



☆......☆......☆

رات کو ثمرین نے اپنے ابو کو تفصیل سے راجو کی دھمکی اور بدمعاشی کے بارے میں سب بتا دیا، طلعت احمد ثمرین کی زبانی اپنے بھتیجے راجو کے بارے میں سن کر سناٹے میں آ گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس کا بھتیجا نیچ اور گھٹیا بھی ہو سکتا ہے۔ طلعت احمد غصے میں آگ بگولہ ہو گئے۔ ساری رات سو نہ سکے اور دوسرے دن صبح سویرے ہی اپنے بھائی افتخار احمد کے گاؤں گئے اور افتخار احمد ایک الگ کمرے میں لے جا کر راجو کی ساری خباثتیں بتا دیں۔ افتخار احمد نے کچھ پل سوچنے کے بعد کہا۔

تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے ثمرین راجو کی منگ ہے۔ یہ تو جوانی میں ایسی چھوٹی موٹی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔'' افتخار احمد کی اس جواب نے طلعت احمد کو حیران پریشان کر دیا۔

''بس بھائی بہت ہو گیا راجو سے میں اپنی بیٹی کے رشتے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ وہ ایک انمول ہیرا ہے اُسے میں کیچڑ میں کبھی نہیں پھینک سکتا۔ آپ جیسے بھائی کے رشتے کی قربانی تو دی جا سکتی ہے مگر اپنی بیٹی کی نہیں جسے میں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ میں اُسے راجو جیسے ان پڑھ جاہل اور آوارہ کے پلے باندھ کر اُس کی زندگی دوزخ میں نہیں ڈال سکتا۔ اب راجو میری بیٹی کے آس پاس بھی دکھائی دیا تو پھر مجبوراً مجھے پولیس سے رجوع کرنا پڑے گا۔'' طلعت احمد نے انتہائی غصے سے اپنے بڑے بھائی افتخار احمد کو کرارہ سا جواب دیا اور اُن کا جواب سنے بغیر گھر سے نکلا آیا۔

☆......☆......☆

ثمرین کے کالج میں آج ہاف ڈے تھا لہٰذا ثمرین کی جلدی چھٹی ہو گئی۔ موسم بھی آج بہت سہانا تھا ثمرین ایسے موسم میں خوب انجوائے کرتی تھی راستے میں ثمرین آئسکریم لے لی۔ سوچا گھر جا کر آرام سے کھائے گی، نازش آج سارے رستے ثمرین کو چھیڑتے ہوئے آ رہی تھی، ثمرین بھی آج کافی موڈ میں تھی اور وہ اپنی پسند کی شاعری موسم کے مزاج کے مطابق نازش کو سنا رہی تھی، راستے میں نازش کا گھر آ گیا تو ثمرین نے اُسے خدا حافظ کہا اور اپنی گلی کی طرف مڑ گئی اچانک سامنے سے آنے والے دو موٹر سائکل سوار افراد میں سے پیچھے بیٹھے ایک آدمی نے بوتل سے کوئی چیز ثمرین پر پھینک دی۔ ثمرین کو لگا جیسے کسی بھیانک آگ نے ثمرین کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو، درد اور اذیت سے ثمرین کی ایک خوفناک چیخ نکل گئی اور ثمرین نیچے گر گئی۔ پھر ثمرین کو کچھ ہوش نہ رہا اُس کے ساتھ کیا قیامت بیتی ہے۔ محلے کے لوگ اکٹھے ہو گئے ثمرین کی آئسکریم اُس کے ہاتھ میں تھی اور شولڈر پر لٹکا بیگ ایک طرف لڑھک گیا۔

ثمرین کی امی کو پتا چلا تو وہ گھر سے بھاگتی ہوئی آئیں اور ثمرین کی حالت دیکھ کر دیوانہ وار چیخنے لگ گئیں۔ اتنے میں محلے کے لوگوں نے جلدی سے ثمرین کو ہسپتال پہنچا دیا طلعت احمد کو اطلاع دے دی گئی تھی۔ وہ بھی جلدی سے ہسپتال پہنچے تو پتا چلا کے ثمرین پر کسی نے تیزاب پھینک دیا ہے۔ طلعت احمد کو لگا جیسے اُن کی جان نکل گئی ہو ہسپتال میں ایک جگہ ایمرجنسی کے باہر طلعت احمد کی بیوی زار قطار رو رہی تھی اور پوری برادری کے لوگ جمع تھے۔ طلعت احمد بھی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور ہچکیاں لے کر رونے لگ گئے۔

مسز فرحت نے اپنے خاوند کو دلاسا دیا مگر آنسوؤں کا اذیت بھرا سمندر تھا جو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ طلعت احمد نے اپنی پوری زندگی کسی کو نہیں پہنچایا تھا مگر آج اُن کی جان سے پیاری بیٹی کو یوں انتقام کا نشانہ بنایا گیا کہ سوچنے سے بھی جھرجھری ہو رہی تھی۔

جس بچی کی ایک تکلیف طلعت احمد کو غمزدہ کر دیتی تھی آج اُسی بچی پر ایک قیامت گزر رہی تھی اور طلعت احمد کا غم کے مارے بُرا حال تھا کچھ ہی دیر بعد ایمرجنسی روم سے ڈاکٹر باہر نکلا اور طلعت احمد کو کہا۔

شکر ہے آپ کی بچی خطرے سے باہر ہے آپ کی بچی کا ہاتھ، کان اور دائیں گال کو تیزاب نے متاثر کیا ہے مگر آپ کی بیٹی کے کندھے پر جو بیگ تھا اُس کی وجہ سے قمر اور جسم باقی حصہ تیزاب سے محفوظ رہ گیا طلعت احمد یہ سن کر سجدے میں گر گیا اور کہا، اے میرے رب تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے تو نے میری بچی کی زندگی رکھ لی، اتنے میں افتخار احمد اور اُسکی بیوی بھی ہسپتال پہنچ چکے تھے افتخار احمد کے چہرے پر کافی پریشانی تھی افتخار احمد نے اپنے بھائی کو گلے سے لگایا اور دلاسہ دیتے ہوئے کہا جس نے بھی یہ ظلم کیا ہے خدا اُسے ضرور سزا دے گا۔ طلعت احمد اپنے بھائی کے گلے لگ کے کافی دیر تک روتا رہا ایک مہینہ تک ڈاکٹرز نے ثمرین کو انتہائی نگہداشت میں رکھا طلعت احمد نے دفتر سے ایک مہینہ تک چھٹی لے لی تھی اور دن رات اپنی بچی کی تیمارداری کی، ثمرین کو جب پوری طرح ہوش آیا تو اُسے اپنے جسم کے مختلف حصوں پر شدید تکلیف کا احساس ہوا ایسا لگ رہا تھا کہ سارا جسم جیسے جل رہا ہو مارے تکلیف کے ثمرین کی آنکھوں سے آنسو آ گئے۔ طلعت احمد نے اپنا ہاتھ ثمرین کے سر پر رکھا اور کہا، میری بیٹی بتا کس نے یہ ظلم تیرے ساتھ کیا ہے میں خود اپنے ہاتھوں سے اُس کو جہنم واصل کروں گا، ثمرین نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دماغ پر تھوڑا زور دیا تو حقیقت واضح ہو گئی۔ جس کے ہاتھ میں تیزاب کی بوتل تھی اس کے ہاتھ کی انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی یقیناً راجو کی تھی ثمرین نے آنکھیں کھولیں اور ہولے سے جواب دیا، ابو جس نے یہ ظلم کیا وہ ہمارا اپنا ہے مگر آپ کو میری قسم آپ قانون کو ہاتھ میں نہیں لیں گے اللہ پاک بہتر فیصلہ کرنے والا ہے اُس کی سزا میں نہیں دے سکتی اُس کی سزا خدا ہی دے گا، طلعت احمد اپنی بیٹی کا جواب سن کر دنگ رہ گیا کل کی چھوٹی سی ڈول آج کتنی بڑی ہو گئی ہے اور کتنی بڑی بڑی باتیں کرنے لگی ہے، مگر بیٹا ظالم کو معاف کر دینا اُس سے بھی بڑا ظلم ہے اُس نے تمہارا چہرہ بگاڑنے کی کوشش کی تمہاری جان لینے کی کوشش کی ہم اُس درندے کو کیسے معاف کر دیں، طلعت احمد نے انتہائی غصے سے جواب دیا، ابو میرا چہرہ بگڑا تو نہیں نا اور اگر بگڑ بھی جاتا تو دل تو نہیں بگڑتا نا، میں تو آج بھی آپ کی پہلی جیسی ڈول ہوں نا۔'' ثمرین نے تکلیف میں بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں میری بیٹی تم پہلے جیسی ہی ہو اور خدا غرق کرے اُس راجو کو جس نے درندگی کی انتہا کر دی مگر میری بیٹی تم جیسا کہو گی ویسا ہی ہو گا۔'' طلعت احمد نے یہ کہتے ہوئے اپنی بیٹی کو گلے سے لگا لیا۔

☆......☆......☆

ثمرین نے جب گھر قدم رکھا تو لگا وہ کسی دوزخ سے نکل کر جنت میں آ گئی ہو۔ سچ ہے گھر جیسا سکون دنیا میں کہیں نہیں مل سکتا، ثمرین نے طویل عرصے بعد آئینہ میں اپنا سراپا دیکھا دائیں گال کے نیچے تیزاب نے کچھ نشان چھوڑ دیے تھے، کان بری طرح جھلس گیا تھا مگر شکر تھا کہ چہرہ مسخ ہونے سے بچ گیا، ثمرین کی

رنگت آج بھی جمالی ہی تھی اور ہونٹوں کی شادابی بھی ویسی ہی تھی، کچھ بھی نہیں بدلا تھا اور بدل بھی کیسے سکتا تھا جب خدا کی ذات نہ چاہے تو کوئی کسی کو زرا بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ ثمرین کے چہرے کا جتنا نقصان ہوا تھا اُس کے بارے میں ڈاکٹرز کی رائے تھی کہ یہ میڈیسن اور ڈاکٹر کی تجویز کی ہوئی کریمز کا ریگولر استعمال رہا تو جلد دائیں گال کی متاثر جلد ٹھیک ہو جائے گی۔

طلعت احمد نے ثمرین کا علاج بیرونِ ملک سے کروایا اور جلد ہی متاثرہ حصہ بھی بہتر ہو گیا۔

ثمرین کی عیادت کے لیے اس کے کالج کی تمام کلاس فیلوز اور ٹیچرز بھی آئیں سب ثمرین کے حوصلے اور ہمت کی داد دیتی رہیں۔

اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی ثمرین ڈگمگائی نہیں اور ثابت قدم رہی، ثمرین نے جس طرح لمحہ لمحہ اذیت اور تکلیف سے وقت گزارہ تھا وہی جانتی تھی یا خدا جانتا تھا۔ کوئی اتنا بھیانک انتقام اپنے دشمن سے بھی نہیں لیتا جتنا دردناک انتقام ثمرین سے لیا گیا تھا اور ثمرین اکثر سوچتی تھی کہ پاکستان میں ہزاروں خواتین کے ساتھ اس قسم کا سلوک کیا جاتا ہے۔ سیکڑوں عورتیں اپنے مسخ چہروں کے ساتھ اپنی باقی ماندہ زندگی گزار رہی ہیں۔

کیا مرد شرم اور احساسِ جرم سے مرتا نہیں؟ اتنا ظلم کر کے بھی وہ دندناتا پھرتا ہے، سچ تو یہ ہی ہے کہ جب انسان بگڑ جائے تو اُس سے بڑا کوئی جانور نہیں اور عورتوں پر ظلم کرنا، اُن پر تیزاب پھینکنا، اُن کی جسمانی اذیت دینا یقیناً یہ کام جانور ہی کر سکتا ہے انسان نہیں۔ وہ عورت جو ماں بھی ہے، بہن بھی ہے، بیٹی بھی ہے اور کسی کی بیوی کی صورت میں بھی ہے آخر مرد انتقام میں اتنا اندھا کیوں ہو جاتا ہے اُسے یہ تک احساس نہیں ہوتا کہ اُس کا انتقام کسی کی زندگی کا خاتمہ ہی نہیں کرے گا بلکہ ساری زندگی پل پل اذیت دے گا۔

ثمرین نے سوچ لیا تھا کہ جب وہ ڈاکٹر بن گئی تو اپنی خدمات تیزاب سے متاثرہ خواتین کے لیے وقف کر دے گی اور اپنا جتنا بھی کمائے گی اُس سے اُن

عورتوں کی مدد کرے گی جو اس عظیم ظلم کا شکار ہیں کیونکہ ثمرین کو پتا چلا گیا تھا جب تک انسان کے ساتھ خود وہ ظلم نہ ہو اُسے تب تک دوسرے پر ہونے والے ظلم کا احساس نہیں ہوتا۔

ثمرین نے دوبارہ سے اپنی تعلیم کے ساتھ رشتہ بحال کرلیا تھا۔ دن رات گھر بیٹھ کر پڑھنے لگی اور پھر ثمرین نے ایف۔ ایس۔ سی میں بھی ٹاپ کر دیا اور شہر کے ایک بہترین میڈیکل کالج میں ایڈمیشن ہو گیا اور وہ دن طلعت احمد کی زندگی میں خوشیوں کا ڈھیر لے کر آیا

-

طلعت احمد نے اس خوشی کی موقع پر ثمرین سے کہا کہ بتاؤ تمہیں کیا گفٹ دوں۔'' تو ثمرین نے جواب دیا۔

''ابو آپ نے جو میری زندگی کے لیے اتنا کچھ کیا۔ یہ میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ بس میں چاہتی ہوں کی میں ظلم کی شکار عورتوں کی مدد کروں اُس حوالے سے آپ کو میری مدد کرنا ہو گی۔''

طلعت احمد پہلے ہی اپنے حصے میں آنے والی زرعی زمین اور جائیداد ثمرین کے نام کر چکے تھے اور ثمرین کے منہ سے یہ بات سن کر حیران رہ گئے اور پیار سے اپنی بیٹی کے پیشانی پر بوسہ لیتے ہوئے کہا۔

''میری بیٹی میرا جو کچھ بھی ہے وہ تیرا ہے اور تو اسے اپنے اس عظیم مشن کے لیے جس طرح مرضی چاہے استعمال کرنا۔ مجھے فخر ہے کہ میں ایک عظیم بیٹی کا باپ ہوں جو دوسروں کی بھلائی کا سوچتی ہے۔''

ایک دن جب ثمرین گھر واپس آئی تو طلعت احمد کے پاس اپنے چچا افتخار احمد اور اُس کی بیوی کو روتے ہوئے دیکھا۔ افتخار احمد نے ثمرین کو دیکھا تو لپک کر ثمرین کی طرف بڑھے اور بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بیٹی جس نے تیرے ساتھ ظلم کیا وہ میرا بیٹا راجو ہی تھا مگر تم لوگوں نے تو اُسے سزا نہیں دی مگر خدا کی ذات نے ضرور دی ہے۔ ہمارے گھر میں آگ لگ گئی۔ ہم سب شادی میں گئے ہوئے تھے اور پیچھے راجو گھر میں اکیلا تھا اور پورا گھر جل گیا اور راجو بھی اُس آگ کی لپیٹ میں آ گیا اور میرا راجو مر گیا بیٹی، میرا راجو مر گیا۔'' یہ کہتے ہوئے افتخار احمد پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اتنے میں طلعت احمد نے آ کر افتخار کو دلاسا دیا، ثمرین کو راجو کی اس دردناک موت کا دکھ ہوا مگر ساتھ میں یہ بھی لگا کہ کون کہتا ہے خدا انصاف میں دیر کرتا ہے خدا کی پکڑ تو بہت سخت ہے۔

''انکل جی میں نے کبھی نہیں چاہا کہ ہم راجو سے کوئی انتقام لیں مگر شاید خدا کو یہی منظور تھا۔ خدا آپ کو صبر دے۔'' ثمرین نے افتخار احمد کو کہا۔

''مگر بیٹی تو میرے بیٹے کو دل سے معاف کر دے تاکہ اُس کی آگے کی منزل آسان ہو جائے۔'' افتخار احمد نے انتہائی منت والے لہجے میں کہا۔

''انکل جی میں خدا کو حاضر ناظر جان کر راجو کو معاف کرتی ہوں۔'' یہ کہہ کر ثمرین اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

☆......☆......☆

آخر ایک طویل اور تھکا دینے والے سفر کے بعد موسم بہار کی آمد آمد ہو گئی باغوں پہ بہار آ گئی۔ ہر ایک چیز نکھر گئی۔ ثمرین کے نام کے ساتھ ڈاکٹر لگ گیا، صرف یہی نہیں بلکہ ثمرین ڈاکٹر فواد کی ہم سفر بھی بن گئی۔ طلعت احمد کا خواب تعبیر پا گیا۔

ثمرین نے اپنے حوصلے اور ناقابل شکست عزم سے یہ ثابت کر دیا کہ وقت کتنا ہی بھیانک اور خوفناک کیوں نہ ہو مگر وہ انسان کے حوصلے اور پختہ عزم کو شکست نہیں دے سکتا۔ ثمرین نے ڈاکٹر بن کر اپنی خدمات اُن ظلم کی شکار عورتوں کے لیے مختص کر دی اور اپنی ساری زرعی زمین بیچ کر ایک فلاحی ادارہ بھی قائم کر دیا جس کے توسط سے ظلم کی شکار عورتوں کا علاج اور تعلیم کے مختلف پروجیکٹ سٹارٹ بھی ہو گئے اور ڈاکٹر فواد نے ثمرین کے اس مشن میں بھرپور ساتھ دیا اور پاکستان کے مخیر حضرات نے بھی اس سلسلے میں بھرپور تعاون کیا۔ ثمرین نے اپنے مشن کی کامیابی پر ایک بھرپور سانس لیا اس سانس میں ثمرین اپنی ماضی کی تلخی کو بہت دور چھوڑ آئی اب صرف خوشیوں کا آنگن ثمرین کا منتظر تھا۔

☆☆......☆☆

# مجبورِ وفا

خوشنما جاوید

کراچی سے، اُس عورت کا قصہ جس نے لفظ برائی کے معنی ہی بدل دیے

''کہاں ہو وجی جلدی آؤ۔ تم نے سُنا نہیں کہاں مرگئے۔'' مامی عروبا نے چلا کر پوری طاقت سے وجی کو پکارا۔ وجی اپنا سارا کام چھوڑ چھاڑ کر مامی عروبا کے پاس پہنچا۔ پہلے تو مامی عروبا نے خوب ڈانٹا پھر بھی غصہ ٹھنڈا نہ ہوا تو بے چارے بچے کے ہاتھ پر جلتی ہوئی استری رکھ دی۔ وجی بلک بلک کر رونے لگا۔ وجی کی عمر اُس وقت صرف آٹھ سال تھی۔

عروبا ہماری سگی مامی تھیں اور وجی اُن کا سگا اور اکلوتا بیٹا تھا۔ مگر وہ ممتا نام کے جذبے سے بالکل عاری تھیں۔ مامی کا تعلق لائنز ایریا کے پسماندہ علاقے سے تھا۔ مامی عروبا کے 9 بہن بھائی تھے، جن میں سات لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ مامی عروبا کی والدہ بھی اچھے کردار کی عورت نہ تھیں۔ اُس نے اپنے پہلے شوہر یعنی مامی کے ابو سے طلاق لے لی تھی اور ایک جوان لڑکے سے شادی کر لی تھی۔ اُس سے ایک بیٹا بھی تھا۔ مامی کے ابو نے بھی شادی کر لی تھی۔ اس طرح تمام بہن بھائی اپنی پھوپو کے پاس حیدرآباد میں رہتے تھے۔

جب مامی کی شادی ہمارے ماموں سے ہوئی تو وہ صرف 16 سال کی تھیں۔ جبکہ ہمارے ماموں 35 سال کے تھے۔ مامی بہت خوبصورت اور سرخ و سفید رنگت والی دوشیزہ تھیں۔ مامی کی سب بہنیں، چونکہ انہیں ماں باپ دونوں ہی کا سایہ نصیب نہ ہوا تھا اس وجہ سے بدکرداری کی طرف چلی گئی تھیں۔ اور بھائی آوارہ اور چوری چکاری کرنے لگے تھے۔ مامی کے ماضی کا پس منظر بتانے کا مقصد یہ تھا کہ انہوں نے کن حالات میں پرورش پائی۔

''جلدی آؤ عروبا تمہاری بہن آئی ہیں۔'' ماموں کی آواز پر مامی اپنا سب کام چھوڑ چھاڑ کر بھاگی ہوئی آئی۔ اور جب سب بہنیں اکٹھا ہو جاتی تھیں تو ماموں کو تنگ کرنے کے نت نئے منصوبے بناتی تھیں۔ کبھی اپنے بھائیوں سے مل کر چوری کروا دیتیں، کبھی فون پر حراساں کر کے پیسے نکلوا لیتی تھیں۔ جب ماموں سے شادی ہوئی تو اتنی خطرناک نہ تھیں لیکن جیسے جیسے ماموں کی دولت کا نشہ چڑھنے لگا تو اب وہ پہلے جیسی سیدھی سادی دوشیزہ نہ رہی تھیں، بلکہ ایک مکار اور خطرناک عورت بن چکی تھیں۔

ہمارے ماموں اکبر علی سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ وہ ایک قابل اور لائق افسر تھے۔ اپنی سرکاری ذمے داریاں بہ خوبی سرانجام دے رہے تھے، چونکہ گھر میں روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ اس وجہ سے ماموں شروع ہی سے ایک نوعمر اور خوبصورت عورت سے شادی کے



خواہش مند تھے۔

اس وجہ سے انہوں نے نہ جانے کتنی امیر کبیر گھرانے کی لڑکیوں کو ٹھکرا دیا تھا۔ ہماری خالہ اور امی نے نہ جانے کتنی لڑکیوں کے یکے بعد دیگرے رشتے دکھائے لیکن انہیں ایک لڑکی پسند نہ آئی۔ شاید یہ اُنہی لڑکیوں کی بددعا تھی کہ مامی عروبا ماموں سے ٹکرائیں۔ ماموں اکبر کی عمر نکلتی جا رہی تھی، اس وجہ سے جب مامی عروبا نے پہل کی تو ماموں نے جلدی سے بغیر سوچے سمجھے ہاں کر دی اور چند رشتے داروں کو بُلا کر نکاح پڑھوا دیا گیا۔

ماموں کو عروبا مامی کے رشتے داروں یا اُن کی پچھلی زندگی سے کچھ لینا دینا نہ تھا۔ بس وہ تو اُن کی خوبصورتی کے اسیر تھے۔ جیسا مامی کہتیں وہ ویسا ہی کرتے تھے۔ اس طرح مامی عروبا ماموں کی زندگی میں آ گئیں۔ سب لوگ اُن کا پس منظر اچھی طرح جانتے تھے، مگر ماموں کے آگے مجبور تھے۔

شادی کے ایک سال بعد ہی مامی نے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ غیر مردوں کی آمد ورفت ماموں کی غیر موجودگی میں جاری رہتی تھی۔ چوبیس گھنٹے مامی کے ہاتھ میں موبائل ہوتا تھا۔ رات رات بھر جاگ کر باتیں ہوتی تھیں۔

''عروبا کہاں ہو تم!''

ماموں اکبر کی آواز پر مامی فوراً ماموں کے پاس حاضر ہو جاتی تھیں۔ ماموں پھولے نہ سماتے کہ میری کم سن بیوی اتنی فرمانبردار ہے۔ مامی کو وہ ہر موقع پر سونے کا بسکٹ دیتے تھے۔

اُن کی یہ خوشی اُس وقت دوچند ہوئی جب انہیں اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹا دیا۔ اُس کا نام ماموں نے وجاہت علی خان رکھا۔

ماموں گھمانے پھرانے کے تو عادی تھے۔ انہوں نے پاکستان کا ہر کونہ مامی کو گھمایا تھا۔ یہاں تک کہ عمرے پر اور دبئی تک لے گئے تھے۔ مہنگے سے مہنگا لباس زیب تن کرنا، اعلیٰ زیورات، میک اپ یعنی جو منہ سے نکالتی وہ ماموں جان پیش کرتے تھے۔

جب ذرا مامی کو ہوش آیا تو اس کا اصل روپ بھی کھل

کر سامنے آ گیا۔ غیر مردوں سے تو وہ پہلے بھی ملتی رہی تھی اور جب سے ایک بچے کی ماں بنی یعنی وجاہت پیدا ہوا تو اس کا رہا سہا ڈر بھی نکل گیا۔ اسی طرح زندگی اپنے ڈگر پر رواں دواں تھی۔ ماموں پیسے کمانے کے چکر میں دن رات مصروف رہتے تھے اور وہ عورت ماموں کی کمائی پر عیش وعیاشی کرتی تھی۔

ایک سال بعد اُن کے گھر ایک اور بیٹی نے جنم لیا۔ اس ننھی پری کا نام انعم رکھا گیا۔ ماموں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اس کے بعد ایک اور بچی ایمان اس دنیا میں آئی۔ اب تو ماموں کی کمر جھک چکی تھی۔ عمر کی جھریاں اُن کے چہرے سے عیاں تھیں۔ ماموں اپنی بیوی اور بچوں سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ اس محبت میں اُن کی جائز و ناجائز فرمائش آنکھیں بند کر کے پوری کرتے۔



جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مامی عروبا ڈنکے کی چوٹ پر ہر بُرا کام کرتی۔ اُسے بچوں کی بھی پروا نہ تھی۔ پورا گھر برائی کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ یہاں تک کے خاندان کے ہر آدمی کی زبان پر مامی عروبا کا ذکر ہوتا تھا۔ اس صورتِ حال کو بھانپتے ہوئے ماموں نے تمام رشتے داروں کے مردوں کا گھر میں آنا منع کر دیا تھا۔

جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آئے دن گھر میں جھگڑے رہنے لگے۔ اگر زیادہ سختی کرتے تو نشے کی گولیاں کھا کر مامی عروبا اسپتال پہنچ جاتیں اور ماموں بے چارے رات رات بھر اسپتال میں پڑے رہتے اور اس کی خدمت کرتے رہتے تھے۔

اگر ہماری خالہ ماموں سے کہتی کہ مامی کو طلاق دے دو تو وہ کہتے۔

”میرے بچوں کو کون سنبھالے گا۔ بچے بھی اتنے بگڑ چکے تھے کہ شاید ہی سوتیلی ماں انہیں برداشت کرتی۔“ اس وجہ سے ماموں عروبا کے احسان مند رہتے تھے۔ اور اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتے تھے کہ وہ میرے گھر میں رہ رہی ہے۔

دوسری طرف اُن کے بچے بڑے ہو رہے تھے اور مامی اپنی پوری جدوجہد کے ساتھ تینوں بچوں کو بگاڑنے میں لگی ہوئی تھیں۔ بچوں نے بھی ہر غلط عادت وحرکات سیکھ لی تھیں۔ ہر بچے کے ہاتھ میں مہنگا سے مہنگا موبائل ہوتا تھا۔ اور اگر ماموں منع کرتے تو وجاہت ماموں پر ہاتھ بھی اُٹھاتا تھا۔

اگر ہماری خالہ ماموں کو کسی بات کا بتاتی تو نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ مامی اُن خالہ کا داخلہ اپنے گھر بند کروا دیتی تھیں اور کو باہر سے یہ دھمکی ملتی تھی کہ اگر تم نے منہ کھولا یا عروبا کو کچھ کہا تو تمہیں مروا دیں گے۔ اس وجہ سے ماموں خاموش ایک طرف پڑے رہتے تھے۔

ہماری امی اُن کے معاملے میں زیادہ نہیں بولتی تھیں، اس وجہ سے اُن کا داخلہ منع نہیں تھا۔ کیونکہ مامی کو ہم لوگوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ چونکہ ہمارے ایک ہی ماموں ہیں اور ہم نہیں چاہتے کہ اُن کے گھر مین لڑائی جھگڑا ہو۔ جبکہ ماموں اپنی بیوی سے بے انتہا پیار کرتے ہیں۔ وہ ہر بات میں اُس ہی کی طرف داری کرتے تھے۔ اس لیے کہنے والا خود ہی شرمندہ ہو کر چپ ہو جاتا تھا۔

اس لیے ہم لوگوں نے اُن کو اُن کے حال پر چھوڑ رکھا تھا۔ ہاں کبھی کبھار اُن کے گھر چکر لگا آتے تھے۔

وجیہی نے بھی اب باپ کی طرح چپ سادھ لی تھی۔ اگر وہ ماں کو کسی نامحرم کے ساتھ فون پر گفتگو کرتے دیکھتا تو نظر انداز کر دیتا تھا اور لڑکیاں ماں کے رنگ میں پوری طرح رنگ چکی تھیں۔ ہر ایک سے تلخ گفتگو کرنا، فقرے کسنا اور نفرت کی نگاہ سے دیکھنا۔

چوبیس گھنٹے وہ بھی موبائل یا انٹرنیٹ پر چیٹنگ کرنا اُن کا معمول بن چکا تھا۔

اب وجاہت دسویں کلاس میں اور بچیاں انعم اور ایمان چھٹی اور ساتویں جماعت میں ہیں۔ اُن کی اٹھان اور باتیں دیکھ کر ہر کوئی انہیں بڑا ہی سمجھتا۔ گھر کے حالات نے بچیوں کو وقت سے پہلے ہی بڑا کر دیا تھا۔ انٹرنیٹ پر اُن کا کس سے رابطہ ہے اور کیا گفتگو کر رہی ہیں۔ کسی کو ایک دوسرے سے سروکار نہ تھا۔ ماں الگ فون پر لگی ہوتی ہے اور لڑکیاں الگ لگی ہوتی ہیں۔

مامی عروبا جب تک خود کسی سے پیچھا نہ چھڑانا چاہتی، اُن سے کوئی بھی پیچھا نہیں چھڑا سکتا تھا اور کوئی اِن سے گستاخی کرنا چاہے تو نہ جانے مامی کے قبضے میں

کتنے لوگ تھے کہ اُن کا ٹھکانا قبرستان ہوتا تھا۔ یا پھر اُس کا گھر تباہ و برباد ہو جاتا تھا۔ اس عورت نے 18 سال سے لے کر 70 سال تک کے شخص سے اپنے مراسم رکھے تھے۔

اب مامی عروبا ماموں سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔ اس لیے اُس نے صاف الفاظ میں ماموں سے طلاق کا مطالبہ کر دیا اور ماموں کے لاکھ نا چاہنے پر بھی اُس سے طلاق لے لی تھی۔

ماموں ہمیشہ سے ڈرتے تھے کہ بچے اتنے بگڑ چکے ہیں۔ اب انہیں کون رکھے گا۔ اس لیے انہوں نے اپنے ڈیفنس کے بنگلے کو چھوڑ کر جہاں مامی اب اپنے دوسرے شوہر کے ساتھ رہ رہی تھیں، وہاں ایک چھوٹا سا 200 گز کا گھر خرید لیا۔ مامی اپنے دوسرے شوہر کے ساتھ رہ رہی تھی، تمام رشتے داروں نے اُن سے ناتا توڑ لیا تھا۔

ماموں مجبوراً اس عورت کو برداشت کر رہے تھے اور ساتھ رہنے پر مجبور تھے۔ باوجود اُس کے کہ وہ دوسری شادی کر چکی تھی۔

ماموں کی جائیداد کی وجہ سے اس عورت نے یہ حل نکالا کہ وہ ایک ساتھ رہیں۔ اگر وہ اپنے شوہر کو لے کر علیحدہ ہو جاتی تو اُسے یہ جائیداد اور عیش و آرام والی زندگی کو خیر باد کہنا پڑتا اور ماموں کے عقل پر تو پتھر پڑ چکے تھے۔ انہیں اس بات سے کوئی سروکار نہ تھا کہ وہ کس کے ساتھ رہ رہے ہیں۔

اب مامی کا کم عمر شوہر جو مامی سے 5 سال چھوٹا تھا اور مامی کے بچے اور ماموں ایک ساتھ رہ رہے ہیں۔

ماموں اپنے بچوں کے بگڑنے سے بخوبی واقف ہیں۔ مگر اب وہ مجبور ہیں۔ اب بھی وہ مامی کا ہی ساتھ دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ شاید میری سابقہ بیوی میری میرے اوپر احسان کر رہی ہے۔

سب لوگوں نے کئی بار ماموں کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ نہیں مانے۔ اُن کے خیال میں دوسری عورت اگر آتی تو شاید بچے رُل جاتے۔ حالانکہ سارا کام گھر کا خود ہی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ خود ہی چائے بنا کر اپنی سابقہ بیوی کو دیتے ہیں۔ اُس کا علاج معالجہ بھی خود ہی کرواتے ہیں۔

آخر میں میں اپنے سب پڑھنے والوں سے یہ التماس کرتی ہوں کہ میرے ماموں کے حق میں دعا کریں۔ کیا معلوم کس کی دعا میں تاثیر ہو اور ماموں کی زندگی بدل جائے۔

☆☆......☆☆

# اب کہاں بھاگو گے؟

ایم اے شکیل

ڈیرہ اللہ یار سے، اُس شخص کی کہانی، جو تاعمر اپنی فیملی سے بھاگتا رہا مگر......

علی بابا دفتر میں داخل ہوا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑی ہوئی تھیں۔

''کیا ہوا خیر تو ہے۔'' میں نے پوچھا۔ ''لگتا ہے کوئی بڑی پریشانی ہے۔'' علی بابا تقریباً لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا اور اپنی کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔

''تم تو یہی کہو گے کہ یہ میرا وہم ہے۔ مگر رات پھر وہی ہوا۔ مجھے پھر وہی چیخ سنائی دی جیسے کوئی عورت زور زور سے چلا رہی ہے۔ مدد کے لیے پکار رہی ہے۔ اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔'' علی بابا نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر کہا۔ میں نے اس کے قریب اپنی کرسی کھسکائی اور پوچھا۔

''تمہیں یقین ہے کہ وہ کسی عورت کی ہی آواز تھی۔'' علی بابا نے کہا۔

''کمال کرتے ہو، کیا میں عورت اور مرد کی آواز میں تمیز نہیں کر سکتا۔''

میں نے وضاحت کی۔ ''میرا مطلب ہے کہ شاید وہ سچ مچ کی عورت نہ ہو بلکہ کسی ڈرامے کا کردار ہو، چوبیس گھنٹے تو لوگ یہاں ٹی وی دیکھتے رہتے ہیں۔ کیا پتا کسی گھر میں کیبل پر کوئی فلم چل رہی ہو یا ٹی وی کے کسی چینل پر۔''

علی بابا نے کہا۔ ''ہرگز نہیں۔''

''تب تو تمہیں چاہیے تھا کہ باہر نکل کر پتا کرتے کہیں سچ مچ کوئی عورت مصیبت میں نہ ہو۔'' علی بابا بولا۔

''پہلے مجھے بھی یہی خیال آیا تھا اور میں نے پڑوسیوں سے بھی پتا کیا تھا مگر......''

''مگر کیا......'' میں نے پوچھا۔ علی بابا نے کہا۔

''ہمارے فلور میں تو کوئی فیملی والا ہی نہیں، سنا تھا کہ اوپر کے دو ایک فلیٹوں میں کچھ فیملیز رہتی ہیں۔''

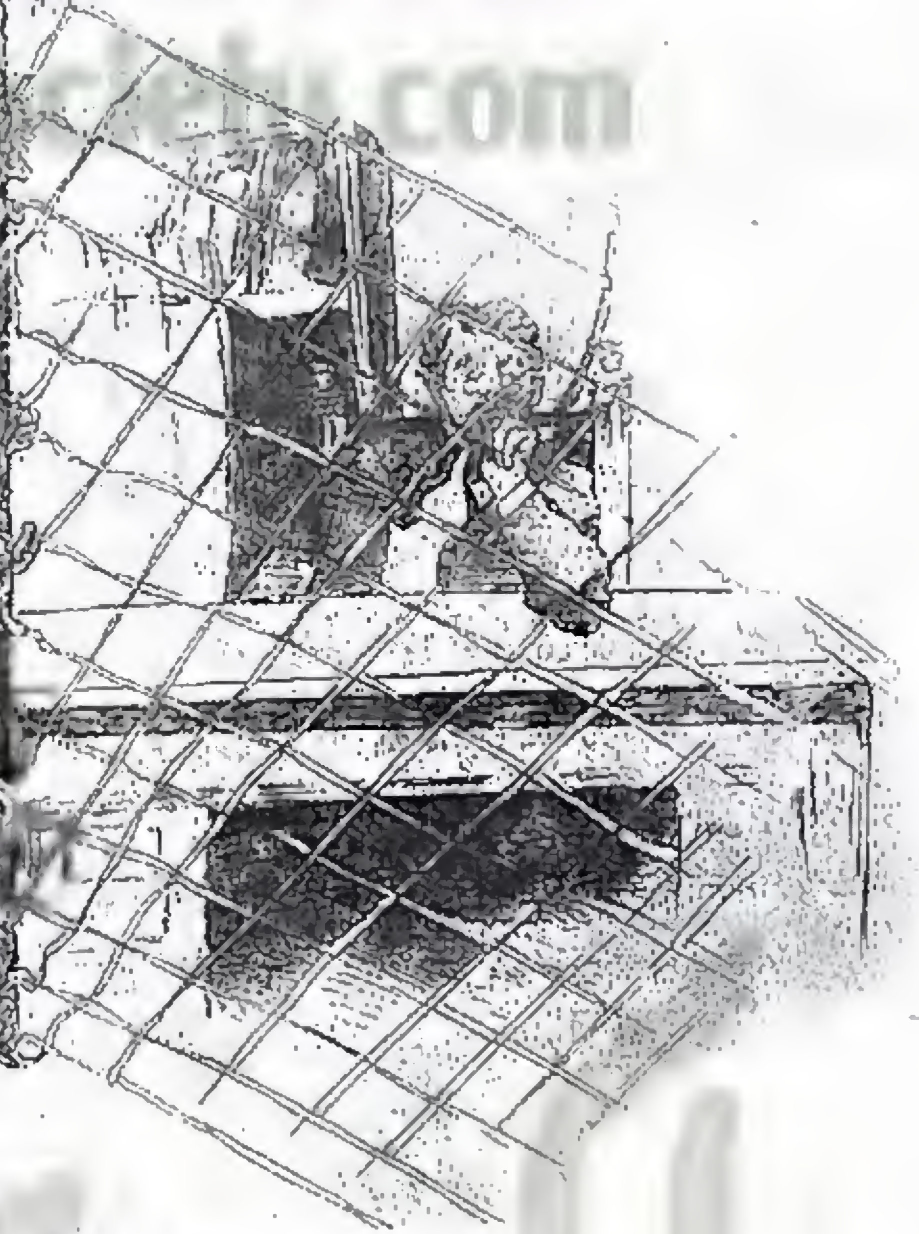
''تو۔'' علی بابا نے کہا۔

''میں نے سوچا شاید کوئی بیوی اپنے شوہر کی زیادتیوں کا نشانہ بن رہی ہو یا پھر شاید کوئی خادمہ۔'' میں نے کہا۔

''ہاں یہ ممکن ہے۔ بعض سنگدل لوگ اپنی خادماؤں کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں۔ اخبارات میں تو روز ایسے نجانے کتنے قصے ہوتے ہیں۔''

''مگر میری ساری کوشش ناکام ہو گئیں۔ میں نے ہر طرف پتا کیا لیکن کچھ معلوم نہیں ہوا۔ اوپر والی منزل میں ایک صاحب سے پوچھا تو وہ بڑے متعجب ہوئے۔ کہنے لگے۔ یقیناً آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے





صاحب! میں تو دو سال سے یہاں مقیم ہوں اور دل میں یہ حسرت باقی ہے کہ کبھی تو کوئی غیر مردانہ آواز کان میں پڑے۔''

میں نے کہا۔ ''چلو پھر تو تمہارا وہم دور ہو گیا ہوگا۔ اب آرام سے سونا۔ تمہیں بھی آئے دن کوئی نہ کوئی پریشانی رہتی ہے۔ خوامخواہ۔'' علی بابا نے کہا۔

''میں بھی یہی سمجھا تھا چار دن پہلے جب اوپر کی منزل والے صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے سوچ لیا تھا کہ آخر یہ قصہ ختم ہو گیا۔ وہم کی بھی تو آخر ایک حد ہوتی ہے مگر۔''

''مگر......'' میرے کان کھڑے ہوئے۔

''مگر کل رات بھر میں نے وہی چیخ سنی۔ کسی عورت کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز...... جیسے وہ بیتاب ہو کر کسی کو پکار رہی ہو۔''

''ارے۔'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''وہی آواز جو تم بار بار سن چکے ہو۔''

''بالکل میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں۔'' علی بابا نے کہا۔

''فلیٹ میں اور کون کون رہتا ہے۔ تمہارے ساتھ۔''

علی بابا نے جواب دیا۔ ''میں ایک دوست کے ساتھ رہتا ہوں۔ مگر آج کل وہ چھٹی پر اپنے گھر گیا ہوا ہے۔ میں اکیلا ہی ہوں البتہ ان دنوں میرا بیٹا آیا ہوا ہے میرے پاس۔ اِسے حال ہی میں یہاں نوکری ملی ہے۔ زیادہ تر تو وہ سمندر میں تیل کی تنصیبات پر رہے گا لیکن مہینے میں کم از کم ہفتے بھر کے لیے میرے پاس آیا کرے گا۔'' میں نے پوچھا۔

''جب تمہیں اس عورت کی چیخ سنائی دی تو تمہارا بیٹا وہاں موجود تھا۔''

''ہاں، اسی روز تو وہ آیا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ اس نے بھی وہ آوازیں ضرور سنی ہوں گی۔''

''پتا نہیں شاید وہ سو رہا ہوگا۔''

''تو کیا تم نے اس سے اس بارے میں پوچھا تھا۔'' میرا سوال بر وقت تھا۔

''ہاں صبح اُٹھ کر میں نے اس سے پوچھا تھا۔ مگر اس نے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس نے بتایا کہ اسے تو گہری نیند کی وجہ سے کوئی آواز سنائی نہیں دی۔''

''کوئی بات نہیں اب دوبارہ وہ چیخ سنائی دے تو اس سے دوبارہ پوچھنا۔'' میں نے علی بابا کو تسلی دی۔

علی بابا کے بارے میں مشہور تھا کہ اسے غیب کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ وہ ایسے لوگوں سے باتیں کرتا ہے جو کبھی اس سے نہیں ملے۔ ایسے منظر دیکھتا ہے جو کبھی دوسروں کو نظر نہیں آئے۔ وہ شاید غیب کی دنیا کا باشندہ تھا۔ وہ پچھلے پچیس سال سے یہاں رہ رہا تھا اور تیل کمپنی کے اکاؤنٹس کے شعبے میں ملازم تھا۔ کچھ دنوں سے اسے راتوں میں اچانک کسی عورت کے چیخنے کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ یہ دور پہلے بھی اس پر گزرا تھا، مگر پھر خودبخود سب کچھ ٹھیک ہوگیا تھا۔

اس کا کہنا تھا کہ شاید وہ عورت کہیں چلی گئی تھی یا شاید اس کی بے چین روح کو قرار آگیا تھا۔ لیکن وہ عورت کون تھی اور اس پر کیا افتاد پڑی تھی، اس بارے میں کبھی کوئی نہیں جان پایا۔

☆......☆......☆

اور علی بابا کی راتیں اس عورت کی چیخوں سے بھر گئی تھیں۔ اس کی وحشت بڑھ گئی تھی۔ اس کی طبیعت ایک دن اتنی زیادہ خراب ہوگئی کہ اسے اسپتال میں داخل کرنا پڑا۔

اس کا قریبی دوست ہونے کی وجہ سے مجھے اس کا معالج کبھی کبھی اپنے کمرے میں بلا لیتا۔ ایک دن میں نے اس سے سوال کیا۔

''آپ کا کیا خیال ہے یہ کسی چیخیں ہیں جو اس کے وجود پر چھا گئی ہیں اور جن کا سراغ نہیں ملتا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''یہ چیخیں دراصل ان کے دماغ میں ہیں۔ حقیقی زندگی میں ان کا وجود نہیں مگر اسے ان سے چھٹکارا دلانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ذہن و دل کے تمام دریچے کھول دیے جائیں اور اس کی ذات کی راہداریوں میں قدم بڑھاتے خوف کو بے نقاب کردیا جائے۔''

''مگر ڈاکٹر یہ سب کیسے ہوگا۔''

میں نے حیرت زدہ ہوکر سوال کیا۔ جس کا جواب ڈاکٹر نے یہ دیا کہ اس کے لیے خود علی بابا کو اپنی روح کی گرہیں کھولنی ہوں گی۔

☆......☆......☆

اس دن میں علی بابا سے ملنے گیا تو اپنے بستر پر چت لیٹا ہوا۔ چھت کو گھور رہا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ میں نے اس کے پاس پہنچ کر کہا۔

''علی بابا کیسے ہو۔ چہرے پر تو بڑی رونق ہے۔ ماند پڑتے خضاب کے باوجود داڑھی کی دلکشی بڑھ گئی ہے اور......''

علی بابا نے آنکھیں کھول دیں اور تنک کر بولا۔'' مذاق مت کرو، میرے لیے دعا کرو۔ میں بڑی مصیبت میں ہوں۔''

میں نے بناوٹی خوش دلی کا موڈ برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ''کیسی مصیبت، کہاں کی آفت بھائی، تم تو خوش نصیب لوگوں میں سے ہو جن کے کانوں میں بڑھاپے میں بھی نئی نئی نسوانی آوازیں رس گھولتی ہیں۔''

علی بابا بے دلی سے مسکرایا۔ ''نسوانی آوازیں نہیں چیخیں کہو۔''

''تعجب ہے بھائی گھر تو گھر اسپتال میں بھی......''

علی بابا نے پھر سے چھت پر لگا دیں پھر بولا۔'' وہ چہرہ دیکھ رہے ہو اوپر۔''

''کیا......'' میں حیران ہوا۔ ''کہاں۔''

علی بابا نے چھت کی طرف اشارہ کیا۔

''اوپر دیکھو۔'' کمرے کی سجاوٹی چھت میں بارش کا پانی رسنے سے ایک بے ہنگم سا دھبہ ابھر آیا تھا۔ گول اور کچھ چوکور سا۔ علی بابا نے کہا۔

''مجھے پتا ہے رات کو ادھر سے چیخوں کی آوازیں آتی ہیں۔''

''کیا باتیں کرتے ہو یار۔ بارش کے پانی کے اس بدنما دھبے کو تم عورت کا چہرہ سمجھ رہے ہو۔ چلو اسے

گھورنا بند کردو۔ میں ڈاکٹر سے کہتا ہوں تمہارا بستر یہاں سے کہیں اور شفٹ کردے۔" یہ کہہ کر میں چلا گیا۔

☆......☆......☆

دوسرے دن ڈاکٹر نے مجھے فون کیا۔

"سُنیئے! آپ کو پتا ہے نورین کس کا نام ہے؟"

میں نے کہا کہ مجھے تو نہیں معلوم مگر زبیر کو آنے دیں اسے ضرور پتا ہوگا۔"

"کون علی بابا کا بیٹا۔" ڈاکٹر نے برجستہ کہا۔

"ہاں وہ سمندر میں آئل کمپنی میں پر کام کرتا ہے مگر جب شہر آتا ہے تو یہیں پر ٹھہرتا ہے، اپنے باپ کے پاس۔" عجیب اتفاق ہے کہ اس بار علی بابا کے اسپتال میں داخل ہونے سے ایک دن پہلے ہی وہ اپنی ڈیوٹی پر گیا تھا۔

☆......☆......☆

زبیر سمندری ڈیوٹی سے فارغ ہوتے ہی گھر پہنچا اور میرا پیغام ملنے پر اسپتال چلا آیا۔

"یہ سب کیسے ہوا۔" اس نے پوچھا۔

"میرے جانے سے پہلے تو ایسی حالت نہیں تھی ان کی۔"

"ذہنی دورہ ہے۔ کبھی کبھی اچانک طبیعت بگڑ جاتی ہے۔" ڈاکٹر نے اُسے تسلی دی۔ زبیر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"مجھے ابا کی بیماری کے بارے میں پتا تھا مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ...... بظاہر تو ٹھیک ہی لگتے تھے۔ ابھی چھ مہینے پہلے تو یہ میری شادی کے لیے وطن آئے تھے تب تو......"

"اچھا۔" ڈاکٹر نے پوچھا۔ "تمہاری شادی ہوچکی ہے۔"

"جی ہاں۔ ابا ہی نے تو ضد کرکے کرائی ہے، ورنہ میرا تو ابھی ارادہ نہیں تھا۔" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"تو تمہیں پتا ہی نہیں تھا کہ تمہارے والد کو دماغی دورے پڑتے ہیں اور انہیں عجیب وغریب آوازیں سنائی دیتی ہیں۔" زبیر نے کہا۔

"وہ جی بہت پہلے ایک بار کسی نے یہ ذکر کیا تھا مگر پھر تو ابا ٹھیک ہوگئے تھے۔ میری تو ابھی چھ مہینے

## حیرت انگیز ذہنی یاداشت

مغربی جرمنی کے ایک ڈاکٹر جان گیلر کی یاداشت بہت حیرت انگیز تھی، ان کا دعویٰ تھا کہ جب وہ کوئی چیز پڑھ لیں تو وہ اسے کبھی نہیں بھولتے، اسی طرح جب وہ کسی شخص سے ملاقات کرتے ہیں تو پندرہ بیس سال گزرنے کے بعد بھی وہ اسے پہچان لیتے تھے کہ وہ اس شخص سے ایک بار ملاقات کرچکے ہیں حتیٰ کہ وہ اس شخص کو یہ تک بتادیتے ہیں کہ انہوں نے اس تاریخ کو کس وقت اور کس جگہ ملاقات کی تھی۔

مرسلہ: کاشف مغل۔ ایبٹ آباد

پہلے اس وقت ملاقات ہوئی جب میری شادی کرانے آئے تھے۔ پھر شادی کے چار مہینے بعد اچانک تیل کمپنی میں نوکری ملی تو میں اِدھر چلا آیا۔ بیوی میری وہیں پر ہے۔" میں نے کہا۔

"چلو علی بابا تو خوش ہوگیا ہوگا تمہارے یہاں آنے سے۔"

"خوش۔" زبیر بولا۔

"ہرگز نہیں۔ وہ تو مجھے فوراً اسی وقت واپس بھیج دینا چاہتے تھے۔ مگر میں زبردستی رُک گیا۔ اب اتنی اچھی نوکری ہے اور......" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"تمہارے خاندان میں یا گھر والوں میں نورین نام کی کوئی خاتون تو نہیں۔"

"کیوں۔" زبیر حیران ہوگیا۔

"یہ تو میری والدہ کا نام ہے جی۔"

"کیا۔" ڈاکٹر نے اچنبھے سے مجھے دیکھا پھر علی بابا سے پوچھا۔

"کہاں رہتی ہیں وہ۔" زبیر بولا۔

"جی انہیں تو فوت ہوئے کئی سال ہوگئے۔ میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا تب۔" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"وہ کبھی تمہارے ابا کے پاس رہنے نہیں آئیں

یہاں۔'' زبیر نے کہا۔

''نہیں وہ تو وہیں رہتی تھیں دادا، دادی کے پاس۔ سب کے ساتھ وہ تو بہت کہتی تھیں آنے کے لیے ابا کبھی لائے ہی نہیں۔ بہت روتی تھیں وہ۔'' میں نے پوچھا۔

''ان کا انتقال کیسے ہوا تھا۔ کیا بیمار تھیں۔'' زبیر بولا۔

''میں تو چھوٹا تھا جی۔ مگر دادی بتاتی ہیں کہ وہ کنویں میں گر گئی تھیں، ایک دن پانی نکالتے ہوئے۔''

کچھ دیر خاموشی رہی پھر ڈاکٹر نے کہا۔ ''چلو تم اپنے ابا سے مل لو۔ وہ اندر ہیں۔ مگر ان کی کسی بات کا برا مت منانا۔ انہیں کچھ ہوش نہیں۔'' زبیر علی بابا کے کمرے میں داخل ہوا، پیچھے پیچھے میں تھا اور ڈاکٹر بھی۔ زبیر کے ہاتھ میں کالے رنگ کا ایک دستی بیگ تھا۔ علی بابا زبیر کو دیکھتے ہی اتنی محبت سے مسکرایا جیسے وہ اس کا ہی انتظار کر رہا تھا۔

''اچھا ہوا تم آ گئے۔ میں سمجھا تم واپس چلے گئے ہو۔'' وہ بولا پھر وہ زبیر کے دستی بیگ کو دیکھ کر بولا۔

''لاؤ یہ مجھے دے دو۔''

''نہیں۔'' زبیر بوکھلا گیا۔

''اس میں کچھ نہیں ہے۔'' علی بابا کو اچانک غصہ آ گیا۔ وہ تیوری پر بل ڈال کر بولا۔

''کیسے کچھ نہیں ہے۔ مجھے پتا ہے اس میں اس کی چیخیں بند ہیں۔ نورین کی چیخیں۔ اس رات بھی میں نے دیکھا تھا تم نے اس کی تصویر اس میں رکھی تھی۔ لاؤ مجھے دکھاؤ۔''

''نہیں۔'' زبیر ڈر کے پیچھے ہٹ گیا۔ نرس نے جلدی سے آگے بڑھ کر علی بابا کو سنبھالا۔ زبیر کمرے سے باہر نکل آیا اور میں بھی۔ ہمارے پیچھے پیچھے ڈاکٹر آ رہا تھا۔ زبیر کانپ رہا تھا۔ میں نے اسے سہارا دے کر کرسی پر بٹھایا اور پوچھا۔

''یہ بیگ کا کیا قصہ ہے۔'' زبیر نے کہا۔

''یہ تو مجھے بھی پتا نہیں۔ ایک رات میں بیگ میں سے تصویر نکال کر دیکھ رہا تھا کہ اچانک ابا نے کروٹ لی، میں نے جلدی سے بیگ بند کر کے سرہانے رکھ دیا اور سو گیا۔ کافی دیر کے بعد مسہری ذرا سی ہلی تو اچانک آنکھ کھل گئی۔ دیکھا کہ ابا میرے سرہانے جھکے ہوئے بیگ کھول رہے ہیں۔ مگر وہ تصویر انہیں کیسے ملتی وہ تو میں نے کہیں اور رکھ دی تھی۔ دوسرے دن جب میں جا رہا تھا۔ تو وہ مجھے دروازے پر ملے۔ وہ رات بھر جاگتے رہے تھے ان کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بولے۔

''رات بھر میں یہ چیخیں سنتا رہا ہوں، جو تیرے بیگ میں بند ہیں۔ موقع ملتے ہی اس بیگ کو پھینک دینا۔''

''پھر تم اس بیگ کو یہاں ساتھ لیے کیوں چلے آئے۔'' ڈاکٹر نے پوچھا۔ زبیر نے کہا۔

''مجھے کیا پتا تھا کہ وہ سچ مچ۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''مگر وہ تصویر اب کہاں ہے۔'' زبیر نے جواب دیا۔

''اسی میں ہے جناب۔'' اس نے اپنا بیگ کھولا اور فریم کی ہوئی ایک چھوٹی سی تصویر نکالی۔

''یہ رہی تصویر۔''

''اچھا تو یہ ہے نورین کی تصویر۔'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''تمہاری ماں کی تصویر۔''

''ماں کی تصویر۔'' زبیر ہکا بکا رہ گیا۔

''نہیں جناب یہ تو میری بیوی کی تصویر ہے۔ اسی لیے تو میں اسے ابا سے چھپا رہا تھا، شرم جو آ رہی تھی کہ وہ کیا کہیں گے۔''

اِس کے بعد زبیر رُکا نہیں، ہاسپٹل سے فی الفور چلا گیا۔ ہاسپٹل میں اب صرف علی بابا اور اُس کو سنائی دینے والی اَن دیکھی چیخیں تھیں۔

تصویر میں موجود اس کی بہو، اُس کی اپنی نورین سے بہت حد تک مشابہہ تھی۔

اور وہ چیخیں...... نورین کی تنہائی اور علی بابا کا دیا ہوا فراق تھیں۔

جنہوں نے اُسے اب تا عمر چیخوں میں ڈھل کر ڈرانا شروع کر دیا تھا۔ اب علی بابا، نورین سے بچ کر کہاں جا سکتا تھا؟؟؟

☆☆......☆☆

سومیں سچ بیانی

# اور ستارہ ڈوب گیا

محمد اسماعیل بروہی

نواب شاہ سے اُس نوجوان کی کہانی، جس کے عزائم بہت اونچے تھے مگر...... وقت بہت ظالم نکلا

''اسماعیل بھائی میرا دل چاہتا ہے کہ میں پڑھ لکھ کر ٹیچر بنوں۔ اپنے گاؤں میں سرکاری اسکول کھلواؤں اور تمام غریبوں اور کسانوں کے بچوں کو تعلیم دوں۔'' محسن کی آنکھوں میں چمک اور لہجے میں ایک



عزم ہوتا تھا۔

''تمہیں پتا ہے بھائی اسکول پہلے ہمارے گاؤں میں منظور ہوا تھا۔ جب سرکاری افسران دوبارہ سروے کے لیے آئے تو وڈیرے اللہ ڈنو نے، ان افسروں کی جیبیں بھر دیں اور اسکول اپنے گاؤں میں منظور کروا لیا۔ سب کو پتا ہے کہ ہمارا گاؤں ان کے گاؤں سے بڑا ہے۔ اسکول کی بلڈنگ بھی بن گئی ہے لیکن وہ بلڈنگ وڈیرے اللہ ڈنو کی بھینسوں کا باڑا اور کھادوں کا گودام ہے۔ ان کا چھوٹا بھائی اور بیٹا ٹیچر لگ گئے اور صرف تنخواہ لیتے ہیں، بچوں کو نہیں پڑھاتے۔'' اب اس کے لہجے میں دکھ اور غصہ تھا۔

''محسن ہم کیا کر سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ اسماعیل بھائی۔ میں انشاء اللہ اپنے گاؤں میں اسکول منظور کرواؤں گا۔ بچوں کو تعلیم کی روشنی دوں گا۔ جب میں تعلیم مکمل کرلوں گا تو ہر ادارے کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ صحت کے لیے ڈسپنسری بھی بنواؤں گا۔''

پہاڑ جیسا عزم رکھنے والا یہ ستارہ چمکنے سے پہلے ہی ڈوب گیا کیوں کہ محسن اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ اس کی ناگہانی موت پر پورے گاؤں کے ہی نہیں بلکہ اردگرد کے تمام گاؤں کے لوگ روئے تھے۔ میں اس کی کہانی لکھ رہا ہوں اور رو بھی رہا ہوں۔

محسن ہمارے گاؤں کا نوجوان اور خوبصورت لڑکا تھا۔ اس کا باپ شاکر علی ایک زمیندار تھا۔ ان کی اچھی خاصی زمینیں بھی تھیں۔ جن کی دیکھ بھال ان کے ہاری کرتے تھے۔ شاکر علی کے دو بیٹے تھے۔ محسن اور ماجد۔ محسن 19-18 سال کا خوبصورت لڑکا تھا۔ گاؤں کی لڑکیاں محسن کو دیکھتیں تو آہیں بھرتیں۔

محسن علی کے والد شاکر علی کی بھی عام سی گندمی رنگت تھی۔ اس کی والدہ بھی عام سی شکل و صورت کی تھیں۔ چھوٹا بھائی بھی عام سی رنگت کچھ سانولا کچھ گندمی تھا۔ لیکن محسن حسنِ مجسم تھا۔

ایک غم اس کے والدین کے ساتھ ساتھ سب کو کھائے جا رہا تھا کہ حسن اور زندگی سے بھرپور اس نوجوان کو ایک بیماری تھی۔ اُسے مرگی کا دورہ پڑتا تھا۔ جس نے اُس کی تعلیم کو بھی متاثر کیا۔ مشکل سے اس نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ بیماری کی وجہ سے 2 سال اس نے میٹرک میں لگائے تھے۔

پہلی بار میٹرک کے امتحان کے وقت، کمرہ امتحان میں، پرچہ شروع ہوتے ہی اُسے مرگی کا دورہ پڑا تھا۔ پھر مسلسل پانچ روز تک روزانہ دورہ پڑا۔ اور یوں اُس کا ایک سال ضائع ہوگیا۔ اور پھر اس نے اگلے سال میٹرک کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا تھا۔ پھر ماں باپ نے کہا کہ بیٹا چھوڑ دو پڑھائی کو۔ کون سی تمہیں نوکری کرنی ہے۔ اللہ کا دیا ہوا سب کچھ ہے اپنی زمینیں ہیں۔ ہمارے لیے کافی ہیں۔ اور تیری طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی۔'' محسن نہایت ادب سے والدین کو سمجھاتے ہوئے کہنے لگا۔

میرا خواب اور میرا مشن ہے پڑھنا۔ میں اپنے لیے نہیں ان غریب بہن بھائیوں کے لیے پڑھوں گا۔ اپنے علم سے ان کو روشنی دوں گا۔''

پھر اس کے والدین اس بات پر راضی ہوگئے کہ تم اپنی تعلیم پرائیویٹ جاری رکھو۔ کالج میں پرائیویٹ داخلہ لو اور گھر پہ پڑھائی کرو۔ صرف امتحان دینے کالج جاؤ۔''

پھر اس نے گیارہویں کا داخلہ لیا۔ اور گھر پر تیاری شروع کی اور ہر شام کو ماسٹر اختر علی اُسے پڑھانے گھر پر آتے تھے۔ ماسٹر اختر علی کا گھر بھی اُسی گاؤں میں تھا اور اس کی ڈیوٹی شہر کے اسکول میں تھی۔ گیارہویں پاس کرنے کے بعد اس نے بارہویں میں داخلہ لے لیا اور اپنی پڑھائی پر توجہ تیز کردی۔

محسن گھومنے کا بہت شوقین تھا۔ اس کے والد نے اُسے بائیک لے کر دی تھی۔

محسن جب بھی زمینوں پر جاتا تھا، تو اس کی ماں کو فکر لگی رہتی تھی کہ کہیں اسے مرگی کا دورہ نہ پڑ جائے اور وہ گر جائے۔ کوئی اٹھانے والا نہ ہو۔ اسی لیے ماں اسے باہر جانے سے روکتی تھی۔

پھر بھی محسن ماں کو سمجھاتے ہوئے کہتا کہ ماں آپ فکر مت کرو، میں جلد لوٹوں گا۔'' ماں تو آخر ماں ہوتی ہے۔ جب تک محسن گھر نہ آتا ماں کو فکر رہتی تھی۔ جب

محسن گھر پہنچتا تو ماں کو سکون ملتا۔
محسن کی عجیب بیماری تھی یہ جہاں صاف پانی کھڑا ہوا نالی وغیرہ میں نظر آتا تو اُسے مرگی کا دورہ پڑ جاتا کیوں کہ صاف پانی میں اُسے اپنا عکس دکھائی دیتا اور جیسے ہی پانی میں اپنا عکس دیکھتا اور مرگی کا دورہ پڑتا تھا۔
ماں کو فکر تھی کہ کھیتوں میں پانی تو ہوتا ہی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ گر جائے اور اٹھ ہی نہ سکے۔
جب بھی دورا پڑتا وہ 15-10 منٹ بے ہوش ہو جاتا۔ محسن کو ہفتے میں ایک دوبار دورہ پڑتا تھا۔ اس کی حالت غیر ہوتی تھی منہ سے رالیں بہتی تھیں۔ اور ناک سے فوں فوں کی آوازیں نکلتی تھیں۔ جب بھی دورہ پڑتا ماں باپ یا جو بھی دیکھتا تو اس کے جسم کو سہلاتا تھا۔
ہاتھوں کو...... پاؤں کو سہلانے سے وہ جلدی ہوش میں آجاتا تھا۔ باپ نے کوئی ڈاکٹر، کوئی حکیم کوئی پیر فقیر نہیں چھوڑا تھا۔ پھر بھی محسن کا یہی حال رہتا۔
ویسے وہ فٹ فاٹ اور صحت مند لگتا۔ مرگی کا دورہ چلتے پھرتے بیٹھے بٹھائے پڑنے والی بیماری ہے۔
☆......☆......☆
وقت گزرتا رہا۔ ایک روز محسن اپنے ٹیوشن ٹیچر کے لیے اپنے باغ سے آم توڑ کر اس کے گھر دینے گیا۔ کیوں کہ اس روز اتوار تھا۔ تو ٹیچر گھر پر ہوگا۔ جب آم لے کر اس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اُس کی بیوی شاہ بانو نے دروازہ کھولا۔ کیونکہ ماسٹر اختر علی کام سے گیا ہوا تھا۔ تو اس کی بیوی نے دروازہ کھولا۔
تو محسن کو دیکھ کر حیران ہوئی۔ پہلے بھی اُس نے محسن کو دیکھا ہوگا مگر آج قریب سے دیکھ کر اُس کی آنکھیں چندھیا گئیں، وہ محسن کو دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس کو سانس لینا بھی بھول گیا۔ پھر محسن نے پہل کی اور سلام کیا۔ موصوفہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھی تھیں۔ محسن شاہ بانو کے ہاتھ میں آم تھما کر واپس چلا گیا۔ محسن تو چلا گیا۔ ساتھ میں شاہ بانو کے ہوش بھی اڑا لے گیا۔ جیسے شاہ بانو کی آنکھوں میں محسن کی تصویر ٹھہر گئی۔
شاہ بانو اب ہر وقت محسن کے بارے میں سوچنے لگی۔ شاہ بانو کے خوابوں اور خیالوں میں محسن کا عکس ... جوانی سے بھرپور حسن کی وہ دیوانی ہوگئی تھی۔ بیٹھے بٹھائے بس یہی سوچتی کہ کیا حسن دیا ہے رب نے اُسے۔ کیا حسن، کیا جوانی، کاش! کچھ لمحوں کے لیے وہ میرا بن جائے تو مجھے اور کیا چاہیے۔''
یہی سوچ سوچ کر شاہ بانو کا جنون عشق دن بدن بڑھنے لگا اور وہ محسن سے ملنے کو بے تاب رہنے لگی۔
☆......☆......☆
گاؤں میں واٹر سپلائی کی سہولت نہیں تھی۔ لوگ گاؤں سے تھوڑا باہر لگے ٹیوب ویل سے پانی بھرتے تھے۔
ایک ٹیوب ویل گاؤں کے مغرب کے طرف تھا اور لوگ زیادہ تر اُسی سے پانی بھرتے تھے اور دوسرا ٹیوب ویل گاؤں کے مشرق کے طرف تھا۔ وہ ٹیوب ویل محسن کے والد شاکر علی کی زمینوں پر لگا ہوا تھا۔ اس پہ لوگ کم جایا کرتے تھے۔ اس وجہ سے کہ وہ کچھ دور پڑتا تھا۔ اب شاہ بانو مشرق والے ٹیوب ویل پر پانی بھرنے جانے لگی۔ اور آتے جاتے محسن سے نظروں کا ٹکراؤ بھی رہتا تھا۔ ایک آدھ بار اس نے محسن کو اشارے بھی کیے تھے اور محسن سمجھتے ہوئے بھی انجان بن گیا تھا۔
اور روز شاہ بانو نے گھڑا اُٹھایا اور دل ہی دل میں رب سے دعا کی کہ یا رب آج محسن سے ملنے کی اسباب پیدا کرنا۔
محسن اس سے پہلے ہی ٹیوب ویل پر موجود تھا۔
اس روز گرمی کچھ زیادہ تھی اور دوپہر کا وقت تھا۔ محسن کو گرمی نے تنگ کیا اور وہ جا کر ٹیوب ویل پر نہا رہا تھا۔ محسن ٹیوب ویل کے سیمنٹ اور اینٹوں سے بنی ہوئی حوض میں بیٹھ کر پانی کے مزے لے رہا تھا۔ ٹھنڈا پانی ٹیوب ویل سے نکل کر حوض میں گر رہا تھا۔ جب شاہ بانو ٹیوب ویل کے قریب پہنچ گئی تو یہاں محسن نہاتے نہاتے اچانک کھڑا ہو گیا اور سامنے شاہ بانو محسن کے سر پر پہنچ گئی تھی۔ محسن نے نہانے کے لیے صرف جانگیا پہنا ہوا تھا۔ جب شاہ بانو نے اس کو اس حالت میں دیکھا تو اپنے ہوش گنوا بیٹھی اور اس کے ہاتھ سے خالی گھڑا گر گیا۔ اور شاہ بانو بھی چکرا کر گرنے لگی۔ محسن نے لپک کر شاہ بانو کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام لیا

اور شاہ بانو گرنے سے بچ گئی۔ کچھ ہوش کچھ بے ہوشی لیے تاثرات شاہ بانو کو محسوس ہوا کہ وہ اپنے محبوب کے خوبصورت اور مضبوط ہاتھوں میں ہے۔ اسے بے ہوشی میں بھی سرور آنے لگا اور اس پل کو یونہی ٹھہر جانے کی دعا کرنے لگی۔ پھر محسن نے اپنے آپ کو سنبھالنے لگا۔

'ارے یہ میں کیا کر رہا ہوں۔ پرائی عورت کو تھام رہا ہوں اور میرے جسم پر کپڑے بھی نہیں ہیں کوئی دیکھے گا تو کیا سوچے۔' گا اور جلدی جلدی محسن نے شاہ بانو کو زمین پہ بٹھا دیا۔ تو شاہ بانو نے آنکھیں کھول دیں اور پلک جھپکتے ہی محسن کا ہاتھ تھام کر کہنے لگی۔

''محسن کچھ پل مجھے دے دو۔ ورنہ میں مر جاؤں گی۔'' اس کی بات سے محسن کو جیسے کرنٹ سا لگا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ کر کہنے لگا۔ کہ یہ آپ کیا کہہ رہی ہو۔''

''محسن میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں، صرف ایک بار پھر میں تمہارے راستے میں نہیں آؤں گی۔'' شاہ بانو روہانسی لہجے میں کہنے لگی۔

''نہیں ...... نہیں جو آپ سوچ رہی ہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ آپ میرے ٹیچر کی بیوی ہو۔ ماسٹر اختر علی میرے باپ کی جگہ ہے اور اس نسبت سے تم میری ماں کی جگہ ہو۔ خدا کے لیے آئندہ ایسا مت سوچنا۔'' محسن کو اب شاہ بانو پہ غصہ آ رہا تھا اور محسن اپنے کپڑے اٹھا کر چلنے لگا۔

اور شاہ بانو خاموشی اور حسرت بھری نگاہوں سے اُسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

☆......☆......☆

ایک دن محسن کلین شیو کر کے اپنی ماں کے پاس جا کر کہنے لگا۔ ''امی میں کیسا لگ رہا ہوں۔'' پہلے وہ صرف داڑھی شیو کرتا تھا۔ آج مونچھوں کو بھی ختم کر کے ماں کے پاس آیا تھا۔

ماں دیکھ کر کہنے لگی کہ بیٹا مونچھوں کو کیوں ختم کر دیا۔ ہم تو یہی چاہتے ہیں کہ تم مونچھوں کے ساتھ ساتھ ہلکی داڑھی بھی رہنے دیتے۔ ماں عاجزی سے کہنے لگی تھی۔

کیوں امی ...... محسن ماں کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگا۔

بس ایسے ہی۔ ماں اپنا منہ دوسری طرف کر کے بولی۔

وہ ماں تھی اُسے ڈر تھا۔ کہ کہیں کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ بیٹے کو کیوں کہ کلین شیو سے محسن کا چاند سا چہرہ غضب ڈھا رہا تھا۔

ماں اس کے بلائیں لینے لگی تھی۔

''ماں میں بڑے آئینے میں خود کو دیکھوں۔'' محسن ماں کے شانے پکڑ کر کہنے لگا۔ کیوں کہ بڑے آئینے میں دیکھنے سے اُسے روکتے تھے۔ وہ شیو وغیرہ ایک چھوٹے دس انچ کے آئینے میں دیکھ کر کرتا تھا۔ آج ماں نے اُسے اجازت دی تھی۔ اور محسن دوڑ کر خود کو آئینے کے سامنے جا کر دیکھنے لگا۔ اور ماں بھی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

محسن اپنے آپ کو شیشے میں دیکھ کر چکرانے لگا اور گرنے لگا اور ماں نے دوڑ کر اُسے تھام لیا کیونکہ محسن پہ مرگی کا دورا پڑا تھا۔ اور اس کی حالت غیر ہونے لگی، گھر میں کوئی اور نہیں تھا۔ صرف ماں تھی اور مالی کی بیوی سفورن تھی۔ ماں نے سفورن کو آواز دی اور سفورن بھی دوڑی آئی۔

اُس روز شاکر علی گھر پہنچا تو اس کی بیوی نے محسن کی حالت کے بارے میں بتایا اور فکر مندی سے کہنے لگی۔

''محسن کے ابا! میں جلد از جلد اپنے بچے کی خوشیاں دیکھنا چاہتی ہوں۔ محسن کے سر پر سہرا دیکھنا چاہتی ہوں۔ آپ ذاکر علی بھائی سے بات کریں۔''

ذاکر علی، شاکر علی کا بڑا بھائی تھا اور محسن کا تایا تھا۔ ذاکر علی کی بیٹی رحیما بچپن ہی سے محسن کے نام منسوب تھی۔ اب محسن کے والدین یہ چاہتے تھے کہ یہ رشتہ پکا ہو جائے۔

☆......☆......☆

ایک دن شام کو شاکر علی بیوی کے ساتھ محسن کے کمرے میں آئے اور کہنے لگے۔

''بیٹا! ہم چاہتے ہیں کہ تیرا اور رحیما کا رشتہ پکا کر دیں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ...... ایسا نہ ہو کہ تم انکار کر دو اور ہم شرمندہ ہو جائیں۔''

''پر بابا سائیں میں ابھی شادی نہیں کروں گا۔ مجھے کچھ بننا ہے۔ ہاں اگر آپ لوگ چاہتے ہو کہ بات پکی ہو جائے تو آپ منگنی کی رسم ادا کریں مجھے کوئی اعتراض نہیں...... رحیما بہت اچھی لڑکی ہے۔ میرے تایا کی بیٹی ہے۔ آپ کو پسند ہے تو مجھے بھی پسند ہے۔''

اگلے روز شاکر علی اور اس کی بیوی ذاکر علی کے گھر گئے اور انہیں مایوس لوٹنا پڑا۔ اور گاؤں میں پہلی بار یہ ہوا تھا کہ کسی لڑکی نے بڑوں کا فیصلہ نہ مان کر انکار کیا تھا۔ اس انکار میں ذاکر علی اور اس کی بیوی کا ہاتھ تھا یا رحیما کی اپنی مرضی تھی۔ کیونکہ اتنا بڑا فیصلہ وہ اکیلے نہیں کر سکتی تھی۔ ضرور ماں باپ کی سپورٹ تھی۔ جو رحیما نے سب کے سامنے یہ تک کہا کہ میں محسن سے شادی نہیں کروں گی۔ میں صرف وڈیرے اللہ ڈنو کے بیٹے جواد سے شادی کروں گی۔''

رحیما کے انکار نے پورے گاؤں میں ہلچل مچا دی تھی۔ تمام لڑکیوں نے دل تھام لیا تھا کہ رحیما تُو نے یہ کیا کیا؟ جس کی ایک جھلک کے لیے ہم ترستے ہیں۔ اور تُو ہے کہ اس کی جیون ساتھی بننے سے انکار کر دیا۔''

''کچھ تو رحیما کو کچا چبانے کو بھی تیار ہو گئیں کہ تم نے ہمارے دلبر کا دل توڑا ہے۔''

کچھ نے رحیما سے براہِ راست اپنے غصے کا اظہار کیا تھا۔



''رحیما تُو بہت پچھتائے گی، بہت روئے گی۔''

اس انکار کا دکھ اور غصہ پورے گاؤں کو تھا۔ اور محسن اُسے تو کوئی پروا ہی نہیں تھی۔ کہتا تھا کہ اچھا ہے۔ رحیما کی اپنی مرضی ہے ویسے بھی شادی میں زبردستی نہیں ہوتی۔

مجھے خوشی ہے کہ گاؤں کی کسی لڑکی نے اپنی مرضی کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ اچھی بات ہے اُسے بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی زندگی گزارے۔ اپنے ہم سفر کو خود چنے۔ اور میری زندگی کا یہ مقصد ہے کہ میں غریبوں کو تعلیم دوں۔ ان کے حق کے لیے دن رات کام کروں۔ بعد میں اپنے بارے میں سوچوں گا۔''

صرف ایک بات اس نے اپنی ماں سے کی تھی کہ اماں مجھے رحیما کی فکر ہے، جواد اچھا لڑکا نہیں ہے۔ وہ غنڈہ اور شرابی ہے۔ موٹر سائیکل چھیننے کی وارداتوں میں ملوث ہے۔ بلکہ یہاں جتنی بھی موٹر سائیکلیں چھینی گئی ہیں، ان میں جواد کا ہاتھ ہے۔ پولیس اُسے کچھ نہیں کہتی۔ وہ پولیس کو ہفتہ دیتا ہے۔ چوری اور لوٹ مار کے دھندوں میں بہت آگے نکل چکا ہے۔ اور وہ شہر کے بازارِ حسن کا بھی پجاری ہے۔ اماں جی رحیما سے کہو کہ اُس سے شادی نہ کرے۔'' ماں نے بڑے تحمل سے محسن کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''بیٹا ہم لاکھ رحیما کو سمجھائیں لیکن وہ ہماری بات نہیں مانے گی، بلکہ ہمیں کہے گی کہ یہ اپنے مطلب کے لیے جواد کی برائی کرتے ہیں۔ محسن تم اپنے آپ کو کیوں ہلکان کرتے ہو۔ یہ راستہ رحیما نے اپنے لیے خود چنا ہے۔ آگے اس کا نصیب!''

''پر ماں......''

''بس چھوڑو اس قصے کو۔'' ماں نے محسن کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ تو محسن خاموش ہو گیا اور سوچنے لگا کہ کسی طریقے سے رحیما کو خود سمجھاؤں گا۔ پر محسن کو رحیما سے بات کرنے کا موقع نہ ملا۔ اور بڑی دھوم دھام سے جواد اور رحیما کی منگنی ہو گئی۔

وڈیرے اللہ ڈنو نے منگنی پر بہت دولت خرچ کی تھی اور رحیما جیسے ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔ وہ بہت خوش تھی یہ دیکھ کر کہ منگنی پر اتنے سونے کے زیورات ہیں، تو شادی پہ جانے کیا ہوگا۔

☆......☆......☆

اُس روز گرمی کچھ زیادہ تھی اور لائٹ اچانک چلی گئی۔ تو محسن نے سوچا کہ گھر سے زمینوں پر جایا جائے۔ وہ گھر سے نکل کر زمینوں پر پہنچ گیا۔ لائٹ نہ ہونے کی وجہ سے ٹیوب ویل بھی بند تھا۔ وہ ٹیوب ویل کے قریب آم کے درخت کے نیچے قمیض اتار کر بیٹھ گیا۔ اچانک دو نقاب پوش عورتیں اُس کے سر پر پہنچ گئیں۔ محسن گھبرا کر اٹھنے لگا ہی تھا کہ ایک عورت نے نقاب اتار کر اُسے سلام کیا۔

''ارے زلیخا جی آپ۔'' محسن نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

زلیخا! وڈیرے اللہ ڈنو کی چھوٹی بیٹی تھی۔ جسے محسن

نے ایک دو بار دور سے ہی دیکھا تھا۔ اور اب پہچان گیا تھا زلیخا کو۔

زلیخا نے بھی محسن کو دور سے ہی دیکھا تھا۔ یا اس کی خوبصورتی کے بارے میں اوروں سے سنا تھا۔ پر آج وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آئی تھی۔

زلیخا بڑے اطمینان سے کہنے لگی۔

''محسن میں کئی روز سے یہاں آتی ہوں، صرف آپ سے ملنے کے لیے۔''

''زلیخا یہ آپ کیا کہہ رہی ہو۔ اور یہاں آ کر آپ نے اچھا نہیں کیا۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو قیامت آ جائے گی۔ مہربانی کر کے آپ چلی جائیں۔'' زلیخا نے اس کی ایک نہ سنی اور دوڑ کر محسن کو دونوں بانہوں میں بھر لیا۔

''میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔ میں تمہارے بنا نہیں جی سکتی۔''

محسن اس افتاد سے گھبرا گیا۔ اور کہنے لگا۔

''زلیخا ہم چھوٹے زمیندار ہیں اور تم بڑے زمیندار کی بیٹی ہو۔ ہمارا ملن نہیں ہو سکتا۔ اور تمہاری تو منگنی بھی ہو چکی ہے۔ تمہارے کزن اکبر سے۔''

زلیخا محسن سے الگ ہو کر بولی۔

''محسن کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ ہم کورٹ میرج کر لیں گے۔ بس تم میرا ساتھ دو۔''

''نہیں زلیخا خدا کے لیے مجھے ایسے امتحان میں مت ڈالو۔ تمہارا بابا ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میں اپنی زندگی اپنے گاؤں کے لوگوں کے لیے علم کے چراغ جلانے کے لیے وقف کر چکا ہوں۔ میں آج تمہارے سر پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہوں کہ میں نے تم کو کبھی کسی اور نظر سے نہیں دیکھا۔'' محسن نے زلیخا کے سر پر ہاتھ رکھنے کو ہاتھ بڑھایا تو زلیخا نے ہاتھ جھٹک دیا اور بولی۔

''مت کہو مجھ سے یہ سب۔'' زلیخا رونے لگی تھی۔

''مجھے تم سے محبت ہے۔ اس محبت کو قائم رہنے دو اور ہاں ایک شرط پہ یہاں سے جاؤں گی۔''

''کون سی شرط۔'' محسن تیزی سے بولا۔

''میں مہینے میں ایک بار تمہارے دیدار کو آؤں گی۔'' زلیخا نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

''مجھے منظور ہے لیکن خدا کے لیے ابھی جاؤ۔'' محسن ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔

زلیخا کئی لمحوں تک محسن کو غور سے دیکھتی رہی، اور پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کے بولی۔

''کاش! میں رحیما کی جگہ ہوتی تو تیرے پاؤں دھو دھو کر پیتی۔ پر...... پر......'' وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ اور اس کے آنسو رواں ہو گئے۔

قریب کھڑی خاتون غالباً اس کی نوکرانی تھی، وہ پھر اس سے مخاطب ہوئی۔

''چلو ماسی چلیں۔'' اور محسن سکون بھری سانس خارج کر کے زمین پر بیٹھ گیا۔ اور سوچنے لگا یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے۔ ہر عورت، ہر لڑکی میری دیوانی ہے آخر کیوں......

اور پھر اس نے پاس رکھی ہوئی قمیض کی جیب سے موبائل نکالا اور ہینڈ فون لگا کر میوزک سننے لگا۔ تین چار گھنٹے کیسے گزر گئے اُسے علم ہی نہ ہوا اور شام پانچ بجے کے قریب اُس کے گھر سے فون آیا۔ دوسری طرف اُس کی ماں تھی جو بڑی پریشانی کہنے لگی۔

''محسن جلدی گھر آ جاؤ بیٹے۔ گلنار کا ہاتھ کٹ گیا ہے مشین میں آ کر۔''

محسن گھر کی طرف دوڑا تھا۔ گلنار ماسی سفورن اور مالی رمضان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ رمضان مالی تھا اور سفورن ماسی ان کے گھر پر کام کرتی تھی۔ گلنار کا ہاتھ کٹتے کٹتے کلائی تک کٹ گیا تھا۔ اور وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

محسن نے گاؤں میں رہنے والے ٹیکسی والے کو فون کیا اور گلنار کو ٹیکسی میں ڈال کر شہر کے ہاسپٹل لے گیا۔ پھر شاکر علی اور مالی رمضان بھی ہاسپٹل پہنچ گئے۔

گلنار اب بہتر تھی۔ کچھ دن ہاسپٹل میں رہ کے وہ گھر آ گئے۔

گھر آتے ہی گلنار رونے لگی تھی اور خود کو ادھورا محسوس کرنے لگی تھی۔ سب نے اُسے تسلیاں دیں تو وہ کچھ سنبھلی تھی۔ پھر بھی سانولی سلونی سی ہنس مکھ لڑکی کو

خاموشی اور دکھ نے آ گھیرا تھا۔

☆☆☆

کچھ دن یوں ہی گزر گئے۔ پھر ایک دن محسن ماں باپ سے چوری چھپے گاؤں کے قریب سے گزرنے والی نہر پر نہانے چلا گیا۔ اور نہر پر پہنچ کر اُس نے بائیک ایک طرف کھڑی کی۔ آج نہر پر کوئی نہیں تھا۔ وہ اکیلا تھا۔ جسم کو ہوا فرحت بخشنے لگی اور وہ ہوا کا مزا لینے یوں ہی کھڑا رہا۔ اور اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے اپنے بال سنوارنے لگا۔

اچانک اس نے دیکھا کہ کوئی لڑکی تیزی سے نہر کے بند پر چڑھ کر نہر کی طرف دوڑنے لگی ہے۔ لڑکی نے عجلت میں اپنے جوتے اور دوپٹہ پھینک دیا اور پانی میں اترنے لگی۔ محسن نے اُسے پہنچان لیا وہ گلنار تھی اس نے آواز لگائی۔

''گلنار......اے گلنار۔'' محسن نے تیزی سے اس کی جانب دوڑ لگا دی تاکہ پہنچ کر گلنار کو اس حرکت سے باز رکھا جائے لیکن محسن کے پہنچتے ہی ایک دم شڑاپ کی آواز کے ساتھ گلنار پانی میں کود گئی تھی۔

محسن نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر چھلانگ لگا دی۔ اور گلنار کو نہر سے باہر نکال لیا۔ گلنار بری طرح کھانسنے لگی تھی کیوں کہ پانی اس کے حلق میں جا چکا تھا۔ کچھ دیر بعد اُس کی سانس بحال ہوئی تو وہ رونے لگی۔ محسن کو اُس پہ غصہ آ رہا تھا۔ وہ اُسے جھنجھوڑ کر کہنے لگا کہ پگلی تو یہ کیا کر رہی تھی۔''

''محسن سائیں آپ نے مجھے کیوں بچایا۔ مجھے مرنے دیتے۔'' گلنار روتے ہوئے کہنے لگی۔

''آخر کیا ہوا ہے؟'' محسن نے چیخ کر کہا۔

''مجھ بدنصیب کو مرجانا چاہیے۔ محسن سائیں۔ ایک تو ہاتھ کٹ گیا اور......'' گلنار آگے کچھ نہ کہہ سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''اور کیا......'' محسن کا لہجہ کچھ دھیما ہوا۔

''محسن سائیں ان لوگوں نے میری منگنی توڑ دی۔ رقیہ پھوپو نے آج انگوٹھی اور دوپٹا واپس کر دیا ہے۔ وہ کہتی ہیں، اب اس کا ہاتھ کٹ گیا ہے۔ اب ہم اسے بہو نہیں بنا سکتے۔'' گلنار کے رونے میں اور تیزی آ گئی تھی۔

''انہوں نے منگنی توڑ دی اور تم خودکشی کرنے لگیں۔ تم تو پاگل ہو بالکل۔ گلنار ایسا نہیں کرتے۔'' محسن کا لہجہ سمجھانے والا تھا۔

''محسن سائیں...... مجھ بدنصیب سے اب کون شادی کرے گا۔ مجھے مرجانا چاہیے۔''

''نہیں گلنار زندگی بہت انمول چیز ہوتی ہے اور صرف ایک بار ملتی ہے۔ تمہیں جینا ہوگا اپنے لیے، اپنے ماں باپ کے لیے جینا ہوگا۔'' محسن بڑے اعتماد سے کہنے لگا۔

''میں ماں باپ پہ بوجھ نہیں بنوں گی۔ محسن سائیں مجھے مرنے دو۔ مجھے پتا ہے مجھ سے اب کوئی شادی نہیں کرے گا۔''

''میں کروں گا تم سے شادی۔'' محسن گلنار کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر پُر اعتماد لہجے میں بولا۔ اس کی بات سن کر گلنار کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے محسن کو دیکھ رہی تھی اور محسن اس کی حیرانی سے محظوظ ہونے لگا۔

''ارے پگلی کیا دیکھ رہی ہو۔ میں تم سے شادی کروں گا۔'' محسن نے مسکرا کر کہا۔

''سائیں میں آپ کے قدموں کی خاک ہوں۔ مجھ بدنصیب کو اتنی عزت مت دو۔'' گلنار محسن کے قدموں میں بیٹھنے لگی۔

محسن نے اُسے شانوں سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''پگلی آج سے تم میرے قدموں کی خاک نہیں میرے دل کی رانی ہو۔''

اس نے گلنار کا دوپٹہ اٹھایا اور اس کے سر پر ڈال دیا اور چلنے کو کہا۔ بائیک اسٹارٹ کی، گلنار کو بٹھایا اور گھر کی طرف چلنے لگا۔

گلنار کو اس کے دروازے پر اتار کر وہ اپنے گھر پہنچ کر ماں کو پکارنے لگا۔ محسن نے اپنی ماں کو بانہوں میں بھر لیا۔ لاڈ سے کہنے لگا۔

''ماں آج میں نے ایک وعدہ توڑا اور ایک وعدہ کیا۔'' ماں مسکرانے لگی۔ ''ماں پہلے بتاؤ تم مجھے ڈانٹو گی نہیں۔''

"نہیں میری جان!" ماں اس کے [illegible] گال پر ہاتھ رکھ کر پیار سے کہنے لگی۔

"ماں پہلے وعدہ توڑا نہر پر نہانے گیا۔" محسن نے شرارت سے ماں کو دیکھ کر کہا۔

"دیکھو میری جان! تمہاری طبیعت کی وجہ سے منع کرتے ہیں ہم نہر پر جانے کو۔"

"دوسرا وعدہ ماں میرے نہر پر جانے سے اور کسی کی جان بچ گئی۔ وہ گلنار نہر میں چھلانگ لگا کر خودکشی کرنے لگی تھی۔"

"یا اللہ خیر! کیوں؟" ماں کلیجے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگی تھی۔

"ماں اس کی پھوپی نے اُس کی منگنی توڑ دی تھی۔"

"ہاں مجھے پتا ہے بیٹا!" ماں لمبی سانس بھر کر کہنے لگی۔

"ماں میں نے گلنار کو ڈوبنے سے بچایا اور اس سے ایک وعدہ کیا محسن نے مسکراتے ہوئے ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اچھا! کیا وعدہ کیا!" ماں محسن کو غور سے تکنے لگی۔

"ماں میں گلنار سے ہی شادی کروں گا۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔"

ماں کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے اور پھر وہ ممتا کی ماری مسکرا دی۔

"میری جان ہم تیری خوشی میں خوش ہیں۔ گلنار اچھی لڑکی ہے۔ تم کو پسند ہے تو ہمیں بھی پسند ہے۔"

"ماں زندہ باد!" محسن نے ماں کو اٹھا کر نعرہ لگایا۔

"ارے پاگل چھوڑ دیں گر جاؤں گی۔" ماں ہنستی ہوئی کہنے لگی۔ وہ ہنس بھی رہی تھی اور اُس کے آنسو بھی نکل رہے تھے۔

یہ خبر دیکھتے ہی دیکھتے جنگل کی آگ کی طرح گاؤں میں پھیل گئی تھی۔

شاکر علی بھی بہت خوش تھا۔ مالی رمضان اور ماسی سفورن خوشی سے پاگل ہو رہے تھے۔ سانولی سلونی اور تیکھے نقوش والی گلنار اپنے آپ کو کوہ قاف کی پری سمجھنے لگی تھی اور واقعی محسن کسی شہزادے سے کم نہ تھا اور ادھر گاؤں کی جس لڑکی نے سنا وہ گلنار کی قسمت پر رشک کرنے لگی۔ اور کچھ تو حسد سے جل کر کوئلہ ہو گئی تھیں۔

☆......☆......☆

## حادثہ

ایک صاحب ملازمت کے لیے انٹرویو دے رہے تھے۔ انٹرویو لینے والے صاحب نے پوچھا۔

"آپ کبھی بیمار رہے ہیں؟"

"جی نہیں۔"

"کوئی حادثہ وغیرہ پیش آیا؟"

"ہرگز نہیں۔"

"لیکن انٹرویو دینے کے لیے آپ بیساکھیوں کے سہارے تشریف لائے ہیں۔"

انٹرویو دینے والا۔" دراصل میں کل آیا تھا اور زبردستی اندر آنا چاہ رہا تھا، آپ کے چپڑاسی نے مجھے اٹھا کر کھڑکی سے نیچے پھینک دیا تھا۔"

انٹرویو لینے والا۔" اس کا مطلب ہے کہ آپ کو حادثہ پیش آ چکا ہے۔"

انٹرویو دینے والا۔" جی نہیں یہ حادثہ نہیں تھا، آپ کے چپڑاسی نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا۔

☆......☆......☆......☆

## کیا سین ہے

دو ہم شکل جڑواں بچے سردی کے موسم میں اپنے کمرے میں بیٹھے تھے، اُن میں سے ایک ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا اور دوسرا اُداس کونے میں بیٹھا کانپ رہا تھا۔

باپ نے پوچھا: "تم اتنا کیوں ہنس رہے ہو؟"

وہ بولا: "کچھ نہیں پاپا، آج امی نے دونوں بار اسی کو نہلا دیا ہے۔"

مرسلہ: جواد احمد۔ پشاور

پھر محسن کے انٹر کے امتحانات شروع ہوگئے۔ پیپرز کے دوران اس نے شہر میں رہائش اختیار کرلی۔ اور جب پیپرز ختم کر کے وہ گاؤں پہنچا تو ایک خبر نے بہت دکھ دیا۔ اور رحیما نے رو رو کر اپنا برا حال کیا تھا۔ خبر یہ تھی کہ رحیما کے منگیتر جواد نے شہر کی طوائف سے نکاح کر کے اُسے گاؤں لے آیا تھا۔ اور وڈیرا اللہ ڈنو بھی جواد کے اس حرکت سے دُکھی تھا۔ اُسے بہت لعنت ملامت تھی۔ اور ان دونوں کو گھر سے نکال دیا تھا۔ جواد نے اپنی بیوی کو لے کر شہر والی کوٹھی میں رہائش اختیار کر لی۔ شہر میں ان کی بہت سی کوٹھیاں تھیں ایک میں جواد اور اس کی بیوی رہنے لگے۔

رحیما کے والد ذاکر نے بھی غم و غصے کا اظہار کیا تھا۔ وہ وڈیرے اللہ ڈنو کی حویلی جا کر ان سے کہا تھا کہ جواد سے کہو وہ صرف ایک بیوی کو رکھے۔ وہ ناچنے والی اگر اُسے عزیز ہے تو میری بیٹی کو چھوڑ دے۔''

وڈیرے اللہ ڈنو نے صاف صاف کہا کہ میاں ذاکر دو شادیاں کرنا کوئی معیوب بات نہیں۔ دو شادیاں کرنا ایک رواج بھی ہے وڈیروں کا۔ وہ شہر والی شہر میں رہے گی۔ اور تیری بیٹی حویلی میں بس یہی میرا فیصلہ ہے۔''

ذاکر علی اُس کی بات سن کر واپس آ گیا تھا۔ رحیما کی اب حویلی میں ملازمہ جیسی عزت ہوگی۔ یہ سب کو اندازہ تھا۔ اور محسن بھی رحیما کے لیے دُکھی تھا۔ مگر یہ تو رحیما کا اپنا فیصلہ تھا۔

☆......☆......☆

وقت اپنے رفتار سے گزر رہا تھا۔ محسن کو اپنے رزلٹ کا انتظار تھا اور رزلٹ بھی آ گیا محسن فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوا تھا۔

اس روز اس کی ماں اور باپ نے خوشی سے پورے گاؤں میں لڈو بانٹے اور انہیں کیا پتا تھا کل کا سورج ان کے لیے دکھوں کا پہاڑ لے کر آئے گا۔

☆......☆......☆

اس روز شام کی چائے پر محسن نے اپنے والدین سے ڈھیروں باتیں کی۔

''بابا سائیں میں آگے بھی پڑھوں گا۔ کچھ دن بعد اپنے کاغذات بنواؤں گا اور دو مہینے کے بعد پرائمری ٹیچر کے لیے انٹرویو دوں گا۔ بابا سائیں میں ٹیچر بنوں گا اور اپنے گاؤں میں اسکول کھلواؤں گا۔

آپ اسکول کے لیے زمین دیں گے ناں۔'' محسن نے معصومیت سے اپنے بابا کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

''کیوں نہیں میری جان! تم جہاں چاہو اسکول بنواؤ۔''

''بابا سائیں یہ قریبی زمین جہاں ہم مویشیوں کے لیے چارہ کاشت کرتے ہیں۔ وہ ہی زمین اسکول کے لیے مناسب رہے گی۔''

''ہاں...... ہاں......'' شاکر علی نے مسکرا کر کہا۔

''بابا سائیں میں ٹیچر بننے کے بعد آگے بھی کوشش کروں گا کہ یہاں ڈسپنسری بھی منظور ہو جائے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ غریبوں کا علاج ہو۔''

اس کی ماں چپ چاپ اس کا خوبصورت چہرہ تک رہی تھی۔ اُسے اپنے بیٹے پر پیار آ رہا تھا۔

''اور بابا سائیں...... آپ کوئی اور مالی ڈھونڈ کے لائیں۔ اور ماں جی آپ بھی کوئی اور ماسی ڈھونڈو۔ میری گلنار کے ماں باپ اب ہمارے نوکر نہیں ہمارے رشتے دار ہونا چاہئیں۔ اب وہ آرام سے زندگی گزاریں گے۔''

شاکر علی اور اس کی بیوی ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگے۔

''محسن ٹھیک کہتا ہے۔ کل سے ہم اپنے لیے ماسی اور مالی ڈھونڈیں گے۔''

یہ بات ماسی سفورن دروازے کی اوٹ سے سن رہی تھی اور خوشی سے نہال ہو گئی، کتنا خیال ہے۔ ہمارے محسن سائیں کو ہمارا۔ اس کے آنسو نکل آئے۔

اُس رات محسن نے آٹھ بجے تک اپنے ماں باپ اور چھوٹے بھائی سے ڈھیروں باتیں کی۔

جب کھانا ختم ہوا تو کہنے لگا کہ امی خیسو کے لیے تھرماس میں چائے دے دو۔ میں اُسے چائے دینے جاؤں گا۔''

محسن ہر رات خیسو کے لیے چائے لے جاتا تھا۔ خیسو دن رات ٹریکٹر چلاتا تھا زمینوں پر۔ کھانا اُسے ہاری

دیتے تھے مگر چائے وہ محسن کے گھر کی ہی پیتا تھا۔

☆......☆......☆

اُس رات چودھویں کی رات تھی۔ محسن نے خمیسو کو چائے پلا کر کچھ دیر اُس سے باتیں کی اور گھر کی طرف جانے لگا۔

آج چاند کی روشنی اُسے بہت پیاری لگ رہی تھی۔ کھیتوں سے ہوتا ہوا جب وہ چھوٹی نالی پر چڑھ آیا تو چھوٹی نالی خالی تھی۔ اُس وقت اس میں پانی نہیں تھا۔ جب وہ آگے گیا تو چھوٹی نالی میں اُسے پانی نظر آیا۔

سوچا پاؤں میں مٹی لگی ہے ذرا دھولوں۔ ویسے تو نالی خالی تھی، صرف ایک جگہ گڑھا سا تھا۔ جس میں پانی صاف شفاف تھا۔

محسن نالی کے کنارے بیٹھ گیا۔ اور پاؤں پانی میں لٹکا دیے۔ اُسے چاندنی کی وجہ سے صاف پانی میں اپنا عکس دکھائی دیا۔ اور پھر اچانک اسے دورہ پڑنے لگا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا اور لڑکھڑاتا ہوا منہ کے بل نہر میں جا گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ پانی تھوڑا تھا مگر اُس کا سر پانی میں ڈوبا ہوا تھا اور باقی سارا جسم باہر تھا۔

اُدھر سب گھر والے سو گئے تھے۔ ماں کو پتا تھا کہ محسن خمیسو کو چائے دے کر اپنے کمرے میں جا کر سو جائے گا۔ اور وہ اُس رات بھی بے فکر ہو کر سو گئی۔

پورے گاؤں میں جس کی جان تھی...... اب وہ بے جان ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

روز صبح سویرے اٹھ کر ماں نماز پڑھتی پھر محسن کو جگاتی تھی۔ آج نہ جانے کیوں ماں کا دل بے چین تھا۔ معمول کے مطابق ماں محسن کے کمرے میں گئی تو حیران رہ گئی۔ بستر ویسے کا ویسا پڑا تھا، جیسے وہ رات کو بچھا کر گئی تھی اور کمرے میں محسن تھا ہی نہیں۔

بے چینی میں ماں نے شاکر کو جگایا۔ شاکر علی اٹھا اور کہنے لگا کہ شاید وہ نماز پڑھنے گیا ہو۔

''لگتا ہے وہ بستر پر سویا ہی نہیں ہے۔'' ماں تشویش سے بولی تھی۔

''میرا دل بے چین ہے اُسے فون کرو کہ وہ کہاں ہے؟''

پھر شاکر علی نے نمبر ملایا کال جاتی رہی، جاتی رہی، پھر مسلسل کال ملاتا رہا لیکن کال اٹینڈ نہ ہوئی۔ ماں رونے لگی تھی۔ محسن کو ڈھونڈنے کے لیے قدم باہر نکال دیے۔ جو بھی ملا اُس سے محسن کا پوچھا کسی نے کچھ نہ بتایا۔ اسی اثناء میں ایک بچہ دوڑتا ہوا آیا اور شاکر علی سے کہنے لگا۔

''محسن کھیتوں والی نالی میں پڑا ہے۔''

اتنی دیر میں بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے اور سب وہیں دوڑ پڑے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ محسن اوندھے منہ گرا پڑا ہے۔ تھوڑے سے پانی میں صرف اُس کا سر ڈوبا ہوا ہے۔ اور باقی جسم باہر ہے۔ سب نے اُسے اٹھایا لیکن وہ ہمیشہ کے لیے اپنے رب کے پاس جا چکا تھا۔ گاؤں میں کہرام مچ گیا۔

جس نے سنا وہ تڑپ اٹھا۔ محسن کے گھر اپنے گاؤں کے لوگ اور اردگرد کے گاؤں کے لوگ جمع ہونے لگے۔ جس نے سنا وہ اُسی طرف چلا آیا۔ عورتیں، مرد، بوڑھے جواں حتیٰ کہ بچے بھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے تھے۔

شاکر علی اور اُس کی بیوی روتے روتے بے ہوش ہو جاتے اور پھر لوگ انہیں ہوش میں لاتے۔ پھر دھاڑیں مار مار کر روتے اور بے ہوش ہو جاتے۔

محسن کی ناگہانی موت کا سن کر گلنار ایک چیخ مار کر بے ہوش ہوئی تھی۔ پھر لاکھ کوششوں کے باوجود وہ ہوش میں نہ آ سکی تھی۔ اُسے شہر کے ہاسپٹل میں داخل کیا گیا۔ اور وہ اب تک کوما میں ہے۔

دور دراز سے لوگ جوق در جوق آتے۔ صرف اُسے دیکھنے کی خاطر وہ واقعی دیکھنے کے لائق تھا۔ اس کا چہرہ اور نکھر آیا تھا۔ پھول سا چہرہ آنکھیں موندے بے غم سویا پڑا تھا جیسے۔

جب اُسے آخری آرام گاہ کے لیے اٹھایا گیا تو جیسے قیامت کا منظر تھا۔ کوئی ایک آنکھ نہ تھی جو نہ روئی ہو۔ ہنستا، مسکراتا، جیتا جاگتا محسن غریبوں کے لیے کئی خواب سجائے منوں مٹی تلے سو گیا تھا۔ وہ چمکتا ستارہ تھا جو بجھ گیا اور دلوں کو ویران کر گیا تھا۔

☆☆......☆☆

# ٹکا اور آنا

روشانے عبدالقیوم

کراچی سے، اُس شخص کی کہانی، جس نے آج بھی کتابوں سے رشتہ جوڑا ہوا ہے

گاؤں سے وہ سادہ لوح سے بندے کچھ دن قبل ہی شہر آئے تھے۔ وہ کتابوں کی خوبصورت شیشوں والی دکانوں کو حیرت اور دلچسپی سے تکتا جا رہا تھا، ہاتھ میں سبزی کی تھیلی تھی۔ جا بجا فٹ پاتھ پر کتابوں کے ٹھیلے سجے ہوئے تھے، کافی معقول افراد جو صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس اِکا دُکا ٹھیلوں پر کھڑے کتابیں ٹٹول رہے تھے۔

اس نے آج تک کپڑوں، پھل فروٹ وغیرہ کی مارکیٹ اور دکانیں دیکھی تھیں، کتابوں کی دکانیں بھی ہوتی ہیں؟ اس نے حیرت سے سوچا اور اسے شوق بھی ہوا، اس نے اپنے حلیے کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور پھر اداس ہو کر حسرت سے رنگین خوبصورت کتابوں والی دکان کو دیکھا۔

ناچار اسے فٹ پاتھ پر موجود بوڑھے شخص کے ٹھیلے کی طرف جانا پڑا۔ کتابیں کافی خستہ حال تھیں، بالکل اس بوڑھے کی طرح جو سگریٹ کے کش لیتا، کپکپاتے نحیف سے وجود کے ساتھ گاہکوں کا منتظر تھا۔ زمین پر دوزانو بیٹھ کر اس نے سبزی کی چھوٹی سی تھیلی پاس رکھی اور ایک کتاب اٹھالی، باقی کتابوں کی نسبت اس کی جلد اور حالت ٹھیک تھی۔

''راجہ گدھ'' اس نے یہ مشکل سا نام پڑھنے میں تھوڑا سا وقت لگایا۔ بھلا یہ نام کیسا ہے؟

اس نے ایک صفحہ کھولا، فرض کرو ایک راستہ ہے، پتھریلا، آسمان پر سورج، موسم خط استوا جیسا...... اس راستے پر چلنے والا ضرور سوچے گا کہ وہ لوگ کتنے خوش نصیب ہیں۔ باتیں مشکل تھیں کچھ سمجھ میں آئیں اور کچھ زیادہ ہی سر پر سے گزر گئیں، اس نے کتاب بند کر کے آگے پیچھے دیکھا اور خاموشی سے دیگر کتابوں کے درمیان رکھ دیا۔

''کاش میرا ابا بھی کباڑ بیچنے کے بجائے تمہاری طرح کتابوں کا ٹھیلا سجاتا۔'' اس نے بابا کو دیکھا۔

''تمہارے باپ کا میری طرح کتابوں کا ٹھیلا ہوتا ناں تو پھر تم سے پوچھتا۔ یہ جو کباڑ بیچ کر سبزی وغیرہ پوری ہوتی ہے اس سے بھی جاتے، ہم سے پوچھو جو یہاں بیٹھے مکھیاں اڑاتے، یا ان نئے نئے صاف ستھرے کپڑوں سے آنے والوں کو دیکھتے ہیں، جو کتابیں الٹ پلٹ کر چلتے بنتے ہیں۔

کبھی چار روپے بھی جیب سے نہ نکالے کسی نے۔'' بابا کی بوڑھی آنکھوں میں ناامیدی لمحے میں سمٹ آئی تھی۔

''کتنا ناشکرا ہے یہ بابا۔'' اس نے حیرت اور افسوس سے اسے دیکھا اور سبزی کی تھیلی اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ بوڑھے بابا کی ایسی تلخ اور سچی بات اسے کچھ عرصے بعد سمجھ۔

''نکے او نکے...... نکے او نکے...... سنتا ہے یا کان سے بھی گیا...... نکے؟'' اس کا بھائی آنا پھولی سانسوں کے درمیان بھاگتے ہوئے پاس آیا۔

''کیا ہے؟'' نکے نے بابا کی بات کا غصہ اس پر نکالا۔

آنا اپنی جگہ ساکت کھڑا اپنے کم گو بھائی کو جاتا دیکھتا رہا۔ یہ آج نکے کو کیا ہوا۔ ایسی بات تو اس نے پہلے کبھی نہ کی تھی۔ وہ حیران تھا۔

''اسے چلتے چلتے احساس ہوا کہ وہ اکیلا ہے تو مڑ کر دیکھا، وہ دور کھڑا اسے دیکھ رہا تھا، عجیب سی نظروں سے

''اب کیوں مرے کھڑے ہو، پہلے تو جلدی جلدی کا شور مچا رکھا تھا؟'' وہ غصے سے چلایا۔ اس کی بات پر آنا تو حیران ہوتے چل پڑا۔



''ابا کہہ رہا ہے جلدی سبزی لا۔ کباڑ بیچنے بھی جانا ہے۔ جلدی کھانا کھا لیں۔ اس نے وجہ بھی بتا دی۔

''ہونہہ اس کباڑ کے درمیان ہم پیدا ہوئے اور اسی کے درمیان مریں گے، جانے کب جان چھوٹے گی اس بلا سے۔'' اس نے سر جھکا اور گھر کی طرف چل پڑا۔

☆......☆......☆

''دیکھ بھال کے چھانٹی کرو۔ خراب مال ایک طرف اور تھوڑا صحیح مال ایک طرف، کسی کام آ جائے گا۔'' باپ جس کا نام فرید تھا، سب اسے چھوٹے قد اور موٹاپے کی وجہ سے بھالو کہتے تھے۔

اس نے اپنے بیٹوں نکے اور آنے سے کہا آنا تو زور شور سے ہاتھوں کو حرکت دیتا باپ کو خوش کر رہا تھا

جب کہ ٹکا مرے مرے ہاتھوں سے بد دماغی میں ہاتھ چلا رہا تھا۔

''تیز ہاتھ چلا یہ کیا کر رہا ہے؟ کام کا دل نہیں لاٹ صاحب کا؟'' فرید تپ کر بولا۔

''ابا آج کل یہ کسی اور چکر میں ہی پڑ گیا ہے۔ پتا ہے آج میں نے دیکھا؟'' چالاک سا آنا باپ کا چمچہ جو تھا۔ تجسس پھیلاتے معنی خیزی سے بولا۔

''کیا دیکھا۔'' وہ چوکنا ہوا۔ ٹکا اسی طرح بے دلی سے کام کرتا رہا، ابا کا خوف یکدم بھول گیا تھا۔

یہ آج کتابوں کے ٹھیلے کے پاس کھڑا تھا اور کوئی کتاب بھی اس کے ہاتھوں میں۔'' آنے نے سینہ پھلا کر فرید کو بتایا کیوں کہ کتابوں کا سب سے بڑا مخالف وہ ہی تو تھا اس طبقے کے لوگ یونہی کتابوں کی مخالفت کرتے ہیں، کیوں کہ بچے اگر اس طرف متوجہ ہو جائیں تو ان کا دھندا چوپٹ ہو جاتا ہے، چاہیں ان کی دس اولادیں کیوں نہ ہوں وہ سب کو اپنے ساتھ کام پر لگا دیتے ہیں۔

''ٹکے یہ کیا بک رہا ہے؟ واقعی تُو ان چکروں میں پڑ گیا ہے؟'' باپ نے گھوری سے نوازا تو جی چاہ رہا تھا کہ ایک ہاتھ جڑ دے نالائق کو۔

''نہیں ابا وہ تو ویسے ہی نظر پڑ گئی تھی تو اٹھالی۔'' وہ منمنایا۔

''خبردار اگر آئندہ کبھی کتابوں کو ہاتھ لگایا تو وہی ہاتھ کاٹ کے رکھ دوں گا۔

تم کباڑیے کی اولاد ہو یاد رکھنا ایک کباڑیے کے ہاتھ میں کتاب اچھی نہیں لگتی۔ میں تو اس پڑھنے لکھنے کے ہی خلاف تھا مگر تمہاری ماں کو بڑا شوق ہوا تمہیں پانچ جماعتیں پڑھانے کا، یہ تو اچھا تھا کہ وہ مر گئی۔ وگرنہ تم دونوں کو ڈائریکٹر بنا کر چھوڑتی۔'' وہ بہت غصے میں تھا۔

ٹکے نے کوئی جواب نہیں دیا اپنا کام کرتا رہا۔ باپ کا غصہ مزید بلندی پر پہنچ گیا۔

''سن لیا تم نے میں کیا بک رہا تھا۔'' وہ کف اڑاتے ہوئے چلایا۔ ٹکے نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

☆......☆......☆

وہ اپنے ماحول سے متنفر تھا، بچپن سے اپنے ارد گرد اپنے باپ سمیت ہر شخص کو پان گٹکے کی پیک اڑاتے، گالیاں بکتے اور گندے کپڑوں میں ملبوس دیکھا تھا۔

غربت جہالت اور گندگی اس کی ذات اور زندگی کا ناسور بن چکا تھا۔ اسے صاف ستھرا اسکول اور اچھے اچھے استاد بہت پسند تھے۔

مگر ماں کے بعد باپ نے اسے وہاں سے نکال دیا اور کرائے کہ چھوٹے سے گھر میں کاٹھ کباڑ سمیت رہنے لگے۔ اخبار کا ایک آدھ ٹکڑا مل جاتا تو وہ بہت محبت اور شوق سے پڑھتا، چاہے سمجھ خاک بھی نہ آتی...... وہ اب جوان ہو چکا تھا مگر اپنا ماحول پہلے دن کی طرح ہی اسے ناپسند تھا۔

جب سے ٹھیلے پر وہ کتاب پڑھی تھی اب دل پھر سے پڑھنے کے لیے بے چین رہنے لگا۔ کافی دنوں تک خود پر جبر کیے وہ اس طرف نہیں گیا تھا مگر پھر اسے جانا پڑا، یہ سوچ کر کہ کتاب پڑھنا کوئی گناہ تو نہیں۔ اپنے ماحول سے اک پل کو نکل کر راحت تو حاصل کی جاسکتی ہے۔

☆......☆......☆

''بڑے دن بعد آئے۔ مجھے تمہارا انتظار تھا۔'' اسے بوڑھے بابا کی بات حیرت میں مبتلا کر گئی۔

''میرا انتظار؟'' وہ بڑبڑایا۔ پہلی بار کسی نے اس کی ذات کو معتبر ٹھہرایا تھا، بھلا وہ اس قابل ہے کہ کسی کو اس کا انتظار ہو؟ گھر سے ہمیشہ اسے بے کار ہونے کا خطاب ملا تھا۔

''ہاں تمہارا انتظار۔'' بوڑھا مسکرایا۔ شاید وہ مسکراہٹ بھول چکا تھا۔ ''کیوں کہ تم میں مجھے اپنا آپ دکھتا ہے۔ تمہیں بھی کتابوں سے بہت محبت ہے میں نے اس دن سے جان لیا تھا۔'' وہ مزید گویا ہوا۔

''ہاں مگر میرا ابا نہیں چاہتا، میں کتاب کے قریب بھی جاؤں۔'' ٹکے نے اداسی سے جواب دیا۔

''تمہارا ابا تو بڑا ظالم ہے۔ باپ ہو کر بھی تمہیں کتاب پڑھنے سے منع کرتا ہے۔ اچھا تم میرے ساتھ

کام کرو گے۔ اس طرح تمہارا ابا سمجھے گا تم کام کر بتے ہو، مگر تم کتابیں پڑھنا؟'' ٹکے کو وہ مزید حیران کر گیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو جانتے نہیں تھے اور بابا اس سے اتنی اپنائیت سے بات کر رہا تھا۔

''تم شاید سوچ رہے ہو میں تم پر اتنا مہربان کیوں ہوں۔ تو میں نے کہا نا تم میں مجھے اپنا آپ نظر آیا ہے اور یہ بھی ہے کہ میں اتنا کماتا نہیں ہوں۔ تمہیں اپنے ساتھ رکھ لوں گا اور اس سے ناں میرا گزارا ہوگا نہ تمہارا، شاید تم یہی سوچ رہے ہو۔'' آخری بات پر اس نے ہنستے ہوئے انگلی ہلا کر پُر زور تائید کی تھی۔ ''آخری جملہ زیادہ درست ہے۔'' ٹکا یہی سوچ رہا ہوگا۔

''نہیں ایسی بات نہیں۔'' وہ خجل ہوا۔

''اچھا یہ سب چھوڑو تمہارا نام کیا ہے۔ اچانک بابا نے موڈ بدلا۔

''ٹکا!'' ٹکے کے جواب نے بوڑھے کو حیران کر دیا۔

''ٹکہ.....؟'' یہ بھلا کیا نام ہے تم جیسے قیمتی انسان کا نام بھلا ٹکہ کیسے ہوسکتا ہے؟ شاید کسی جوہری کی نظر نہیں پڑی تم پر، ورنہ میں نے اتنے نوجوان دیکھے ہیں، تم سب سے مختلف ہو۔''

بابا کو جیسے صدمہ ہوا تھا ''اصلی نام کیا ہے؟''

''پتا نہیں ہمیشہ اسی نام سے ماں باپ نے اور آنے نے پکارا ہے۔'' وہ سادگی سے بولا

''لو بھلا..... اب یہ آنہ کون ہے؟'' بابا نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

''میرا بھائی۔'' اس کے جواب پر وہ کچھ نا بولا، ٹکہ بھی خاموش تھا۔

''آج کتاب نہیں پڑھو گے؟'' اس کی خاموشی محسوس کر کے بابا نے اس کی خاموشی دور کرنا چاہی اسے تو بہانہ چاہیے تھا جو مل گیا۔ ایک معصوم شرمندہ شرمندہ سی مسکراہٹ چہرے پر پھیل گئی۔

''جھلے.....تو اٹھا لوں ناں کتاب.....'' بابا نے پیار سے گھرکا۔ ''میری کون سی بیوی یا بچے ہیں جن کا میرے ساز و سامان پر حق ہوگا اور اگر ہوتے بھی تو ان کتابوں کے سوا میری کوئی وصیت تھوڑی ہوتی، ڈھیرے ڈھیرے کتابوں کی خریداری، بھی وقت کے ساتھ ختم ہوتی جا رہی ہے۔ ایک آدھ کتاب بکتی ہے تو دو چار پیسے ہاتھ لگ جاتے ہیں۔'' بابا بڑبڑایا۔ یہ بڑبڑاہٹ ٹکے نے سن لی تھی، مگر کتاب ہاتھ میں پکڑ کر وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔

جوانی کا دور بڑا رنگین اور پُر فریب ہوتا ہے اس میں ضروری نہیں کہ آدمی محبت کرے اور اس ثمر کی لذت سے آشنائی حال کرے۔ یہ وقت بجائے خود بڑا کیف اور سرور انگیز ہوتا ہے۔

اس میں آدمی اور نہیں تو محبت کرنے والوں کے قریب ضرور رہتا ہے مرتا نہیں تو کم از کم ان لوگوں کو ضرور دیکھتا رہتا ہے۔ جن کے بدن میں موت کا فرشتہ اپنی نازک انگلی سے چھوتا اور انہیں اپنی طرف متوجہ کرتا رہتا ہے۔

اس دور کا خالی ہاتھ انسان، محبت کرنے والوں کی تنہائی اور اداسی کی ٹھنڈک سے اپنے وجود میں ایک مستقل کپکپی محسوس کیے جاتا اور یہ کپکپی چپ چاپ اس میں لرزاہٹ کے ساتھ مل جاتی، جب تک وہ رحم مادر میں تھا اسے محفوظ و پُرسکون ہونے کے باوجود تنہائی کا شعور تھا، لیکن یادداشت بہت کمزور تھی۔''

یہ سطریں پڑھ کر اچانک وہ بڑا ہو گیا اور عقل کی سمجھ حیرت انگیز طور پر بڑھ گئی وہ اک پل میں کچھ سے کچھ ہو گیا۔

آج کتاب کے سرورق پر نام نہیں تھا کیوں کہ وہ بہت خستہ حال ہو چکی تھی۔ وہ کتاب رکھ کر خاموشی سے پلٹا تو پشت پر بابا کی غمزدہ آواز ابھری۔

میں اب بھی منتظر ہوں۔ سوچ کر جواب دینا اب ان بوڑھی ہڈیوں میں دم خم نہیں رہا۔ کسی روز اپنے ایک کمرے کے مکان میں مر جاؤں گا اور میرے پاس کوئی پانی پلانے والا بھی نہ ہوگا تمہیں بیٹا سمجھ کر بہت پیار دوں گا تمہارے باپ کے پاس کم از کم ایک بیٹا تو ہے میرے پاس تو وہ بھی نہیں ہے اور میں لاوارث مرنا نہیں چاہتا۔''

ٹکے کے سینے پر دل کی جگہ جیسے کسی نے زور کا

ہاتھ مارا تھا۔ مگر وہ پلٹا نہیں، بغیر کچھ کہے گھر کی طرف چل پڑا۔ اس بات سے بے خبر کہ آنا اس کی جاسوسی پر مامور تھا۔ باپ کو اپنے بڑے بیٹے کے رویے پر شک تھا۔

☆......☆......☆

وہ گھر میں داخل ہوا تو باپ بھرا بیٹھا تھا۔ وہ ٹھٹک کر وہیں رُک گیا۔

''کہاں تھے تم؟'' وہ ضبط کرتے ہوئے سرخ آنکھیں اس پر نکالتا بولا تھا۔

باہر تھا...... کتابوں کے ٹھیلے کے پاس۔'' وہ بغیر متاثر ہوئے سکون سے بولا۔ اس کا انداز باپ کو سوا نیزے پر پہنچا گیا۔

''ہاں اپنے اس نکمے کے پاس۔ کرنے کو اور کچھ نہیں تو لوگوں کے بچوں کو خراب کر رہا ہے۔ خود تو آرام سے بیٹھا سارا دن سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتا ہے۔ اسے کیا پتا رزق کیا ہوتا ہے اور کیسے کمایا جاتا ہے۔

وہی تمہیں بھڑکا رہا ہے میرے خلاف۔ نکما آوارہ بڈھا کہیں کا۔'' اس کی آخری بات نے نکے کو بھی غصہ دلا دیا۔ کچھ مت کہو ابا، میں اپنی مرضی سے اس کے پاس جاتا ہوں۔ آئندہ اس کے لیے ایسی گالی استعمال مت کرنا۔''

''اچھا کیا کر لو گے تم......؟ یہ اتنے ابال کیوں اٹھ رہے ہیں اس بڈھے کے لیے۔ تیری ماں ماں کا یار تھا؟؟'' بات بہت سنگین تھی۔

''ابا......!'' نکا دھاڑا تھا۔ پھوٹ پڑ چکی تھی اب وہ مزید نکے کو اپنی نظروں کے سامنے برداشت نہیں کرسکتا تھا۔

''مت کہو مجھے ابا۔ جس دن تم پیدا ہوئے تھے میں نے تمہاری ماں سے کہہ دیا تھا کہ میرا دل کھٹک رہا ہے۔ پھر جب تم اسکول میں خوش رہتے تھے تب میں نے سمجھ لیا تھا کہ تمہارا ہمارے ساتھ چلنا ٹھیک نہیں۔ تم میرے ماحول میں خوش نہیں تھے۔

پڑھنا چاہتے تھے مگر میں پھر بھی تمہارے نخرے برداشت کرتا رہا۔ اب اور نہیں بہت ہو گیا جاؤ۔ جاؤ اس بڈھے نکمے کے پاس۔

اسے ہی ابا کہنا۔ کاٹھ کباڑ میں رہنا تمہیں پسند نہیں تھا میں نے ہی تمہیں زبردستی باندھے رکھا۔ اب رہنا کتابوں کے بیچ خوشی سے۔ آئندہ مجھے اپنی شکل مت دکھانا۔ میرے لیے آنا ہی میرا بیٹا ہے۔ میری ہر بات ماننے والا۔ مجھے خوش کرنے والا، تم تو مجھ پر بوجھ ہو۔ تم سے جان چھوٹ گئی تو سکھ کا سانس لوں گا۔

کام کا نا کاج کا دشمن اناج کا وہ بغیر لحاظ کیے تیز لہجے میں بولا تھا۔ نکے نے ایک پل کے لیے بھی کچھ نہ سوچا اور پلٹ کر دہلیز پار کر لی تھی۔

☆......☆......☆

''ایک باپ اپنے بیٹے سے ایسی بھی باتیں کرسکتا ہے، مجھے یقین نہیں آتا۔ وہ مجھ سے اتنا بیزار تھا۔ میں اس پر بوجھ تھا۔

اس نے مجھے گھر سے نکلنے کو کہا، اگر ناں بھی کہتا تو میں اب وہاں نہیں رہتا۔'' وہ بابا کے پاس بیٹھا ناک کی سیدھ میں دیکھتا بہت اداس تھا، گاڑیوں کا شور، لوگوں کی باتوں کا شور، اسے کچھ دکھائی یا سنائی نہیں دے رہا تھا۔

بابا خاموشی سے سگریٹ کا دھواں اڑاتا اسے سن رہا تھا۔

''جب میری ماں مری تھی، تو ہمارے دکھ کا خیال کیے بغیر وہ کہہ رہا تھا کہ اچھا ہے مر گئی۔ اس کے حصے کی روٹی اب میں کھا لیا کروں گا۔

پیٹ بھر کے کھانا تو ملے گا نا۔ اتنا بے حس شخص جو ایک مرے ہوئے شخص کا لحاظ نہ کر سکے، وہ زندوں کا کیا لحاظ کرے گا۔ آج سے میں آپ کے پاس رہوں گا۔ آپ کا بیٹا بن کر۔ وہ رہے اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ۔''

''وہ جیسا بھی ہے تمہارا باپ ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک بار پھر سوچ لو؟'' جہاندیدہ بوڑھے نے اپنے تجربے کے پیشِ نظر اسے سمجھانا چاہا۔

''نہیں بابا زندگی ایک بار ہی ملتی ہے۔ میں نے سوچ لیا ہے۔ یہ میری زندگی ہے اپنی مرضی سے

گزراوں گا اسے۔'' اس نے اٹل لہجے میں کہہ کر چہرہ موڑ کے بابا کو دیکھا۔

''جیسے تمہاری مرضی۔'' اس نے کندھے اچکا کر معذوری ظاہر کی۔

☆......☆......☆

''تم تو میرے لیے خوش قسمت ثابت ہوئے ہو اب تو میں اچھا کما لیتا ہوں۔ واہ بھئی! بڑھاپے میں میری قسمت چمک اٹھی۔ واہ رے مولا، تیرے کرم!!!'' وہ اوپر کی طرف دونوں ہاتھ اٹھا کر آہ بھرتے ہوئے بولا۔ نکے نے کوئی جواب نہیں دیا بس مسکراتے ہوئے خستہ حال کتابوں پر خاکی کاغذ چڑھا تا نام لکھتا جارہا تھا۔

آج بابا کے ہاتھ میں سگریٹ کے بجائے من چلے کا سودا، کتاب تھی۔ نکے کے آجانے سے وہ ٹھیلے سے مطمئن تھا ایک آدھ کتاب پڑھ لیتا جو کب کی ذہن سے محو ہو چکی تھی۔ بڑھاپے کا پڑھنا، پہلے کے پڑھنے سے بڑھ کر لطف دیتا، وہ سر دُھنتا رہ جاتا۔

''آہا...... مزہ آ گیا، واہ کیا الفاظ ہے شاباش بھئی اشفاق احمد صاحب پر ہے۔ جتنی بار پڑھو تو پہلی بار کی طرح چونکا دیتا ہے۔ لو تم بھی سنو۔'' اس نے چشمہ لگی آنکھوں کو چندھیا کر پڑھنا شروع کیا۔

''اس دنیا میں محبت کا کاروبار...... رائے کا یقین...... اعتماد کا ثبوت صرف خیال کی زد میں ہے۔ ڈاکو کی ماں اس خیال کے ستون سے بندھی ہے کہ اس کا بچہ ڈاکو نہیں ہے۔ تم اس کو آرے سے چیر دو وہ تسلیم ہی نہ کرے گی کہ اس کا بچہ ڈاکو ہے۔ جس عاشق کی محبوبہ بے وفا ہے لیکن عاشق اس کی وفا کے خیال میں پرویا ہوا ہے۔ وہ اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں کرتا۔ انسان اپنے ایمان، اپنے اعتماد، اپنے اعتماد کی کشتی میں سفر کرتا ہے، اور اس کی کشتی اس کے یقین کے بادبان کے ساتھ چلتی ہے۔''

''کیسا؟'' پوری عبارت پڑھ کر بابا نے نکے کو دیکھا۔

''بہت زبردست، واقعی یہ دونوں میاں بیوی اعلیٰ پائے کے تخلیق کار ہیں۔ کیا غضب کی کتابیں لکھی ہیں دونوں نے۔ شاید ہی ہمارے ملک میں ان جیسا لکھنے والا ملے، پڑھتے ہوئے انسان ہر شے سے غافل ہو جاتا ہے۔'' نکے نے اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی ساری کتابیں پڑھ لی تھیں۔ اب وہ مشکل سے مشکل الفاظ اور جملے پڑھ کر مطلب سمجھ لیتا تھا بابا ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھ کر اس کی بات کی تائید کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

''آنے۔ تیرا شکریہ، تیری وجہ سے مجھے رہائی ملی۔ میں بہت خوش و مطمئن ہوں۔ لگتا ہی نہیں کہ میں اب تک اپنے باپ کے پاس تھا۔ کبھی پیار کے دو بول نہیں سنے اس کی زبان سے۔ کیسا تھا باپ! جذبات سے عاری۔ ٹھیلے والا بابا تو بہت اچھا ہے۔ کمانا زیادہ نہیں پر بچوں کی طرح مجھے خوش کرتا ہے۔ میرے لیے اماں کی طرح...... طرح طرح کے کھانے بناتا ہے۔ وہ کہتا ہے اب مجھے ابا کہو جیسے میں نے تمہیں بیٹا تسلیم کرلیا ہے، مگر میں اسے کیسے ابا کہوں...... میرا ابا تو ایسا نہیں تھا۔ ابا تو مارنے والا، اماں کو برا بھلا کہنے والا۔ ہر وقت چیخنے اور گالیاں دینے والا تھا۔ میں بابا کو بابا ہی کہتا ہوں۔ کیا کروں زبان پر اتنے محبت کرنے والے شخص کے لیے ابا لفظ نکلتا ہی نہیں۔''

''بس بیٹا، تم تھک گئے ہوگے، اب سو جاؤ۔'' بابا نے اپنے پیروں کو ہولے ہولے دباتے نکے کو سوچ میں دیکھ کر اس کے ہاتھوں پر اپنا بوڑھا کانپتا ہاتھ رکھا۔

''نہیں مجھے تو ابھی نیند نہیں نہیں آرہی۔'' وہ چونک کر بولا۔

''اللہ تمہیں خوش رکھے۔ کسی اولاد کی طرح میرا خیال کرتے ہو۔ میری آنکھوں کی ٹھنڈک بن گئے۔ لگتا ہی نہیں کہ کچھ دنوں کا ساتھ ہے، یوں لگتا ہے کہ جیسے ہم برسوں سے شناسا ہوں، کیسا بدنصیب شخص تھا جو اپنے فرمانبردار بیٹے کی قدر نہ کر سکا۔'' بابا آبدیدہ ہو گیا۔

''بابا ایک بات پوچھوں؟'' نکے نے بے اختیار آگے ہو کر کہا جو بات وہ پوچھنے جارہا تھا، بار ہا اس کے ذہن میں آئی تھی مگر پوچھ نہ سکا تھا۔

"پوچھو۔"
"تم نے شادی کیوں نہیں کی؟"
"وقت پر کوئی نہیں ملی، بال سفید ہو گئے ایک ملی مگر وہ بھی میری نا ہو سکی۔" بابا نے بہت آسانی سے بتا دیا حالانکہ نکہ ڈر رہا تھا کہ وہ کیسا تاثر دے گا۔
"مطلب......؟ پوری بات بتاؤ ناں۔ میں نے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا، مگر تم نے اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔" نکے کی بات پر وہ ہنس دیا۔
"تم نے کب پوچھا جو میں بتا دیتا، مجھے تو بہانہ چاہیے کوئی میرے دل کا حال جانے۔ میں دنیا سے اتنا کورا ہو کر بھی نہیں جانا چاہتا۔" وہ اداسی سے بولا۔
"تو اب میں پوچھ رہا ہوں ناں، مجھے اپنی زندگی کے بارے میں کچھ بتاؤ میں جاننا چاہتا ہوں۔" وہ تجسس سے بولا۔
"حق ہاہ!!! اللہ بھی کتنا مہربان ہے۔ ساری زندگی مجھے دکھ ملتے رہے۔ جن سے محبت کی وہ بچھڑتے رہے اب یہی ایک خواہش تھی جو خدا نے تمہاری صورت میں پوری کر دی۔ تمہیں بتا نہیں سکتا کتنی خوشی ہوئی یہ سن کر کہ تم میرے بارے میں جاننا چاہتے ہو۔" وہ بہت خوش لگ رہا تھا۔
ان دنوں پاکستان بننے کی تحریک زور و شور پر تھی۔ جب میری اکلوتی چچازاد مجھ سے منسوب ہوئی۔ وہ مجھ سے محبت کرتی تھی، بے حد حسین اور نہایت بے باک۔ میں اس وقت کے نوجوانوں کی طرح شرمیلا اور کم گو تھا مگر وہ کسی سے نہیں ڈرتی تھی۔ اکثر بے دھڑک میرے کمرے میں آ جاتی، چوڑیوں کی کھنک کے ساتھ جب وہ زور سے ہنستی تو میرا برا حال ہو جاتا۔ اسے سمجھاتا کہ میرے گھر میں دو بہنیں ہیں، ماں ہے۔ وہ لوگ کیا سوچیں گے۔ تم میرے کمرے میں مت آیا کرو، تو وہ کہتی ہائے اللہ! شکیل تم کس قدر ڈرپوک مرد ہو۔" اور قہقہہ لگا کر میری بے بسی کا لطف لیتی کمرے سے غائب ہو جاتی اور مجھ سے منسوب ہو جانے کے بعد وہ پردہ کرنے کے بجائے ہمارے ہاں موجود رہتی۔

ایک دن میں ایک کمرے میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا کہ اچانک وہ چلی آئی اور ہمیشہ کی طرح دبے پاؤں آنے کے بعد چوڑیاں کھنکا کر مجھے متوجہ کیا میں نے انجان بن کر سر اوپر نہ اٹھایا۔ مجھے اس کی بے باک ادائیں سخت ناپسند تھیں مگر میں مجبور تھا، ماں باپ اور چچا نے میری مرضی جانے بغیر ہی آپس میں سب کچھ طے کر لیا اور مجھ سے پوچھا بھی جاتا تو میں اتنا نڈر نہیں تھا کہ جھٹ سے ان کے منہ پر انکار کر دیتا۔ کہنے لگی۔
"شکیل کتابیں پڑھنا چھوڑ دو۔ کیا تم ہر وقت ان ہی میں گھسے رہتے ہو۔" بہت ناز سے بولی تھی۔ میں نے ایک پل کو سر اٹھا کر اسے دیکھا جو مجھے دیکھ رہی تھی۔
"کتاب میرا عشق ہے اور جب تک میں زندہ ہوں اس سے میرا رشتہ ختم نہیں ہو سکتا۔" میرا لہجہ پہلی بار سخت ہوا تھا۔
"اور تم اچھی طرح جانتے ہوں مجھے کتابیں پڑھنے والے لوگ کتنے زہر لگتے ہیں۔ مجھے ایسا شکیل چاہیے جو صرف مجھے دیکھے، دن میں دس بار میری تعریف کرے، خالدہ تم کتنی خوبصورت ہو، تم پر ہر رنگ کس قدر کھلتا ہے، خالدہ تم ہنستی ہو تو کتنی اچھی لگتی ہو۔ ہر بات ہر لمحے ہر گھڑی بس میری تعریف۔ کتابیں پڑھنا چھوڑ دو شکیل۔" پہلی بار میں نے اس زندہ دل ہر پل مسکراتی لڑکی کو آبدیدہ ہوتے دیکھا تھا
۔
"کتاب میری سانس ہے اور میں سانس لینا نہیں چھوڑ سکتا۔"
"میں ایک بے حس شخص کے ساتھ ساری زندگی بت بن کر نہیں گزار سکتی۔" وہ روتے ہوئے کمرے سے نکلی تھی اور میں ہلتے پردے کو دیکھتا رہ گیا تھا۔
اس دن کے بعد میں نے اسے اپنے گھر میں نہیں دیکھا، امی اور چھوٹی بہنیں اسے یاد کرتیں، اس کا ذکر کرتیں تو میں چور سا بن جاتا۔ پھر مجھے کسی کام کے لیے لاہور آنا پڑا۔ پاکستان بننے کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور ہر طرف پھیل گئیں۔ اک آگ تھی جس نے

ہر شے کو جلانا شروع کر دیا۔ اب میں پچھتا رہا تھا کیوں کہ میں ان خراب حالات میں بوڑھے والدین اور چھوٹی بہنوں کو چھوڑ کر آ گیا اور پھر اک دن خبر ملی کہ میرا پورا خاندان لاہور آتے ہوئے مارا گیا میرے والدین نہیں، میرا چچا اور اس کی اکلوتی ہنستی مسکراتی بیٹی بھی...... بہت وقت لگا یہ صدمہ بلکہ قیامت جھیلنے میں۔

پیسہ میرے پاس تھا نہیں۔ میں نے کتابوں کا ٹھیلہ لگا لیا، اور اچھا خاصا کمانے لگا۔ زندگی یونہی گزرتی رہی، وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ گزرتے وقت کے احساس نے مجھے آئینہ دکھایا تو مجھے خود پر ہنسی آئی، میرے بال آدھے سے زیادہ سفید ہو گئے تھے اور مجھے اک جوان عورت سے محبت ہو گئی تھی۔ میں اسے نہیں جانتا تھا، بس وہ روز میرے ٹھیلے کے سامنے سے گزرتی تھی اور میں سیاہ چادر میں مقید اس کے حسن کو دیکھتا رہتا۔

''ایک مہینہ اسی طرح گزر گیا۔ ایک دن میں نے اس کا راستہ روکا اور اس سے بات کی، اپنی محبت کا اظہار کر دیا، شاید وہ گھبرا گئی تھی۔ میرے سوالوں کے جواب دیے بغیر ہی چلی گئی۔ وہ مجھ سے گریز کرتی، بات کرنے سے کتراتی مگر میں بھی اپنے عشق میں پکا تھا، ہار کیسے مان لیتا؟ میرے بارہا مجبور کرنے پر وہ مجھ سے بات کرنے پر راضی ہوئی۔ اس نے کہا کہ اب وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے مگر اس سے آگے مجبور ہے۔ اس نے کہا کہ میں اس کا پیچھا چھوڑ دوں اور یہ کہہ کر چلی گئی۔ مجھے اس رات نیند نہ آئی، صبح کا انتظار کرتا رہا اور پھر صبح ہو گئی میں نے اس کی مجبوری جاننے کی کوشش کی، وہ نہیں مانی۔ مگر پھر میری ضد پر مجبور ہو کر بتایا کہ وہ شادی شدہ ہے۔ ایک اجڈ کباڑیے کے ساتھ جہنم سی زندگی گزار رہی ہے۔ وہ بہت بدصورت تھا اور شمیم آراء کا حسن برداشت نہیں ہوتا تھا وہ واقعی شمیم آراء تھی۔ بہت حسین اس بات پر مجھے دھچکا لگا۔

میں نے اس سے کہا کہ اس کباڑیے کو چھوڑ دو، میں تمہیں بہت خوش رکھوں گا۔ وہ کہنے لگی ایسا قطعاً ممکن نہیں۔ اس کے دو بیٹے ہیں وہ شوہر کو تو چھوڑ دے گی ان کے بچوں کے کیا ہوگا۔ میں نے اسے ہر طرح یقین دلایا کہ میں اس کے بچوں کو باپ بن کر پالوں گا۔ تمہیں مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی مگر وہ نہ مانی۔ وہ اس شخص سے اس کی باتوں سے خوفزدہ تھی۔ اس نے مجھے قسم دی کہ مجھے بھول جاؤ اور پھر وہ مجھے کبھی وہاں سے گزرتے دکھائی نا دی، دھیرے دھیرے لوگ کتابیں پڑھنا فراموش کرتے رہے۔ میرا ٹھیلا ویران رہنے لگا مگر میں نے وہ جگہ نہ چھوڑی۔ میں آج بھی اسی کا انتظار کرتا ہوں۔'' بابا کی بات ختم ہو گئی تھی مگر ٹنکہ ساکت ششدر تھا۔ شمیم آراء کے ذکر تک وہ بہت اشتیاق سے سنتا رہا تھا۔

کباڑیے کی بیوی شمیم آراء سے محبت...... اور اس کے دو بیٹے، یہ سب کچھ اس کے ذہن میں گڈمڈ ہو رہا تھا۔

''جاؤ ماں کے یار کے پاس تمہارا وہ کچھ لگتا۔'' اسے گھر سے نکالتے وقت باپ کے وہ الفاظ یوں سچ ہو جائیں گے اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

''کیا ہوا بچے؟'' بابا کو ٹنکہ ٹھیک نہیں لگا تھا تو تشویش سے بولا۔

''کباڑیے کی بیوی شمیم آراء...... وہ تو میری اماں تھی جو کب کی مر چکی، اس کی خوبصورتی کو دیکھتے میری نانی نے اسے شمیم آراء کا نام دیا تھا۔ وہ تو میری ماں تھی، جس کو اس کباڑیے نے جوانی میں مار دیا تھا۔'' ٹنکہ بچوں کی طرح رونے لگا اور یہی الفاظ بار بار دہراتا۔ بابا اپنی جگہ ساکت جہاں کا تہاں بیٹھا رہ گیا تھا۔ ٹنکے کو سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اچھا بھلا وہ لوگ شہر میں رہتے تھے اسکول جاتے تھے۔ اماں بہت خوش تھی۔ ہر بار میں سمجھوتا کرنے اور مار پیٹ کھانے والی اماں نے اس بات پر سمجھوتا نہیں کیا تھا وہ ٹنکہ اور آنے کو خود تیار کر کے اسکول چھوڑ آتیں۔ ایک دن اس کی ماں نے کہا وہ گاؤں جا رہے ہیں۔ ابا کو تو گاؤں کا نام سننے ہی کی دیر تھی۔ مختصر سا سامان باندھ کر گاؤں روانہ ہو گئے۔ اماں کا انتقال وہیں ہوا۔ وہ لوگ کافی عرصہ وہاں رہے۔ دونوں بھائی جوان ہو گئے تھے اب ان کا باپ اکیلا ناں تھا۔ گاؤں میں اب ان کا کام ٹھیک

سے نہیں ہوتا تھا۔ وہ لوگ پھر شہر آ گئے وہیں جہاں وہ لوگ پہلے رہتے تھے۔

روتے روتے تھک کر اس نے سر اٹھایا، بابا ساکت بیٹھا سامنے دیوار کو بغیر جنبش یا حرکت کیے تکتا جا رہا تھا۔ ٹکے کو کسی انہونی کا احساس ہوا تھا۔

''بابا اس نے پکارنے کے ساتھ ہی ہاتھ بڑھا کر ان کا کندھا ہلانا چاہا تھا کہ وہ مٹی کے تودے پر بستر کی طرح گر گیا۔ اس کی حرکت قلب بند ہونے سے زندگی چلی گئی تھی۔ ٹکہ ان کے مرنے پر بہت رویا تھا اتنا کہ اگر اس کا باپ بھی مر جاتا تو وہ اتنا نہ روتا، یوں لگتا تھا جیسے آج اس کا سگا باپ مرا تھا۔

وہ ٹھیلے کا اکیلا مالک بن گیا تھا۔ اسے جس لڑکی سے محبت ہوئی وہ اسے یہ کہہ کر چلی گئی کہ آج تو پھر ایک آدھ لوگ کتاب خریدنے آ جاتے ہیں، اگلے چند سالوں میں یہ آدھ لوگ بھی آنا چھوڑ دیں گے۔ یہ پاکستان ہے، یورپ نہیں جہاں ہر بس اسٹاپ پر، سفر میں اور تفریحی مقامات میں بیٹھے لوگ ہاتھ میں اک کتاب ضرور رکھتے ہیں۔ ٹھیلے کو بیچ کر کوئی ڈھنگ کا کام کرو۔ بڑھاپے میں کیا کرو گے، ابھی تم جوان ہو کما سکتے ہو، میں جانتی ہوں آج کی لڑکیاں اور ان کا معیار...... کم از کم تم جیسا کتابوں کے ٹھیلے پر بیٹھا آدمی نہیں ہو سکتا۔ اپنے بڑھاپے پر رحم کرو اور کچھ کما کر اپنے لیے جمع کر کے رکھو، کام آئے گا۔''

وہ چلی گئی پانچ سال گزر گئے، اس نے پھر کبھی محبت کرنے کی غلطی نہیں کی۔ جس کتاب کے لیے گھر چھوڑا تھا، پھر محبت کو چھوڑ دیا۔ اس کتاب سے رشتہ کیا اتنا کھوکھلا ہو سکتا ہے کہ وہ ایک بے بھروسہ زندگی کے لیے کتاب سے رشتہ ختم کر لیتا۔ جس کو باپ نے ٹکہ بنا دیا ہو اسے معاشرہ کیا عزت دیتا، اسے عزت چاہیے بھی نہیں تھی۔ باپ نے سکھایا ہی کب تھا کہ عزت کیا ہوتی ہے۔ ایک دن بابا نے کہا تھا کہ خود اپنی عزت کرو لوگ خود بخود تمہاری عزت کریں گے۔ جو تمہیں ٹکا کہے اس کا منہ توڑ دو، آئندہ کسی کی ہمت نہیں ہوگی تمہیں ٹکہ کہنے کی۔ تمہاری ذات ایسی نہیں کہ تمہیں ٹکا کہا جائے۔ تمہاری ماں نے تمہارا نام امجد رکھا تھا۔

کتنے پیار سے تمہیں وہ امجد کہتی تھی۔ تم ٹکے نہیں ہو۔''

اس وقت وہ اتنا سمجھ دار نہیں تھا اس کا دھیان ہی اس طرف نہ تھا کہ بابا کو کیسے میرا نام پتا چلا اور میری ماں کے بارے میں بھی...... مگر بعد میں اسے سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔ کہ ایک انجان بوڑھا بھلا کیسے ایک انجان شخص کو اپنے پاس رکھنے کی خواہش کر سکتا ہے پھر اسے سگی اولاد کی طرح پیار دے سکتا ہے۔ کیوں کہ ٹکہ کوئی انجان یا غیر نہ تھا اس کی محبوبہ کا بیٹا تھا۔ اپنی ماں کا ہم شکل، بھلا جو شخص اپنی محبوبہ کا سن کر صدمے سے زندگی ہار سکتا ہے وہ ٹکے کو کیسے نا پہچان پاتا کہ وہ کس کا بیٹا ہے۔ جس کی شکل پر صاف لکھا تھا کہ وہ شمیم آراء کا بیٹا ہے۔''

☆......☆......☆

آنا اتنے برس بعد اس سے ملنے، اس سے معافی مانگنے آیا تھا۔ وہ اب اکیلا تھا ابا مر چکا تھا۔ آنے کو معاف کر دیا تھا۔

دونوں خاموش تھے، معافی تلافی ہو چکی تھی، مگر بعد کا، مرحلہ تکلیف دہ تھا۔

''ابا نے صحیح کہا تھا۔ وہ اماں کا یار تھا۔ اس نے ایسے ہی تو مجھے سگا بیٹا نہیں بنا لیا تھا۔ وہ مجھ میں اماں کو دیکھا کرتا تھا۔ میرا خیال رکھ کر یوں خوش ہوتا کہ گویا اماں کا خیال کر رہا ہو۔'' بات بہت بڑی تھی۔ مگر ٹکے نے بہت سکون اور آرام سے کہہ دی۔

''غیرت کرو ٹکے تم کیسے اماں کے لیے ایسی بات کر سکتے ہو؟'' وہ غصے سے بولا غصے میں شدت سے نتھنے پھڑک رہے تھے۔

''غیرت ہونہہ!'' وہ استہزائیہ ہنسا۔ ''تم جانتے ہو کہ عزت کس چڑیا کا نام ہے کبھی ہمارے ماں باپ نے تمہیں سکھایا ہے کہ عزت، عزت یا محبت جیسے جذبات بھی کوئی انسان رکھ سکتا ہے۔ اس نے ہمیں صرف یہ ہی سکھایا ہے کہ میں ٹکا اور تم آنا ہو۔ اس سے بڑھ کر ہماری کوئی حیثیت یا مرتبہ نہیں۔ ہماری اماں کے دیے نام تک اس نے ہم سے بھلا دیے۔

ہمیں اتنا گرا دیا کہ اب چاہ کر بھی اٹھ نہیں سکتے۔ ساری زندگی گالیاں، مار پیٹ اور کوسنے دے دے کر

احساس کمتری میں مبتلا کر دیا۔ یہ اس لیے کہ ہم اس کے سامنے کبھی سر نا اٹھا سکیں۔ یہ کرتے وقت اس نے کبھی ایسا نہ سوچا کہ ہم کسی کے سامنے بھی سر نہ اٹھا سکیں گے۔ وہ ہمارا باپ نہیں دشمن تھا۔ ہمارے جیتے جاگتے وجود کو ناکارہ بنا دینے والا باپ۔ میں بابا کے ساتھ بہت تھوڑا عرصہ رہا اور میں نے بار ہا خواہش کی تھی کہ ہمارا وہ باپ ہوتا۔ اس نے مجھے جینا سکھایا، مجھے خواہش کرنا سکھایا، میرے اندر موجود دل کی موجودگی کا احساس دلایا۔ وہ باپ ہمارا ہوتا تو شاید ہماری ماں اتنی جلدی نا مرتی۔ میرے سامنے اس بے حس شخص کی حمایت نہ کرو، یاد رکھو اس نے تمہیں آنا بنایا ہے۔ اسلم سے آنہ۔ ہماری ماں ایک جیتی جاگتی انسان تھی اسے بھی اپنی زندگی ایک قدر دان و محبت کرنے والے شخص کے ساتھ گزارنے کا حق تھا مگر ہمارے لیے اس نے اپنی خواہش چھوڑ دی۔ ابا سے تو اچھی ماں نکلی۔ ابا ہوتا تو ہماری پروا بھی نا کرتا۔ اپنی من پسند زندگی گزارتا۔ نکے کی باتیں تلخ سہی پر حقیقت تھیں۔ اسے آج احساس ہو رہا تھا کہ کاش وہ بھی نکے کی صحبت میں رہتا باپ کی چمچہ گیری نا کرتا تو آج اس کے پاس کچھ تو ہوتا نا!!!

☆......☆......☆

''جس وقت اسے ڈرایا جاتا رہا، وہ آج کا تھا''

اس نے کتابوں کو بہت سنبھال کے رکھا تھا بہت ترتیب کے ساتھ۔ گاہکوں کے انتظار میں صبح تڑکے سے سہ پہر ہو گئی مگر کوئی ٹھیلے کی طرف نہ آیا اس نے بابا کی پسندیدہ کتاب قربت مرگ میں محبت اٹھا کر پڑھنا شروع کر لی۔

اگر یہ موت ایک چار دیواری، ایک کمرے کے اندر، ایک چارپائی پر ہوتی ہے جس کا بان درمیان سے ڈھیلا پڑ چکا ہوتا ہے اور بوجھ کو ظاہر کرتا ہے کہ مرگ وزن بڑھا دیتی ہے، بے جان بدن کو بھاری کر دیتی ہے اور اسے کندھے دینے والے ہمیشہ محسوس کرتے ہیں کہ جب وہ سانس لیتا تھا وہ ہرگز اتنا بھاری نا تھا......

وہ مزید بھی پڑھتا اگر پاس سے گزرتے نوجوانوں کی بات اور قہقہہ اسے متوجہ نا کرتے۔

''زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے اور یہ بے وقوف لوگوں کے انتظار میں خود ہی اپنی کتابیں پڑھنے لگا۔''

''ہمارے لوگوں کا یہی تو المیہ ہے جب تک منہ پر طمانچہ نا مار دو سمجھتے ہی نہیں۔'' ایک شخص نے کہا تھا اور سارے لوگ تائید کرنے لگے دوسرا بولا۔

''اب تو دنیا جہاں کی مہنگی اور قیمتی کتابوں کو ڈاؤن لوڈ کرو تو جھٹ سے مل جاتی ہے اور ہم اسے اپنے ٹیب یا آئی فون میں بھی دیکھ سکتے ہیں، کتاب پکڑنے کا وقت کس کے پاس ہے؟'' اس کی بات پر سب نے مشترکہ قہقہہ لگایا تھا۔ اس نے دل گرفتگی سے کتاب بند کر کے رکھ دی۔

آج کل کے ان امیر نوجوانوں کو کون سمجھائے کہ احمقوں کی جنت کے سردارو، جب تک ہاتھ میں پکڑی کتاب نہ پڑھ لو، اسے پڑھنے کا لطف کیا، ہاتھ میں جدید آلات کے چمکتے کھلونے پکڑ کر سمجھتے ہیں بہت بڑے بادشاہ بن گئے۔ اس کے اس جنون کی وجہ سے کتابوں کا جنون آہستہ آہستہ دم توڑ رہا ہے، خطوط لکھے جاتے ہیں وہ ان بھی انہی کھلونوں کی نذر ہو گئے۔ ہیں آسان بات کہ مسیج کر دو بات ختم۔ زمانہ آگے کی طرف جا رہا ہوگا۔ مگر میں تو بہت پیچھے ہوں۔ مجھے ہاتھ میں پکڑی کتاب اچھی لگتی ہے۔ مجھے خطوط لکھنا اچھا لگتا ہے، بجلی نا ہو تو لالٹین یا دیا جلانا اچھا لگتا ہے۔ کیا میں ایک ہی جوان بوڑھا رہ گیا ہوں اپنی نسل کا۔ یا میرے جیسے اور بھی لوگ ہیں...... ہوں گے کیوں نہیں مگر آٹے میں نمک کے برابر، اتنے قلیل لوگوں کی خواہش پر بھلا کیا دنیا چلے گی؟؟؟؟

مجھے ہر بار دھتکارا جاتا ہے۔ کتاب سے دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، مگر مجھے کتاب سے دور نہیں ہونا۔ میں بھی بابا کی طرح آخری سانس تک کتاب سے رشتہ جوڑے رکھنا چاہتا ہوں۔ یہ میری تنہائی کی ساتھی ہیں...... انسانوں سے زیادہ مجھے خوش مطمئن کرنے والے میرے چہیتے ساتھی!!!

☆☆......☆☆

# گرفت



دستگیر شہزاد

**ٹوبہ ٹیک سنگھ سے، اُس کانسٹیبل کا قصہ، جو یہ بھول گیا تھا کہ رب کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا**

نیچے سڑک پر لوگوں کی بھیڑ بڑھتی جارہی تھی۔ جو بھی آتا بڑے تجسس سے بھیڑ کو دیکھتا اور پھر لوگوں کی نظروں کا تعاقب کرتا ہوا اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا۔ اور پھر اوپر کا منظر دیکھتے ہی حیرت زدہ سا کھڑا رہ جاتا اور خود بھی بھیڑ کا ایک حصہ بن جاتا۔ وہ شہر کی ایک معروف ترین شاہراہ تھی۔ اور اس مصروف ترین شاہراہ کے کنارے وہ بائیس منزلہ ہوٹل کی ایک شاندار عمارت تھی۔ اس بائیس منزلہ عمارت کی اٹھارہویں منزل سے نیچے کے لوگ ننھے ننھے سے نظر آرہے تھے۔ بھیڑ ہوجانے سے ٹریفک میں بھی خلل پڑ رہا تھا۔ گاڑیوں کی ایک لمبی قطار بن گئی تھی۔ اُن کے مالکان جھنجلا جھنجلا کر ہارن دے رہے تھے۔ اُن کے ہارنوں کی تیز جھنجلائی ہوئی تیز آوازیں اوپر اٹھارہویں منزل پر بھی سنائی دے رہی تھیں۔ بھیڑ کی وجہ معلوم کرنے کے لیے لوگ گاڑیوں سے اترتے اور پھر اوپر نظر اٹھتے ہی اپنی اپنی مصروفیات کو بھول کر متحیر کھڑے رہ جاتے۔

وہ اس مصروف شاہراہ کے بائیس منزلہ ہوٹل کی اٹھارہویں منزل کے باہر نکلے ہوئے چھجے پر کھڑا تھا۔ چھجا باہر کی سمت تقریباً دو یا تین فٹ نکلا ہوا تھا اور ایک آدمی دیوار سے چپک کر اُس پر کھڑا ہوسکتا تھا۔ وہ ایک دُبلا پتلا آدمی تھا۔ اُس کے دبلے پتلے چہرے پر ایک اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے بس آخری بار اس دنیا کا جی بھر کر نظارہ کررہا ہو۔ اُداسی اور بے کسی نے اُس کے چہرے کو بے حد معصوم بنادیا تھا۔

نیچے بتدریج بڑھتی ہوئی بھیڑ کو دیکھ کر وہ مسکرایا۔ خودکشی کے لیے اُس نے اِس فائیو اسٹار ہوٹل کی اٹھارہویں منزل کا یہ چھجا چنا تھا۔ تاکہ وہ نرالے ڈھنگ سے خودکشی کرسکے۔

اُس کی پشت پر ہوٹل کی بائیس منزلہ عمارت کی سپاٹ دیوار تھی۔ اور پیروں کے نیچے مختصر سا چھجا......

نیچے سڑک تھی اور سڑک کے اُس پار ٹھیک اُس کی نظروں کے سامنے ایک بینک کی بلند عمارت تھی۔ جس کی چھت سے بہت سی متحیر اور خوف زدہ آنکھیں اُسے گھور رہی تھیں۔ اچانک اُس کے بائیں طرف کی کھڑکی سے ہوٹل کے ایک بیرے نے باہر جھانک کر اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں کے ڈیلے خوف اور حیرت کے مارے اپنے حلقوں سے نکلے پڑے تھے۔ کچھ دیر تک وہ اُسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ پھر



اُس نے تھوک نگلا اور گلا صاف کر کے بولا۔
''یہ کیا ہو رہا ہے؟''
''دیکھ نہیں رہے ہو کہ کیا ہو رہا ہے۔'' اُس نے بے زاری سے جواب دیا۔
''کتنی خطرناک بلندی ہے۔ اگر پاؤں پھسل گیا تو ہڈیوں کا بھی پتا نہیں چلے گا۔'' اس خطرناک لمحے میں بھی اُسے ہنسی آ گئی۔ بہت پُر اسراری ہنسی۔ اور وہ آنکھ دبا کر بولا۔
''میری موت کے بعد میری ہڈیوں کا پتا چلے یا نہ چلے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''
''ارے! کیا تم خودکشی کرنے جا رہے ہو۔''
''نہیں ذرا ہوا کا پتا کر کے ابھی آتا ہوں۔'' اُس نے خوشدلی سے کہا۔
بیرے کے گول گول دیدے ایسے لگتا تھا جیسے اب اپنے حلقوں سے نکل کر دوڑ لگائیں گے۔ جلدی سے اُس نے اپنا سر کھڑکی کے اندر کر لیا۔ چند منٹ بعد اسی کھڑکی سے موٹے شیشوں کی عینک لگا۔ یہ اُس ہوٹل کے منیجر کا سر تھا۔

''اے مسٹر!'' اُس کی بھی آواز آئی۔
''کہیے؟''
''یہ کیا حماقت ہے۔ کیا پاگل پن ہے۔ چلیے آیئے میں کہتا ہوں چلیے آیئے۔''
''آپ اپنا کام کیجیے منیجر صاحب۔ میرے معاملے میں دخل دینے کا آپ کو کوئی حق نہیں۔''
''لیکن آپ ہیں کون ذاتِ شریف اور یہاں پہنچے کیسے؟''
''میں حماد مغل ہوں اور جس کمرے میں کھڑے آپ مجھ سے باتیں کر رہے ہیں۔ یہ میرا ہی کمرہ ہے۔ کل شام ہی میں نے اسے حاصل کیا ہے۔ جایئے بکنگ کلرک سے پوچھیے۔ میں کوئی چور اُچکا نہیں ہوں۔''
''میرے بھائی ہم خودکشی کرنے کے لیے کمرہ کرائے پر نہیں دیا کرتے۔ آپ سیدھی طرح واپس اپنے کمرے میں چلے آئیں۔ تو بہتر ہے ورنہ......؟''
''ورنہ کیا؟''
''ورنہ آپ کو زبردستی وہاں سے ہٹانے کا

بندوبست کیا جائے گا۔''
اُس نے منیجر کی طرف گھور کر دیکھا۔ اور کہنے لگا۔
''اگر میرے پاس پہنچنے کی کوشش کرو گے تو میں اسی لمحے نیچے چھلانگ لگا دوں گا۔''
یہ سن کر منیجر کا رنگ فق ہو گیا اور وہ جلدی سے کھڑکی سے ہٹ گیا اور چیخ چیخ کر گھبرائے ہوئے لہجے میں کسی کو کچھ ہدایت دینے لگا۔ حماد مغل نے کچھ لوگوں کے اِدھر اُدھر بھاگنے کی آوازیں بھی سنیں اور پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔
''ہٹ جاؤ، بھاگ جاؤ یہاں سے..... کیوں بھیڑ لگا رکھی ہے۔ جاؤ سب یہاں سے۔'' اور دوسرے ہی لمحے ایک لمبے قد کے سارجنٹ کا چہرہ بائیں طرف کی کھڑکی میں اُبھرا۔
''یہ کیا حماقت ہے۔'' سارجنٹ نے پوچھا۔
اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔
''میں نیچے ٹریفک انسپکشن پر تھا۔ ہوٹل کے منیجر نے مجھے شکایت کی ہے کہ تم یہاں سے کود کر خودکشی کرنے جا رہے ہو۔ کیا یہ سچ ہے؟ یا خودکشی کا ڈھونگ رچا کر سستی شہرت حاصل کرنا چاہتے ہو؟''
''تم نے سچ سمجھا۔''
''پھر تو ماننا پڑے گا کہ تم نے خودکشی کرنے کا ایک نرالا اور انوکھا طریقہ اختیار کیا ہے۔ لوگ چپکے سے مرجاتے ہیں تم ساری دنیا کو جمع کر کے بڑے اطمینان سے مرنا چاہتے ہو۔''
''میرے کام نرالے ہی ہوتے ہیں۔'' سارجنٹ کو اس کی یہ بات بے حد پسند آئی۔ اُس نے قہقہہ لگایا۔ اور پھر گولڈ لیف کا پیکٹ اُس کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔
''تم باتیں بڑی دلچسپ کرتے ہو۔ لو سگریٹ پیو۔'' اُس نے سگریٹ لینے سے انکار کر دیا۔ سارجنٹ نے ایک سگریٹ سُلگایا اور پھر بولا۔
''آج موسم کتنا پیارا ہے۔''
''ہاں خودکشی کرنے کے لیے۔''
''تم تو بڑے بھیانک آدمی معلوم ہوتے ہو۔ کیا نام ہے تمہارا؟'' سارجنٹ نے پوچھا۔
''حماد مغل.....''
''گھر میں تمہارے کون کون ہے؟''
''کوئی نہیں.....اور تمہارے؟''
''ایک محبت کرنے والی بیوی ہے اور دو پیارے پیارے بچے۔''
''اس دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں ہے۔ کوئی بھی نہیں؟''
''بڑے افسوس کی بات ہے۔'' سارجنٹ نے اظہار ہمدردی کیا۔
''میرا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں۔'' حماد مغل کو اپنے یہ الفاظ بُری طرح کھٹکے اور ایک جھٹکا سا اُس کے ذہن کو لگا۔

☆.....☆.....☆

دو دن پہلے تک تو اُس کے پاس سب کچھ تھا۔ اُس کی دنیا آباد تھی۔ اُس دن جب وہ دفتر جانے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ تب تو مشعال تھی۔ اُس نے دروازے پر آ کر اُسے الوداع کہا تھا اور اُس نے مشعال سے ہلکی سی چھیڑ چھاڑ بھی کی تھی۔ جیسا کہ اُس کا روز کا معمول تھا۔
مشعال اُس کی وفادار بیوی ہوتے ہوئے بھی اُس کی وفادار نہ رہی تھی۔ یہ بات تو وہ دو مہینے پہلے ہی جان چکا تھا۔ پھر بھی مشعال اُس کے سامنے تھی۔ اسی دنیا میں تھی۔ اُس کے ہوتے ہوئے بھی غیر مخصوص انداز میں مشعال کی زندگی میں کوئی آ گیا تھا۔ اور مشعال اُس سے دور ہوتی چلی گئی تھی۔ اچھے وقتوں پر آہستہ آہستہ برے وقت کا سایا پڑ رہا تھا۔ پہلے تو یہ جان کر اُس کے دل میں آگ لگ گئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ مشعال کو مارے خوب مارے، مشعال سے اُسے شدید نفرت محسوس ہوئی تھی۔ لیکن نہ تو وہ مشعال کو مار ہی سکا تھا اور نہ ہی اُس سے نفرت ہی کر سکا تھا۔ اور جس سے کوئی ٹوٹ کر محبت کرتا ہو۔ شدید محبت کرتا ہو۔ اُس سے بھلا نفرت کیسے کر سکتا ہے؟ یہ سب جان کر بھی وہ شاکر کی ہمراہی میں نئے گلستانوں کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔ وہ مشعال سے نفرت نہ کر سکا۔

محبت کے بھی انداز عجیب ہوتے ہیں۔

حماد مغل، مشعال سے نفرت نہ کر سکا۔ لیکن یہ کیسی حیرت انگیز بات تھی کہ وہ شاکر سے بھی نفرت نہ کر سکا تھا۔ اُس سے حماد مغل کا تعارف نہ تھا۔ مگر حماد نے ایک مرتبہ شاکر کو دیکھا تھا۔ وہ یقیناً اُس کے مقابلے میں زیادہ مردانہ وجاہت کا مالک قد آور صحت مند' پُرکشش صنفِ نازک کے لیے خاص اپیل رکھتا تھا وہ!

حماد مغل نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر مشعال اُسے چھوڑ کر شاکر کو اپنانا چاہتی تو وہ اُن کے درمیان رکاوٹ نہ بنے گا۔ اُسے ہر حال میں مشعال کی خوشی مقصود تھی۔ وہ اپنے دل پر پتھر رکھ لے گا۔ مشعال کو وہ کیا دے سکتا ہے۔ سوائے چند رنگین وعدوں کے، زندگی تو بہت کچھ مانگتی ہے اور بہت کچھ اُس کے پاس نہ تھا۔ شاکر کو زندگی کی بہترین آسائشیں میسر تھیں۔

☆......☆......☆

ایک شام اُس نے مشعال کو شاکر کے ہمراہ شہر کے ایک مشہور لیکن قدرے بدنام ہوٹل سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔ شاکر ایک قیمتی سوٹ میں ملبوس تھا۔ مشعال کو شاکر کے ساتھ دیکھ کر اُس کا دل ٹوٹ گیا۔

مشعال بہت خوش تھی۔ اُس نے مشعال پر ذرا بھی ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ شاکر اور اُسے ایک ساتھ ہوٹل سے نکلتے دیکھ چکا ہے۔ اُس کے رویے میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔ اور پھر اُس شام جب وہ دفتر سے گھر لوٹا تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ گھر میں ایک غیر فطری سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

مشعال اپنے بستر پر اوندھے منہ پڑی تھی۔ اُس کے منہ سے نیلے نیلے جھاگ نکل کر منہ کے چاروں طرف پھیل گئے تھے۔ اُس کا جسم سرد اور اکڑا ہوا تھا۔ وہ مر گئی تھی۔ اُسے مرے ہوئے دیر ہو گئی۔

پاس ہی ایک کھلا ہوا خط پڑا تھا۔ جس میں مشعال نے حماد مغل سے بے وفائی کی معافی مانگی تھی۔ شاکر نے اُسے فریب دیا تھا اور اُس نے جھوٹ کہا تھا کہ وہ کنوارا ہے...... وہ دو بچوں کا باپ تھا۔ شاکر نے مشعال کی بہت بے عزتی کی تھی۔

## ٹھوس ثبوت

تیز رفتاری کے جرم میں ایک صاحب کا چالان ہوا اور انہیں مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ انہوں نے صحت جرم سے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! میں تو صرف تیس کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہا تھا۔''

''کیا تم اپنی بات کا کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہو؟'' مجسٹریٹ نے دریافت کیا۔

''جناب! ثبوت کے طور پر صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ اس وقت میں اپنی بیوی کو لینے اپنے سسرال جا رہا تھا۔'' ان صاحب نے جواب دیا۔

مرسلہ: شرمین شاہ۔ صادق آباد

عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے۔ ظلم، تشدد، بے وفائی لیکن اپنی بے عزتی کسی بھی حال میں برداشت نہیں کر سکتی، وہ بھی بکھر گئی تھی۔ وہ خود کو قابو میں نہ رکھ سکی۔ اُس نے نہ جانے کون سا تیز اثر کرنے والا زہر کھا کر خودکشی کر لی تھی۔ زندگی کی وہ ڈور ہی توڑ ڈالی تھی۔ جس سے خوشیوں کی آس بندھی تھی۔

بڑی دیر تک وہ دیوانوں کی طرح مشعال کے بے جان جسم کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھورتا رہا اور شاکر کے بارے میں سوچتا رہا اور پھر اُس نے وہی زہر کی شیشی اٹھالی...... تھوڑی دیر تک وہ مری ہوئی مشعال کے جسم سے پیار کرتا رہا اور پھر......

☆......☆......☆

شام سے رات ہو گئی تھی۔ اور اب دوسرے دن کی روشنی پھوٹنے والی تھی۔ مگر اُسے ہر طرف ایک ہی موسم اور روشنی کے بجائے اندھیرا دکھائی دے رہا تھا۔

دن کی روشنی پھوٹنے سے پہلے ہی وہ گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ مشعال کا مردہ جسم ویسے ہی بستر پر پڑا تھا، اُس کی اسے اب کوئی فکر نہیں تھی۔ اُس کے حواسوں پر شاکر اور انتقام چھایا ہوا تھا۔

شاکر ایک مجرم تھا۔ ظالم تھا۔ اُس نے مشعال کی

جان لے لی تھی۔ یہ سچ ہے کہ دنیا کی کوئی عدالت شاکر کو مشعال کے قتل کا مجرم قرار نہیں دے سکتی تھی اور نہ ہی اُسے کسی قسم کی سزا دے سکتی تھی۔ لیکن اُس کے علاوہ بھی ایک عدالت ہے۔ بہت بڑی عدالت......

دن چڑھتا رہا اور وہ شاکر کی تلاش میں تمام شہر میں چکر لگاتا رہا۔ اُسے نہ تھکن تھی نا وقت کا احساس کیونکہ یہ سب چیزیں کل ہی دور ہوگئی تھیں۔

کتنی بڑی دیوانگی تھی یہ۔ وہ آدمیوں کے اس جنگل میں شاکر کو تلاش کر رہا تھا۔ جس کا پتا نشان، اُسے کچھ بھی تو معلوم نہ تھا، اُس نے دو بار اُسے دیکھا ضرور تھا اور جس کے نام سے بھی وہ ابھی ابھی مشعال کے خط سے ہی واقف ہوا تھا۔ اُسے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ شاکر کرتا کیا ہے۔

دن آدھے سے زیادہ گزر چکا تھا۔ وہ ابھی تک شاکر کی تلاش میں نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا رہا تھا۔ آخر بھٹکتے بھٹکتے بائیس منزل ہوٹل میں آ ٹھہرا تھا۔

اُس کے دل و دماغ میں آگ لگی ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

''کہو بھائی حماد...... ابھی تک یونہی کھڑے ہو؟'' یہ اُس سارجنٹ کی آواز تھی۔ جو کچھ دیر پہلے سگریٹ پلانے کا حکم دے کر اُسے اپنے پاس بلانا چاہتا تھا۔

اب وہ دائیں سمت کی کھڑکی پر ٹانگ سڑک کی طرف اور دوسری کمرے میں کیے اس طرح بیٹھا تھا۔ جیسے لکڑی کے گھوڑے پر بیٹھتے ہیں۔ ایک ہاتھ سے اُس نے کھڑکی کی اوپری چوکھٹ پکڑ رکھی تھی اور اُسے مضحکہ خیز انداز سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک سارجنٹ کا ہی تو اتنی دیر سے انتظار کر رہا تھا۔ اُسے پوری اُمید تھی کہ وہ اپنے جذبۂ تجسس سے مجبور ہو کر دوبارہ ضرور اُتر آئے گا۔

''نیچے لوگ بے چینی سے تمہارے چھلانگ لگانے کا انتظار کر رہے ہیں۔ کیا تم انہیں مایوس کرو گے؟''

کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''مطلب یہ کہ لوگ تقریباً ایک گھنٹے سے تمہارا نیچے چھلانگ لگانے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اب اگر تم نے چھلانگ نہیں لگائی تو ٹکٹ بیچ کر تماشا نہ دکھانے والی بات ہوگی۔''

''تماشا؟ میں اپنی جان دے رہا ہوں اور اُن کے لیے تماشا ہے۔'' اُس کے لہجے میں دبی ہوئی نفرت کی ایک ہلکی سی جھلک آ گئی۔ انسپکٹر اس کے بدلے ہوئے لہجے کو بھانپ کر ہنستا ہوا بولا۔

''اور نہیں تو کیا۔ تمہاری جان پیاری ہوگی تو تمہیں ہوگی۔ انہیں اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ وہ تماشا دیکھنے آئے ہیں۔ اتنی دیر تک انتظار کرنے کے بعد وہ تمہیں خودکشی کرتے ہوئے نہ دیکھ سکے تو انہیں بڑی مایوسی ہوگی۔ کچھ لوگ تو چھلانگ کے لیے تمہیں للکار بھی رہے ہیں۔ اور وقت برباد کرنے پر تمہیں گالیاں بھی دے رہے ہیں۔'' اُسے بڑے زور کا غصہ آیا۔ تلخ لہجے میں بولا۔

''یہ میرا نجی معاملہ ہے۔ اس میں کسی کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ میں خودکشی کروں یا نہ کروں میری مرضی۔''

''میں بھی تو یہ ہی کہتا ہوں تم ناحق اپنی جان دیتے ہو؟ جان دینے سے تمہاری مشکل دور تو ہو نہیں ہو جائے گی۔ حوصلے سے کام لیا جائے اور سنجیدگی سے کوشش کی جائے۔ تو ایسا کون سا کام ہے۔ جو ہو نہیں سکتا ایسی کون سی گتھی ہے جو سلجھ نہیں سکتی۔ جان ہے تو جہان ہے۔''

حماد مغل کچھ دیر نیچے بڑھتی ہوئی بھیڑ کو دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے بائیں طرف کی کھڑکی کی طرف دیکھا جہاں وہ انسپکٹر بغور اپنی بات کا ردِعمل اُس کے چہرے پر دیکھ رہا تھا۔ اور پھر اچانک جیسے اُسے ہوش آ گیا ہو۔ سہمے ہوئے لہجے آہستہ سے سر ہلا کر اُس نے کہا۔

''ہاں تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ جان ہے تو جہان ہے۔''

انسپکٹر اپنی اس کامیابی پر فخر سے مسکرایا۔

''شکر ہے کہ تمہیں وقت پر ہوش آ گیا۔ صبح کا بھولا شام کو بھی گھر واپس آ جائے تو کچھ نہیں بگڑا کرتا۔ آہستہ آہستہ وہ کھڑکی کی سمت بڑھنے لگا۔ چند ہی لمحوں

کے بعد وہ اچانک رُک گیا۔ ایک بار اُس نے خوف زدہ نظروں سے نیچے دیکھا اُس کے قدم ڈگمگائے۔

وہ گرتے گرتے بچا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے اُس کا سر چکرا رہا ہو۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ انسپکٹر کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ حماد مغل نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''میرا سر چکرا رہا ہے۔ پیر کانپ رہے ہیں۔ میں گر پڑوں گا۔ میری مدد کرو۔ میں اب مرنا نہیں چاہتا۔''

انسپکٹر نے تسلی دی۔ ''گھبراؤ نہیں میں آتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ باہر چھجے پر اُتر گیا۔ جہاں حماد مغل سہما ہوا کھڑا تھا۔ اِردگرد کی عمارتوں کی چھت پر اخباری رپورٹروں اور فوٹوگرافروں کی بھیڑ موجود تھی۔

انسپکٹر سوچ رہا تھا۔ اس موقع پر لیے گئے فوٹو اُس کی ترقی میں بڑے معاون ثابت ہوں گے۔ محکمے میں اس کی بہادری کی دھوم مچ جائے گی۔ اِس کے علاوہ یہ اُس کا فرض بھی تو ہے۔

انسپکٹر کو چھجے پر اُترتا دیکھ کر نیچے کھڑے ہوئے لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ احتیاط سے چھجے کی طرف بڑھنے لگا۔ ایک سناٹا چھا گیا۔ لوگ سانس روک کر اوپر دیکھنے لگے۔ چند لمحوں کے اندر ہی انسپکٹر حماد مغل کے اتنے نزدیک پہنچ گیا، جہاں سے ہاتھ بڑھا کر وہ اس کا ہاتھ آسانی سے پکڑ سکتا تھا۔ انسپکٹر نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

''لو میرا ہاتھ پکڑ لو۔'' اُس نے فوراً ہاتھ پکڑ لیا۔ انسپکٹر نے ہمت بندھائی۔ میرے ساتھ ساتھ احتیاط سے سرکتے ہوئے چلے آؤ حوصلہ بحال رکھو۔''

''میں جانتا تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔'' حماد مغل نے انسپکٹر کے نزدیک آکر گھمبیر لہجے میں کہا۔ حماد مغل کی یہ بات انسپکٹر کی سمجھ میں نہ آئی۔ اس کا بدلا ہوا لہجہ بھی اُسے کچھ عجیب سا لگا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو تم؟''

''میں......'' حماد مغل [illegible]

''میں مشعال کا شوہر ہوں۔ مشعال کو تم جانتے ہو شاکر۔''

اچانک انسپکٹر کا رنگ اُڑ گیا۔ اُس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی لیکن اب وہ ہاتھ حماد مغل کی سخت گرفت میں تھا۔

''آج اس ہوٹل کے سامنے تمہاری ڈیوٹی ہے۔ یہ معلوم کر کے ہی میں یہاں چھجے پر آ کھڑا ہوا تھا۔ شاکر مجھے پورا یقین تھا کہ تم ضرور اوپر آؤ گے۔''

''نہیں نہیں۔'' انسپکٹر شاکر نے رندھی آواز میں نہ جانے کیا کہنا چاہا۔ خوف سے اُس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ آواز بھی صاف نہیں نکل رہی تھی۔



''مشعال نے خودکشی کر لی ہے شاکر! اور اس کی ذمہ داری تم پر ہے۔ اور میں مشعال کی اس خودکشی کا صدمہ نہ سہار پایا اور...... میں تم سے اس ظلم کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ مشعال کہا کرتی تھی میرا ہر کام دنیا سے نرالا ہوتا ہے۔ اس لیے تم سے انتقام لینے کا یہ نرالا انداز بھی قدرت کی طرف سے عطا ہوگیا۔ آؤ شاکر......'' اور اُس نے ایک جھٹکے کے ساتھ شاکر کو اپنی طرف کھینچا۔ اس بھیانک لمحے میں بھی تیزی سے نیچے گرتے ہوئے شاکر نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر کسی نامعلوم چیز کو پکڑنے کی کوشش کی۔ لیکن...... دایاں ہاتھ اب بھی مشعال کے شوہر...... حماد مغل کی سخت گرفت میں تھا۔

اور اب صرف انسپکٹر ہی لوگوں کو دکھائی دے رہا تھا۔ حماد مغل کو سکینڈوں میں لوگ بھول گئے تھے۔ کئی لوگوں نے اس حیرت انگیز منظر کو موبائلوں میں بھی ریکارڈ کر لیا تھا۔ حماد مغل اپنے انتقام کی آگ کو ٹھنڈی کر کے واپس سکون کے ساتھ کھڑکی کے راستے غائب ہو چکا تھا۔ اور نیچے شاکر کا پچکا ہوا مسخ شدہ چہرہ لوگوں کے لیے عبرت کا نشان بن چکا تھا۔ انسان جو دل چاہے، اپنی مرضی سے کرتا ہے لیکن بھول جاتا ہے، نیلی چھتری والے کے فیصلے کے آگے سب کچھ بے کار ہو جاتا ہے۔ اور اس کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا



☆☆......☆☆

# ہم شکل

ایم اے راحت

سچی کہانیاں میں پہلی بار برصغیر کے نامور قلم کار ایم اے راحت کے قلم کا جادو

سطر سطر تجسس سموئے، سنسنی خیز سلسلے کی بارہویں کڑی

## خلاصہ

شاہ زیب کا تعلق روایت پسند گھرانے سے تھا۔ مشترکہ خاندان پر مبنی اس خاندان میں شاہ زیب سب سے چھوٹا اور لاڈلا فرد ہے۔ خاندان کی بزرگ دادی اماں بڑی اہمیت کی حامل شخصیت ہیں۔ اُن کے قصوں اور ٹوٹکوں سے ہر فرد مستفید ہوتا ہے۔ ایک دن قصوں کے درمیان دادی اماں نے کہا کہ دنیا میں اللہ نے ہر انسان کے سات ''ہم شکل'' بنائے ہیں۔

ایک دن شاہ زیب کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی۔ ہسپتال لے جانے کے بعد ڈاکٹر شاہ زیب کو برین ٹیومر ہونے کی اطلاع دیتا ہے۔ شاہ زیب زندگی کے باقی ماندہ دنوں کو ہسپتال کی نذر کرنے کے بجائے اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کو ترجیح دیتا ہے اور یوں وہ گھر والوں کو اطلاع دیے بغیر شہر سے دور سفر پر نکل جاتا ہے۔

دلاور ایک عادی مجرم ہے اور اس کی شکل شاہ زیب سے مشابہ ہے۔ دلاور کے دھوکے میں پولیس شاہ زیب کو گرفتار کرلیتی ہے۔ دلاور ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہوکر شاہ زیب کی مدد کرنے کا فیصلہ کرلیتا ہے۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد دلاور شاہ زیب کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

طویل سفر کرنے کے بعد ریل اسٹیشن پر رُکتی ہے تو ایک مجمع اُسے نظر آتا ہے۔ ایک لڑکی شاہ زیب کو ''عالی'' کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔ مجمع میں موجود ایک بزرگ اُسے زبردستی اپنے ساتھ گھر لے جانے پر مجبور کرتا ہے۔ شاہ زیب کو اپنی دادی کی بات یاد آتی ہے سات ہم شکل والی یعنی کہ ایک اور ''ہم شکل'' اس نئی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ذہنی کوفت کا شکار ہو جاتا ہے۔

گھر پہنچنے کے بعد شاہ زیب کو معلوم پڑتا ہے کہ ''عالی'' جو اس گھر کا بیٹا ہے وہ شاہ زیب کا ہم شکل ہے اسٹیشن والی لڑکی جس کا نام نشاط ہے وہ عالی کی بیوی ہے عالی نشاط سے غلط فہمی کا شکار ہوتے ہوئے گھر سے چلا گیا تھا۔ اب شاہ زیب کو عالی سمجھ کر سب گھر والے اور نشاط سمجھانے کی اور غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاہ زیب نے بڑی مشکل سے ان کو یہ بات باور کرائی کہ وہ عالی نہیں شاہ زیب ہے جس کی





شکل عالی سے مشابہہ ہے۔ بہرکیف عالی کے خاندان والوں کو جب شاہ زیب کی حقیقت معلوم ہوئی تو وہ اس کے احسان مند ہو گئے اور شکریہ ادا کرتے اس سے اس کے بارے میں معلوم کرنے لگے۔ شاہ زیب نے بتایا کہ اس کی دادی ماں نے ایک بار کہا کہ ہر انسان کے سات ہم شکل ہوتے ہیں بس میرا دل چاہا کہ اپنی زندگی میں اپنے ہم شکلوں کو تلاش کروں اور یقین کریں کہ مجھے میرے دو ہم شکل مل گئے ایک دلاور اور آپ کا عالی اور تیسرا میں اور اب چوتھے ہم شکل کی تلاش ہے۔

عالی کے گھر والے اس کو خاصی رقم دے کر رخصت کرتے ہیں۔ شاہ زیب اپنے تیسرے ہم شکل عالی کے بعد وہاں سے نکل کر ایک فور اسٹار ہوٹل میں جاتا ہے۔ اب شاہ زیب کی زندگی میں سیزار و آجاتا ہے۔ وہ برطانیہ کے ایک خفیہ گینگ سے منسلک ہے۔ جس نے سیزارو کو ہائی جیک کیا ہوا ہے۔ ابھی شاہ زیب سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اُسے کوروتی ٹکرا جاتی ہے۔ کچھ بندے اُسے زبردستی اُس جگہ پہنچا دیتے ہیں جہاں پر ڈینیل نے کوروتی کو رکھا ہوا ہے۔

اب آگے ملاحظہ کیجیے

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے اپنا تھیلا معمول کے مطابق کندھوں پر باندھا۔ شاہ زیب نے بھی تیاریاں کیں اور بالآخر اس کے گھوڑے پر سوار ہونے کے بعد خود بھی سوار ہو گیا۔ شاہ زیب کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کرے، اس نے دل میں یہ ضرور سوچا تھا کہ اگر کسی دوسرے انسان کا وجود نظر آ گیا تو یقینی طور پر ان خاتون کو بھی قسمت پر چھوڑنے کی کوشش کرے گا۔ ظاہر ہے زبان ہی نہیں ہے اس کے پاس جو پتا چل سکے کہ آخر وہ ہے کون اور کون سے جہنم میں جارہی ہے۔

اس دن کا سفر بھی دوسرے دن کے سفر سے مختلف نہیں تھا، دوپہر کو دونوں ایک پتھریلے میدان سے گزرے جس میں پیلے رنگ کی باریک باریک ریت بچھی نظر آرہی تھی۔ اس کے انتہائی سرے پر کچھ کھنڈرات نظر آئے۔

شاہ زیب حیرت زدہ نگاہوں سے ان کھنڈرات کو دیکھنے لگا۔ صحرائے اعظم کے اس دور دراز علاقے میں یہ کھنڈرات کیا حیثیت رکھتے تھے۔ یہاں تو اس جدید ترین دور میں بھی باقاعدہ عمارات یا کھنڈرات بنانے کا رواج نہیں تھا، شاہ زیب نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر خود ہی برا سا منہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ وہ بھلا ان کھنڈرات کے بارے میں کیا بتا سکتی تھی۔ ان کا رخ بھی انہی کھنڈرات کی جانب تھا، گھوڑوں کو سفر میں کوئی دقت پیش نہیں آرہی تھی، لیکن وہ بھی پسینے میں تر تھے، جب کچھ اور آگے بڑھے تو یہ انکشاف ہوا کہ وہ کھنڈرات نہیں بلکہ چھوٹی پہاڑیاں ہیں، چھوٹے چھوٹے پہاڑی ٹیلے جن میں ہواؤں نے سوراخ کر کے انہیں عجیب و غریب شکلیں دے دی تھیں۔ دروازے، غلام گردشیں چھتیں سائبان سب کے سب ہوا کی تراش کا کمال پیش کر رہے تھے، بہت عجیب اور پراسرار جگہ تھی، الگ الگ بنے ہوئے ان کھنڈرات کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ غول بیابان کیا چیز ہوتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ لوگ ان کھنڈرات کے قریب پہنچ گئے، آگے جانے کا راستہ انہی کھنڈرات کے درمیان سے گزرتا تھا، یہ لوگ کھنڈرات میں داخل ہو گئے، ایک درمیانی دراڑ میں پہنچے تو ایسی عمدہ ٹھنڈک محسوس ہوئی جیسے ایئر کنڈیشنڈ عمارت میں آگئے ہوں۔ لڑکی نے گھوڑا روک دیا اور شاہ زیب بھی فوراً ہی گھوڑے سے نیچے کود پڑا۔ وہ بھی شاید یہاں قیام کرنے پر آمادہ نظر آرہی تھی چنانچہ دونوں گھوڑوں کو وہیں چھوڑ دیا گیا اور ان کی لگامیں ایک پتھر سے الجھا دی گئیں۔ شاہ زیب نے ایک صاف اور ہموار جگہ دیکھی اور پھر وہیں دراز ہو گیا، اس نے مسکرائی نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھا، انداز ایسا ہی تھا جیسے خود بھی اس جگہ آرام کرنے پر متفق ہو اور پھر وہ بھی بے سدھ ہو کر ایک طرف لیٹ گئی۔

تقریباً آدھا گھنٹہ اسی طرح لیٹے لیٹے گزر گیا۔ پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور پتھر کے ایک نوکدار ٹکڑے سے پہاڑ کی

سل سے کچھ لکیریں کاڑھنے لگی، شاہ زیب نے محسوس کیا کہ ان لکیروں کا کاڑھنا بے مقصد نہیں ہے اس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا بھی تھا جسے وہ بار بار دیکھتی جا رہی تھی، شاہ زیب نے آہستہ سے کھنکارا تو وہ اس کی جانب متوجہ ہوگئی۔ اس کی حسین آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے پھر چمک لہرائی۔ دوسرے لمحے اس نے اپنا ہاتھ شاہ زیب کی جانب اٹھایا اور قریب آنے کا اشارہ کرنے لگی۔

''خیریت....؟'' شاہ زیب نے بیزاری سے پوچھا۔

اس نے زور زور سے شاہ زیب کو قریب آنے کا اشارہ کیا اور وہ اس کے قریب پہنچ گیا۔ پھر اس نے کاغذ کا ایک نیلے رنگ کا ٹکڑا اس کے سامنے کر دیا، اس پر غالباً واٹر کلر سے کچھ تصویریں بنائی گئی تھیں، لکیریں، نشانات اور ایسی ہی دوسری چیزیں.. کاغذ کا یہ ٹکڑا غالباً بڑی احتیاط سے رکھا گیا تھا۔ شاہ زیب نے غور سے اسے دیکھا، لڑکی غالباً شاہ زیب کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی، کاغذ کے ٹکڑے پر بنے ہوئے نشانات اور زمین کی لکیروں میں سو فیصد ہم آہنگی تھی، انہی میں وہ کھنڈرات بھی نظر آ رہے تھے جن میں اس وقت وہ دونوں موجود تھے۔

لڑکی نے پتھر کے ایک نوکیلے ٹکڑے سے ان کھنڈرات کی طرف اشارہ کیا اور انہیں نوک سے کھٹکھٹانے لگی، مقصد یہ تھا کہ کیا کاغذ پر بنے ہوئے نقشے میں یہ کھنڈرات نمایاں نظر نہیں آئے، لڑکی کی نگاہیں سوالیہ انداز میں شاہ زیب کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ طوعاً و کرہاً شاہ زیب نے اس کے اس مشغلے میں دلچسپی لینا شروع کر دی، شاہ زیب نے اس کی بنائی ہوئی لکیروں کو دیکھا اور اسے احساس ہوا کہ جن راستوں سے گزر کر یہ لوگ یہاں تک آئے ہیں ان کی نشاندہی ان لکیروں میں کی گئی ہے۔ شاہ زیب کے دل میں ایک تجسس اور دلچسپی جاگ اٹھی، شاہ زیب نے کاغذ کے اس ٹکڑے کو ہاتھ میں لیا اور اسے بغور دیکھنے لگا، درمیان سے پھٹا ہوا تھا، اس کی لمبائی بتاتی تھی کہ کم از کم اتنا ہی لمبا ٹکڑا اس میں اور شامل ہوگا، لیکن اب وہ آدھا تھا، وہ غالباً شاہ زیب سے اپنے بنائے ہوئے نقشے کی تصدیق چاہتی تھی، چنانچہ شاہ زیب نے گردن ہلا کر آہستہ سے کہا۔

''بالکل.. تم نے اس کی نقل بالکل ٹھیک کی ہے۔'' شاہ زیب انگلی سے کھنڈرات کے نشانات کو کھٹکھٹانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں اطمینان کے آثار نظر آئے۔

''باقی آدھا ٹکڑا کہاں ہے؟'' شاہ زیب نے پوچھا، لیکن وہ سپاٹ نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھتی رہی۔

''تم اپنے مطلب کی ساری باتیں سمجھ لیتی ہو جو میں کہتا ہوں وہ تمہاری سمجھ میں نہیں آتا۔'' شاہ زیب نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا اور کاغذ کا ٹکڑا اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس نے کاغذ کا ٹکڑا لے کر احتیاط سے تہہ کیا اور اسے اپنے لباس میں رکھ لیا، پھر وہ پتھر کا نوکیلا ٹکڑا لے کر کچھ اور لکیریں کاڑھنے لگی جو ان کھنڈرات سے آگے کی تھیں۔ لیکن پھر شاہ زیب نے اسے چونکتے ہوئے دیکھا، وہ ناگن کی طرح پلٹی اور شاہ زیب کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں ایک سوالیہ نشان تھا، لیکن شاہ زیب اس کا سوال نہیں سمجھ سکا تھا، پھر اس نے اوندھے لیٹ کر زمین سے کان لگا دیے۔ غالباً کوئی نئی افتاد پڑی تھی اس پر، شاہ زیب اسے دیکھتا رہا۔ زمین پر کان لگانے کی وجہ نہیں سمجھ سکا تھا، پھر وہ برق رفتاری سے پلٹی اور اٹھ کھڑی ہوئی، اس نے پیروں سے جلدی جلدی وہ نقشہ مٹا دیا۔ شاہ زیب اس کی بوکھلاہٹ کی وجہ نہیں سمجھ پایا تھا، لیکن باہر سے گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز نے شاہ زیب کو چونکا دیا، تب صورت حال کافی حد تک اس کی سمجھ میں آ گئی تھی، اس نے پھرتی سے اپنا تھیلا اٹھایا اور کندھے پر لادنے لگی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی کی آمد سے خوفزدہ ہو کر یہاں سے بھاگ جانا چاہتی ہو۔

پھر اس نے شاہ زیب کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے اس طرف بڑھنے لگی جدھر گھوڑے کھڑے تھے۔ ابھی وہ اپنے گھوڑوں کے نزدیک پہنچے ہی تھے کہ فائر کی آواز سنائی دی اور گولی اس جگہ سے صرف چند گز کے فاصلے پر پتھر کی ایک چٹان سے ٹکرائی جہاں یہ لوگ موجود تھے۔ شاہ زیب کے منہ سے ایک خوفزدہ سی آواز نکل گئی۔ اب دیر کرنا

موت کو آواز دینے کے مترادف تھا، کوئی آ گیا تھا چنانچہ گھوڑوں کو دوڑا کر دوسری طرف چھوڑ دیا گیا۔
اب مسلسل گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، پہاڑی کھنڈرات کے دوسری جانب کافی دور تک وہی پیلے رنگ کا میدان چلا گیا تھا اور اس کے بعد چھدرے درختوں کا سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ غالباً لڑکی کی یہی کوشش تھی کہ وہ درختوں میں پہنچ جائے لیکن یہ لوگ کون تھے اور لڑکی ان سے خوفزدہ کیوں تھی۔ یہ نیا سوال شاہ زیب کے ذہن میں گردش کر رہا تھا، اگر اتفاقیہ طور پر ان دونوں کو کسی نے یہاں دیکھ لیا تھا تو پھر گولیاں چلانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

بہرطور یہ سوال جواب کا وقت نہیں تھا کیونکہ عقب سے جس انداز میں گولیاں چلائی جا رہی تھیں اس سے یہ احساس ہوتا تھا کہ بمشکل تمام ان لوگوں نے اس لڑکی کو ڈھونڈ لیا ہے اور اب اس کی جان لینا چاہتے ہیں، چنانچہ اس کے ساتھ ساتھ شاہ زیب کی زندگی کو بھی خطرہ لاحق تھا اور اس وقت صرف ایک ہی کوشش زیادہ سودمند تھی اور وہ یہ کہ یہاں سے نکل بھاگا جائے۔

کئی گولیاں سنسناتی ہوئی ان کے آس پاس سے گزر گئیں، لڑکی کے گھوڑے نے اچانک ہی ایک زوردار ٹھوکر کھائی ایک گولی اس جگہ سے صرف چند گز کے فاصلے پر پتھر کی ایک چٹان سے ٹکرائی جہاں یہ دونوں موجود تھے۔ شاہ زیب کے منہ سے ایک خوفزدہ سی آواز نکل گئی، اب دیر کرنا موت کو آواز دینا تھا۔ کوئی آ گیا تھا چنانچہ ان دونوں نے گھوڑوں کو دوڑا کر دوسری طرف چھوڑ دیا۔ اب مسلسل گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پہاڑی کھنڈرات کے دوسری جانب کافی دور تک وہی پیلے رنگ کا میدان چلا گیا تھا اور اس کے بعد چھدرے درختوں کا سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ غالباً لڑکی کی یہی کوشش تھی کہ وہ درختوں میں پہنچ جائے، لیکن یہ لوگ کون تھے اور لڑکی ان سے کیوں خوفزدہ تھی؟

یہ نیا سوال شاہ زیب کے ذہن میں پیدا ہوتا تھا، اب تک تو صرف وہی منظر عام پر رہی تھی۔ لیکن اب کچھ اور لوگ بھی اس میں ملوث ہو گئے تھے، اگر اتفاقیہ طور پر ان دونوں کو کسی نے یہاں دیکھ لیا تھا تو پھر گولیاں چلانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ یہ سوالات شاہ زیب کے ذہن ہی میں پیدا ہوئے تھے اور یقیناً ذہن ہی میں مر جانے والے تھے کیونکہ ان کا جواب بھلا لڑکی کہاں سے دے سکتی تھی، ویسے بھی یہ سوال و جواب کا وقت نہیں تھا کیونکہ عقب سے جس انداز سے گولیاں برسائی جا رہی تھیں اس سے یہ احسوس ہوتا تھا کہ بمشکل تمام ان لوگوں نے اس لڑکی کو پایا ہے اور اب اس کی جان لے لینا چاہتے ہیں چنانچہ اس کے ساتھ ساتھ شاہ زیب کی زندگی کو بھی خطرہ لاحق تھا اور اس وقت صرف ایک ہی کوشش زیادہ سودمند تھی اور وہ یہ کہ یہاں سے نکل بھاگا جائے۔

کئی گولیاں سنسناتی ہوئی ان کے آس پاس سے گزر گئیں، لڑکی کے گھوڑے نے اچانک ہی ایک زوردار ٹھوکر کھائی، ایک گولی اس کی ران میں لگی تھی، گھوڑا ہنہنا کر الف ہوا اور منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ شاہ زیب نے اپنے گھوڑے کی لگامیں کھینچیں اس کا خیال تھا کہ لڑکی گئی کام سے، لیکن اس نے حیرت انگیز طور پر لڑکی کو گھوڑے سے زمین پر چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھا وہ ہاتھوں کے بل زمین پر گری اور الٹی قلابازیاں کھا کر کھڑی ہو گئی، لیکن دوسری قلابازی اس نے پھر کھائی اور اس کے نتیجے میں وہ شاہ زیب کے گھوڑے پر پہنچ گئی۔ اس نے گھوڑے کی لگامیں اپنے ہاتھوں میں پکڑ لی تھیں اور شاہ زیب کے بازوؤں کے نیچے سے ہاتھ نکال کر گھوڑے کو دوڑا رہی تھی، اتنی برق رفتاری کا مظاہرہ بلاشبہ ناقابل یقین تھا، لیکن صورت حال اس وقت یہی تھی کہ ایک لمحے کی تاخیر نہ کی جائے۔

ان لوگوں نے ایک بار بھی پلٹ کر پیچھا کرنے والوں کو نہ دیکھا جو گولیاں برسا رہے تھے، یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کتنے فاصلے پر اور کتنی تعداد میں ہیں، بالآخر شاہ زیب اور لڑکی چھدرے درختوں کی آڑ میں آ گئے لیکن یہ درخت جائے پناہ کے طور پر محفوظ نہیں تھے۔ گھوڑا بدستور دوڑتا جا رہا تھا۔ اب عقب سے گولیاں نہیں برسائی جا رہی تھیں۔ شاہ زیب اور لڑکی ان لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ لیکن لڑکی نے گھوڑے کی رفتار کم نہیں کی تھی، کافی

فاصلے پر پہنچنے کے بعد جنگل گھنا ہونا شروع ہو گیا، لیکن لڑکی پناہ لینے کے موڈ میں نہیں تھی، اس نے بائیں سمت کا رخ کیا، حتیٰ کہ یہ لوگ ایک ایسے مقام پر جا نکلے جو کسی قدر محفوظ محسوس ہوتا تھا، یہاں بھی جنگل ہی تھا لیکن درخت ایک دوسرے سے تقریباً جڑے ہوئے تھے، جانے یہ صحرائے اعظم کا کون سا حصہ تھا، بہرطور یہ لوگ ان درختوں کے درمیان پہنچ گئے، شاہ زیب کی حالت کافی خراب ہوگئی تھی، چہرہ بری طرح بگڑا ہوا تھا، یہ لوگ جنگل میں کافی دور تک اندر آ گئے اور پھر ایک جگہ نسبتاً صاف ستھری نظر آئی جہاں پہنچ کر لڑکی نے گھوڑا روک لیا اور پھرتی سے نیچے اتر گئی۔ شاہ زیب نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر اس لڑکی سے دور چلا جائے، لیکن پھر وہی خوف دامن گیر ہو گیا کہ اس ہولناک جنگل میں کدھر جائے گا، چنانچہ وہ بھی مجبوراً گھوڑے سے اتر آیا۔ وہ گہری گہری سانسیں لے رہی تھی اور اس کے کان مسلسل گردش میں تھے جیسے وہ دور دور کی آوازیں سننے کی کوشش کر رہی ہو۔ گھوڑے کو ایک طرف چھوڑ دیا گیا اور دونوں ایک درخت سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔

''اے خاتون مصیبت جہاں اب کیا ارادہ ہے، کیا ان جنگلوں ہی میں ہماری زندگی بسر ہو جائے گی۔''

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا اور اِدھر اُدھر دیکھتی رہی، پھر اس نے شاہ زیب کا بازو تھپتھپایا اور ایک سمت بڑھ گئی، پتا نہیں کمبخت نے کیا دیکھ لیا تھا، وہ تقریباً پندرہ گز تک شاہ زیب کو اسی طرح ساتھ لیے آگے بڑھتی رہی اب شاہ زیب نے بھی وہ چٹانیں دیکھ لیں جو عجیب وغریب تھیں۔ گھاس کے ڈھکی ہوئی چٹانیں جن کے نیچے سوراخ نظر آ رہے تھے، غالباً یہ غاروں کا کوئی علاقہ تھا، یہ لوگ ایک غار کے سامنے رک گئے۔ لڑکی نے ایک لمحے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر اس نے ایک غار کے دہانے کے قریب پہنچ کر اندر قدم رکھ لیا لیکن دوسرے لمحے ایک وحشت ناک قہقہہ سنائی دیا اور لڑکی چونک کر پیچھے ہٹ گئی، شاہ زیب کی چیخ نکل گئی تھی۔

اندر سے کوئی ہنستا ہوا نکلا اور شاہ زیب کے شانوں کو چھوتا ہوا ایک لمبی زقند لگا کر سامنے کی سمت بھاگ گیا، شاہ زیب حیرت سے منہ کھولے دیکھتا ہی رہ گیا۔ بھاگتے ہوئے جانور کی پشت دیکھ کر تو یہی احساس ہوتا تھا کہ وہ کوئی انسان تھا جس نے قہقہہ لگایا اور فرار ہو گیا، عجیب وغریب جانور تھا کنگرو کی طرح اچھلتا ہوا بھاگ رہا تھا، لیکن اس کا قہقہہ انسانی قہقہے سے کتنا مشابہ تھا، لڑکی نے ایک گہری سانس لی اور اس کے بعد اس غار میں داخل ہو گئی۔ چند لمحوں بعد وہ مایوسی سے باہر نکل آئی، غار اتنا کشادہ نہیں تھا کہ یہ دونوں اس میں پناہ لے سکتے، تاہم اتنا ضرور تھا کہ دونوں اس میں چھپ کر بیٹھ سکتے تھے۔

لڑکی نے باہر نکل کر چند لمبی لمبی جھاڑیاں کاٹیں اور انہیں غاروں کے دہانے پر اس طرح ڈال دیا کہ وہ اسی کا حصہ معلوم ہوں، جگہ کیسی بھی تھی لیکن تھی محفوظ، اور ان لوگوں کو دشمنوں سے پوشیدہ رہنے میں ضرور مدد ملتی، گھوڑے کی موجودگی البتہ باعث تشویش تھی، اور اس سے یہ خوف تھا کہ وہ لوگ گھوڑے دیکھنے کے بعد انہیں ضرور تلاش کریں گے اور اگر وہ اس کوشش میں کامیاب ہو گئے تو پھر نجانے شاہ زیب اور لڑکی کے ساتھ کیا سلوک کریں۔

شاہ زیب کو یہ خوف دامن گیر ہو گیا تھا کہ اس ماحول میں اگر یہ لوگ پکڑے گئے تو نجانے ان کے ساتھ کیا سلوک ہو، شاہ زیب نے لڑکی سے کچھ کہنا چاہا لیکن جھنجلا کر خاموش ہو گیا، وہ سمجھتی تو اس سے کچھ کہتا۔ جو کچھ کرنا تھا شاہ زیب کو کر لینا چاہیے تھا، لیکن اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ باہر نکل کر گھوڑوں کے قریب پہنچے اور انہیں خداحافظ کہہ دے۔

کافی دیر گزر گئی اور اس کے بعد غالباً شام جھکنے لگی۔ سورج اپنا سفر طے کر چکا تھا، جھکتی ہوئی شام تیزی سے یہاں کے ماحول پر مسلط ہوتی جا رہی تھی، ویسے بھی یہ بہت گھنا جنگل تھا اور سورج یہاں بہت کم اپنی حشر سامانیوں کا مظاہرہ کر سکتا تھا۔

کچھ دیر کے بعد چاروں طرف تاریکی پھیل گئی تھی، کوئی سرسراہٹ سی ابھری تو شاہ زیب نے چونک کر گردن باہر نکالی لڑکی نے فوراً ہی شاہ زیب کو پیچھے کھینچ لیا، لیکن اتنی دیر میں شاہ زیب باہر کا جائزہ لے چکا تھا۔ کچھ فاصلے پر

ایک سیاہ سی چیز نظر آئی جو آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ ذرا دیر میں اندازہ ہوگیا کہ وہ کوئی انسان ہے، اس کا مطلب تھا کہ دشمنوں نے ان لوگوں کی سمت کا صحیح اندازہ لگا لیا تھا اور یہاں تک پہنچ گئے۔ شاہ زیب دم سادھے بیٹھا رہا قدموں کی آوازیں آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہوئی محسوس ہوئیں وہ کئی تھے، لیکن شاہ زیب اور لڑکی کو نظر نہیں آرہے تھے، یہ لوگ سانس روکے بیٹھے رہے، لڑکی کی طرف سے بھی کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی، جس سے احساس ہوتا کہ وہ بھی پوری طرح محتاط ہے، آہٹیں کچھ دیر تک سرسراتی رہیں اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ لڑکی اپنی جگہ سے باہر نکل آئی اور اس نے شاہ زیب کا کالر پکڑ کر گھسیٹنا شروع کردیا۔

''اب کیا مصیبت نازل ہوگئی تم پر؟'' شاہ زیب نے دانت کچکچا کر کہا، لیکن اس نے اتنی زور سے شاہ زیب کو کھینچا کہ وہ گھسٹتا ہوا باہر نکل آیا، عجیب مصیبت گلے پڑ گئی تھی، شاہ زیب کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی، یہ جگہ تو اس کے خیال میں کافی محفوظ تھی، اس نے شاہ زیب کو کھڑا کیا اور اس کے بعد ایک طرف گھسٹنے لگی، گویا وہ لڑکی یہ جگہ چھوڑ دینا چاہتی تھی۔ پہلے تو شاہ زیب کی سمجھ میں کچھ نہ آیا لیکن بعد میں اس نے جب غور کیا تو اس کی آنکھیں شدت حیرت سے پھیل گئیں۔ یہ ایک بہترین اقدام تھا وہ لوگ جس راستے پر تلاش کرکے یہاں تک پہنچے تھے لڑکی اس راستے پر جارہی تھی اس سے یہ فائدہ ہوسکتا تھا کہ اب وہ لوگ شاہ زیب اور لڑکی کو اس سمت تلاش نہیں کریں گے، ممکن ہے وہ ان چٹانوں کو بھی تلاش کرلیں جن کے درمیان سوراخ بنے ہوئے تھے، شاہ زیب کو احساس ہوا تھا کہ لڑکی اتنی بیوقوف نہیں ہے جتنا وہ سمجھ رہا تھا۔

یہ لوگ دیر تک سفر کرتے رہے، پھر کوئی آواز نہیں سنائی دی تھی، جس راستے پر یہ لوگ جارہے تھے وہاں جنگل زیادہ گھنا اور خوفناک ہوتا چلا گیا تھا، بعض جگہ زمین پر دلدل بھی محسوس ہورہی تھی جو گھاس میں چھپی ہوئی تھی، لہٰذا سفر میں سخت دشواری پیش آرہی تھی۔ لڑکی ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی کافی پرسکون تھی۔ خاصا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک بار پھر ان لوگوں نے ایک جھنڈ میں پناہ لی۔ درختوں کے درمیان قد آدم گھاس اگی ہوئی تھی، شاہ زیب کے کان آہٹوں پر لگے ہوئے تھے اور وہ دور دور تک کی آوازیں سننے کی کوشش کررہا تھا، لیکن اطراف میں کوئی آواز نہیں تھی، لڑکی یہاں کافی دیر رکی، آہستہ آہستہ چاند نکل آیا تھا اور چاندنی درختوں سے چھن چھن کر پہنچ رہی تھی جس سے بعض حصے اچھے خاصے روشن ہوگئے تھے۔ درخت یہاں بھی گھنے اور آپس میں جڑے ہوئے تھے اور زمین کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ انسانی قدموں سے ناآشنا ہے، کچھ فاصلے پر جانوروں کی خشک ہڈیاں بکھری نظر آرہی تھیں، کئی منٹ یہاں گزارنے کے بعد وہ دونوں اس جگہ سے آگے بڑھ گئے، یہاں تک کہ درختوں کا سلسلہ منقطع ہوگیا، تھوڑے ہی فاصلے پر پتھریلا میدان نظر آرہا تھا، لڑکی مقامی جغرافیے سے اچھی طرح واقف تھی اور ایسے راستوں پر جارہی تھی جو مشکل نہیں تھے یہاں تک کہ آہستہ آہستہ رات ختم ہوگئی۔

شاہ زیب اور لڑکی کہیں تھوڑی دیر رک جاتے اور اس کے بعد پھر سفر کرنے لگتے، غالباً لڑکی راتوں رات ان لوگوں سے اتنی دور نکل جانا چاہتی تھی کہ دن کی روشنی میں وہ ان لوگوں کو تلاش نہ کرسکیں۔ جب سورج نکلا تو یہ لوگ ایک ایسے علاقے میں تھے جہاں درخت بہت کم تھے اور چھوٹے چھوٹے ٹیلے بکھرے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان جھاڑیاں بکثرت موجود تھیں۔ ٹیلے بالکل سنسان اور خاموش تھے۔ اطراف میں جانور وغیرہ بھی نظر نہیں آرہے تھے۔ شاہ زیب نے سوچا کہ لڑکی یہاں بھی دھوکہ کھا گئی اگر غذا کا مسئلہ پیش آگیا تو کیا ہوگا، یہاں تو اس کے شکار کرنے کے لیے جانور بھی نہیں تھے، دوسرے ہی لمحے شاہ زیب کو احساس ہوا کہ بلاشبہ یہاں شکار کرنے کے لیے جانور تو نہیں لیکن ان کے شکاری ضرور موجود تھے۔

ایک ٹیلے کے عقب سے پانچ چھ افراد نمودار ہوئے ان کے ہاتھوں میں رائفلیں دبی ہوئی تھیں، ان کے چہروں پر ایسے تاثرات نظر آرہے تھے جیسے وہ چھپے ہوئے انہی کا انتظار کررہے ہوں، آن کی آن میں وہ شاہ زیب اور لڑکی کے چاروں طرف بکھر گئے۔ لڑکی پینترے بدل رہی تھی۔ اس کی نگاہیں ان لوگوں پر جمی ہوئی تھیں۔ یوں

محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے ان سے ہار نہ مانی ہو۔
وہ چیختے دہاڑتے ہوئے ان کی جانب لپکے اور ان کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ دانتوں سے شاہ زیب اور لڑکی کو چیر کر رکھ دیں گے۔ شاہ زیب تو آسانی سے ان کی گرفت میں آ گیا لیکن لڑکی اچانک ہی زمین پر ہاتھ رکھ کر اچھلی اور اس کی دونوں ٹانگیں دو افراد کے منہ پر پڑیں۔ ان کے حلق سے بے اختیار چیخیں نکل گئیں، لڑکی نے چھلانگ لگائی اور اتنی برق رفتار سے ایک ٹیلے پر چڑھی کہ یقین نہیں آتا تھا۔
شاہ زیب دو آدمیوں کی گرفت میں تھا لیکن اس کی آنکھیں لڑکی کو دیکھ رہی تھیں، آن کی آن میں ٹیلے کی بلندی پر نظر آئی اور اس کے بعد دوسری طرف کود گئی۔
''شیردن...'' ان میں سے ایک دہاڑا اور پھر سب اس کی طرف دوڑ پڑے جو شاہ زیب کو پکڑے ہوئے تھے وہ بھی اسے گھسیٹتے ہوئے اسی جانب جا رہے تھے۔ شاہ زیب نے بلندی پر پہنچ کر دیکھا، لڑکی ٹیلوں کے دامن میں بھاگ رہی تھی، دو افراد پوری قوت سے اس کے پیچھے پوری قوت سے دوڑ پڑے اور لڑکی سے ان کا فاصلہ کم ہونے لگا لیکن لڑکی چھلاوہ بنی ہوئی تھی۔ تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر وہ رکی اور ان لوگوں کی طرف ہاتھ ہلایا انداز ایسا ہی تھا جیسے الوداع کہہ رہی ہو۔ ایک بار پھر اس نے آگے چھلانگ لگا دی۔ اس کے نزدیک ترین پہنچ جانے والے دونوں افراد دوبارہ اس کے پیچھے دوڑ پڑے لیکن وہ دس پندرہ گز ہی گئے ہوں گے کہ ان کے قدم ٹھٹک گئے اور پھر ان کے چہروں پر دہشت نمایاں ہوگئی۔
وہ اچانک ہی دونوں ہاتھ بلند کر کے کھڑے ہو گئے اور پھر زور زور سے چیخنے لگے، شاہ زیب کے ساتھ موجود دونوں افراد حیران رہ گئے۔ ان دونوں نے بے اختیار شاہ زیب کو چھوڑ دیا اب شاہ زیب بھی حیرت سے ان چیخنے والوں کو دیکھ رہا تھا جبکہ لڑکی دوڑتی ہوئی کافی دور نکل گئی تھی۔ اگر پیچھے والے چاہتے تو اسی رائفلوں کا نشانہ بنا سکتے تھے لیکن وہ بھی ان چیخنے والوں کی طرف متوجہ تھے جو اپنی جگہ کھڑے چیخ رہے تھے، پھر ایک دہشت ناک منظر نگاہوں کے سامنے رونما ہو گیا۔ چیخنے والوں کے قد آہستہ آہستہ چھوٹے ہونے لگے، فوراً ہی صورت حال سمجھ میں آ گئی۔ جس جگہ وہ کھڑے تھے وہاں دلدل تھی اور وہ دلدل میں اندر تک چلے گئے تھے۔ اب ان کے قدم دلدل میں دھنستے جا رہے تھے۔
شاہ زیب ان لوگوں کے چھوٹے ہوتے ہوئے قد دیکھ رہا تھا اور خوف و دہشت سے اس کے بدن میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ وہ چیخ چیخ کر مدد کے لیے اپنے ساتھیوں کو پکار رہے تھے اور کنارے پر کھڑے آدمی بری طرح ناچ رہے تھے ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کی کس طرح مدد کریں۔ دلدل میں ڈوبنے والوں سے بہت آگے کافی آگے وہ چھلاوہ لڑکی دوڑی چلی جا رہی تھی یہ بات ناقابل یقین تھی کہ اس کے پاؤں ایک لمحے کے لیے بھی دلدل پر نہیں ٹک رہے تھے، بس یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے پاؤں دلدل کو چھوتے ہیں اور اس کے بعد وہ آگے چھلانگ لگا دیتی ہے، بالآخر دلدلی علاقہ ختم ہو گیا۔
شاہ زیب اگر چاہتا تو ان کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر یہاں سے فرار ہو سکتا تھا لیکن اس نے بھی مصلحت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ لڑکی تو نکل ہی گئی تھی اب اگر وہ یہاں سے بھاگ جاتا تو بلاوجہ ان لوگوں کا مجرم قرار پاتا اور بھاگ کر جاتا بھی کہاں، تھوڑے بہت فاصلے کے بعد وہ اسے دوبارہ پکڑ لیتے۔ شاہ زیب نے چیخ کر کہا۔
''تمہارے پاس رسہ نہیں ہے، اگر ہو سکے تو رسے کا انتظام کرو، ابھی ان لوگوں کے دلدل میں غرق ہونے میں دیر ہے۔''
یہ بات غالباً ان لوگوں کی سمجھ میں آ گئی، ان میں سے ایک آدمی نے برق رفتاری سے چھلانگ لگا دی اور ایک جانب دوڑ گیا، ایک ڈیڑھ منٹ میں وہ واپس بھی آ گیا، اس کے ہاتھ میں نائلون کا ایک رسہ تھا جسے اس نے راستے ہی میں کھول لیا تھا اور اب اسے بکھراتا چلا آ رہا تھا۔

''مجھے دو۔'' شاہ زیب نے کہا اور اس شخص کے ہاتھ سے رسہ لینے کی کوشش کی لیکن جو شخص شاہ زیب کی نگرانی کرر ہا تھا اس نے شاہ زیب کو دھکا دے کر پیچھے ہٹایا اور رائفل کی نال اس کے سینے سے لگا دی، باقی لوگ اپنے ساتھیوں کی مدد میں مصروف ہو گئے۔ رسہ گھما کر پھینکا جاتا لیکن ہوا کے باعث ہر بار وہ ان سے کچھ فاصلے پر چلا جاتا۔

''کیا تم ان لوگوں کو موت کے حوالے کرنے پر تیار ہو بیوقوف لوگو! رسہ مجھے دو۔''

اس بار پتا نہیں کیوں ان میں کچھ نرمی پیدا ہوئی۔ ایک نے رسہ شاہ زیب کی جانب بڑھا دیا۔ شاہ زیب نے اپنے سامنے کھڑے شخص سے رائفل چھین لی۔ باقی دونوں نے چونک کر شاہ زیب کو دیکھا اور رائفلیں اس کی جانب سیدھی کر لیں۔ لیکن شاہ زیب نے ان پر توجہ دینے کے بجائے جلدی سے رسے کا سرا رائفل میں مضبوطی سے باندھا اور رائفل کی نال پکڑ کر پوری قوت سے گھمانے لگا۔ جب اس کا مقصد پورا ہو گیا تو اس نے رائفل پوری قوت سے ڈوبنے والوں کی جانب اچھال دی وہ ان کے قریب جا گری۔ انہوں نے پھرتی سے رسہ پکڑ کر اپنے بدن کے گرد کس لیا۔ شاہ زیب کی اس کوشش سے رائفل بردار غالباً مطمئن ہو گئے تھے۔

اب رسے کی مدد سے انہیں کھینچا جانے لگا۔ شاہ زیب بھی ان کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ پھر دلدل سے ان دونوں کے بدن اکھڑے لگے یہاں تک کہ وہ دلدل میں ایک لمبی لکیر بناتے ہوئے دور تک آ گئے، یہ لوگ بری طرح پسینہ پسینہ ہو گئے تھے لیکن ڈوبنے والوں کو بچانے میں کامیاب ہو گئے تھے، وہ دلدل سے نکلے تو شاہ زیب بھاگ کر ان تک پہنچا۔

''پانی ہے؟'' شاہ زیب نے سوال کیا اور ایک شخص نے حیرت زدہ انداز میں پانی کی چھاگل اس کی طرف بڑھا دی، شاہ زیب نے دونوں کو پانی پلایا اور ان کے شانوں پر تھپکیاں دینے لگا۔ بدبودار دلدل سے ان کے بدن لتھڑ گئے تھے۔ انہیں صاف کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ تاہم شاہ زیب کی یہ کوشش تھی کہ ان کے لتھڑے ہوئے بدن صاف کر دیے جائیں۔ وہ سب متحیرانہ نگاہوں سے شاہ زیب کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ تو ان کے دشمنوں میں سے تھا۔ وہ لوگ اسے گرفتار کرنے کی کوششوں میں رات بھر مصروف رہے تھے اور وہ ان لوگوں کے ساتھ یہ دوستانہ سلوک کر رہا تھا، لیکن شاہ زیب نے اپنی دانست میں بہت بڑا تیر مار لیا تھا۔ کافی دیر تک شاہ زیب ان لوگوں پر مصروف رہا اور آخر کار انہیں اس گندگی سے نجات دلانے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہاں کوئی تالاب وغیرہ نہیں ہے؟''

''آؤ...'' ان میں سے ایک نے کہا اور اپنے دونوں ساتھیوں کو سہارا دے کر وہ اس طرف چل پڑے جدھر سے انہیں برآمد ہوتے دیکھا گیا تھا۔ شاہ زیب خود بخود ان کے ساتھ جا رہا تھا اور ان سے زیادہ تیز رفتاری کا مظاہرہ کر رہا تھا، تب اس نے کافی فاصلے پر ٹیلوں کی آڑ میں دو گاڑیاں کھڑی دیکھیں۔ یہ لینڈ روورز تھیں۔ گاڑیوں میں کافی سامان موجود تھا۔ آس پاس اور کوئی شخص نہیں تھا۔ غالباً یہی چھ افراد یہاں موجود تھے۔ شاہ زیب گاڑیوں کے قریب پہنچ کر زمین پر بیٹھ گیا، وہ لوگ اپنے ساتھیوں کے لباس وغیرہ کا بندوبست کرنے لگے۔ دو آدمی مسلسل شاہ زیب پر نگاہ رکھے ہوئے تھے، لیکن اسے کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔

چند لمحات کے بعد ایک شخص نے شاہ زیب کو ایک پیالی میں کوفی پیش کی۔ کوفی کی سوندھی سوندھی خوشبو شاہ زیب کی ناک سے ٹکرائی تو اس نے جلدی سے پیالی تھام کر چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے شروع کر دیے۔ شاہ زیب کے نگران بھی ہاتھوں میں کوفی کے مگ لیے اس کے قریب ہی بیٹھ گئے۔

''تم نے ہمیں پاگل کر کے رکھ دیا ہے۔'' ایک نے شکوے کے سے انداز میں کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم یہ بات کیوں سوچ رہے ہو؟'' شاہ زیب نے کوفی کا ایک بڑا سا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''کیا تم اس کے ساتھ نہیں تھے؟''

''تھا.....''

''اور رات کو جب تمہیں تلاش کیا جا رہا تھا اس وقت کیا تم نے اسے تحفظ نہیں دیا؟''

''دوستو! میرے بارے میں سنو گے تو حیران رہ جاؤ گے، اگر میں تم سے یہ کہوں کہ میں نے اسے تحفظ نہیں دیا بلکہ وہ مسلسل مجھے قیدی بنائے ہوئے تھی تو کیا تم اس بات پر یقین کرو گے؟''

''ہاں... اس شیطان کی خالہ کی ہر بات پر یقین کیا جا سکتا ہے، خدا کی پناہ انسان تو کہا ہی نہیں جا سکتا اسے، کیا شئے ہے، کس کس طرح اس نے ہم لوگوں کو ڈاج دیا ہے، کیا خیال ہے تمہارا جارج کیا اسٹون برادرز اس سلسلے میں ہمیں معاف کر دیں گے؟''

''یہ سوچنا ہی چھوڑ دو، جو کچھ ہوگا سامنے آ جائے گا۔'' دوسرے نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''میں تو اب بھی سوچتا ہوں تو ششدر رہ جاتا ہوں، دلدل پر دوڑنے کا یہ فن کیا بالکل اجنبی نہیں تھا؟''

''اس کمبخت نے اسے چھلاوہ بنا دیا تھا اور یقینی طور پر اس نے اس کے ساتھ کچھ اس قسم کی کارروائیاں کی ہوں گی کہ وہ مافوق الفطرت بن گئی ہے۔''

شاہ زیب یہ باتیں سن رہا تھا، لیکن ابھی ان سے کوئی سوال کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ تاوقتیکہ وہ اس پر مکمل اعتبار نہ کر لیں، دوسرے آدمی نے جس کا نام جارج لیا گیا تھا شاہ زیب سے پوچھا۔

''کیا تم اس کے قبضے سے فرار کی فکر میں تھے؟''

''یہ بات بھی نہیں تھی دراصل میری مجبوری مجھے اس کے ساتھ لگائے لگائے پھر رہی تھی۔ میں صحرائے اعظم سے بالکل ناواقف ہوں۔ پھر اس کے قبضے میں پہنچنے کے بعد سے اب تک اس کوشش میں مصروف رہا کہ یا تو کوئی بستی نظر آ جائے یا چند افراد تاکہ میں اس سے جان چھڑا کر ان کا سہارا لے سکوں۔ تنہا ان ویرانوں میں بھٹکنے کی ہمت نہیں تھی۔ میں ان علاقوں سے بالکل ناواقف ہوں۔''

اسی وقت باقی چاروں میں سے ایک شخص ان لوگوں کے قریب آ گیا اور جارج سے مخاطب ہو کر بولا۔

''جارج! واپس چلو اب یہاں رکنا بے مقصد ہے۔ یہ دلدل دور تک چلی گئی ہے اور اسے عبور کر کے دوسری جانب جانا بے سود ہے، ہمیں فوراً ہی اسٹون برادرز کو اس کے نکل جانے کی اطلاع دینی چاہیے۔''

دونوں کھڑے ہو گئے، کوئی کگ اٹھا کر لینڈ رووَر کے عقبی حصے میں رکھے گئے اور پھر ان میں سے ایک نے کہا۔

''دوست! معاف کرنا تمہارے لیے یہ کارروائی یقیناً تکلیف دہ ہوگی، لیکن ہمارے لیے ضروری ہے، براہ کرم اپنے ہاتھ بلند کر لو تاکہ تمہاری تلاشی لے لی جائے۔''

شاہ زیب نے پورے خلوص سے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔

''میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے جو تمہارے لیے تکلیف دہ ہو۔''

تاہم انہوں نے شاہ زیب کی تلاشی لی اور پھر اسے بڑے دوستانہ انداز میں لینڈ رووَر میں بٹھا دیا گیا۔ دلدل سے بچنے والے بھی ساتھ ہی تھے، یہ لوگ آگے روانہ ہوئے تو ان میں سے ایک نے کہا۔

''ہم تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولیں گے، کیا نام ہے تمہارا؟''

''شاہ زیب۔'' شاہ زیب نے جواب دیا اور وہ اس کے نام کا تلفظ ادا کرنے لگے، جانے کون سے ملک سے باشندے تھے، بہت کم لوگ ہی ایسے نظر آئے تھے جو اس نام کو صحیح طور پر لے سکے تھے، وہ اس کا بہت بہت شکریہ ادا کر رہے تھے، شاہ زیب نے ان سے آہستہ سے کہا۔

''حالانکہ پچھلی رات اگر آپ لوگ مجھے پا لیتے تو یقیناً میرا حشر اس لڑکی جیسا ہی کیا جاتا، لیکن حقیقت یہ تھی کہ میں دل سے اس کے ساتھ نہیں تھا۔'' شاہ زیب نے کہا اور پھر خاموش ہو گیا، اس کے بعد راستے میں کوئی اور گفتگو

نہیں ہوئی۔

سفر تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہا۔ پتھریلی زمین پر ان کی رفتار کچھ ہلکی تھی، یہ لوگ ایک ایسے خطے میں پہنچ گئے جہاں درختوں کی بہتات تھی اور زمین پر مخمل جیسے سبزے کا فرش بچھا ہوا تھا، تھوڑے فاصلے پر ایک آبشار پہاڑوں بلندیوں سے گر رہا تھا اور نیچے ایک ندی بناتا ہوا دور تک نکل جاتا تھا۔ اسی سبزہ زار پر سفید خیموں کا ایک گاؤں آباد نظر آیا، خیموں کی تعداد پچیس یا تیس کے درمیان ہوگی، جنہیں ایک دائرے کی شکل میں لگایا گیا تھا، درمیان میں خالی جگہ چھوڑ دی گئی تھی جس کے ایک گوشے میں بڑی نفاست سے فولڈنگ میزیں اور کرسیاں جمائی گئی تھیں۔ وہ لوگ شاہ زیب کو لیے ہوئے خیموں کے درمیان آگئے اور پھر ایک طرف بنے ہوئے خیمے کے ایک دروازے میں اسے داخل کر دیا گیا۔ پھر ان میں سے ایک آدمی نے کہا۔

''مسٹر شاہ زیب! آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس وقت تک خیمے میں رہیں جب تک آپ سے دوبارہ رابطہ قائم نہ کیا جائے، خیمے سے باہر نکلنے کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ نے بدعہدی کی اس طرح آپ کو نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔''

شاہ زیب نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ چلے گئے، شاہ زیب اطمینان سے خیمے کا جائزہ لینے لگا، وہاں ہر شئے موجود تھی جس کی ضرورت اہم تھی، شاہ زیب نے جوتے اتارے اور منہ ہاتھ دھو کر پلنگ پر دراز ہو گیا اور اس چھلاوے کے بارے میں سوچنے لگا جو واقعی اس کی زندگی میں سب سے زیادہ عجیب کردار ثابت ہوا تھا۔ اس سے جدا ہونے کے بعد احساس ہوا کہ وہ دنیا کی حسین ترین شئے سے جدا ہو گیا ہو۔ اس کا سراپا شاہ زیب کی نگاہوں میں تھے، خاص طور سے جب وہ چاندنی میں جھیل کے اندر مچھلی کی مانند تیر رہی تھی، اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے تاثرات اس بات کے مظہر تھے کہ وہ شاہ زیب کی طرف سے کسی پہل کی منتظر ہے۔ لیکن اب اپنی اس کمزوری کو کیا کرتا جو ہمیشہ ہی اس کے ساتھ رہی تھی جس کے باعث وہ اس بات کا عادی ہو گیا تھا کہ دوسرے ہی کوئی قدم اٹھائیں تو وہ آگے بڑھے ورنہ وہ خود کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

رات کو اس کے کانوں میں موسیقی کی مدھم آوازیں ابھریں، غالباً وائلن بجایا جا رہا تھا، اس کے بعد بینجو بھی سنائی دیا۔ شاہ زیب حیرانی سے منہ کھول کر رہ گیا۔ ان لوگوں نے جنگل میں منگل بنا ڈالا تھا، زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک شخص اندر داخل ہوا اس نے دو مومی شمعیں خیمے کے اندر رکھ دیں۔

''آپ اگر باہر آنا چاہتے ہیں تو آ سکتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا، انداز بڑا مہذب اور شریفانہ تھا۔ شاہ زیب کو بھلا کیا ضرورت تھی کہ خیمے میں پڑا رہتا اجازت مل گئی تھی چنانچہ خیمے سے باہر نکل آیا۔

باہر کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، وہ میزیں جو پہلے ایک گوشے میں سمٹی ہوئی تھیں اب جگہ جگہ بچھا دی گئی تھیں، ان پر موم بتیاں ایک خاص انداز میں روشن تھیں، بہت سی میزوں پر لوگ شراب کے برتن سجائے بیٹھے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر ایک کاؤنٹر بنا ہوا تھا جس کے پیچھے چند افراد کام کر رہے تھے۔ بوتلیں ایک طرف نفاست سے ایک ٹرالی میں سجی ہوئی تھیں اس طلسمی منظر میں کھو کر شاہ زیب اتنا حیران ہوا کہ بیان سے باہر تھا۔

کچھ دیر تو وہ احمقوں کی طرح ایک طرف کھڑا رہا، پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا سب سے قریبی میز پر جا بیٹھا۔ کسی نے کوئی چیز لا کر شاہ زیب کی میز پر نہیں رکھی تھی البتہ اس نے دیکھا کہ جس شخص کو کسی شئے کی ضرورت ہوتی ہے وہ اپنے طور پر ہی اٹھا لیتا ہے، گویا یہاں سیلف سروس تھی، لیکن ظاہر ہے شراب سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور فی الحال شراب ہی پی جا رہی تھی، چنانچہ وہ خاموشی سے بیٹھا ان لوگوں کو دیکھتا رہا، پھر ایک شخص اس کے قریب آیا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا، شاہ زیب نے چونک کر اسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ شخص خود ہی مخاطب ہوا۔

''میرا نام البرٹ ہے اور میں ان دونوں میں سے ایک ہوں جن کی جان بچانے میں آپ نے انتہائی ذہانت کا

ثبوت دیا تھا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''اوہ... مسٹر البرٹ! میں آپ کو زندگی کی مبارک باد دیتا ہوں۔''

''شکریہ... کیا آپ ڈرنک نہیں کرتے؟''

''نہیں...'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''آپ کے لیے کچھ اور لاؤں؟''

''کوئی مل جائے تو...''

''ہاں کیوں نہیں... ہر چیز مل سکتی ہے ایک منٹ... میں ابھی حاضر ہوا۔'' البرٹ ممنونیت کے جذبات کا شکار تھا، تھوڑی دیر بعد وہ اپنے لیے شراب کی بوتل، گلاس اور آئس باکس اور شاہ زیب کے لیے ایک کاغذی کپ میں کوفی لے آیا۔

''یہ ماحول آپ کو کیسا لگا؟'' اس نے کپ شاہ زیب کو تھماتے ہوئے پوچھا۔

''ناقابلِ یقین۔''

''اسٹون برادرز دراصل شاہی خاندان کے افراد ہیں او شہنشاہیت کی خوبو کبھی نہیں جاتی، خواہ وہ کسی بھی جگہ ہوں۔ میں آپ کو ان کے بارے میں تفصیلات بتاؤں گا، یوں سمجھ لیجیے کہ انہوں نے اپنے لیے اس زمین پر ہی جنت بنا ڈالی ہے۔''

''افسوس میں اسٹون برادرز ہی سے ناواقف ہوں۔''

''آپ بھی انہیں دیکھ سکیں گے، ویسے آپ کے بارے میں انہیں تفصیلات فراہم کر دی گئی ہیں''

''گڈ... لیکن کیا میں یہ معلوم کر سکتا ہوں کہ آپ لوگ صحرائے اعظم میں کیا کر رہے ہیں؟''

''میں آپ کو تھوڑی بہت تفصیلات تو بتا سکتا ہوں لیکن بہتر یہ ہوگا کہ پہلے اسٹون برادرز سے آپ کا تعارف ہو جائے، پھر ہمارے درمیان دوستانہ تعلقات میں آسانی ہوگی۔''

شاہ زیب گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا، پھر اس نے ایک خیمے سے دو افراد کو برآمد ہوتے دیکھا میزوں کے درمیان پھیلی ہوئی مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آوازیں یک لخت معدوم ہو گئی تھیں۔ شاہ زیب گہری نگاہوں سے آنے والوں کا جائزہ لے رہا تھا، عمر اٹھائیس یا انتیس سال ہوگی دونوں کی شکلیں حیرت انگیز طور پر یکساں تھیں۔ بالوں کا اسٹائل، آنکھیں، ناک چہرہ حتیٰ کہ لباس بھی بالکل ایک جیسا تھا۔ ان کے آنے سے ایک تیز خوشبو فضا میں پھیل گئی جو یقیناً کسی اعلیٰ درجے کے سینٹ کی تھی۔ یہ سوال کسی سے کرنا مناسب نہ تھا کہ کیا وہ دونوں اسٹون برادرز ہی ہیں۔ انہیں ایک ہی نگاہ میں دیکھ کر یہ بات کہی جا سکتی تھی۔

دونوں ایک میز پر آ کر بیٹھ گئے اور ان کے سامنے شراب کے برتن سجا دیے گئے۔ بھنبھناہٹیں پھر جاری ہو گئی تھیں۔ غالباً ان لوگوں کو اجازت تھی کہ تفریح کے اوقات میں ان کی موجودگی کی پروا نہ کی جائے وہ اپنے طور پر شراب نوشی میں مصروف ہو گئے۔ البرٹ شاہ زیب کی میز سے اٹھ کر چلا گیا تھا، شاہ زیب خاموش بیٹھا اس ماحول کو دیکھتا رہا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ یہاں لڑکیاں بھی کافی تعداد تقریباً پچیس تیس کے قریب موجود تھیں، واقعی اتنا بڑا گروہ لے کر صحرائے اعظم کے ان ہولناک علاقوں میں داخل ہونا معمولی بات نہیں تھی اور پھر ظاہر ہے ساز و سامان کی منتقلی بھی ایک مسئلہ تھی، پتا نہیں اس کے لیے ان لوگوں نے کیا انتظامات کیے تھے کیونکہ بیشتر علاقے ایسے تھے جدھر گاڑیوں کا گزرنا ممکن نہ تھا تاہم اس مسئلے میں سر کھپانے کی ضرورت فی الحال نہیں تھی۔ موسیقی کی دھنیں تبدیل ہونے لگیں، میزوں کو ایک خاص ترتیب سے سمیٹ لیا گیا اور درمیان میں دائرہ سا بن گیا۔ شاہ زیب نے موسیقی کی ان بدلتی ہوئی دھنوں کا مطلب بھی سمجھ لیا۔ غالباً رقص کا پروگرام تھا اور ایسا ہی ہوا، جوڑے ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر رقص کرنے لگے، بڑی مفاہمت کا ماحول تھا، خواتین ہر شخص کی پذیرائی کر رہی تھیں، تھوڑی دیر کے بعد پارٹنر بدل جاتے تھے، گویا کوئی کسی کی ملکیت نہیں تھا۔ اسٹون برادرز نے واقعی ایک بہترین گروہ

آرگنائز کیا تھا اور اس کے لیے جو تیاریاں کی گئی تھیں وہ بھی قابل داد تھیں۔

کسی نے شاہ زیب کی جانب توجہ نہیں دی تھی، پھر اس کی نگاہ ایک بوڑھے شخص پر پڑی، وہ بھی کچھ ایسی ہی شخصیت کا مالک تھا کہ ایک نگاہ دیکھ کر اسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا، چوڑے چکلے بدن کا مالک، براق کی طرح سفید بال، چہرہ جاندار اور جھریوں سے پاک تھا، بدن کی ترتیب بتاتی تھی کہ جوانی کے زمانے میں بہت پرمشقت رہا ہے، اس کی چوڑی کلائیاں بھی سفید بالوں سے بھری ہوئی تھیں۔ بوڑھے کے سامنے ایک دبلی پتلی سی لڑکی بیٹھی تھی جس کی آنکھوں میں ہلکے سے حلقے پڑے ہوئے تھے۔ ہونٹ بھی خشک تھے، یوں لگتا تھا جیسے یا تو وہ بیمار ہو یا بہت کمزور۔ اس نے اپنے سامنے سبز رنگ کے کسی سیال کا گلاس رکھا ہوا تھا جو یقینی طور پر شراب نہیں تھی، جبکہ بوڑھے کے سامنے شراب کے برتن سجے ہوئے تھے۔

کافی دیر اسی طرح گزر گئی، رقص کے کئی راؤنڈ ہوئے اور اس کے بعد موسیقی کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ پھر کاؤنٹر پر کھانے پینے کی اشیاء سجائی جانے لگیں، یہ اشیاء ٹرے میں رکھی جارہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں بھی سیلف سروس ہوگی، بہت سی نفیس چیزیں شاہ زیب کا ؤنٹر پر نظر آئیں۔

کھانے پینے کا سلسلہ شروع ہوا ایک ہلکی سی گھنٹی کی آواز ابھری تھی گویا یہ کھانے کے لیے اجازت کا وقت تھا، اسٹون برادرز بھی اپنی جگہ سے اٹھ گئے اور ایک ایک ٹرے ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے اپنی جگہ واپس آگئے۔ اب جگہ پر بیٹھے رہنا حماقت ہی تھی چنانچہ شاہ زیب بھی اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے ایک ٹرے لاکر اپنے سامنے رکھ لی۔

شاہ زیب کو یہ ماحول پسند آنے لگا تھا اور وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اگر اسٹون برادرز کے ساتھ کوئی لمبی شمولیت ہوجائے تو کیا حرج ہے، ویسے بھی اس نے اپنا رویہ جس طرح کا رکھا ہوا تھا اس سے امکانات تھے کہ یہاں اس کی پذیرائی ہوگی۔ ان کے انداز سے بھی یہ پتا چلتا تھا کہ شاہ زیب کو جتنے گھنٹے خیمے میں رکھا گیا تھا اب اتنے ہی گھنٹے کی مکمل آزادی فراہم کردی گئی تھی۔

کھانے پینے سے فراغت حاصل کرنے میں تقریباً ایک گھنٹہ ہی صرف ہوگیا۔ اپنی اپنی ٹرے خود ہی واپس کاؤنٹر پر رکھ دی گئی۔ چند افراد کاموں میں مصروف تھے۔ یہاں ذمے داریاں شاید تقسیم کردی گئی تھیں۔ میزوں کی صفائی ہوئی اور اس کے بعد پھر موسیقی کا سلسلہ جاری ہوگیا، ایک شخص شاہ زیب کے پاس پہنچ گیا اور مہذب لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔

''مسٹر شاہ زیب! اسٹون برادرز سے ملاقات کرنا پسند کریں گے؟''

''کیوں.. کیا وہ مجھ سے ملاقات کرنے کے خواہش مند ہیں؟'' شاہ زیب نے سوال کیا۔

''ہاں..'' اس نے جواب دیا اور شاہ زیب اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد شاہ زیب ان دونوں کے قریب پہنچ گیا۔ دونوں نے انتہائی مہذب انداز میں کھڑے ہوکر شاہ زیب سے مصافحہ کیا اور اسے احترام سے بیٹھنے کی پیشکش کی۔

''آپ کیا پینا پسند کریں گے؟'' ان میں سے ایک نے کہا۔

''نہیں شکریہ.. میرا خیال ہے میں اس کی ضرورت نہیں محسوس کررہا۔''

''گڈ.... آپ کی ہمارے درمیان شمولیت بڑے عجیب وغریب حالات میں ہوئی ہے اور ہم ان حالات کے بارے میں آپ سے گفتگو کرنا چاہیں گے۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ ہمارے پاس پہنچنے کے بعد آپ کو کسی قسم کی کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟''

''نہیں... بلکہ میں حیرت انگیز طور پر اس ماحول سے لطف اندوز ہورہا ہوں۔ واقعی آپ لوگوں نے کمال کردکھایا ہے۔''

''شکریہ مسٹر شاہ زیب، ویسے یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ آپ کا تعلق کہاں سے ہے؟''

''میں ایشیائی باشندہ ہوں۔''

''ہمارا بھی یہی خیال تھا، ویسے آپ کا مشغلہ کیا ہے؟''

''آوارہ گردی۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''کہاں کہاں کی خاک چھانی ہے آپ نے؟'' ایک نے شوخ لہجے میں کہا اور شاہ زیب اسے تفصیلات بتانے لگا۔ لیکن اپنی اصل کہانی کو پوشیدہ ہی رکھا تھا اس نے، بس اتنی ہی تفصیل بتائی تھی کہ مختلف ممالک کی سیر کرتا رہا ہے، اس کے پاس کوئی خاص وسائل نہیں ہیں اور اپنے طور پر مختلف علاقوں میں مختلف طریقوں سے گھومتا پھر رہا ہے۔ اسی طرح صحرائے اعظم افریقہ آ گیا تھا۔ لیزا سے دوستی کے بارے میں صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ لڑکی اسے کہیں ملی تھی اور اس کے بعد جب وہ یہاں آیا تو اس لڑکی نے شاہ زیب کی پذیرائی کی اور افریقہ کے اندرونی علاقے میں گھمانے کے لیے لے گئی۔ اس کے بعد خود بخود ہی اس پراسرار لڑکی کا تذکرہ نکل آیا۔ اس کے بارے میں شاہ زیب نے ایک بات بھی ان لوگوں سے نہ چھپائی۔ ایک آدمی بولا۔

''آپ کافی نفیس انسان معلوم ہوتے ہیں۔ آپ نے ہماری مشکل خود بخود حل کر دی اور لازمی ہے کہ یہ تصور آپ کے ذہن میں ہوگا کہ ہم اس کے بارے میں آپ سے سوالات کریں گے۔''

''ہاں.... میں جانتا ہوں۔''

''اس کی وجہ؟'' ان میں سے ایک نے سوال کیا۔

''وجہ صاف ظاہر ہے۔ آپ کے ساتھی اس لڑکی کو قتل کرنا چاہتے تھے انہوں نے اسے گھیرا لیکن وہ ان کے قبضے سے صاف نکل گئی۔ ظاہر ہے اگر آپ کو اس سے دلچسپی نہ ہوتی تو آپ میری جانب بھی متوجہ نہ ہوتے، مجھ سے یقینی طور پر آپ اس کے بارے میں سوال کرتے چنانچہ آپ کے سوالات کرنے سے قبل ہی میں نے اپنے اور اس کے درمیان تمام تفصیلات آپ کو بتا دیں''

''ہم آپ کے شکرگزار ہیں، بلاشبہ انسانوں پر اعتبار کرنا چاہیے اور اس وقت تک کسی کے سلسلے میں بے اعتبادی کا شبہ نہیں کرنا چاہیے، جب تک کہ اس سے بے اعتمادی کا مظاہرہ نہ ہو جائے۔''

''میں آپ کے اس نظریے سے متفق ہوں۔ ویسے کیا میں انفرادی طور پر آپ لوگوں کا تعارف نہیں حاصل کر سکتا؟''

''ہم ہمیشہ سے اسٹون برادرز کے نام سے منسوب ہیں۔ آپ ہمارے درمیان نمبروں کی ترتیب بھی نہیں کر سکتے۔ آپ نے محسوس کر لیا ہوگا کہ ہم میں سرِمو فرق نہیں ہے، چنانچہ ہم لوگ اپنے نمبروں کا تعین بھی نہیں کر سکتے۔ آپ ہمیں اسٹون برادرز کہہ سکتے ہیں۔ جب چاہیں ہم میں سے کسی کو ون یا ٹو کہہ لیا جائے حالانکہ یہ یقین کرنا مشکل ہوگا کہ ہم میں ون یا ٹو کون ہے۔''

''مجھے اس بات کا اندازہ ہو رہا ہے، بہرطور اسٹون برادرز، میں اس لڑکی کے بارے میں آپ سے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''ضرور! ہمیں اس کے بارے میں جو کچھ معلوم ہے ہم آپ کو یقینی طور پر بتا دیں گے، لیکن اس سے قبل کچھ سوالات ہمارے ذہن میں ابھرتے ہیں۔ ممکن ہے اگر درمیان میں گفتگو کا سلسلہ رخ تبدیل کر جائے تو وہ سوالات ہی ذہن سے نکل جائیں۔ اس لیے آپ ہمیں اجازت دیں کہ ہم پہلے وہ سوالات آپ سے کر لیں۔''

''ٹھیک ہے، آپ لوگوں کے بہترین رویے کا میں دل سے قائل ہوں۔''

''دراصل ہم آپ کو سو فیصد لڑکی کا ساتھی سمجھتے، لیکن ہمارے ساتھیوں نے ہمیں تمام رپورٹ دے دی ہے اور درحقیقت آپ کا یہ احسان بھی ہے کہ آپ نے ہمارے دو ساتھیوں کی زندگی بچائی اور ہم سے مکمل تعاون کیا۔ اس وقت اگر آپ کسی طرح کے عدم تعاون پر آمادہ ہوتے تو ان دو افراد کی زندگی بچانا ناممکن تھی۔ آپ یہ بات جانتے ہیں کہ زندگی کتنی قیمتی شے ہوتی ہے۔ زندگی ایک بار ملتی ہے بار بار نہیں ملتی۔''

''وہ میرا فرض تھا اور ظاہر ہے ان لوگوں سے میری براہ راست کوئی دشمنی نہیں تھی۔ لڑکی کا مسئلہ بھی چونکہ

میرے ذہن میں واضح نہیں تھا۔ اگر مجھے اس کا علم ہو جاتا کہ لڑکی مظلوم ہے اور آپ لوگوں کی وجہ سے اسے نقصان پہنچ سکتا ہے تو پھر شاید میرا رویہ آپ کے ساتھ یہ نہ ہوتا۔ تاہم وہ انفرادی طور پر بھی بہت کچھ تھی اور اس کے اندر خود اعتمادی کے سوا کچھ بھی نہیں پایا جاتا تھا بلکہ میں تو اس کے ساتھ کچھ لمحات گزارنے کے بعد یہ محسوس کر رہا تھا کہ میں تو اس کا محکوم ہوں اور وہ صرف از راہِ کرم مجھے اپنے ساتھ لیے پھر رہی ہے۔''

اسٹون برادرز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے ایک دوسرے کی صورت دیکھتے رہے پھر ان میں سے ایک نے کہا۔

''ہمیں براہ کرم! اس کی شخصیت کے بارے میں مکمل تفصیلات بتائیے۔ پہلی بار جب وہ رقص کے دوران آپ کے سامنے آئی تو اس کی کیا کیفیت تھی؟''

''وہ قبیلے کی عام لڑکیوں کی طرح ایک رقاصہ لگ رہی تھی اور اس نے اپنا چہرہ رنگا ہوا تھا۔ دوسری بار وہ رات کی تاریکی میں مجھے نظر آئی اور میں حیران رہ گیا۔ اس وقت اس کے جذبات برگشتہ تھے۔''

''تیسری بار اس سے آپ کی ملاقات اس وقت ہوئی جب آپ جنگل میں جا پھنسے تھے۔''

''ہاں... میں اس کی تفصیلات آپ کو بتا چکا ہوں۔''

''اس کے بعد کیا کیفیت رہی؟''



''کس سلسلے میں؟''

''اس کی ذہنی و جسمانی حرکات کے سلسلے میں۔''

''میں سمجھتا ہوں وہ مجھے خود سے متاثر کرنا چاہتی تھی۔''

''چلیے ٹھیک ہے میرا خیال ہے یہ الفاظ کافی ہیں۔ اچھا کوئی ایسی خاص بات آپ نے اس کے ساتھ رہ کر محسوس کی جس پر آپ کو تعجب ہوا؟''

''جن کھنڈرات میں آپ کے آدمی اس کی تلاش میں پہنچے تھے۔ وہاں میں اور وہ الگ الگ لیٹ گئے تھے۔ تھوڑی دیر تک وہ لیٹی رہی پھر وہ اٹھی اور پتھر کے ایک نوکیلے ٹکڑے سے زمین پر ایک نقش بنانے لگی۔ اس میں ان کھنڈرات کی نشاندہی بھی کی گئی تھی جن میں ہم اس وقت موجود تھے۔ لڑکی کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پھٹا ہوا ٹکڑا تھا جس پر ویسے ہی نقوش بنے ہوئے تھے، یعنی جن راستوں سے گزر کر ہم لوگ وہاں تک پہنچے تھے وہی راستے اس کاغذ کے ٹکڑوں پر بنے ہوئے تھے۔''

اسٹون برادرز کے چہروں پر عجیب سے تاثرات نظر آئے۔ وہ گہری اور چمکدار نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھ رہے تھے۔

''پھر کیا ہوا؟''

''بس جب اس نے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنیں تو جلدی سے نقشہ زمین پر سے مٹا دیا''

''کیا آپ کے خیال میں اس نقشے کے تھوڑے بہت نقش اس جگہ باقی ہوں گے۔''

''میں نہیں کہہ سکتا، ہوسکتا ہے پتھر پر نوکیلے پتھر سے بنائے گئے نقش تازہ ہوں۔''

''اوہ... کاغذ کا وہ ٹکڑا آپ نے دیکھا؟''

''جی ہاں۔''

''کیا کیفیت تھی اس کی؟'' اسٹون برادرز نے پوچھا اور شاہ زیب انہیں کاغذ کے اس ٹکڑے کے بارے میں تفصیلات بتانے لگا۔ اسٹون برادرز خاموشی سے شاہ زیب کو دیکھتے رہے، کافی دیر بعد دونوں نے ہی بیک وقت کہا۔

''بلاشبہ مسٹر شاہ زیب! ہم نے آپ کے ایک ایک لفظ پر یقین کیا ہے۔ ہم سو فیصد اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ آپ نے جو کچھ کہا اس میں ایک لفظ بھی غلط نہ ہوگا۔ ہم آپ کو اور بھی پیشکش کرتے ہیں۔ آپ اگر چاہیں تو

افریقہ کی سیاحت میں کچھ عرصہ ہمارے ساتھ رہ سکتے ہیں، ہوسکتا ہے آپ کی دلچسپی کے اور بھی سامان پیدا ہو جائیں، لیکن اگر آپ یہاں نہ رہنا چاہیں تو ہم آپ کو وہ تمام لوازمات فراہم کر سکتے ہیں جن کے ذریعے آپ واپسی کا سفر طے کریں۔ مثلاً واپسی کے راستوں کے نقشے، گھوڑا اور ایسا سامان جو راستے میں آپ کے کام آسکے۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ اس سلسلے میں آپ جلدی نہ کریں۔ چند روز تو ہمارے ساتھ گزاریں۔ اس کے بعد یہ فیصلہ کر لیں کہ آپ کو کہیں جانا ہے یا مزید کچھ عرصہ ہمارے ساتھ گزارنا ہے۔''

شاہ زیب نے خاموشی سے گردن ہلائی اور اس کے بعد وہ دونوں اٹھ گئے اور ان میں سے ایک نے کہا۔

''افسوس! آپ نے جو اس نقشے کے بارے میں بتایا ہے ممکن ہے ہمیں اس کے کچھ نشانات مل جائیں۔ وہ ہمارے لیے از حد ضروری ہیں۔ نقشہ کیا ہے اور کیسا ہے اس کے بارے میں آپ کو دوسری ملاقات میں تفصیل بتادی جائے گی۔ آپ ان لوگوں کے درمیان پُرامن رہیں۔ کسی شخص کو آپ سے کوئی تعرض نہیں ہوگا۔ میں ہدایات دے دوں گا کہ آپ کو ایک معزز ساتھی کی حیثیت سے رکھا جائے۔ یہاں کے تمام اصولوں سے بھی آگاہ کردیا جائے گا۔''

انہوں نے شاہ زیب سے ہاتھ ملایا اور ایک جیسی چال چلتے ہوئے وہاں سے ہٹ کر ایک خیمے میں داخل ہوگئے۔

مشاغل جاری تھے قہقہے ابھر رہے تھے، شراب کے دور پھر سے چلنے لگے تھے۔ شاہ زیب یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسٹون برادرز نے اپنے ان ساتھیوں کے لیے کچھ اصول متعین کیے ہیں اور شاہ زیب کو بخوبی اندازہ ہوگیا کہ کھل کھیلنے اور تفریحات کی حد تک تمام چیزیں جائز تھیں۔ غالباً اس سے زیادہ کی اجازت کسی کو نہیں تھی کیونکہ اس طرح رقابتوں کا خدشہ پیدا ہوتا ہے اور رقابتیں حادثے جنم دیتی ہیں۔

یہ شور و غوغا رات کو بارہ بجے تک جاری رہا، پھر گھنٹی بجی اور لوگوں نے اپنی اپنی جگہیں چھوڑ دیں۔ شاہ زیب بھی اس خیمے کی جانب چلا آیا جس میں اب تک اسے رکھا گیا تھا۔ شاہ زیب نے اپنے ذہن کو تمام تفکرات سے آزاد کیا اور بے فکری سے سو گیا۔

☆......☆......☆

دوسری صبح وہ انسانی آوازیں سن کر ہی جاگا تھا۔ لوگ اپنے اپنے مشاغل میں مصروف تھے۔ اسے بتایا گیا کہ پانی کا ذخیرہ کہاں ہے چنانچہ وہ آبشار سے بہنے والی ندی کے کنارے پہنچ گیا، لیکن پانی برف کی طرح سرد تھا۔ غالباً برف پگھل پگھل کر نیچے آرہی تھی، ماحول بھی اسی وجہ سے سرد تھا۔ یہ پانی قطعی اس قابل نہیں تھا کہ نہایا جائے، فوراً ہی نمونیہ ہو جانے کا خدشہ تھا، چنانچہ شاہ زیب نے صرف پاؤں بھگوئے، چہرہ اور پاؤں دھوئے اور واپس آگیا۔ کاؤنٹر پر معمول کے مطابق ناشتے کی ٹرے لگادی گئی تھیں۔ شاہ زیب نے اپنی ٹرے اٹھائی اور اپنے خیمے میں چلا آیا تھا۔ ناشتا کرنے کے بعد اس نے سوچا کہ کم از کم کیمپ کے بارے میں مکمل معلومات تو حاصل کرے، چنانچہ وہ خیموں کی اس چھوٹی سی آبادی سے باہر نکل آیا، اس پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ تمام لوگ اپنے اپنے مشاغل میں مصروف تھے، عقبی حصے میں درختوں کے جھنڈ کے پیچھے کچھ گاڑیاں کھڑی تھیں، ان میں دو بڑے بڑے ٹرک، تین لینڈ روور اور باقی دوسری چھوٹی گاڑیاں تھیں، سب کی سب نئی تھیں۔ ٹرکوں پر کینوس سے ہر قسم کی پردہ داری کردی گئی تھی۔ ان میں کیا تھا یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔

بہرحال شاہ زیب اسٹون برادرز کا کارخانہ عجائب دیکھتا ہوا واپس اپنے خیمے میں آگیا۔

دوپہر کو دو بجے کے قریب کھانا خیمے میں ہی ملا، کھانے سے فارغ ہو کر شاہ زیب نے باہر جھانکا تو دیکھا کہ دو جیپیں کسی لمبے سفر سے آئی تھیں، مگر یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہاں سے، بہرحال ابھی یہاں شناسائی بھی نہیں تھی، البتہ شام کو اس کی ملاقات البرٹ سے ہوگئی۔

''ہیلو مسٹر شاہ زیب..''

''ہیلو البرٹ...''

''بور ہو رہے ہوں گے۔''

''ہاں شاید بور ہونے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔''

''آپ نے کیا فیصلہ کیا، واپس جائیں گے یا ہمارے ساتھ رہیں گے۔؟''

''میں نے ابھی فیصلہ نہیں کیا۔''

''اگر آپ سیاح ہیں تو میرا مشورہ ہے کہ صحرائے اعظم ہمارے ساتھ دیکھیں۔''

''مگر کچھ سوالات میرے ذہن میں الجھے ہوئے ہیں البرٹ۔''

''ایک بات کا اطمینان رکھیں، اسٹون برادرز آپ کو ہر طرح سے مطمئن کر دیں گے۔'' البرٹ نے جواب دیا اور شاہ زیب خاموش ہو گیا۔

شام کا ماحول پچھلے دن کے مطابق تھا تمام لوگ اپنے کاموں سے فارغ ہو چکے تھے اور اب اسی احاطے میں اپنے اپنے مشاغل کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ سورج چھپ گیا اور گراؤنڈ میں موسیقی کی آوازیں ابھرنے لگیں، گویا ان کا مشغلہ شروع ہو گیا تھا۔ شاہ زیب نے بھی لباس تبدیل کیا جو اسے وہیں مہیا کر دیا گیا تھا اور پھر باہر نکل آیا۔

وہ ان لوگوں کی تفریحات کا جائزہ لے رہا تھا، یہ بات غور کرنے کی تھی کہ اسٹون برادرز اور ان کا یہ گروہ صرف سیاحت کے لیے ہی یہاں نہیں آیا تھا بلکہ اس کے پس پردہ کچھ اور بھی تھا کیونکہ جس طرح اسٹون برادرز نے نقشے کے بارے میں گفتگو کی تھی وہ کچھ اور ہی انداز تھا۔

وہ پراسرار لڑکی ان لوگوں کے لیے انتہائی دلچسپی کا باعث تھی اور شاہ زیب کے لیے بھی۔ کیونکہ لڑکی کا کردار ان سب میں سب سے زیادہ عجیب وغریب تھا۔

نقشہ کیا حیثیت رکھتا ہے اور اس کا آدھا ٹکڑا لڑکی کے پاس کیوں تھا، یہ ساری باتیں اس کے ذہن میں گڈمڈ ہوتیں تو دماغ اڑنے لگتا تھا۔ شاہ زیب نے سوچا کہ جو ہو رہا ہے ہونے دو۔ اسی وقت ایک شخص اس کے پاس پہنچ گیا اس نے آہستہ سے کہا۔

''اسٹون برادرز آپ کو طلب کر رہے ہیں مسٹر شاہ زیب۔''

شاہ زیب نے اس طرف دیکھا جہاں وہ دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے مشروب بدمست کے برتن سجے ہوئے تھے۔ شاہ زیب ان کے قریب پہنچ گیا۔ دونوں نے معمول کے مطابق ایک ہی آواز اور ایک ہی انداز میں شاہ زیب کا خیر مقدم کرتے ہوئے اسے بیٹھنے کی پیشکش کی تھی پھر ان میں سے ایک نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مسٹر شاہ زیب، یقینی طور پر اتنا وقت گزر جانے کے بعد آپ نے ہمارے ساتھ قیام کرنے کا یا جانے کا فیصلہ کر لیا ہوگا ویسے ہماری پیشکش اب بھی برقرار ہے اور یہ پورے خلوص پر مبنی ہے۔ ہم بغیر کسی لالچ کے آپ کو واپسی کے لیے مواقع مہیا کر سکتے ہیں۔''

''لیکن میں آپ کی رائے پوچھنا چاہتا ہوں۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''تو پھر سن لیجیے، ہم دونوں بھائی کسی بھی طور آپ کو اس طرح واپس بھیجنے کے حق میں نہیں ہیں، تاہم آپ پر کوئی پابندی اور دباؤ بھی عائد نہیں کیا جا سکتا۔ بس ہمیں اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے آپ کی ضرورت ہے۔''

''اور اگر میں آپ سے آپ کا مقصد پوچھوں تو...؟''

''آپ کو اس کا حق ہے۔'' اسٹون برادرز میں سے ایک نے کہا۔

''تو پھر پہلی بات تو میں آپ سے پوچھوں گا کہ صحرائے اعظم میں آپ کی آمد کا مقصد کیا ہے اور جن عظیم الشان انتظامات کے ساتھ صحرا میں داخل ہوئے، وہ میرے لیے انتہائی حیرت کا باعث ہے۔ ان کی وجہ بتانا پسند کریں گے۔؟''

''شاید آپ نے ہمارے بارے میں یہاں معلومات حاصل کی ہوں، ہمارا تعلق شاہی خاندان سے ہے اور اس

میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہمارے وسائل بھی لامحدود ہیں مگر ہماری دلچسپی اور مشاغل ذرا مختلف ہیں۔ میرے پاس اس نقشے کا آدھا ٹکڑا موجود ہے جس کا بقیہ آدھا آپ نے اس لڑکی کے پاس دیکھا تھا۔ اس نقشے میں ایک عظیم الشان خزانے کا راز چھپا ہوا ہے اور ہم وہ خزانہ حاصل کرنے کے لیے ہی صحرائے اعظم میں داخل ہوئے ہیں۔ یقینی طور پر آپ کے ذہن میں اس خزانے کے متعلق سوالات بھی ابھر رہے ہوں گے لیکن بہتر یہ ہے کہ ابھی اس کے بارے میں کوئی سوال نہ کریں۔ دوسری بات اس ساز وسامان کے ساتھ یہاں داخل ہونے کی ہے تو شاید آپ نے اپنی عملی زندگی میں کبھی فلمی زندگی کا بھی مطالعہ کیا ہو تو آپ کے ذہن میں اسٹون برادرز کی بنائی ہوئی فلمیں بھی آسکتی ہیں۔"

''اوہ... تو.. تو کیا...... تو کیا...؟''

''ہاں وہ اسٹون برادرز ہم ہی ہیں۔ یہ ہمارا مشغلہ ہے اور مشغلے کے طور پر ہم نے کئی فلمیں بنائی ہیں، کروڑوں ڈالر کا خرچہ کیا ہے ان پر اور ہماری کئی فلمیں مقبولیت کی انتہاء کو پہنچی ہوئی ہیں۔ اس بار بھی آپ جن لوگوں کو ہمارے ساتھ دیکھ رہے ہیں یہ ایک فلم یونٹ کے طور پر ہی صحرائے اعظم میں داخل ہوئے ہیں اور صحرائے اعظم پر ایک فلم بنا رہے ہیں اور اپنی پسند کے مطابق جو جگہ دیکھتے ہیں وہاں اس فلم کی شوٹنگ بھی کر لیتے ہیں۔ مقصد صرف یہی ہے کہ دونوں کام ہو جائیں۔

صحرائے اعظم کا سفر ہم نے اسی لیے اختیار کیا ہے، ہم اس خزانے کا حصول چاہتے ہیں اور یہ جتنے لوگ ہمارے ساتھ ہیں اگر خزانہ ہمیں دستیاب ہو گیا تو یہ سب اس کے حصے دار ہوں گے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ ہماری یہاں آمد کا مقصد کیا ہے اور ہم نے ان میں سے کسی سے بھی نہیں چھپایا۔ ان میں سے بہت سے لوگ فلمی پروفیشنل ہیں لیکن زیادہ تر نئے اور مہم جو افراد ہیں، جو فلم سے نہیں مہم جوئی سے دلچسپی رکھتے ہیں، اس طرح ہمارے دونوں کام ہو رہے ہیں۔ اس لڑکی کا مسئلہ آپ کے ذہن میں الجھ رہا ہو گا تو یوں سمجھ لیجیے کہ دوسری پارٹی وہ لڑکی ہے جو اس خزانے کے بارے میں تفصیلات جاننا چاہتی ہے اور ہم اس کے ہاتھوں کافی نقصان اٹھا چکے ہیں۔

خزانے کے نقشے کا آدھا ٹکڑا اس نے اپنی حیرت انگیز صلاحیتوں کی بنیاد پر ہم سے حاصل کیا ہے، اس نقشے سے متعلق ایک کہانی ہے جسے ہم نے اپنے ذہنوں میں محفوظ رکھا ہے اور اس کے لیے ہمیں کوئی مجبور نہیں کر سکتا کہ ہم وہ کہانی اسے سنائیں۔

مسٹر شاہ زیب! تمام تفصیلات آپ کو بتا دی گئی ہیں۔ ہمیں اس پر ذرہ برابر اعتراض نہیں ہو گا اگر آپ بھی خزانے کے حصے داروں میں شامل ہو جائیں۔ یعنی افریقہ کی سیاحت کریں اور اگر خزانہ دستیاب ہو جائے تو اس میں سے اپنا حصہ لے کر دنیا کے کسی بھی گوشے میں آباد ہو جائیں۔ خزانے کے بارے میں تفصیلات بھی آپ کو آہستہ آہستہ دی جائیں گی کہ وہ کتنی بڑی مالیت کا ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں آپ کی ضرورت یوں بھی درپیش ہے کہ اس لڑکی نے حیرت انگیز طور پر آپ کو اپنا ساتھی منتخب کرنے کی کوشش کی تھی جبکہ اس سے قبل ایسی کوئی بات دیکھنے میں نہیں آئی۔ ان وجوہات کا جائزہ لینا پڑے گا جن حالات میں آپ اس سے جدا ہوئے ہیں اور جو کہانی ہمارے علم میں آئی ہے اس سے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر دوبارہ آپ کبھی اس لڑکی تک پہنچ سکے تو وہ معمول کے مطابق آپ کی پذیرائی کرے گی اور اگر آپ ہمارے آدمی ہوں گے تو پھر ہماری مشکلات حل ہو سکتی ہیں۔ یوں سمجھ لیجیے مسٹر شاہ زیب کہ آپ اچانک ہمارے لیے ایک کارآمد ساتھی بن گئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود شاید آپ سے ہماری نسلی برتری یا خاندانی برتری سمجھیں کہ ہم کسی بھی شخص کو اس کی مرضی کے خلاف مجبور نہیں کرتے۔ ہم نے اپنی ضرورت کے اظہار کر دیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی آپ کے لیے پھر وہی بات دہرائی جاتی ہے کہ اگر آپ اپنے طور پر پسند نہیں کریں گے تو ہم آپ کی واپسی کا بندوبست کر دیں گے۔''

(زندگی کے پیچیدہ راستوں میں اپنے ہم شکلوں کی کھوج میں نکلے
شاہ زیب کی اگلی منزل کیا ہو گی......؟ جاننے کے لیے اگلی قسط کا انتظار کیجیے)

پہلا شعلہ

محبت اور نفرت کی چھپی چھپی آنچ

# اور میں مرگیا



**سدرہ انور علی**



جھنگ سے، اُس عزت کے لٹیرے کی کہانی جو اپنا انجام بھول بیٹھا تھا

''بنوں کی سہیلی ریشم کی ڈوری۔ چھپ چھپ کے شرمائے دیکھے چوری چوری۔'' یہ بندیا تھی۔

''بابل کی گلیاں نہ چھڈ کے جانا، پاگل دیوانہ اس کو سمجھانا۔'' یہ شان تھی۔

''لب کہیں نہ کہیں بولتی ہے نظر، پیار نہیں چھپتا یار چھپانے سے۔'' یہ سنگم تھی۔

''اوئے صدقے جاؤں یار سامنے تو دیکھ۔'' میں کال میں مصروف تھا جب میرے دوست یاسر نے میرا کندھا ہلا کر سامنے اسٹیج پر متوجہ کیا۔ میری نظر سامنے پڑی تو پھر پلٹنا بھول گئی۔

''ارے اس قدر حسین، مہ جبیں، دلنشین لڑکیاں میں نے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ دل ہی نہیں چاہتا نظریں ہٹانے کو۔'' میں خباثت اور کمینگی سے ہنستے ہوئے کہا۔

''تو کس کو پٹائے گا یار!'' تیسرے دوست نے پھر مجھے مخاطب کیا۔

''کیوں ہم تینوں کو ہی پٹا لیتے ہیں۔''

''ابے دفع دور مجھے تو یہ بلیک سوٹ والی پسند ہے۔ بس یہی چاہیے مجھے۔''

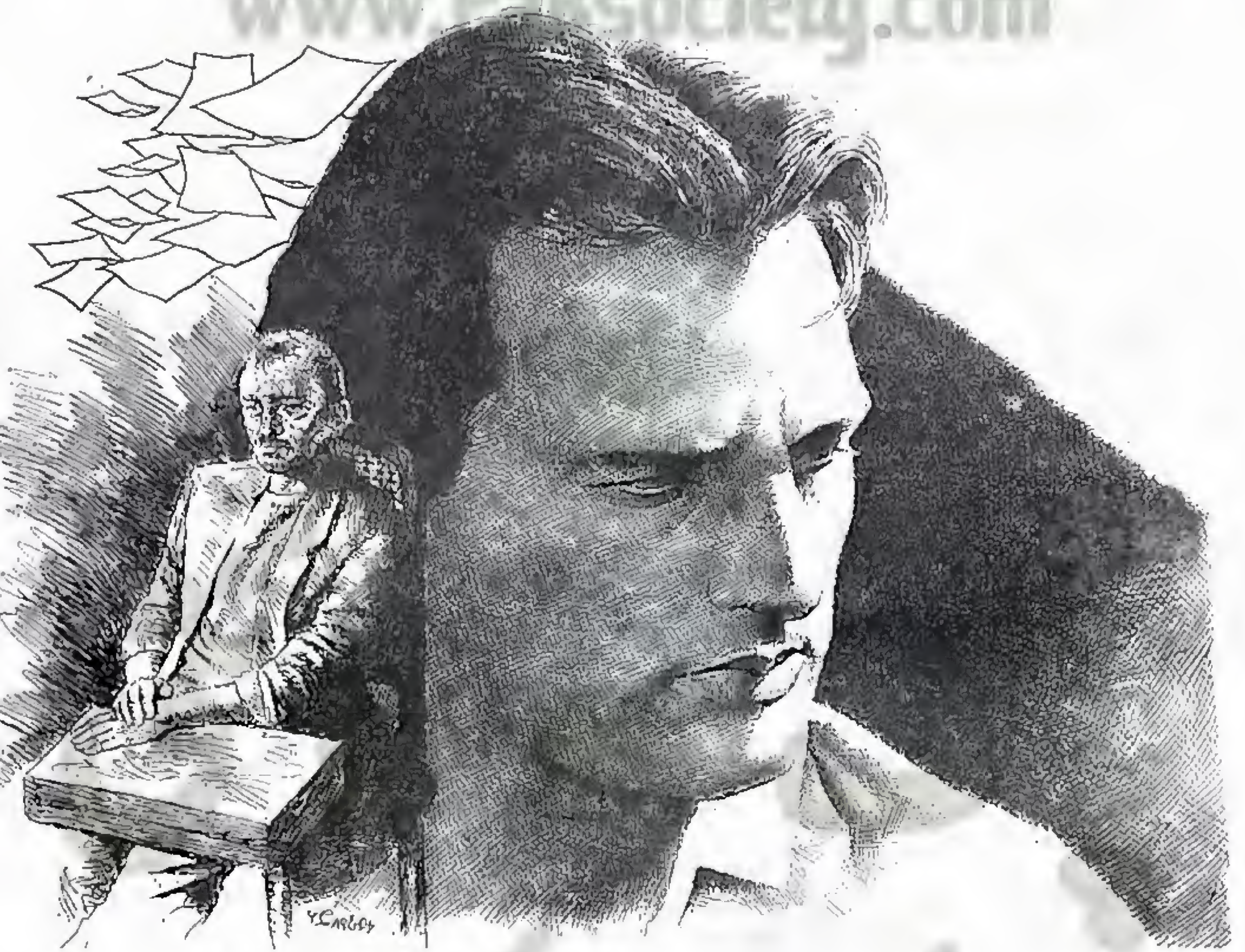
''کیا چاہیے! مطلب کیا ہے تیرا؟ یہ کوئی کسی جیولر کی دکان پر پڑا ہوا سونا، چاندی نہیں جو تجھے چاہیے ہوگا اور تجھے مل جائے گا۔ یہ لڑکیاں ہیں جنہیں تم جانتے تک نہیں۔''

''ابے چپ یہ کیا بحث شروع کردی۔ یہ ہیرا ہیں ہیرا اور یہ میں لے کر رہوں گا۔ خریدنا پڑے، چوری کرنا پڑے یا چھیننا پڑے، اوکے۔ اور ہاں انجان سے پہچان بناتے مجھے کوئی دیر نہیں لگتی۔ ہم اس میدان کے پرانے کھلاڑی ہیں۔ اب تُو بس دیکھتا جا ہمارا کمال۔ باقی دو میں سے تجھے کوئی چاہیے؟''

''نہیں یار تُو انجوائے کر۔ میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔''

☆......☆......☆

آج میرے ایک بہت ہی عزیز دوست کی شادی تھی۔ اس نے بہت اصرار کرکے مجھے لاہور سے یہاں بلایا تھا کہ تم میری شادی میں ضرور آنا اور میں نے بھی اس سے وعدہ کرلیا کہ میں اس کی شادی میں ضرور آؤں گا اور اب یہاں گرین گارڈن میرج لان آکر بیٹھے مجھے دس منٹ ہی گزرے تھے۔ بارات میرے آنے سے پہلے ہی آچکی تھی۔ میں ذرا لیٹ پہنچا تھا۔ دلہن کو دلہا کے پاس اسٹیج پر بٹھایا جاچکا تھا۔ لان میں بہت خوبصورت



میوزک چل رہا تھا ہر جگہ برقی قمقمے روشن تھے۔ ویٹرز ہر جگہ پر مہمانوں کی تواضع میں مصروف تھے۔ جب وہ تینوں لڑکیاں ہال میں داخل ہوئیں۔ خوبصورت لباس میں ملبوس دوپٹے گلے میں جھولتے ہوئے ہلکے میک اپ کے ساتھ وہ کسی اور ہی دیس کی لگ رہی تھیں۔ میری عیاش طبیعت میں اور عیاشی در آئی۔ ان تینوں میں ایک لڑکی بہت زیادہ حسین تھی۔ بس وہی ایک بار صرف ایک بار مجھے چاہیے تھی۔ انڈین گانے کو بہت خوبصورت انداز میں گائے ہوئے جیسے ایک لڑکی ایک بول پھر دوسری اس سے اگلا جملہ ادا کرتی اور ساتھ ساتھ ڈانس بھی کر رہی تھیں۔ ایسی لڑکیاں اور عورتیں عموماً آپ نے شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں دیکھی ہوں گی۔ اُن کا قبیلہ، گڑوی والے کے نام سے مشہور ہے۔ یہ جہاں بھی چلی جائیں تو لوگ پہچان لیتے ہیں کہ یہ گڑوی والے ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر پنجاب میں رہتے ہیں۔ اُن کا پیشہ ناچ گانا ہے۔ مرد حضرات ڈھولکیاں اور ڈرم بجاتے ہیں جبکہ عورتیں ناچتی بھی ہیں اور گاتی بھی ہیں۔ جہاں جس شہر میں بھی یہ جائیں کمانے کے لیے تو یہ وہاں خالی میدان دیکھ کر اپنی جھونپڑیاں وہیں لگا کر رہتے ہیں۔ یہاں آپ کو یہ بھی بتاتی چلوں کہ ہمارے ملک کی معروف گلوکارہ نصیبو لعل بھی انہی کے قبیلے سے تعلق رکھتی ہیں۔

گڑوی والے جہاں کہیں بھی چلے جائیں لوگ اُن کے ساتھ بہت عزت سے پیش آتے ہیں اور نصیبو کی وجہ سے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ اور ایک اور اہم بات کہ اس قبیلے کے لوگ اپنے نام انڈین اور پاکستانی فلمسٹاروں کے نام پر رکھتے ہیں۔ اُن کا رہن سہن اٹھنا بیٹھنا سب اداکاراؤں کی نقل ہوتا ہے تو یہ خود کو بھی اداکار سمجھنے لگتے ہیں۔ مگر اب یہاں وہ ایک ایسے انسان کی

نظروں میں آ چکی تھیں۔ جو اُن کے ساتھ کچھ بھی اچھا نہیں کرنے والا تھا۔ ہوسکتا تھا وہ یہاں آنے پر تمام عمر پچھتاتیں۔ مگر یہ اُن کا پیشہ ہے اور انہوں نے ہر اُس جگہ جانا ہے جہاں کوئی شادی ہو یا لوگ انہیں خود بلائیں۔ یہاں اُن کے ساتھ وہ ہونے والا تھا جو انہوں نے کبھی سوچا تک نہیں ہوگا۔

☆......☆......☆

مجھے اب یہی انتظار تھا کہ جیسے ہی تقریب اختتام کو پہنچے گی میں اُٹھ کر اُن کو اپنے جال میں پھانس لوں گا جو کہ میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ مگر ابھی کافی ہلا گلا جاری تھا۔ میں بے چینی سے، پہلو پہ پہلو بدلنے لگا۔ ہر کام کا انجام ہوتا ہے۔ سو تقریب اپنے اختتام کو پہنچی۔ ہال آہستہ آہستہ خالی ہونے لگا۔

وہ تینوں لڑکیاں ایک سائیڈ پر ہو کر اپنی جمع شدہ رقم گننے اور حساب میں مصروف تھیں۔ جب میں اُن کے سر پر پہنچ گیا۔ آہٹ پا کر ایک لڑکی نے سر اوپر اٹھایا اور بولی۔

''چور یا اُچکے لگتے تو نہیں ہو پھر کیوں ہمارا پیا (پیسہ) تاڑ رہے ہو؟''

''اس کی بات پر میں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا باقی دو لڑکیاں بھی سر اٹھا کر مجھے دیکھنے لگیں۔

''یہ جتنا پیسہ تم لوگوں نے تین گھنٹے ناچ گا کر کمایا ہے نا۔ اتنا میں آپ کو ایک سیکنڈ میں دے سکتا ہوں اور میں کوئی چور یا اچکا نہیں بہت بڑا ڈاکو رہ چکا ہوں ماضی میں۔''

''اچھا پھر تو بڑا پیسا ہوگا آپ کے پاس مگر ہم تو حلال رزق کھاتے ہیں۔''

''یہ حق حلال کا ہے ناچ گانے سے کمایا ہوا؟'' میں نے کہا تو وہ بولی۔

''جو بھی ہے یہ ہمارا پیشہ ہے۔ ہم لاہور سے یہاں آئے ہیں۔ جس طریقے سے اللہ نوازے۔''

''اچھا آپ لاہور سے یہاں آئی ہیں؟''

''جی ہاں لاہور سے۔''

''تو پھر میں بھی لاہور سے آیا ہوں۔ آپ کا گھر کہاں ہے؟''

''ہم دو بھنیں (بہنیں) ہیں اس نے نیچے بیٹھی ہوئی لڑکیوں میں سے ایک پر ہاتھ رکھ کر کہا ہمارا گھر پنڈی روڈ پر ہے اور یہ ہماری کزن ہے شان۔ اس کا گھر کرشنا نگر میں ہے۔''

''سنگمڑی شاٹھ ہزار ہیں۔'' اب نیچے بیٹھی ہوئی دونوں لڑکیاں اُٹھ کھڑی ہوئیں اور ایک بولی۔

''ساٹھ ہزار روپے ہیں۔'' جن کو وہ گن رہی تھی۔

''یہ کیسا نام ہے آپ کا؟'' میں نے اپنا جال مزید بچھاتے ہوئے کہا۔

''جی میرا نام سنگم ہے اور سب مجھے سنگمڑی کہتے ہیں۔''

''اور اِن کا نام کیا ہے؟'' میں نے دونوں کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ! اس کا نام بندیا ہے اور یہ شان ہے۔''

''اچھا پھر تو یہ تم دونوں کی شان ہے برا مت ماننا یہ تم دونوں سے زیادہ خوبصورت ہے۔''

''اوہ ہو نہیں جی برا کیوں مانیں گے حسین تو یہ واقعی ہے۔''

''یہ میری ہونے والی بھابی ہے۔''

ایں یہ کیا میں نے دل میں سوچا پھر خود کو نارمل کیا۔ خیر مجھے کیا میں نے شادی تھوڑی نا کرنی ہے۔ شان ہم سے تھوڑے فاصلے پر جا کر کھڑی ہوگئی جیسے وہ بہت تھکی اور اکتائی ہوئی ہو۔ وہ ہی مچھلی میرے جال میں نہیں آرہی تھی۔ جسے میں چاہتا تھا۔ اگر یہ دونوں بھی نکل گئیں تو میرے دو گھنٹے برباد ہوجائیں گے۔ زندگی میں پہلی بار ہار جاؤں گا جو کہ مجھے بالکل پسند نہیں۔

''اچھا سنگم جی یہ اپنی نصیبو لعل بھی آپ کی رشتہ دار ہے۔ ہاں جی نصیبو لعل ہماری بلادری (برادری) کی ہے میرے بابا کی کزن ہے۔''

''اوہ اچھا...... اور یہ اپنی شان کا منگیتر تمہارا بھائی وہ کہاں رہتا ہے۔''

''وہ جی بینڈ باجا ٹیم کے ساتھ ڈرم بجاتا ہے۔ اے اِنا اے چھوری۔ (اے اِدھر آ لڑکی)۔''

شان جو بہت ہی تھکی ہوئی لگ رہی تھی اس نے دونوں کو بلایا۔

اس کی آواز گانا گا کر خراب ہوئی جا رہی تھی یا تھی ہی ایسی۔
''چھوری سنگروی ناتینے پتا نہ مئے پتا اے کیوو (نہ تجھے پتا نہ مجھے پتا کہ یہ کون ہے)''
''ہاں چل اے چھوری۔'' سنگم نے بندیا کو کہا اور وہ چلنے لگیں مجھے اپنی دال گلتی ہوئی نہ لگ رہی تھی تو میں نے دال کو ایک اور تڑکا لگانے کا سوچا۔
''آیئے سنگم جی میں آپ کو چھوڑ دوں کہاں جائیں گی راتوں رات لاہور تو جا نہیں سکتیں۔ یہاں میرا گھر ہے میرے گھر میں رات گزار لیں صبح ہوتے ہی چلے جانا۔''
''نا نہیں ہم نے کبھی کسی اجنبی پر اعتبار نہیں کیا۔ آپ جائیں اپنے رستے اور ہم جائیں ہمارے رستے۔''
''ارے یہ تو کوئی بات نہ ہوئی پچھلے دو گھنٹے سے میں آپ سے باتیں کر رہا ہوں۔ کیا میں آپ کو شکل سے لوفر لگتا ہوں۔''
''لوفر تو لگتے ہو جی!'' اب کی بار شان بولی تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور میں نے اُس کے قریب جا کر زور سے اس کی کلائی کو پکڑا اور کھینچ کر لے جانے لگا کہ یکدم مجھے سب کچھ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ شان نے دوسرے ہاتھ سے چٹاخ تھپڑ میرے منہ پر مارا۔ تو میں اتنا مضبوط اور توانا نوجوان ہو کر ایک طرف کو گر پڑا۔
شان چلا کر بولی۔ ''سنگم بندیا بھاگو یہاں سے۔''
اس سے پہلے کہ وہ تینوں بھاگنا شروع ہوتی میں نے تیر کی طرح اُٹھ کر پھر شان کو پکڑ لیا۔ قریب ہی میری گاڑی کھڑی تھی۔ ہمارے علاوہ وہاں کوئی نہ تھا۔ ڈوبتے چاند کی رات تھی۔ ہر طرف گھور اندھیرا تھا۔ میں نے اُسے گھسیٹنا شروع کر دیا اور گھسیٹ کر گاڑی کے قریب لے آیا۔ سنگم اور بندیا نے بہت کوشش کی اسے چھڑانے کی۔ مگر میں اپنا آخری وار خالی جاتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔
''ہاں تو شان جی آپ کتنا معاوضہ لیں گی ایک رات کا؟'' اس نے پھر ایک زور کا تھپڑ میرے منہ پر جڑ کر میرے چودہ طبق روشن کر دیے۔
''تو انسان نہیں درندہ لگتا ہے اور ہم گڑوی ضرور بجاتی ہیں مگر اپنی عزت کبھی فروخت نہیں کی۔ تجھے رب کا واسطہ ہے ہمیں جانے دے۔ کیا تجھے اللہ سے ڈر نہیں لگتا؟'' وہ روتے ہوئے التجائیں کر رہی تھی مگر جانتی نہیں تھی کہ میرا دل ہے ہی نہیں پتھر ہے اور پتھر سے سخت چیز کوئی نہیں ہوتی۔
''نہیں شان میں بہت بے رحم ہوں۔ میں نے تمہیں جانے دیا تو یہ میری توہین ہوگی۔ سیدھے طریقے سے گاڑی میں بیٹھ جاؤ ورنہ.....'' میں نے اُس کا بازو کھینچا اور گاڑی میں دھکیل دیا۔ سنگم اور بندیا میرے پاؤں پر گر گئیں۔ میں نے خباثت سے مسکرا کر اُن کی طرف دیکھا تو سنگم بولی۔
''شوبان صاحب میرا بھائی مر جائے گا۔''
''ہائے اوئے پھر تو میں بھی مر رہا ہوں۔ سو تم ہمیں جانے دو بچو۔ اپنا خیال رکھنا یہ کل آپ کو مل جائے گی صحیح سلامت۔''
''پلیز شوبان صاحب تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔''
''شش.....'' میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اُسے چپ ہونے کا کہا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی ادھر شان کو قابو کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ وہ چیخ چلا رہی تھی۔ آگے روڈ پر ہمیں کوئی روک بھی سکتا تھا پھر مجھے وہی کرنا پڑا جو اب ضرورت بن چکا تھا۔ میں نے اپنا ریوالور نکال کر اُس کی کمر پر لگا دیا تو وہ چپ کر گئی۔ اُس کی آنکھیں خون آشام ہو رہی تھیں اور چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اور میرا دل مستی سے لبریز۔ آنے والے لمحات کا سوچ کر میرا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا۔ میرا گھر قریب آ گیا۔ میں نے گاڑی اندر پارک کی اور اسے بے دردی سے گھسیٹ کر باہر نکالا اور اپنے کمرے کا لاک کھول کر اس کو اندر بند کیا۔ اور خود باہر کھڑے ہو کر ستانے لگا۔ ان لڑکیوں نے آج مجھے بہت تھکا دیا تھا۔ مجھے آج تک کسی لڑکی پر اتنی محنت نہیں کرنی پڑی تھی۔
خیر جب میں اندر گیا تو وہ کمرے میں نہیں تھی۔ مجھے بہت حیرت ہوئی کہ وہ کہاں چلی گئی مگر نظریں گھمانے پر وہ مجھے صوفے کے پیچھے چھپ کر بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ تو ایک خبیث سی مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر رینگ گئی۔ میں اس کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا تو وہ تیز ہوا میں جلتے ہوئے دیے کی مانند لرزنے لگی اور اُٹھ کر میرے آگے

ہاتھ جوڑ دیے۔ میں نے آگے بڑھ کر اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے تو وہ کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹ گئی۔ میں پھر اس کے قریب آ گیا وہ پھر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے وہ دیوار سے جا لگی اور اونچی آواز سے چیخنے لگی مگر یہاں اس کی چیخیں سننے والا کوئی نہیں تھا۔ میں نے اُس کے جسم سے ایک ایک کپڑا اُتار کر قینچی سے کاٹ ڈالا۔ وہ بالکل برہنہ میرے سامنے تھی۔ اُس کے بھرے بھرے جسم سے اپنے انگ ملاتے، میں جنت کی سیر کرتا رہا۔ وہ اَن چھوئی گلاب کی کلی۔ میری ہر مزاحمت کو حوصلے اور ہمت سے برداشت کرتی خود بھی تو جنت کی سیر کر رہی تھی۔ اب وہ کِھل کر گلاب ہو چکی تھی۔ میں اس کے شریر، رسیلے گداز جسم کا جتنا اور جہاں سے ممکن ہوا رس پی چکا تھا۔ اس کی شان ختم ہوگئی اور میری درندگی اور ہوس ناکی نے اُس کالی سیاہ گھور رات میں ایک اور حوا کی بیٹی کی عزت تار تار کر دی تھی۔ ایک انسان پھر سے وحشی بن گیا اور شان کے چہرے پر موت سے بھی زیادہ اذیت ناک درد رقم ہو گیا۔

☆......☆......☆

ایک طوفان تھا جو آ کر گزر گیا مگر اپنے پیچھے تباہی کی ایسی داستان چھوڑ گیا۔ جو تا قیامت گروی قبیلے کے لیے کرب اور اذیت کی مثال قائم کر گیا۔

شان صبح صادق تک ہر ہر طرح سے لٹتی رہی تھی۔ پوری طرح لہولہان ہو کر بھی جیسے وہ پتھر کی سی معلوم ہو رہی تھی۔ جب اس درندے نے کہا۔

"اب تم جا سکتی ہو۔" شان نے سرخ سرخ آنکھیں اوپر اٹھائیں اور کہا میری زندگی رہی تو ضرور تجھ سے انتقام لوں گی اور اگر زندگی نے مجھے مہلت نہیں دی تو مر کر بھی میں تجھے چین سے جینے نہیں دوں گی۔ یاد رکھنا۔"

سجان کی آنکھیں غضب ناک ہوگئیں اور اس نے انگلی اُٹھا کر کہا کہ اب کوئی بھی بکواس کی تو یہاں سے زندہ نہیں جانے دوں گا۔ جاؤ یہاں سے۔ اس سے پہلے کہ تمہیں اس دُنیا سے ہی جانا پڑے۔"

شان بلا کی پھرتی سے اٹھی اور دوڑتی ہوئی کمرے کا اور پھر صحن کا دروازہ پار کر گئی۔

باہر آ کر اس نے سنگم کا فون ملایا۔ پہلی بیل پر ہی اس نے کال اٹینڈ کی اور بولی۔

"تم کہاں ہو شانے، میری جان۔" اور پھر اسے شان کی سسکیاں سنائی دیں جسے سُن کر سنگم کا دل بیٹھتا چلا گیا۔

"تم ہو کہاں شان۔"

"میں ڈائیوو اڈے کے قریب ہوں تم وہیں آ جاؤ۔"

پھر تینوں اکٹھی ہوئیں مگر شان اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ اِن تینوں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ سنگم اُس کے گریز کو اچھی طرح سمجھ گئی تھی مگر اُس کو ہلکی سی امید تھی کہ ہو سکتا ہے......؟ مگر اس کی سسکیاں اور ہچکیاں اسے سب بتا رہی تھیں۔ اور اُس کا پہنا مردانہ لباس......

"اب ہم راجو کو کیا جواب دیں گے۔" بندیا بولی سنگم نے کہا۔

"اب ہمیں راجو کو سچ سچ سب کچھ بتا دینا چاہیے۔"

یہ سننا تھا کہ شان اس کے پیروں میں گر پڑی اور کہا۔

"سنگم بچپن سے لے کر آج تک ہم ساتھ ہیں۔ تمہیں ہماری دوستی کی قسم تم راجو کو نہ بتاؤ، پلیز۔" اس کی آواز میں درد تھا مگر سنگم نہ سمجھ سکی اور کہا۔

"میں اپنے بھائی کو دھوکہ نہیں دے سکتی۔" اس نے سفاکیت سے کہا اور اپنے بھائی راجو کو فون پر ساری داستان سنا دی، جسے سُن کر وہ آگ بگولہ ہو گیا۔ سنگم نے بہت کہا کہ اس میں شان کا قصور کوئی نہیں مگر راجو جیسا غیرت مند لڑکا جس نے آج تک شان کے علاوہ کسی کو دیکھا تک نہیں تھا اس سے یہ سب برداشت نہیں ہوا اس نے کہا کہ تم تینوں فیصل آباد آ جاؤ پھر وہیں پر بات ہوگی۔"

☆......☆......☆

شان کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ پھر آپے سے باہر ہو گیا اور کہا۔

"دیکھ شانے ٹھیک سے بتا وہ تیرا یار تو نہیں تھا۔ اس نے تمہیں ہی کیوں......" اس سے آگے وہ کچھ نہیں بول پایا اور شان پر تھپڑوں کی بوچھاڑ کر دی۔ شان نے بہت

قسمیں واسطے دیے کہ میرا کوئی قصور نہیں۔ مگر راجو کو اس کی کسی بات پر یقین نہ رہا تھا۔

''دیکھ راجے مجھے میرے شاہ میر بھائی کے سر کی قسم، میرا کوئی قصور نہیں۔ تمہیں ہماری بچپن کی محبت کی قسم، میرا اعتبار کرلو۔''

''جا میں تم پر تھوکتا بھی نہیں۔ ہماری منگنی ختم۔'' شان نے اُس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھنا چاہا تو راجو نے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا اور کہا۔

''اپنا غلیظ، ناپاک وجود مجھ سے دور رکھو۔'' سنگم اور بندیا نے راجو کو بہت سمجھایا مگر اس نے کہا کہ میں نے آج تک کسی کا کچھ نقصان نہیں کیا پھر کوئی مجھے کیسے نقصان پہنچا سکتا ہے۔ ضرور اس کا اپنا چکر تھا۔ اسے کہو میری نظروں سے دور ہٹ جائے ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گا۔'' یہ سُن کر شان آگے آئی اور بولی۔

''راجو میں مر جاؤں گی۔''

''میرے لیے تو تم مر چکی ہو۔''

''ٹھیک ہے پھر میں تمہیں مر کر دکھاتی ہوں۔''

''مرو۔''

''میں مر جاؤں گی راجے! میں مر جاؤں گی۔''

''سنگمڑی اسے کہو یہ میرے لیے اسی وقت مر گئی تھی جب اس نے میری امانت کسی غیر کو سونپ دی۔''

سنگم بولی۔ ''دیکھ راجے اِس کا کوئی قصور نہیں۔ سب میری آنکھوں کے سامنے ہوا۔''

''پھر وہ تمہیں یا بندیا کو کیوں نہیں لے گیا۔ یہ اِس کا اپنا چکر تھا۔ اِس کا اور میرا رشتہ ختم۔ اب یہ مرے یا جیے مجھے کوئی پروا نہیں۔''

شان کا وجود ریزہ ریزہ ہو چکا تھا۔ اس کی کوئی التجا کام نہ آئی۔ ایسی اذیت تو ساری زندگی میں بھی نہ ہوئی تھی۔ اتنا درد تو کبھی نہیں ملا تھا۔

بندیا اس کے قریب آئی اور کہا۔ ''شان یہ تیری قسمت میں لکھا تھا۔ اللہ کی رضا پر راضی ہو جاؤ۔ ایک وقت آئے گا کہ تمہیں یہ دن یاد بھی نہیں رہے گا۔ تُو جانتی ہے بلادری (برادری) میں تجھے کتنے لڑکے چاہتے ہیں۔ راجو پر دنیا ختم نہیں ہوگئی۔ تُو میری بہن ہے، دوست ہے۔''

''نہیں بندیا میں نے کل کی رات کو قسمت سمجھ لیا تھا مگر آج میری دنیا برباد ہوگئی۔ میں اجڑ گئی۔ مجھے اب زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں رہا۔''

''اے سنگمڑی تُو سمجھا اسے۔ (سنگم تو سمجھا اسے)'' بندیا نے سنگم سے کہا مگر تب تک شان وہاں سے اُٹھ آئی اور بھاگنے لگی۔ وہ دونوں بھی اس کے پیچھے تھیں مگر تب تک اُن کے درمیان خاصا فاصلہ بڑھ چکا تھا۔ شان نے خود کو کافی حد تک نارمل کیا اور ایک اسٹور سے دو بوتل تیزاب کی لے آئی۔

سیلز مین اس کے چہرے کی طرف دیکھتا تھا مگر لڑکی بہت جلدی میں تھی۔ اگر وہ خود کو پوزیسو ظاہر نہ کرتی تو سیلز مین اسے کبھی تیزاب نہیں دیتا۔ وہ نیچے اتر آئی۔ وہ دونوں بھی اب قریب پہنچ چکی تھیں۔ مگر تب تک شان ڈھکن کھول کر منہ کو لگا چکی تھی۔ بندیا نے اس کے منہ سے بوتل چھیننا چاہی مگر تب تک وہ غٹا غٹ پی چکی تھی۔ دوسری بوتل سنگم نے چھین لی۔ شان کے منہ سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا کھولتا ہوا تیزاب پی کر بھلا کوئی کب سلامت رہ سکتا ہے؟

راجو بھی چلتا ہوا اُن کے قریب پہنچ چکا تھا اور آگے کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کے سامنے ہی شان نیچے گری ہوئی تھی اس نے دوڑ کر اُسے بازوؤں میں اٹھا لیا۔ اور اسے کس طرح ہاسپٹل لے گیا وہ نہیں جانتا تھا۔ اسے بس اتنا پتا چلا جب نرس اسے ایک پرچی دے گئی۔

''یہ مر چکی ہے۔''

ایڈمنسٹریٹر نگہت۔

میڈیکل کمپلیکس جھنگ۔

راجو دھاڑیں مار کر روتا رہا۔

☆......☆......☆

جب اس کی میت لاہور لے جائی گئی تو وہاں کہرام برپا ہو گیا ہر کوئی اس کی اچانک موت پر ماتم کناں تھا۔ ہر طرف آہیں تھیں، سسکیاں تھیں، ہچکیاں تھیں ایک بات آپ کو یہاں بتا دوں کہ اس وقت گلوکارہ بشماں بھی زندہ تھی۔ اس کو میں نے اپنی آنکھوں سے اس سوگوار ماحول میں بیٹھے دیکھا تھا۔ موت برحق یقین ہے اور

مرنے پر بھی مگر جاتے بوجھتے تو ہم میں سے کوئی بھی مرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ ایسا صدمہ، دکھ، اذیت، بے عزتی اور ذلت شان کے وجود اور روح نے سہی تھی۔ اس کے بعد کوئی کب تک جی سکتا ہے۔ پھر زندگی روٹھ گئی۔ قبرستان میں ایک اور معصوم چہرے نے خود پر مٹی اوڑھ لی۔ اس کی پاکیزگی اور معصومیت کا سارا قبیلہ گواہ تھا۔ اس کی قبر پر پڑی ہوئی گلاب کی پتیوں سے بھی موت کی مہک آتی تھی۔ اَن چاہی ذلتوں کے داغ ایسے ہی جان لیوا بن جاتے ہیں۔

☆......☆......☆

"سر آپ کون سی شیونگ کریم استعمال کرتے ہیں۔ ہماری کمپنی نے یہ کریم بنائی ہے۔ جدید ریسرچ کے بعد۔ ٹچ می شیونگ کریم۔ اس سے جلد کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، کریم جاندار ہو تو شیو بھی شاندار ہوتی ہے۔ یہ شیو جلد کو نرم ملائم اور چمکدار بناتی ہے۔ پلیز آپ یہ ضرور استعمال کرنا۔ یہ اس بڑے پیک کے ساتھ ایک اور چھوٹا پیک آپ کو مفت ملے گا۔"

"نرم ملائم تو آپ بھی بہت ہیں جی۔" میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ لڑکی نے اچانک سر اٹھایا اور کہا۔

"سر آپ نے کیا کہا۔"

"جی وہ میں نے کہا آپ مجھے پانچ پیک دے دیں ٹچ می شیونگ کریم کے۔ پھر آپ کہاں ملیں گی۔"

"نہیں جی ہماری پروڈکٹس ہر اسٹور پر دستیاب ہیں۔ ہم صرف اس کی تشہیر کر رہے ہیں۔"

"پھر بھی آپ مجھے دے دیں۔" میں نے کہا۔

"اور سر آپ کے گھر والے سرف کون سا استعمال کرتے ہیں۔"

"فی الحال تو جی آپ کو استعمال کرنا ہے۔"

"جی سر کیا کہا آپ نے؟"

"کچھ نہیں جی۔ وہ میں نے پوچھا آپ کون سا سرف لے کر آئی ہیں۔"

"یہ ایریل سرف ہے سر یہ داغ دھبوں کو جڑ سے صاف کرتا ہے۔ عام پاؤڈر کی نسبت یہ کپڑے کو جلدی صاف ستھرا کرتا ہے۔ آپ بس یہ ایک بار یوز کر کے دیکھیں۔ اول تو داغ ہوں گے نہیں اور اگر ہوں گے تو بچیں گے نہیں۔"

میری نظریں اس لڑکی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ صاف ستھرا بے داغ چہرہ، خوبصورت لمبی پلکیں، گہری براؤن آنکھیں اونچا لمبا قد بھرا بھرا جسم بلیک شلوار دوپٹے اور سرخ قمیض سر پر قمیض سے میچ ہم رنگ کیپ لی ہوئی تھی۔ لمبی بالوں کی چٹیا کیپ سے نیچے لٹکی ہوئی اس کی خوبصورتی میں اور بھی اضافہ کر رہی تھی۔ وہ اپنی ٹیم یونیفارم میں تھی۔

☆......☆......☆

اس وقت دوپہر کے دو ڈھائی بج رہے تھے۔ جون جولائی کی چلچلاتی دھوپ کوئی ذی روح گلی میں نہ تھا حتیٰ کہ چرند پرند بھی درختوں کی پناہ لیے ہوئے تھے۔ میں اپنے بیڈ روم میں اے سی کی کولنگ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میری آنکھ لگنا ہی چاہتی تھی جب نیچے سے ڈور بیل کی آواز سنائی دی۔ ایک کے بعد دوسری، پھر تیسری، مسلسل ہوتی بیل نے مجھے سخت کوفت میں مبتلا کر دیا۔ میں غصے سے تلملاتا ہوا دروازے پر آیا تو دروازہ کھولتے ہی میری ساری کوفت دور ہو گئی اور کوفت کی جگہ کھلکھلاہٹ نے لے لی۔ جب یہ حسین، مہ جبیں میرے گھر میں داخل ہوئی تو ہر طرف بہار چھا گئی۔ اور آتے ہی ایسے بے تکان بولنا شروع ہوئی کہ میں حیران رہ گیا۔ اس قدر سخت گرمی میں اس کے چہرے پر پسینے کی اک بوند تک نہ تھی۔ اس نے ایک بار بھی میری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ اور اپنی کمپنی کی پروڈکٹس کی تشہیر کرتی رہی۔

"او کے آپ یہ پانچ پیک سرف بھی مجھے دے دیں۔"

"سر آپ کے گھر میں لیڈیز نہیں ہیں؟"

"ہیں جی وہ سب سو رہے ہیں۔" میں نے سرخ ہونٹوں سے سفید جھوٹ بولا۔

"چلیں پھر آپ اپنا نام لکھوا دیں۔"

"میرا نام سبحان علی ہے۔"

"فون نمبر بھی لکھوا دیں پلیز۔" میں نے لکھوا دیا۔

"سر پلیز ایک احسان اور کیجیے مجھے چار پانچ نام اور بھی لکھوا دیں اپنی فیملی ممبرز کے۔" اس نے پیڈ سنبھالتے ہوئے کہا۔

”چلو پھر، پہلے تم اپنا نام بتادو خوبصورت لڑکی!“ میں نے اسے اور انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے پہلے تو حیرت سے مجھے دیکھا پھر ہونٹوں کو گول کر کے کہا۔

”کومل۔“

”بہت خوبصورت نام ہے آپ کا۔“

”سر مجھے دیر ہو رہی ہے پلیز آپ مجھے باقی نام لکھوادیں۔“

میں نے سوچ کر پانچ نام لکھوا دیے۔ ”کومل جی آپ کو کیا فائدہ ہوگا ان ناموں سے۔“

”وہ سر...... وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ ”جتنے کسٹمرز زیادہ ہوں گے اتنا ہی مجھے کمیشن زیادہ ملے گا۔“

”آپ کی تنخواہ کتنی ہے۔“ میں نے اسے باتوں میں لگانے کی کوشش کی۔

”سر پے تو 12000 ہے۔“

”پھر آپ کو دو نمبری کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“

”سر میرے چھوٹے چھوٹے بہن بھائی ہیں۔ میری ماں بوڑھی اور بیمار ہے۔ باپ شرابی ہے۔ جوا بھی کھیلتا ہے۔ کبھی کبھی تو وہ میری ساری تنخواہ چھین لیتا ہے۔ میں بہن بھائیوں میں سب سے بڑی ہوں۔ میں نے B.A کیا ہے اور ساری ذمہ داریاں مجھ پر ہیں۔ لوگوں کی بہت ترلے منتیں کرنی پڑتی ہیں، تب جا کر وہ کچھ خریدتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے یہ 2 نمبر مصنوعات ہیں۔ کوئی کہتا ہے یہ نقلی ہیں۔ ہمارے ہاتھ بھی خراب ہوں گے۔ کچھ تو ہمیں بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہ تمہیں شرم نہیں آتی یوں گھروں میں داخل ہو جاتی ہو۔“ باتیں کرتے کرتے اُس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

”غربت کے ہاتھوں تنگ آ کر ہمیں باہر نکلنا پڑتا ہے۔ لوگ ایسی بھوکی نظروں سے ہمیں تاڑتے ہیں۔“ اس نے پیڈ اندر رکھتے اور بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے کہا۔

”بھوک تو یہاں بھی ہے جاناں۔“

”جی سر؟“

”میں نے کہا کہ کومل جی کہ آپ کی باقی ٹیم کدھر ہے؟“

”وہ جی ہم اِدھر وکی ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ لنچ کرنے، تو لنچ کے بعد میں بیگ اُٹھا کر باہر آ گئی۔ میں نے سوچا کچھ سیل ہو گئی تو میرا فائدہ ہو جائے گا۔ سب نے مجھے روکا کہ نہ جاؤ دوپہر میں سب لوگ سوجاتے ہیں۔ تو میں نے کہا لوڈشیڈنگ کا زمانہ ہے کہاں سب سورہے ہوں گے؟

آپ کو بتاؤں جی مجھے دروازہ بجانے سے سخت کوفت ہوتی ہے۔ لوگ دروازہ کھولتے ہیں تو برے برے منہ بناتے ہیں۔ باتیں سناتے ہیں مگر یہاں مجبور اور بے کس لوگوں کو کون سمجھتا ہے۔ اچھا میں اب چلتی ہوں، آپ کا بہت شکریہ۔“

”آں ہاں رُکیے رُکیے مس کومل! میری بیگم کی کمپنی ہے انڈر گارمنٹس والی۔ اگر آپ کو پُرکشش جاب چاہیے تو آپ ان سے مل سکتی ہیں۔ ویسے بھی انہوں نے کئی اشتہار دے رکھے ہیں میل اینڈ فیمیلز اسٹاف کے لیے، اگر آپ کو چاہیے تو؟“

”ناں نہیں سر تھینکس میں اسی جاب میں بہت خوش ہوں۔“

مجھے یہ مچھلی جال سے نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ میری ایک گھنٹے کی محنت اکارت جا رہی تھی جو مجھے کسی صورت گوارا نہ تھی۔ تو میں نے جال کو ایک اور جھٹکا دینا چاہا۔

”کومل جی اگر پھر بھی کبھی آپ کو ضرورت محسوس ہو تو، ہو سکتا ہے حالات بدل جائیں، تو ایسا کریں آپ ان سے کارڈ لے لیں، کبھی ضرورت پڑی تو آپ کو فوری جاب مل جائے گی۔“

”چلیں جی آپ اتنا اصرار کر رہے ہیں تو میں ان سے مل لیتی ہوں۔“

”ہاں آیئے!“ آہ میں نے سکھ کا سانس لیا اب یہ مچھلی میرے جال میں پھنس چکی تھی۔ یہ سامنے سیڑھیاں ہیں پہلے نمبر والے روم میں ہیں۔“

”سر اس طرح اچھا نہیں لگتا کہ میں اُن کے روم میں جاؤں۔ آپ خود ان سے بات کر لیں۔“

”چلیں آیئے میرے ساتھ۔“

میں اُس کے ساتھ چلتا ہوا اپنے روم میں گیا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے زور سے بیڈ پر پھینکا اور مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"کمینی لڑکی پچھلے ایک گھنٹے سے میرا ٹائم برباد کررہی تھیں۔ تم بہت گھنے جنگل میں آ چکی ہو اور شیر اپنا شکار کبھی نہیں چھوڑتا۔ جب ہرنی خود اس کے پاس آ گئی ہو تو۔" اس نے انتہائی حیرت سے اوپر اُٹھ کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی رہ گئیں۔ کومل اُٹھ کر اس کے پاؤں میں بیٹھ گئی۔ خدا کے واسطے دیے چیخی، چلائی آہیں فریادیں، کچھ بھی تو کام نہ آیا۔ کومل انکار کرتے ہوئے مزاحمت کرتے ہوئے اپنے آپ کو بچانے میں کامیاب نہ ہوسکی۔

کومل لٹنے اور زندگی کی خوبصورتی سے محرومی کے بعد نیچے فرش پر دونوں گھٹنے سینے سے لگائے سسکیاں بھر رہی تھی۔ اس کے آبرو باختہ کردار کی مہک اُڑ چکی تھی وقت گزرتا جارہا تھا۔ بے کلی میں گھلے آنسو بہتے چلے گئے مگر اسے اردگرد کا اپنا کچھ ہوش نہیں تھا کہ وہ کس حالت میں ہے۔ ہوش تو تب آیا جب ایک اور لڑکا جینز شرٹ میں ملبوس اندر داخل ہوا۔ کومل کی ناگفتہ با حالت کو نظر انداز کر کے اسے تسلی دی۔ اس کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا اور کہا۔

"میں سبحان کا دوست ہوں۔ وہ بہت درندہ نما انسان ہے۔ میں تو اسے سمجھاتا رہتا ہوں۔" یکدم اس نے بھی کومل کو ہلکا سا دھکا دیا اور پھر...... کومل اُسی لٹی ہوئی برہنہ حالت میں پھر سے درندگی کا نشانہ بن رہی تھی۔

وہ اسی کمرے میں ایک بار پھر لٹ چکی تھی۔ انسانی شکل میں ایک دوسرا سوٹڈ بوٹڈ سانپ اُسے ڈس چکا تھا۔ اس کا دل اور روح زخموں سے چور چور اور اس کی زندگی سے معصومیت، خوشی، اعتماد، اعتبار سب کچھ رخصت ہو چکا تھا۔

زخموں سے چور وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنی حالت درست کی نیچے سے اپنا بیگ اٹھایا اور باہر نکل آئی۔

جب وہ یہاں آئی تھی سب کچھ تھا اس کے پاس مگر اب خالی الذہن جارہی تھی۔ آگے حالات کی تاریکیاں اور آنے والے وقت کی منہ زور آندھیوں کا سوچ کر ہی اس کے جذبات واحساسات کو چیر کر باہر آنے والی دبی دبی سسکیاں، گھٹی گھٹی آہیں آنکھوں کے رستے برسنے لگیں۔ اس اذیت کا احساس شاید کوئی نہ کر پائے، ان جان سوز لمحات کی گھلاوٹ جن سینوں میں ہوں وہی اس کرب کی گہرائی کا ادراک کر سکتے ہیں۔

حالات نے اس کے سینے پر ایسا تازیانہ لگایا تھا کہ اپنے اوپر گزرنے والے قیامت خیز لمحات اسے کبھی نہ بھول سکتے تھے۔

کومل کے ہنستے کھلکھلاتے خوشیوں سے دمکتے چہرے پر ایسا اذیت ناک درد لکھا تھا کہ وہ اندر تک ٹوٹ گئی۔ گرتے پڑتے روتے سسکتے وہ آفس پہنچ ہی گئی یعنی اس ہوٹل میں جہاں اُن کی ٹیم ٹھہری تھی۔

ٹیم منیجر اسے دیکھتے ہی غضبناک ہوگیا کہ وہ اتنی دیر لگا کر کیوں آئی۔

"مس کومل آپ جانتی ہیں آپ نے کس قدر غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا ہے اور پھر ہماری کال بھی اٹینڈ نہیں کی آپ نے۔ یہ اجنبی شہر ہے۔ خدانخواستہ اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو ہم کیا جواب دیتے آپ کے گھر والوں کو۔ ہمیں اُمید ہے آپ آئندہ ایسا کچھ نہیں کرنا چاہیں گی، اپنی نوکری کو بچانا ہے تو......"

مگر کومل کے اجڑے ویران چہرے کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔ کومل کی سوئی ایک جگہ پر اٹک چکی تھی کہ ہم آپ کے گھر والوں کو کیا جواب دیتے۔ یہی لفظ بار بار اس کے دل ودماغ میں گونجنے لگا۔

"یا اللہ میں اس درندے کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ جس نے مجھے اس حال تک پہنچایا کہ مجھ میں جینے کی تمنا باقی نہیں رہی اور پھر ایک فیصلے پر پہنچ کر وہ لفٹ میں سوار ہوگئی۔ آخری منزل پر پہنچ کر اس نے نیچے چھلانگ لگا دی۔

نیچے بکھرے ہوئے خون کے ایک ایک قطرے میں کومل کی بربادی کا نوحہ تھا۔ اس کے چہرے پر ایسا درد تھا جسے دیکھ کر جگر پھٹتا تھا۔ اس کی لاش جب اس کے گھر پہنچی تو اس کے چھوٹے چھوٹے معصوم بہن بھائی اس کے بوڑھے والدین پر کیا گزری یہ ایک الگ داستان تھی۔

☆......☆......☆

میں نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لگایا اور دھواں ایک گہرا سانس لے کر اپنے اندر کھینچ لیا۔ مجھے جب بھی کوئی کامیابی ملتی تو میں اس پر نازاں، شاداں وفرحاں ہو جاتا اور اپنی اس خوشی کو میں سگریٹ کے ذریعے سیلیبریٹ کرتا۔ اور کش پر کش لگاتا اور ایسے عالم میں، میں کئی سگریٹ کے پیکٹ خالی کر دیتا۔ جیسے ہی سگریٹ کا زہر دھویں کی شکل میں میرے پھیپھڑوں میں داخل ہوتا مجھے

عجیب فرحت کا احساس ہوتا۔ ہر کسی کا خوشی منانے کا اپنا انداز ہوتا ہے۔ آج بھی جو خوشی مجھے ملی تھی کومل کی شکل میں، میں اسی کا جشن منا رہا تھا۔ میں نے ایک بار لمبا کش لگایا، پہلے دھوئیں کو سانس کے ذریعے اندر کھینچا پھر اسے اس طرح خارج کیا کہ دھواں میرے کمرے کی فضا میں چھت تک تحلیل ہوگیا۔ اس وقت رات کے 12:47 منٹ ہورہے تھے۔ میں نے بار بار یہی عمل دہرایا۔ اب پھر میں نے کش لگایا اتنا لمبا کہ سگریٹ کی چنگاری میری انگلیوں کو چھونے لگی ایک ہلکی سی سسکی میرے منہ سے نکلی اور سگریٹ کا ٹوٹا نیچے گر پڑا۔ میں نے اس زور سے دھواں باہر خارج کیا کہ دھواں چھت تک گول مرغولوں کی شکل میں تحلیل ہوگیا کہ اچانک مجھے دھوئیں میں دو لال سرخ انگارہ آنکھیں دکھائی دیں۔

ایسی غضب ناک آنکھیں میں نے کبھی نہ دیکھی تھیں۔ میں جہاں تھا وہیں اپنی جگہ پر سُن ہوگیا۔ پھر میں نے اپنی آنکھیں ڈر کے مارے گھمائیں تو مجھے دو اور غضبناک قسم کی آنکھیں نظر آئیں۔ سارا کمرہ دھوئیں سے بھرتا جارہا تھا۔ کالا سیاہ دھواں جس سے میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے دائیں نظر دوڑائی تو مجھے وہاں بھی لال انگارہ آنکھیں دکھائی دیں۔ جہاں جہاں میں نظریں گھماتا مجھے وہی دو غضبناک آنکھیں دکھائی دیتیں۔ مجھے دھوئیں میں اور کچھ نظر نہیں آرہا تھا پھر وہ آنکھیں میری طرف بڑھنا شروع ہوئیں۔ میں پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھنا چاہتا تھا مگر کسی غیر مرئی قوت نے مجھے ایک جگہ جکڑ رکھا تھا۔

آنکھیں آہستہ آہستہ میرے قریب آئیں پھر کمرے میں چیخیں گونجنے لگیں اتنی دردناک چیخیں میں پہلے بھی سن چکا تھا۔

ڈر کے مارے میری گھگھی بندھ گئی۔ چیخیں سُن کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ خوف سے میری آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ میں مضبوط اعصاب کا مالک بھرپور جوان، میں آج تک کسی چیز سے نہیں ڈرا مگر آج یہ لال انگارہ آنکھیں...... مارے دہشت کے میں ایک ہی جگہ پر سُن ہوکر بیٹھا رہا اچانک چیخیں آنا بند ہوگئیں۔ صرف میرے دل کی دھڑکن مجھے واضح سنائی دے رہی تھی۔ اب

کمرے میں قبرستان جیسا گہرا سکوت طاری ہوگیا۔ اچانک دھواں آہستہ آہستہ چھٹ گیا۔ وہ آنکھیں بھی نجانے کہاں غائب ہوگئیں۔ میں یکدم اپنی جگہ سے اُچھل پڑا جیسے کسی غیر مرئی قوت نے مجھے اُٹھا کر پھینکا ہو۔ میں نے جلدی سے کمرے کا دروازہ کھولا اور نیچے کی طرف دوڑ لگادی۔ میں پھولی سانسوں کے ساتھ نیچے آیا اور نیچے فرش پر ہی بیٹھ گیا۔ یہاں مجھے کچھ سکون محسوس ہوا۔ میں نے سانسوں کو نارمل کیا آج تک کبھی میرے ساتھ ایسا واقعہ پیش نہ آیا تھا نہ میرے گھر کوئی آسیب تھا نہ کوئی بھوت پریت۔

وہ ساری رات میں نے آنکھوں میں کاٹ دی بار بار وہی منظر میری آنکھوں میں آتا تو دہشت کے مارے میرا وجود تھر تھر کانپنے لگتا۔ پھر یوں ہوا کہ جب بھی میرا دل سگریٹ پینے کو چاہتا وہی منظر میرے ذہن میں آجاتا تو میں نے سگریٹ پینا ہی چھوڑ دی۔ وہ منظر اتنا خوفناک تھا کہ کوئی کمزور دل انسان ہوتا تو وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔

☆......☆......☆

آج بہت دنوں بعد پھر میرا من کررہا تھا کہ کوئی حسین دلربا سی دوشیزہ میرے بازوؤں کی زینت بنے، اسی لیے میں آج خوب تیار شیار ہوکر کسی پارک یا ہوٹل کا رُخ کرنے والا تھا۔ میں گاڑی کی طرف بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے ایک لڑکی کو اپنی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ مجھے خوشگوار قسم کی حیرت ہوئی۔ سفید لباس میں ملبوس وہ کوئی حور معلوم ہوتی تھی۔ میں دوڑ کر گاڑی کے پاس پہنچا۔ آج بن مانگے والی برسات لگ رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ مگر وہ حسینہ رُخ موڑے بیٹھی تھی۔ میں نے اسے مخاطب کیا تو اس کا میری طرف دیکھنا مجھ پر بجلیاں ہی تو گرا گیا۔ وہ شان تھی جو شادی کی تقریب میں مجھے ملی تھی۔

''تم میرے گھر کیسے آگئیں جانِ جاناں۔ راستہ تو نہیں بھول گئیں۔''

اس کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ پلکیں نہیں جھپک رہی تھی۔ مجھے کسی انہونی کا احساس ہوا میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھنا چاہا تو میرا ہاتھ اس کے جسم کے آر پار ہوگیا یہ دیکھ کر میرے اوسان خطا ہوگئے۔ میں نے دروازہ کھول کر گاڑی سے نکلنا چاہا مگر میرے ہاتھ

دروازے پر ہی چسپٹ گئے۔ میں نے دوبارہ گردن گھما کر دیکھا تو وہاں کچھ نہ تھا میرے ہاتھ بھی چھوٹ گئے۔ میں نے تیر کی تیزی سے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھانا چاہی مگر وہ کسی ستون کی مانند گاڑی کے آگے آ کھڑی ہوئی۔

اس کی آنکھیں لال انگاروں جیسی ہو رہی تھیں۔ آنکھوں میں قہر اور غضب دیکھ کر میں دہشت کے مارے کانپنے لگا۔ میں نے پھرتی سے گاڑی کو دو قدم پیچھا کیا۔ میں نے جیسے ہی پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا تو میری آنکھیں خوف سے پھٹ گئیں۔ پیچھے سفید لباس پہنے وہی پریوں جیسا سراپا، چہرے پر وہی معصومیت وہ کومل تھی اور مجھے پتا چل گیا کہ یہ بھی روح ہے۔

مجھے اپنی موت واضح سامنے دکھائی دینے لگی۔ میری نظروں میں وہی دو منظر گھومنے لگے۔ وہ آہیں، چیخیں، فریادیں، خدا کے واسطے، میرا حلق خشک ہو گیا۔ میرے وجود پر کپکپی طاری ہو گئی۔ خوف سے میرا دل لرزنے لگا۔ میں بھاگ کر گاڑی سے باہر نکل آیا اور گھر کے کھلے گیٹ سے باہر نکلنا چاہا تو میرے دیکھتے ہی گیٹ بند ہو گیا۔ ایک طرف شان، دوسری طرف کومل ...... میرے ہر طرف موت ناچنے لگی۔ میں دوڑ کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور اندر سے کنڈی چڑھا دی مگر میری چیخیں نکل گئیں جب شان اور کومل دونوں کو اندر موجود پایا۔ میں حواس باختہ ہو کر کبھی ادھر دیکھتا کبھی اُدھر، میرا حوصلہ بلی سے بھی کمتر ہونے لگا بلی تو پھر بھی کسی نہ کسی کا دودھ پی جانے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ مگر میں تو اس بھیڑ کی طرح سہم گیا کہ جسے بھیڑیا اچک کر لے جائے تو وہ مارے خوف کے آواز تک نہیں نکالتی۔

کمرے میں مکمل اندھیرا تھا حالانکہ اس وقت دن کا ایک بج رہا تھا۔

"اے مردود انسان میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا جو تم نے مجھے اس حال میں پہنچایا۔ میری ہنستی بستی زندگی میں آگ بھر دی۔ تجھ کو اب ہم سے کوئی نہیں بچا سکتا۔" یہ شان بھی سیاہ اندھیرے میں وہ ہیولے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ میرے بدن پر کپکپی طاری ہو گئی۔ یہ ہیولہ میری طرف آہستہ سے بڑھنے لگا۔ یہ شان تھی۔

"نہیں، نہیں یہ انسان نہیں ہو سکتا۔ یہ تو اس درندے سے بھی بدتر ہے جو جنگل میں رہتا ہے مگر کسی کو کچھ نقصان نہیں پہنچاتا۔" کومل دہشت ناک نظروں سے میری طرف بڑھنے لگی۔ اس کے ناخن چڑیل کی طرح لمبے تھے۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے وہ میرے قریب آ گئی اور اپنے ناخن میری شہ رگ پر چبھو دیے۔ خون کا ایک فوارہ پھوٹ پڑا اور خون اُڑ کر کمرے کی دیواروں پر بکھر گیا۔ میں اونچی آواز میں چیخنے لگا مگر میری چیخیں سننے والا کوئی نہ تھا۔ یکدم کمرے میں وحشت ناک خاموشی چھا گئی اور میری نظروں کے سامنے دونوں دھواں بن کر اُڑ گئیں اچانک میرا خون بند ہو گیا۔ میں نے شہ رگ پر ہاتھ رکھا وہاں کسی زخم کا نشان تھا نہ تکلیف کا احساس۔ مگر کمرے کی دیواروں پر ہر طرف خون کے چھینٹے تھے۔ اچانک کمرے میں خوفناک چیخیں گونجنے لگیں۔ وہی چیخیں جو کومل اور شان کو لوٹتے ہوئے میں نے سنی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ چیخیں آسمان اور زمین کا سینہ شق کر رہی ہوں۔ چیخیں سنتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ان پُراسرار چیخوں سے میرا دل دہل گیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ خوف اور کرب میں ڈوبی چیخیں میرے کانوں کے پردے پھاڑتی تھیں۔ اک انجانے خوف سے میرا دل اپنی مٹھی میں بھینچا جا رہا تھا۔ پُراسرار خوف کا حصار میرے گرد مضبوط ہوتا گیا۔

اچانک شان اور کومل سفید لباس پہنے پھر میرے سامنے آ گئیں۔ خوف سے میرا دل تھر تھر کانپنے لگا میرا جسم پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ مجھ پر وحشت طاری ہونے لگی میں نے اُن کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے اور پھر میں بے ہوش ہو کر نیچے گر پڑا۔

☆......☆......☆

اچانک میرے سامنے ایک آٹھ دس فٹ کا اونچا لمبا آدمی جس نے سفید پوشاک پہن رکھی تھی اس کے دانت لمبے لمبے تھے ہاتھوں کے ناخن بڑھے ہوئے، رنگ ایسا سیاہ جیسے کالا کپڑا ہوتا ہے۔ وہ آہستگی سے میری طرف بڑھنے لگا۔ اس کا منہ دیکھ کر میں چیخ چنگھاڑ کرنے لگا۔ میرے خوف سے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ وہ آہستگی سے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اب وہ میرے پاس پہنچ گیا اور اپنے دونوں ہاتھوں کے ناخن سے میرے پاؤں چھیل

دیے۔ مجھے ایسا درد محسوس ہوا کہ اتنی تکلیف مجھے کبھی نہ ہوئی ہوگی۔ وہ درد تیزی سے چلتا ہوا میری ٹانگوں سے گزرتا ہوا میرے سینے پر آ کر رُک گیا۔ میں بے چینی سے تڑپنے لگا۔ یوں لگا جیسے کسی نے کوئی ریشمی کپڑا خاردار کانٹوں والی جھاڑی پر ڈال کر کھینچا ہو تو جس طرح کپڑا تار تار ہو جاتا ہے اور وہ درد سرکتا ہوا میرے سر سے گزر گیا۔ اور پھر میں مر گیا۔

میرے منہ سے دلدوز چیخیں نکلیں میں نے اٹھنا چاہا مگر میں تو ہل بھی نہ پا رہا تھا۔ ایک طرف سے دو لڑکے آئے مجھے اُٹھا کر چارپائی پر ڈالا۔ ایک لڑکے نے میرے پاؤں کے دونوں انگوٹھے باندھ دیے اور میرا منہ سفید کپڑے سے باندھ کر کانوں میں روئی ٹھونس دی تا کہ میرا منہ کھلا نہ رہ جائے۔ ایک لڑکے نے بھاگ کر مسجد میں میری اچانک ناگہانی موت کا اعلان کرا دیا۔

''حضرات ایک ضروری افسوسناک اعلان سنیئے! سبحان علی قضائے الٰہی سے وفات پا گیا ہے۔ اس کا جنازہ بارہ بجے اٹھایا جائے گا۔ جنازے میں شرکت کیجیے۔''

یہ اعلان سن کر میں چیخا کہ میں زندہ ہوں۔ مگر میری آواز کوئی نہ سن سکا۔ میرے گھر میں ٹینٹ لگ گئے محلے کے لوگ میرے گھر میں جمع ہو گئے ایک آدمی کفن کے لیے میرے جسم کا ناپ کرنے لگا۔ ایک مولانا صاحب بھی آ گئے اور کہا غسل کا ٹائم ہو گیا ہے۔ چار آدمی آئے اور میری چارپائی اٹھا کر سائیڈ پر رکھ دی اور وہاں پردہ لگا دیا تا کہ غسل کروایا جا سکے۔ میں نے جو ساری عمر عیاشی کی۔ شریف اور نیک لڑکیوں کی عزتیں تار تار کیں آج میرے غسل کے لیے پردہ ٹانک دیا گیا۔ مولوی صاحب نے سب سے پہلے میری سونے کی چین اتار دی جو میں نے دوران ڈکیتی جیولر کی شاپ سے چوری کی تھی۔ پھر میرے ہاتھ سے انگوٹھی اور گھڑی بھی اتار لی۔ پھر میری جیب سے میرا آئی ڈی اور سارے پیسے نکال دیے پھر اس نے میری شرٹ قینچی سے کاٹ دی اور پھر پینٹ بھی کاٹ کر اتار دی میں چیختا رہ گیا کہ مجھے ننگا نہ کرو مگر اس نے میرا انڈرویئر بھی اتار دیا میں بالکل ننگا ہو گیا۔ پھر ٹھنڈے ٹھار پانی کا جگ اُٹھا کر میرے جسم پر گرا دیا۔ مگر مجھے یوں لگا جیسے اُبلتا ہوا کھولتا ہوا گرم پانی ہو۔ پھر اس نے مجھے غسل کروا دیا مگر میری چیخیں انسان کے علاوہ ہر ذی روح نے سنی۔ پھر میری نماز جنازہ ہوئی۔

جنازہ اٹھانے کے لیے چار آدمی آگے بڑھے میرے دماغ میں خوفناک آندھی کے جھکڑ تھے۔ میں یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا اور اٹھنا چاہتا تھا مگر میں ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ میری گاڑی ایک طرف کھڑی تھی جسے میں اب کبھی نہ چلا سکتا تھا۔ میرا جنازہ پڑھ کر مجھے قبرستان لے جایا گیا۔ دو فرشتے مجھ سے مسلسل سوال گو تھے مگر میرے پاس ان کی کسی بات کا جواب نہ تھا۔ پھر میری چارپائی قبر کے کنارے رکھ دی گئی۔ دو لڑکے قبر میں اُتر گئے اور مجھے قبر میں اُتار دیا۔ پھر ایک آدمی بولا جلدی سے قبر پر سلیبیں رکھ دو۔ پھر میری قبر میں اس قدر اندھیرا چھا گیا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ اس قدر گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ہر طرف سانپ اور بچھو میرے جسم کو چمٹ گئے۔ ایک بچھو بار بار میرے جسم کو ڈستا اور پھر ایک کالے ناگ نے میری زبان پر ڈنگ مارا اس کا ڈنگ اتنا زہریلا تھا کہ میرے جسم سے دھواں اٹھنے لگا۔ پھر میری قبر میں آگ بھڑک اٹھی۔ میری قبر پھٹ گئی اور میں قبر سے اڑ کر باہر زمین پر آ گرا۔

ہر طرف قبر کی مٹی اڑ رہی تھی کسی نے زور سے پھر مجھے قبر میں پھینک دیا اور میری آنکھ کھل گئی۔ میں پسینے میں شرابور بھیگا ہوا تھا۔ میرا جسم کانپ رہا تھا۔ اتنا برا خواب تھا شدت پیاس سے میرے ہونٹ خشک تھے۔ حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ میرے سامنے پھر شان اور کومل آ گئیں اور دونوں نے میری شہ رگ میں اپنے نوکیلے ناخن چبھو دیے۔

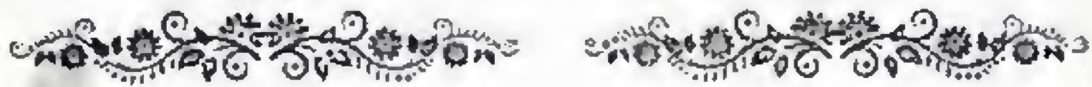
میری چیخیں بلند ہو گئیں اور وہ دونوں قہقہے بلند کرتی ہوئی غائب ہو گئیں۔ تب سے لے کر آج تک پورا سال ہونے کو آیا نہ میں زندوں میں ہوں نہ مردوں میں، میں سوکھ کر کانٹا ہو گیا مجھے کئی طرح کی پُراسرار بیماریاں لگ گئیں۔ جن کا علاج کسی کے پاس نہیں۔ ہر روز مجھے یہی خواب نظر آتا ہے پھر وہ دونوں آتی ہیں اپنے ناخن میری شہ رگ میں چبھو کر غائب ہو جاتی ہیں۔ میں پھر سے بھلا چنگا ہو جاتا ہوں۔ مگر ان کا انتقام پورا نہیں ہو رہا۔ بس میرے لیے دعا کریں کہ خدا جلد از جلد میرا پردہ ڈھک دے۔

☆☆......☆☆

# دیدۂ عبرت



شعبان کھوسہ



کوئٹہ سے، اُس دوشیزہ کی کتھا، جس نے اپنے لیے خود ذلت کے پاتال کا انتخاب کیا تھا

''میرا نام مریم ہے۔ ہم تین بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ میں اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی ہمارے گاؤں کا کا اسکول مڈل تک تھا۔ جب میں نے مڈل امتحان پاس کرلیا تو ابو نے قریبی شہر کے گرلز ہائی اسکول میں میرا داخلہ کروادیا۔

ابو کو ہم بہن بھائیوں کو پڑھانے کا بہت شوق تھا۔ابو خود تو سارا دن وین چلاتے مگر ہمارا بہت خیال رکھتے تھے۔ روز بھائی مجھے موٹر سائیکل پر اسکول چھوڑ کر اپنے اسکول چلا جاتا اور واپسی پر کبھی کبھار اپنے ساتھ لیتے ہوئے گھر آتے۔ جب کسی وجہ سے اسکول کی جلدی چھٹی ہو جاتی تو میں بہت پریشان ہو جاتی تھی۔ اور اسکول کے گیٹ کے سامنے کھڑی بھائی کا انتظار کرتی۔ اسکول کے گیٹ پر آوارہ لڑکے کھڑے ہوتے تھے۔لڑکیوں کو تنگ کرتے اور طرح طرح کی آوازیں کستے، اشارے کرتے۔ یہ روز کا معمول تھا۔خاص کر چھٹی کے وقت یہ آوارہ لڑکے لڑکیوں کو دیکھ کر تنگ کرتے۔ میں نے شام کو آ کر ابو کو بتایا کہ جب جلدی چھٹی ہو جاتی ہے یا بھائی لیٹ آتے ہیں، تو گیٹ پر کھڑے لڑکے لڑکیوں کو تنگ کرتے ہیں۔

ابو نے اس کا حل یہ نکالا کہ مجھے ایک سادہ سا NOKIA کا موبائل دے دیا اور کہا کہ جب بھی اسکول سے جلد چھٹی ہو جائے یا بھائی لیٹ ہو جائے تو مجھے کال کر دیا کرو۔ میں آ کر لے جایا کروں گا۔''

زندگی کی گاڑی رواں دواں تھی۔ میں گھر سے اسکول اور اسکول سے گھر آ جاتی۔ میں دل لگا کر پڑھائی کر رہی تھی۔ مجھے اپنے ابو کے خواب سچ کرنے تھے۔ جو ابو نے ہمارے لیے دیکھے تھے۔اور پھر میں نے میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کرلیا۔اب میں کالج میں آ گئی تھی۔

☆......☆......☆

اتوار کے دن میں اپنی فرینڈ صائمہ سے ملنے اس کے گھر گئی۔ جو میری بہترین دوست تھی۔ جب میں گھر میں داخل ہوئی تو وہ گھر میں کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ صائمہ کی امی صحن میں جھاڑو دے رہی تھیں۔ میں نے صائمہ کا پوچھا۔تو انہوں نے کمرے کی طرف اشارہ کر دیا۔

صائمہ موبائل ہاتھ میں لیے خاموش بیٹھی تھی۔ پریشانی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ مجھ سے صائمہ کا یہ حال دیکھا نہیں گیا۔

''صائمہ کیا ہوا ہے؟ کیوں اس طرح چپ چاپ

اور پریشان بیٹھی ہو۔"
کیا بتاؤں اُمارو!" صائمہ مجھے پیار سے اُمارو بلاتی تھی۔
"کافی دنوں سے ایک لڑکا تنگ کر رہا ہے۔ پلیز مریم کچھ کرو۔ میں تو ابو اور بھائی کو بھی نہیں بتا سکتی۔"
"بس اتنی سی بات پر پریشان ہو۔ لاؤ اپنا موبائل مجھے دو۔" میں نے صائمہ سے اس کا نمبر پوچھ کر اُسے کال ملا دی۔ دوسری طرف سے ہیلو کی آواز آئی۔ میں اس سے مخاطب ہوئی۔
"کیا تمہارے گھر میں ماں، بہن نہیں جو دوسروں کی ماں بہنوں کو تنگ کرتے ہو۔ اگر تمہارے گھر میں بہنیں ہیں اور ذرا بھی شرم ہے تو آئندہ کال یا مسیج نہیں کرو گے۔" میں نے کال پر اُس نمبر پر جو بھی تھا۔ اُسے کھری کھری سنا دیں۔ جیسے ہی میں خاموش ہوئی دوسری طرف سے آواز آئی۔
"تم نے جتنی میری بے عزتی کی ہے تم سے اپنی بے عزتی کا بدلہ ضرور لوں گا۔"
میں کچھ دیر صائمہ کے ساتھ بیٹھ کر واپس اپنے گھر آ گئی۔ اس بات کو ہوئے کئی مہینے گزر گئے۔ میرے ذہن سے اُس دن والی بات نکل گئی۔ نا ہی دوبارہ اُس نے صائمہ کو موبائل پر تنگ کیا۔

☆......☆......☆

کافی دن ہو گئے تھے۔ میں اپنی نانی کے گھر نہیں گئی تھی اور نانی کی طرف سے بلاوے آ رہے تھے۔ میں ای



سے اجازت لے کر بھائی کے ساتھ اپنی نانی اماں کے گھر آ گئی۔

میں شام کے وقت نانی اماں کے کمرے میں ٹی وی دیکھ رہی تھی کہ موبائل کی اسکرین پر انجان نمبر جگ مگا رہا تھا۔ میں نے کال ریسیو کی دوسری طرف مردانہ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

میں نے پوچھا ''کون!'' تو دوسری طرف سے آواز آئی۔

''بندہ ناچیز کو احسان علی کہتے ہیں۔''

''میں کسی احسان کو نہیں جانتی۔''

''نہیں جانتی تو جان جاؤ گی، اس میں کون سی بڑی بات ہے۔''

''میں نے کہا ناں میں آپ کو نہیں جانتی۔ آئے بڑے بن بلائے مہمان کی طرح جان پہچان بڑھانے۔ آئندہ کال مت کرنا ورنہ۔'' اور میں نے لائن کاٹ دی۔

کچھ دن تک میں نانی کے ہاں رہی اور پھر واپس گاؤں آ گئی۔ اس رانگ نمبر والے کی مسلسل کالیں اور میسج آ رہے تھے۔ اس کی ایک ہی ضد تھی کہ مجھ سے دوستی کر لو۔ میں تنگ آ کر کبھی موبائل آن تو کبھی آف کر دیتی۔

☆......☆......☆

میں نے کالج میں اس رانگ نمبر کا اپنی ایک سہیلی سے ذکر کیا۔ تو اس نے مشورہ دیا کہ تم اس سے دوستی کر لو۔ موبائل پر ہی دوستی کا کہہ رہا ہے۔ کون سا تمہیں کھا جائے گا۔''

یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ جو میں نے اُس دوست کی بات مان لی۔ اور میری بربادی کے دن شروع ہو گئے۔

میں رات کو اپنے کمرے میں اسٹڈی کر رہی تھی کہ اس رانگ نمبر کا میسج آیا۔

''پلیز مجھ سے دوستی کر لیں۔''

میں نے REPLY کیا کہ مجھے نہیں کرنی تم جیسے آوارہ لڑکوں سے دوستی۔ مجھے تنگ مت کرو۔''

''کوئی وجہ تو ہو گی دوستی نہ کرنے کی۔ مجھ میں کانٹے لگے ہوئے ہیں۔ جو تم مسلسل انکار کر رہی ہو۔'' اس نے جواب میں لکھا۔

''شاید لگے ہوں کانٹے۔'' اور آہستہ آہستہ میں اُس کی ضد کے آگے مجبور ہوتی چلی گئی اور میں نے اُس سے دوستی کر لی۔ میں کبھی کالج میں تو کبھی گھر میں ٹائم نکال کر اُس سے بات بھی کر لیتی تھی۔

آہستہ آہستہ مجھے احسان سے باتیں کرنا اچھا لگنے لگا۔ اُس کی آواز میں جانے کیا جادو تھا کہ میں اس کی آواز کے سحر میں جکڑتی چلی گئی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس سے پیار کر بیٹھی۔ میں احسان کو دیکھنا چاہتی تھی اور میرے دل کی یہ حسرت دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ میں اللہ میاں سے دعائیں مانگ رہی تھی کہ کسی طرح سے احسان کو دیکھ لوں۔ گاؤں کے قریب ہی حاجن شاہ بابا کا مزار تھا۔ ایک دن گھر والوں نے بابا حاجن شاہ کے مزار پر حاضری دینے اور دعا مانگنے کا پروگرام بنایا۔ میں نے احسان کو کال کر کے بتایا کہ ہم لوگ بابا حاجن شاہ کے مزار پر جا رہے ہیں۔ اگر ہو سکے تو تم بابا سائیں کے مزار پر آ جاؤ۔ میں تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔'' احسان نے رضا مندی ظاہر کر دی کہ میں آ رہا ہوں۔''

میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ میں اپنے محبوب کے آنے پر بہت خوش تھی۔

☆......☆......☆

میں بابا سائیں کے مزار پر دعا مانگ رہی تھی کہ احسان پینٹ شرٹ پہنے سامنے دکھائی دیا۔ سفید رنگت ہلکی سی داڑھی میں وہ بہت خوبصورت اور اسمارٹ نظر آ رہا تھا۔ مجھے تو وہ کسی ریاست کا شہزادہ لگ رہا تھا۔ میری نظر احسان کے چہرے پر پڑی تو میں اُسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ احسان سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ احسان کو دیکھنے کے بعد میرے دل میں اس کا پیار اور بڑھ گیا۔

میں ہر وقت احسان کے خوابوں میں گم رہنے لگی تھی۔ احسان سے میری روز بات ہوتی تھی۔ ہم نے ایک ساتھ جینے مرنے کی قسمیں وعدے کیے۔ احسان نے مجھے بہت سے سپنے دکھائے اور میں اس پر اندھا یقین کرتی چلی گئی۔

ایک رات باتوں باتوں میں احسان نے مجھ سے کہا۔ میں آصف کا دوست ہوں۔ جو آپ کی دوست کو تنگ کر رہا تھا۔ کچھ مہینے پہلے اور آپ نے فون پر اس کی

بے عزتی کی تھی۔ میں نے آصف کے کہنے پر آپ سے دوستی کی تھی۔ تاکہ وہ آپ سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لے سکے۔ اس نے کسی طریقے سے آپ کا نمبر حاصل کیا اور یہ بھی پتا کروایا کہ اُس کی بے عزتی کرنے والی آپ تھیں۔ میں آصف کے کہنے میں تو آ گیا، مگر اب آپ سے سچا پیار ہو گیا ہے۔ میں اب سوچ بھی نہیں سکتا کہ آصف کہ کہنے پر آپ سے کسی قسم کا بدلہ لوں۔'' اور اُس نے مجھ سے معافی بھی مانگی۔

احسان کی یہ باتیں سن کر اس کے لیے میرے دل میں اس کا پیار اور بڑھ گیا۔ میں نے سوچا کہ اگر احسان چاہتا تو آصف کی خاطر مجھ سے بدلہ لے سکتا تھا۔ مگر اُس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔

☆......☆......☆

میری ایک دوست رخسار نے احسان کو اپنا بھائی بنا لیا۔ کیونکہ میں رخسار سے ہر بات شیئر کرتی تھی۔ ایک دن میں نے رخسار سے کہا کہ تم کسی طریقے سے پتا لگاؤ کہ احسان کیسا لڑکا ہے۔

رخسار نے حامی بھر لی اس نے اپنے منگیتر کو ساری بات بتائی کہ تم احسان کے بارے میں معلوم کرواؤ کہ وہ کیسا لڑکا ہے۔''

رخسار نے تھوڑے ہی دنوں میں احسان کے بارے میں پتا کروالیا۔ رخسار کے منگیتر نے کہا کہ احسان ایک اچھا لڑکا ہے۔ مجھے احسان کے معاملے میں مزید تسلی ہوگئی اور یہی میری سب سے بڑی بھول تھی۔

☆......☆......☆

ہمارے کالج میں Game Week شروع ہونے والا تھا۔ میرا احسان سے ملنے کو بہت دل کر رہا تھا۔ اور یہی حال احسان کا بھی تھا۔

میں نے احسان سے کہا کہ میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ ہمارے اسکول میں گیم ڈے شروع ہونے والے ہیں۔ موقعہ بھی اچھا ہے۔ اس بہانے سے آپ سے مل بھی لوں گی۔''

احسان نے آصف کے گھر ملنے کا پروگرام بنایا اور کہا کہ اس بہانے تم آصف کو سوری بھی کر لینا۔ میں نے احسان کے کہنے پر آصف سے سوری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆......☆......☆

گیم ڈے کے دن میں اسکول آئی۔ گیمز سے میری کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے احسان کو میسج کیا کہ آ کر مجھے اسکول سے لے جاؤ۔ تھوڑی ہی دیر میں احسان گاڑی لے کر آ گیا۔ ہم گاڑی میں بیٹھ کر آصف کے گھر آ گئے۔

گھر کی ویرانی بتا رہی تھی کہ گھر میں کوئی نہیں ہے، مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ احسان نے کہا تھوڑی ہی دیر میں آصف آ جائے گا۔ چلو ہم کمرے میں چلتے ہیں۔ میں جب تک اپنی رانی کے لیے اپنے ہاتھوں سے چائے بناتا ہوں۔ احسان اور میں کمرے میں آ گئے۔ احسان کچن سے میرے لیے چائے بنا کر لے آیا۔ میں نے چائے پی کر کپ ایک طرف رکھ دیا۔

اس وقت دن کے دس بج رہے تھے۔ میں صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ احسان سر میری گود میں رکھ کر لیٹ گیا۔ ہم آپس میں پیار بھری باتیں کرنے لگے۔ احسان نے کہا۔

''مریم اگر تم مجھے نہیں ملیں تو میں اپنی جان دے دوں گا۔ اب میں تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔'' اور میں احسان کی ان چکنی چپڑی باتوں کے دلدل میں غرق ہو چلی گئی۔

کب دن کے بارہ بجے پتا ہی نہیں چلا۔ میں نے احسان سے کہا کہ میں بہت لیٹ ہو گئی ہوں۔ لڑکیوں کی بھی اسکول سے چھٹی ہو گئی ہوگی۔

''مریم تھوڑا سا صبر کرو میں آصف کو بُلا لوں۔ تم اُس سے سوری کر لینا تاکہ سب کی غلط فہمیاں ساری دور ہو جائیں۔''

تھوڑی ہی دیر میں آصف آ گیا۔

میں کافی ڈری ہوئی تھی کہ وہ غصے میں جانے کیا سلوک کرے۔ میں نے ڈر ڈر کے آصف کو سوری کہا۔ اور اُس نے مجھے معاف کر دیا۔ احسان اسکول کے گیٹ پر مجھے چھوڑ کر واپس چلا گیا۔

اسکول سے چھٹی ہو چکی تھی۔ میں نے بھائی کو کال کی اور وہ پہنچ گئے اور میں گھر آ گئی۔

ہماری محبت پروان چڑھ رہی تھی۔ واپسی کے سب دروازے بند ہو چکے تھے۔ ہماری محبت کو دو سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ میں احسان کے پیار میں بہت آگے نکل چکی تھی۔ جہاں سے واپسی ناممکن تھی۔

☆......☆......☆

شاید ہماری محبت جو کسی کی نظر لگ گئی۔ میں کافی دنوں سے محسوس کر رہی تھی کہ احسان کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔ میں کال کرتی تو وہ ریسیو نہیں کرتا اگر کر بھی لیتا تو ایسے بات کرتا جیسے مجھ سے جان چھڑانا چاہ رہا ہو۔ میں اس کے اس بدلے ہوئے رویے کی وجہ پوچھتی تو وہ لڑ پڑتا۔

میرا پاگل دل کسی بات کو ماننے کو تیار ہو نہیں رہا تھا کہ احسان یوں اچانک بدل سکتا ہے۔ جو مجھ پر اپنی جان نثار کرنے کی باتیں کرتا تھا۔ وہ یوں میرے ساتھ کیسے بے وفائی کر سکتا ہے۔ مگر یہ سب میری بھول تھی اور میں اُس پر مرتی جا رہی تھی۔

ایک شام احسان کی یاد شدت سے آ رہی تھی۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے احسان کے نمبر پر کال کی تو احسان کا نمبر بند جا رہا تھا۔ میں کافی پریشان ہوئی مسلسل دو دن تک اُس کا نمبر بند رہا۔ تیسرے دن احسان کا میسج آیا کہ میں کوئٹہ جا رہا ہوں۔ کبھی واپس نہیں آؤں گا۔

''میں پریشان ہو گئی کہ احسان ایسی باتیں کیوں کر رہا ہے۔

میں نے احسان کو میسج کیا کہ تم بے شک چلے جاؤ مگر مجھے میرا قصور بتا دو۔ مجھے تم کس بات کی سزا دے رہے ہیں آخر میرا قصور کیا ہے۔''

''مریم ابو اور بڑے بھائی کو ہمارے بارے میں سب پتا چل گیا ہے اور وہ مجھ سے سخت ناراض ہیں۔ میں ان کی ناراضگی مول نہیں لے سکتا۔ اس لیے میرا نمبر بھی بند تھا۔'' حالانکہ وہ اپنے سارے گھر والوں سے اکثر میری بات کرواتا تھا۔ سوائے ابو اور بڑے بھائی کے۔

میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ میں نے احسان کی ہر بات کو سچ مانا۔ مگر میں نادان تھی جو احسان کے اس رویے کو سمجھ نہ سکی۔ یہ بات اسی بدلے کا حصہ تھی۔ جو مجھے بار بار پریشان کیے جا رہا تھا۔ میں اس کی منتیں کیے جا رہی تھی کہ اپنا رویہ تبدیل کر لو۔ کبھی باتوں کے درمیان وہ مجھ سے لڑتا تو کبھی اپنا نمبر بند کر دیتے۔ اور کئی کئی دن بات کیے بغیر گزر جاتے۔

☆......☆......☆

اور پھر وہ ایک دن مجھے بتائے بغیر کوئٹہ چلا گیا۔ جب مجھے اس کے جانے کا علم ہوا تو میں بہت روئی۔ کبھی سجدے، کبھی آنسو، ہزاروں کوششیں لیکن جو قسمت میں نہیں لکھا وہ رونے سے نہیں ملتا احسان نے کوئٹہ جا کر اپنی کزن سے منگنی کر لی۔ احسان کی بے وفائی پر میں دنوں روتی رہی۔ اُسے کال کرتی تو اس کا نمبر کبھی بزی یا پھر بند۔ احسان کی بے وفائی نے مجھے اندر سے توڑ دیا تھا۔ مجھے احسان سے یہ اُمید نہیں تھی کہ وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر جا سکتا ہے۔ وہ جو کہتا تھا مریم تمہارے بغیر میں مر جاؤں گا۔ اگر اس نے مجھے چھوڑنا ہی تھا تو پھر اتنے سپنے کیوں میری آنکھوں کا مقدر کر دیے۔

☆......☆......☆

میں گھر کے کاموں میں مصروف تھی کہ آصف کا میسج آیا۔

''اگر تم احسان کو واپس پانا چاہتی ہو تو ایک طریقہ ہے۔ تم مجھ سے دوستی کر لو۔ اُسے جلاؤ، اُسے احساس دلاؤ کہ اگر تم بے وفائی کر سکتے ہو تو میں بھی بے وفائی کر سکتی ہوں۔ اگر تمہیں میری پروا نہیں تو مجھے بھی نہیں۔''

کہتے ہیں عشق میں ہر عاشق مجبور ہوتا ہے اور میں احسان کو پانے کی خاطر آصف کی باتوں میں آ گئی۔

یہ احسان اور آصف کا سوچا سمجھا پلان تھا مگر میں نہ سمجھ سکی۔ ایک دن آصف نے مجھ سے کہا کہ احسان پر کچھ اثر نہیں ہو رہا حالانکہ میں نے اپنی اور تمہاری دوستی کا بھی بتایا۔''

میرے فرسٹ ایئر کے پیپرز چل رہے تھے۔ احسان کی کال آئی اور مجھے بتایا کہ میں گاؤں واپس آ گیا ہوں۔''

''اب کیا لینے آئے ہو؟''

''مریم میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں مجھ سے ملو۔ میں تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔'' اور اس کے ساتھ ہی احسان نے رونا شروع کر دیا۔ میرا دل نرم پڑ گیا اور پھر اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے میں نے ملنے کی حامی بھر لی۔

دوسرے دن پیپر دے کر آصف کے گھر پہنچی۔ میری نظریں احسان کو ڈھونڈ رہی تھیں، مگر وہ مجھے کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف آصف ہی تھا۔ میں نے آصف سے احسان کا پوچھا تو وہ بدتمیزی پر اتر آیا۔

''وہ بھی آ جائے گا۔ میری جان! اتنی جلدی بھی کیا ہے۔'' میں آصف کے خطرناک ارادے بھانپ گئی۔ میں واپس میں دروازے کی طرف لپکی۔ آصف نے مجھے پکڑ کر واپس کھینچ لیا اور دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے غراتے ہوئے کہا۔

''اپنی نظریں نیچی رکھو۔ تم اس وقت میرے رحم و کرم پر ہو۔ تمہیں یاد ہے نا اس دن کال پر بڑی بڑی باتیں کر رہی تھیں تم اور میں نے تم سے کہا تھا نا میں اپنی بے عزتی کا بدلہ ضرور تم سے لوں گا۔''

میں بھرپور مزاحمت کر رہی تھی اور آصف پر چیخ بھی رہی تھی کہ اتنی چھوٹی سی بات پر مجھے اتنی بڑی سزا نہ دو۔ میں تم سے معافی بھی مانگ چکی ہوں ایک بار پھر مانگتی ہوں پلیز مجھ پر رحم کرو۔''

''زیادہ چیخو مت۔ تمہیں اس وقت گھسیٹتے ہوئے تمہارے گھر بھی لے جا سکتا ہوں۔ تیرے باپ کے حوالے بھی کر سکتا ہوں، کہ دیکھو اپنی لاڈلی کے کرتوت اور میں پورے گاؤں میں بھی بدنام کر سکتا ہوں۔ تم اور تمہارے گھر والے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔

شرافت اسی میں ہے کہ خود کو میرے حوالے کر دو۔ ورنہ تیرا وہ حال کر دوں گا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتی۔''

کاش اُس وقت زمین پھٹتی اور میں اس کے اندر سما جاتی۔

اس کے بعد احسان ہنستا ہوا کمرے میں آیا۔ میں نے غصے میں آ کر احسان کو تھپڑ مار دیا۔ احسان نے دھکا دے کر مجھے چارپائی پر گرا دیا۔ میرے کپڑے تار تار کر دیے۔ دو بھوکے بھیڑیے میری بوٹیاں نوچنے لگے۔ میرے جسم سے کھیل کر اپنے بے رحم نفس کی پیاس بجھا رہے تھے۔ ظالموں نے میرے پاک جسم کو ناپاک کر دیا اور پورے جسم پر درندگی کے نشان لیے میں زخموں سے چور وجود کے ساتھ آصف کے گھر سے نکلی تھی۔ آخر ایک لڑکی کی جائے پناہ ہر حال میں اُس کے باپ کا گھر ہی ہے۔ بابل کا آنگن ہر گندگی کو اپنی چھپر چھایا میں سمو لیتا ہے۔ عزت کا موتی گنوا کر واپس گھر آتے ہوئے دل میں بار بار یہی خیال آ رہا تھا کہ خود کو ختم کر دوں یا پھر کسی کوٹھے پر چلی جاؤں۔ کس منہ سے گھر جاؤں۔

اب میرے پاس رہ بھی کیا گیا تھا جو میں گھر جاؤں۔ میں نے ایک اجنبی پر بھروسہ کر کے خود کو برباد کر لیا تھا۔

گرمی کے دن تھے۔ میری حالت بہت بری تھی۔

امی کمرے میں سو رہی تھیں۔ بھائی بہنیں جاگ رہے تھے۔ میں سیدھا اوپر والے کمرے میں چلی گئی۔ اپنی حالت درست کر کے خود کو کمرے میں بند کر لیا۔

خود کو ختم کرنے کے ارادے سے میں نے چھری ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی کہ اچانک امی نے آواز دی اور چھری کو چھپا کر میں نیچے آ گئی۔

امی نے پیپر کا پوچھا تو میں رو پڑی۔ امی ایک دم پریشان ہو گئی۔ امی نے رونے کی وجہ پوچھی کچھ تو میں نے صاف جھوٹ بول دیا کہ راستے میں میرے پیچھے آدمی لگ گئے تھے۔ اور میں ڈر گئی۔ امی نے دلاسا دیا۔ اور کہا آئندہ اپنے بھائی کے ساتھ آیا کرو۔

امی کو آرام کا کہہ کر میں واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ چارپائی پر لیٹ کر اپنی بدنصیبی پر آنسو بہاتی رہی۔ کافی دنوں تک میں بستر مرگ پر پڑی رہی۔ صحت دن بدن گرتی چلی گئی۔ اس حادثے نے مجھ پر بہت گہرے زخم چھوڑے ہیں جو زندگی بھر نہ بھر سکیں گے۔

میری منگنی اپنے کزن کے ساتھ طے پا گئی تھی۔ ایک اجنبی کی باتوں میں آ کر وہ منگنی بھی توڑ دی گئی تھی۔ میرا کزن مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتا تھا۔

اب بھی بار بار وہ اصرار کرتا ہے کہ مریم میرے دل کے دروازے اب بھی تمہارے لیے کھلے ہیں۔ پلیز لوٹ آؤ۔''

اب کس طرح لوٹ جاؤں میرے پاس اپنے کزن کو دینے کے لیے کچھ بھی تو نہیں ہے۔ شاید اب میں اس کے ساتھ انصاف نہ کر سکوں۔

اب میں نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ پانچ وقت کی نماز پڑھتی ہوں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتی ہوں کہ اللہ میاں میری طرح کوئی اور بہن، بیٹی، بہو کے سیاہ نصیب نہ ہوں۔

☆☆......☆☆

# عامر، عامر اور علی



بشریٰ سعید احمد



لاہور سے، کشمیر کے ایک ایسے مجاہد کی داستان، جس نے ہندو گود میں پرورش پائی مگر......

سید علی حیدر کی لاش سری نگر کیا پہنچی کہ پورا مقبوضہ کشمیر خون میں نہا گیا۔ ایک ایک گھر سے چیخوں کی آواز، ایک ایک آنکھ سے آنسو، ہر ہر ہاتھ نے چھاتی پیٹ پیٹ کر ہندوؤں کے مظالم کی گواہی دی۔ سری نگر میں طلوع ہونے والا سورج بھی شہید کے جسم پر موجود زخموں کو دیکھ کر لرز گیا۔ خون میں ڈوبے ہوئے لاشے کے زخموں کا کوئی حساب نہ تھا۔ ظالموں نے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ چھوڑا تھا۔ جہاں اپنی بربریت کا مظاہرہ نہ کیا ہو۔

جوان بیٹے کی لاش کو گود میں لیے مائی ہاجرہ بس خاموش بیٹھی آسمان کی طرف تک رہی تھی۔ آنکھوں سے بہنے والا ایک ایک آنسو یہ سوال کر رہا تھا۔ آخر کب تک! کب تک یہ ظلم کا بازار گرم رہے گا؟ کب تک مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جائے گی؟ کب تک ماؤں کی گود میں اُن کے بیٹوں کی لاشیں ڈالی جائیں گی؟ کب تک بچے ماؤں کی کوکھ میں یتیم ہوتے رہیں گے؟ کب تک یہ سب کچھ ہوتا رہے گا؟

بڑے بڑے ملکوں کے اونچے اونچے ایوانوں میں کشمیر کے نام پر نام نہاد کانفرنسیں تو ہوتی ہیں، مگر کشمیر کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ ''کشمیر ڈے'' کے نام پر ملک بھر میں سرکاری چھٹی تو ہوتی ہے مگر کشمیر کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ وہاں ہر روز نو جوانوں کے خون سے دھرتی کو رنگا جاتا ہے، ہر روز ہزاروں بچے یتیم ہوتے ہیں۔ اپنے آپ کو سب سے بڑی جمہوریت کہلانے والا خود ہی جمہوریت کی دھجیاں بکھیر رہا ہے۔ اس جمہوریت کے کالے کرتوتوں کا پردہ دنیا کے سامنے چاک ہو چکا ہے۔ بنتے مرد وزن اور بچوں پر ہونے والے بھارتی مظالم نے کشمیر کو آزادی کی نئی جہت اور ایک نیا جذبہ بخشا ہے۔ ان حقائق سے واضح ہو رہا ہے کہ بہت جلد کشمیر کے باسی ہندو بنیے سے آزادی حاصل کر لیں گے۔ ایک ایک کشمیری مرد وزن اور بچوں نے اسی آس وامید پر اپنی جان وعصمت و عزت کی قربانی دی ہے۔

زینب بیٹھی بس بے بسی سے اپنے شوہر کے بے جان وجود کو تک رہی تھی جو ایک ماہ پہلے زندگی سے بھرپور تھا۔ اُسے فخر تھا کہ وہ ایک مجاہد کی بیوی اور ایک شہید کی بیوہ ہے۔ اپنی گود میں سوتے ہوئے چھ ماہ کے عامر علی کو دیکھ کر فخر سے اُس کا سینہ پھول گیا کہ وہ آنے والے دنوں میں ایک مجاہد کی ماں بھی ہوگی۔ اُس نے ابھی سے سوچ لیا تھا کہ عامر علی اپنے باپ کے ادھورے مشن کو پورا کرے گا۔ ہر کشمیری ماں کی طرح اُس نے بھی لوری کی جگہ اپنے بیٹے کو شہیدوں کی داستانیں سنائی تھیں۔

سید علی حیدر مجاہدوں کا دایاں بازو تھا۔ کئی برس سے وہ بزدل ہندو فوجیوں کے لیے ایک عذاب بنا ہوا تھا۔ اُس نے کئی بھارتی فوجی چھاؤنیاں اپنی حکمت عملی سے تباہ کردی تھیں۔ مگر بدقسمتی سے ایک حملے کے دوران وہ ہندو فوجیوں کے ہاتھ لگ گیا۔ پچھلے ایک ماہ سے وہ ہندوؤں کے عقوبت خانے میں اُن کے مظالم کا نشانہ بن رہا تھا۔ اُس کی گرفتاری اور قید کے خلاف ہزاروں مظاہرے ہوئے، جلوس نکالے گئے۔ بھارتی حکومت فوجیوں کے مظالم کے خلاف ہڑتالیں، مظاہرے اور مذاکرے ہوئے لیکن ان جلوسوں کے جواب میں آج علی حیدر کی لہولہان لاش اُس کے گھر پہنچی۔ سید علی حیدر کے جنازے میں لوگوں کا ایک سیلاب تھا جو نہ جانے کہاں کہاں سے اُمڈ آیا تھا۔

شہید کے دفنانے کے بعد سری نگر میں جلوسوں اور مظاہروں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ کشمیری مرد، عورتیں اور بچے ہندو فوج کے خلاف سڑکوں، گلیوں اور بازاروں میں نکل آئے۔ اِس صورت حال میں بھارتی فوج نے کرفیو نافذ کردیا، جو بھی نظر آتا اُسے گولی مار دیتے۔ زینت بھی ایک جلوس کی قیادت کررہی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر ہندو فوج کے مظالم بیان کررہی تھی۔ اس موقع پر بھی عامر علی اُس کی گود میں تھا۔ اچانک ہندو فوج نے چاروں طرف سے جلوس پر حملہ کردیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ تھی، جو کسی طرح رُکنے کا نام نہ لے رہی تھی، ہر طرف سے گولیاں برس رہی تھیں، اچانک ایک گولی سنسناتی ہوئی زینب کے سینے میں لگی، اُسی لمحے زینب نے عامر علی کو نیچے جھاڑیوں کی طرف دھکیل دیا۔

جنت نظیر کشمیر کی زمین مظاہرین خواتین کے لہو سے سرخ ہورہی تھی۔ ہر سو بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ سرسبز و شاداب سفید...... برف سے ڈھکی وادی نے لہو کی سرخ چادر اوڑھ لی تھی۔ اس زمین میں حیدر کے ساتھ اس کی وفا شعار بیوی زینب کا خون بھی شامل ہوگیا۔

☆......☆......☆

''راکیش پلیز ایک منٹ گاڑی روکیں۔'' رادھا نے اچانک چیخ کر کہا۔



''کیا بات ہے؟'' راکیش کپور نے گاڑی روکتے ہوئے پوچھا۔ رادھا بڑی پھرتی سے گاڑی سے اُتری اور جھاڑیوں میں کچھ تلاش کرنے لگی، اتنے میں اسے کسی بچے کے رونے کی آواز آئی۔ جواب کی بار راکیش نے بھی سنی۔

''رادھا یہاں کوئی بچہ ہے۔ جو رو رہا ہے۔'' راکیش جھاڑیوں کو ادھر اُدھر ہٹاتے ہوئے بولا۔

''اے بھگوان یہ تیری کیسی لیلا ہے۔ ایک ماں بچے کے لیے تڑپتی ہے اور کہیں ایک بچہ ماں کے لیے۔'' رادھا نے لپک کر بچے کو اُٹھا کر سینے سے لگالیا۔ برسوں کی پیاسی ممتا کو قرار آ گیا۔ بچے کو کچھ خراشیں آئی تھیں، جن

کی وجہ سے وہ تڑپ تڑپ کے رو رہا تھا۔ رادھا اور راکیش اُسے فوراً ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر نے زخموں پر دوا لگا دی، درد کم ہوا تو بچہ سکون سے سوگیا۔

''بھگوان کی کرپا ہے اُس نے بچے کی جان سلامت رکھی، ورنہ جھاڑیوں میں گر کر اس ننھی سی جان کا کیا بچتا۔'' رادھا نے بچے کا منہ چوم کر کہا۔

''رادھا ہمیں بچے کے بارے میں پولیس کو اطلاع دینی چاہیے۔'' راکیش نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''نہیں راکیش ہرگز نہیں، یہ بچہ میرا ہے۔ بھگوان رام کا اُوتار ہے۔ یہ میرے لیے ہی بھیجا گیا ہے، اب میں اِسے کسی کو نہیں دوں گی..... کسی کو نہیں۔'' رادھا نے بچے کو یوں اپنے سینے میں چھپالیا جیسے سچ میں ہی کوئی اُس سے بچہ چھین رہا ہو۔

''رادھا عقل سے کام لو۔'' راکیش نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ممتا بھی عقل سے کام نہیں لیتی راکیش! ممتا تو ہمیشہ دل کی سنتی ہے اور میرا دل یہ کہتا ہے کہ یہ بچہ میری بارہ سال کی تپسیا کا پھل ہے۔ اگر آپ نے اِسے مجھ سے چھینا تو میں آتما ہتھیا کرلوں گی۔'' رادھا کے انداز پر راکیش خاموش ہوگیا۔

گھر آ کر جب رادھا بچے کو نہلا کر کپڑے بدلنے لگی، تو اُسے معلوم ہوا کہ یہ بچہ تو مسلمان ہے۔ بچے کے گلے میں پڑا ہوا اللہ کے نام کا لاکٹ بھی اس بات کی گواہی دے رہا تھا۔ راکیش کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو وہ ایک بار پھر شش و پنج میں مبتلا ہوگیا۔ اُسے سوچتا دیکھ کر رادھا نے کہا۔

''راکیش آپ دل برا نہ کریں۔ اِس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ مسلمان کے گھر پیدا ہوا ہے، حقیقت میں تو یہ صرف ایک بچہ ہی ہے، جو ابھی دھرموں کی سچائی سے آشنا نہیں آپ گیتا کا وہ پاٹ بھول گئے۔ جس میں بھگوان رام نے اپنے بھگتوں سے کہا تھا کہ اس سنسار میں آنے والا ہر بالک کیول ایک بالک ہی ہے، جس کا دھرم سے کوئی تعلق نہیں، نہ وہ ہندو ہے نہ مسلمان، نہ سکھ ہے نہ عیسائی۔ وہ صرف کیول ایشور کا اُوتار ہے، وردان ہے دیوتاؤں کا..... یہ سیکھشا کا اثر ہے کہ بچے کو کس دھرم کا بنایا جائے، ایک مسلمان کے گھر جنم لینے سے یہ مسلمان نہیں ہوگیا۔ ہم اسے ہندو دھرم کی سیکھشا دیں گے، تو یہ ہندو ہی ہوگا ہمارا بیٹا امر کپور۔'' رادھا نے محبت سے سوتے ہوئے بچے کو دیکھا۔

''امر کپور! ارے واہ تم نے تو نام بھی سوچ لیا ایک دن میں۔'' راکیش نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ایک دن میں نہیں، بارہ سالوں سے سوچ کر رکھا ہے۔'' رادھا نے جواب دیا۔

اس وقت میجر راکیش کپور نے سوچا کہ یہ بچہ پال کر میں ایک تیر سے دو شکار کروں گا۔ ایک تو بیٹا بھی مل جائے گا اور دوسرا اس مسلمان بچے کو میں اپنی طرح انڈین آرمی میں بھیج کر مسلمان کے ہاتھ سے مسلمانوں کی ہتھیا کروا کر اِن آتنک وادیوں سے انتقام بھی لوں گا۔'' اس طرح ہماری آشا بھی پوری ہوگی اور رادھا کی آنکھیں بھی ٹھنڈی رہیں گی۔ پھر یہ کہ اگر یہ کسی مہم میں مارا گیا تو اس سے ہماری جان بھی از خود چھوٹ جائے گی۔

☆......☆......☆

امر کپور آج ہی اپنی ٹریننگ مکمل کر کے آیا تھا۔ اُسے سری نگر میں تعینات کیا گیا۔ یہ شہر مرکز ہونے کی وجہ سے ہندو فوج کے لیے شروع ہی سے امتحان بنا ہوا تھا۔ کیوں کہ مجاہدین نے اس شہر میں واقع فوجی کیمپوں کو اپنا نشانہ بنایا ہوا تھا۔ پھر یہ کہ برسوں پہلے اُس کے پتا راکیش کپور بھی سری نگر فوج میں شامل تھے، بعد میں وہ دہلی آ گئے۔ یہاں ہی امر کپور نے اپنی تعلیم مکمل کی، آج وہ کیپٹن بن کر سری نگر جانے والا تھا۔ امر نے جیسے ہی گھر میں قدم رکھا تو 'جے کالی، جے کالی، کالی ماں' کے الفاظ اُس کے کانوں میں گونجے۔ گھر میں کالی ماں کی پوجا ہو رہی تھی۔ امر سیدھا اوپر اپنے کمرے میں جانے لگا، تو راکیش کپور نے آواز دی۔

''امر بیٹا کہاں جا رہے ہو؟ یہاں آؤ، کالی ماں کی آرتی تو اُتارو۔''

راکیش کپور نے پوجا کی تھالی امر کو پکڑاتے ہوئے کہا۔ تھالی تھام کر امر کافی دیر تک کھڑا کالی دیوی کی مورتی کو دیکھتا رہا۔ کالی سیاہ رنگ کی پتھر کی بنی مورتی اپنی سرخ انگارہ جیسی زبان نکالے اپنے چھ ہاتھوں میں سے ایک میں تیر، ایک میں ترشول، ایک میں انسانی سر

پکڑے ایک ہاتھ کو آشیر باد کے انداز میں اٹھائے ہوئے اپنے ہی پتی کی لاش کے سینے پر کھڑی ہے۔ امر نے دیکھ کر جھرجھری سی لی۔

''امر بیٹا کیا دیکھ رہے ہو۔'' راکیش نے پوچھا۔

''دیکھ رہا ہوں پتا جی کہ اس مورتی میں دیوتاؤں والی کیا بات ہے؟ مجھے تو یہ عفریت لگتی ہے۔'' امر نے پوجا کی تھالی پتا کو واپس دیتے ہوئے کہا۔

''رام رام! بیٹا ایسے نہیں کہتے۔ اِن ہی کی کرپا سے تو تم سری نگر میں کیپٹن بن کر جارہے ہو۔'' راکیش نے امر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''جی پتا جی..... اِن کی کرپا تو سری نگر کے ہر فوجی پر ہے، اسی لیے تو فوجی اِن ہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔'' امر یہ کہہ کر آرتی اُتارے بغیر ہی اوپر چلا گیا۔ راکیش نے رادھا کی طرف دیکھا، جس نے اشارے سے راکیش کو خاموش رہنے کے لیے کہا اور اوپر امر کے کمرے میں چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

آج سری نگر میں آئے ہوئے امر کپور کو دوسرا ماہ ہوا تھا۔ اِن دو مہینوں میں وہ ایک عذاب مسلسل سے گزر رہا تھا۔ ہندو فوجی معصوم اور بے گناہ شہریوں پر بھی آتنک وادی (تخریب کار) ہونے کا الزام لگا کر انہیں اپنے مظالم کا نشانہ بنا رہے تھے۔ یہ سب اُن کے لیے ایک کھیل تھا۔ کشمیریوں کا خون، اُن کی عزت، ہر چیز کو ہندو فوجی اپنا راج سمجھتے تھے۔ لیکن امر اسے ہندو فوجیوں کے ظلم سے تعبیر کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ بے قصور لوگ ہیں۔ ان پر ظلم نہیں ہونا چاہیے۔''

ایک دن کیپٹن امر اور کیپٹن موہن فوجی جیپ میں جارہے تھے۔ راستے میں ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا بکریاں چراتا ہوا گزر رہا تھا۔ اچانک بکریاں جیپ کے سامنے آگئیں اور راستہ بند ہوگیا۔ موہن نے دو تین بار ہارن بجایا۔ جب لڑکے کی کوشش کے باوجود بکریاں راستے سے نہ ہٹیں تو موہن نے ریوالور تان لیا۔ ایک لمحے کی بات تھی اور گولی معصوم کشمیری کے دماغ میں سوراخ کر جاتی کہ امر نے موہن کا ہاتھ پکڑ کر اُوپر کردیا۔ ہوائی فائر ہوا۔ موہن نے غصے سے امر کو دیکھا۔ مگر امر اُس سے بھی زیادہ غصے سے بھرا ہوا تھا۔

''کیا اب اس معصوم بچے پر بھی تم آتنک وادی ہونے کا آروپ (الزام) لگاؤ گے۔'' امر نے غصے سے پوچھا۔

''ہاں! یہ سارے کے سارے کشمیری آتنک وادی ہی ہیں۔ اِن کا ہر بچہ ماں کی کوکھ سے آتنک وادی بن کر نکلتا ہے، پتا نہیں اِن مسلوں کے خون میں کون سی آگ بھری ہے جو اتنے اتیاچار (ظلم) کے بعد بھی ٹھنڈی نہیں ہوتی۔ اِن کے بچوں کی آنکھیں دیکھی ہیں کبھی تم نے؟ یوں لگتا ہے جیسے دو کلاشنکوف لگی ہوں۔'' موہن نے غصے سے کہا اور گاڑی نکال کرلے گیا۔

☆.....☆.....☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ جب چیخ سُن کر امر کی آنکھ کھل گئی۔ چیخ کسی لڑکی کی تھی جو قریب ہی سے آرہی تھی۔

''لو آج پھر کسی معصوم کی عزت کی چتا تیار ہو رہی ہے۔'' امر نے سوچا اور اپنے کیبن سے باہر نکلا۔

''موہن کیا ہو رہا ہے یہ؟'' امر نے جیسے ہی موہن کے کیبن میں قدم رکھا تو ایک لڑکی کو کونے میں دبکے ہوئے اور کیپٹن موہن کو اُس کا دوپٹا ہاتھ میں تھامے کھڑے پایا۔

''کچھ نہیں یار بس ذرا سا دل بہلا رہا تھا۔'' موہن نے خباثت سے ہنستے ہوئے کہا۔

''کسی معصوم لڑکی کی عزت سے کھیلنا دل بہلانا ہے تمہاری نظر میں؟'' امر کی کن پٹی نہ جانے کیوں سُلگنے لگی تھی۔

''ارے یار تمہیں نہیں پتا، یہ کشمیر کی کلیاں بہت خوبصورت ہوتی ہیں۔ اِن کے جسم...... اُف کیا بتاؤں۔'' موہن نے بے شرمی کی انتہا کردی تھی۔

''گھر جا کر گیتا اور لکشمی کو غور سے دیکھنا، اُن کا جسم بھی بالکل اِس لڑکی جیسا ہی ہوگا۔'' امر نے نفرت سے موہن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم میری بہنوں کا اِس لڑکی سے مقابلہ کررہے ہو۔'' موہن کے تلووں سے لگی اور سر تک پہنچی۔

''نہیں میں مقابلہ نہیں کررہا۔ میں تمہاری تفریح کا سامان بڑھا رہا ہوں۔'' امر نے غصے سے زمین پر تھوکا اور لڑکی کو کیبن سے نکال کرلے گیا۔

☆☆......☆☆

"سر کیپٹن امر کپور باغی ہوگئے ہیں۔" جیسے ہی میجر لکشمن نے چھاؤنی میں قدم رکھا تو موہن نے اطلاع دی۔

"What۔ کیا بکواس کرر ہے ہو؟" میجر لکشمن نے حیرت سے کہا۔

"سر میرا وشواس کریں، میں سچ کہہ رہا ہوں۔" کیپٹن امر انڈین آرمی سے غداری کرر ہا ہے۔" موہن نے اپنی بات پر زور دیا۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ وہ میجر راکیش کپور کا بیٹا ہے۔ جن پر انڈین آرمی کو ہمیشہ گرو (فخر) رہا ہے۔" میجر لکشمن نے غیر یقینی انداز میں کہا۔

"سر آپ خود چیک کرلیں۔ کیپٹن امر کسی بھی آتنک وادی پر گولی نہیں چلاتے، کسی کشمیری لڑکی کو ہاتھ نہیں لگاتے، بلکہ وہ ہمیں بھی یہ سب کرنے سے منع کرتے ہیں۔" کیپٹن موہن نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

"ٹھیک ہے، میں خود چیک کروں گا اور اگر یہ جھوٹ ہوا تو تمہارا کورٹ مارشل بھی ہوسکتا ہے۔" میجر لکشمن نے کہا۔

"اور اگر یہ سچ ہوا سر...... تو پھر؟" موہن نے پوچھا۔

"تو پھر امر کا وہ حال ہوگا جو وہ سات جنموں تک یاد رکھے گا۔" میجر لکشمن کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

☆☆......☆☆

"کیپٹن امر آپ کو میجر لکشمن بلا رہے ہیں۔" ایک فوجی نے آکر پیغام دیا۔ امر اپنے کیبن سے باہر آیا تو سامنے میدان میں وہی اذیت ناک منظر جو وہ یہاں آنے کے بعد کئی بار دیکھ چکا تھا۔ پانچ چھ کشمیری لڑکوں کو لائن میں کھڑا کیا ہوا تھا۔ اُن کی حالت بتا رہی تھی کہ اُن پر کافی تشدد کیا گیا ہے۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے بھی نہیں ہو پار ہے تھے۔

"کیپٹن امر یہ آتنک وادی سرحد پار کرتے ہوئے پکڑے گئے ہیں۔" امر کو دیکھ کر میجر لکشمن نے کہا۔

"نہیں جی، اہم آتنک وادی نہیں ہیں۔ ہم تو کھیتوں میں کام کرر ہے تھے۔ فوجی ہمیں زبردستی پکڑ کر لے آئے۔" اُن لڑکوں نے روتے ہوئے کہا۔

"بکواس بند کرو۔" میجر لکشمن گرج کر بولا۔

"کیپٹن امر Shoot Them (مار ڈالو انہیں)، یہ آتنک وادی ہی ہیں۔"

"نہیں سر...... یہ آتنک وادی نہیں ہیں۔" امر نے کہا۔

"کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں یہ میرا حکم ہے۔ You Will Obey My Oder۔" میجر لکشمن چلایا۔

"Shoot Them (ختم کردو انہیں)۔" کیپٹن امر نے اپنی کلاشنکوف سیدھی کی۔

"Shoot Them۔" میجر لکشمن پھر چیخا۔ دس فوجی جن میں کیپٹن موہن بھی شامل تھا، سامنے کھڑے تھے۔

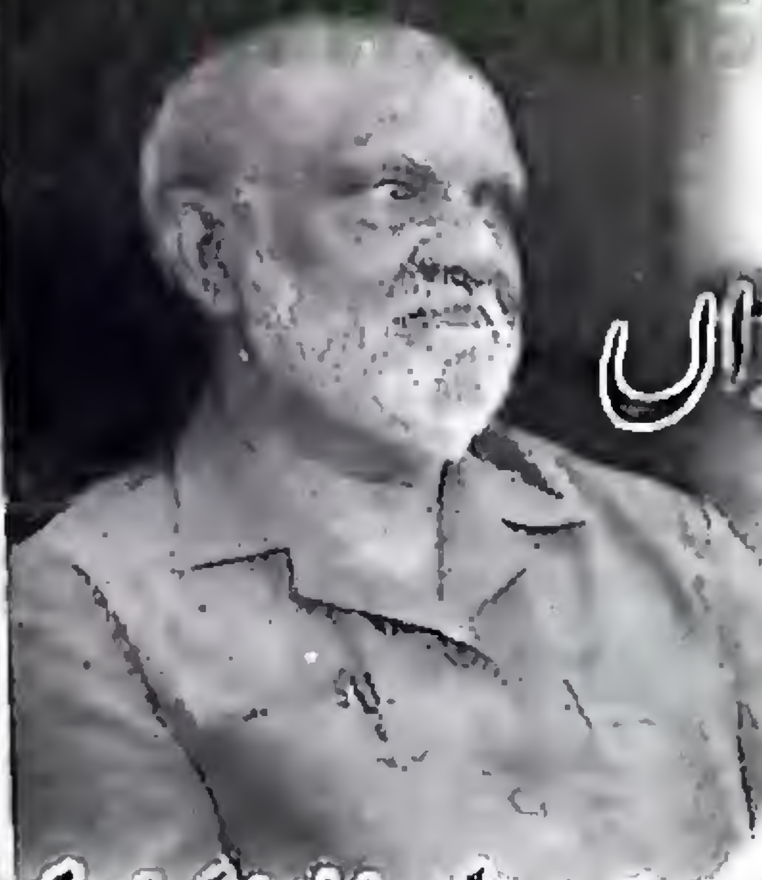
میجر لکشمن نے ایک بار پھر گرج کر کہا۔ "I Say Shoot Them (میں نے کہا، ختم کردو انہیں)۔"

امر کے چار سُو یہ ہی بازگشت گونجنے لگی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ کیپٹن امر نے اپنی کلاشنکوف کا رُخ موڑ کر انڈین فوجیوں اور میجر لکشمن کی طرف کیا اور فائر کردیا۔ ساری وادی ہندو فوجیوں کی چیخوں سے گونج اٹھی۔ میجر لکشمن نے مرتے ہوئے حیرت سے ایک ہندو فوجی کو اپنے ہی ساتھیوں کو مارتے ہوئے دیکھا، مگر یہ کوئی نہ جان سکا کہ ایک ہندو کی گود میں پلنے سے، ہندو کے گھر رہنے سے ایک مسلمان ہندو نہیں ہوجاتا۔ جس بچے کی رگوں میں ایک مسلمان ماں کا دودھ، ایک مجاہد کا خون گردش کرر ہا ہو، وہ خون کبھی نہ کبھی اپنی پکار ضرور سنتا ہے۔ یہ لہو کی پکار ہی تھی جو کیپٹن امر نے دس انڈین فوجیوں کو جہنم واصل کردیا، بعد میں یہی کیپٹن امر مجاہدین کا جانشین بنا اور علی کے نام سے انڈین فوج کے لیے ایک طوفان بنا رہا۔

برسوں پہلے دھرم کے بارے میں بتاتے ہوئے رادھا یہ بھول گئی تھی کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو خون میں شامل ہوکر نسل در نسل جاتا ہے۔ ایک مسلمان مجاہد کا خون خود اپنی پہچان کرواتا ہے، وہ جہاں بھی رہے، جس گھر میں بھی پلے، جس مذہب کے لوگوں میں رہے، مگر رہے گا مجاہد ہی...... سید علی حیدر کا خون ایک مجاہد کا خون تھا، جو عامر سے امر تو کہلایا مگر امر بن نہ سکا۔ آخر علی بن کر ہمیشہ کے لیے امر ہوگیا۔

☆☆......☆☆

سفرنامہ



# برطانیہ میں خزاں

محمود شام

برٹش ٹورسٹ اتھارٹی کی دعوت پر، عظیم صحافی اور شاعر محمود شام کے برطانیہ میں گزرے اُن لمحات کا ذکر جو امر ہوگئے

ایسا سفرنامہ جسے پڑھ کر قاری خود کو اُن ہی مناظر کا حصہ محسوس کرتا ہے

آخری حصہ

انڈیا آفس لائبریری لندن میں کتابیں رکھنے سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ جو کتابیں بھارت کی گرمی میں محفوظ نہیں رہ سکتی تھیں۔ وہ یہاں برطانیہ کے موسم میں محفوظ رہیں۔

یہاں جمع شدہ کاغذات میں ایک خاص سوغات پنسل کی بنائی ہوئی وہ ڈرائنگز ہیں جو برطانوی شہریوں نے ہندوستان سے اپنے گھروں کو بھیجیں۔ یہ زیادہ تر ہندوستان کے شہروں، درختوں، قلعوں اور علاقائی لباسوں میں ملبوس راجوں اور مہارانیوں کی تصویریں ہیں۔ ان کی تعداد تین ہزار سے زیادہ ہے۔ اس زمانے کی تصاویر تو 2 لاکھ کے قریب ہیں۔

ڈاکٹر بنگل بڑے پیار اور تحمل سے یہ تفصیلات ہمارے سوالات کے جوابات میں بتا رہے ہیں۔ نہ جانے کتنے آنے والوں کو انہوں نے یہ باتیں بتائی ہوں گی۔ لیکن آج بھی ان کی دلچسپی وہی ہے۔ کوئی بیزاری نہیں ہے۔

سینٹ پانکر اس میں زیر تعمیر برٹش لائبریری اب تکمیل کے آخری مراحل میں ہے۔ بلڈنگ 1996ء میں لائبریری کے حوالے کردی جائے گی۔ اس لیے آج کل وہاں منتقل کیے جانے والے ریکارڈ کو جدید ترین انداز میں محفوظ کرنے کی تیاریاں ہورہی ہیں۔ 1989-1990ء کے دوران مارٹن موئر نے طویل محنت اور عرق ریزی کے بعد General Guide to The India Office Records مرتب کی ہے۔ جو انڈیا آفس، ریکارڈز میں موجود اجزائے ترکیبی کی طرف پہلی بار رہنمائی کرنے والی ایک جامع تصنیف ہے۔ جن میں 9 میل طویل ایسٹ انڈیا کمپنی (1600-1858) کی دستاویزات بورڈ آف کنٹرول (1784-1858) انڈیا آفس (1858-1947) برما آفس (1937-1948) سبھی سے متعلقہ کاغذات شامل ہیں۔ یہ گائیڈ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں انتظامی پس منظر، ایسٹ انڈیا کمپنی کے لندن میں دفاتر کا قیام۔ انڈیا آفس کا قیام شامل ہیں۔ دوسرا حصہ ان سے متعلقہ ہر قسم کے ریکارڈ کی تفصیلات کا اندراج ہے۔

انڈیا آفس لائبریری کے مختلف حصوں کی تقسیم اس طرح ہے۔ مغربی زبانوں میں شائع شدہ کتابیں اور دستاویزات، جدید ہندوستانی زبانوں کا سیکشن، اسلامی زبانوں کا سیکشن، پرنٹس اور ڈرائنگز کا سیکشن۔

اب آیئے اورینٹیل کلیکشن کی طرف۔ ان میں چائنز اور کورین سیکشن ہے۔ جاپانی سیکشن ہے۔ عربیک سیکشن،

ایرانین اور ترکش سیکشن، عبرانی سیکشن، کرسچین مڈل ایسٹ سیکشن جنوبی ایشیا (ہندو بدھسٹ) سیکشن وسطی ایشیائی زبانوں کا سیکشن، جنوبی ایشیا (اسلامی) سیکشن، جنوب مشرق (ایشیا سیکشن)۔

یورپ اور امریکہ میں وقتاً فوقتاً برصغیر سے متعلق شائع ہونے والے سفرنامے۔ تحقیقی مطالعے، اور برطانوی ہند سے متعلق تصنیفات بھی یہاں شامل ہوتی رہتی ہیں۔

اورینٹل مسودوں اور مطبوعہ کتابوں میں حال ہی میں ہونے والے اضافوں میں۔ تامل دعاؤں اور نغموں کا مجموعہ سیپا مالائی ہے۔ جس میں 19 ویں صدی کے ایک عیسائی شاعر ویٹانایاکم ساستری کا دعائیہ کلام شامل ہے۔

اردو کا ایک دلچسپ مسودہ، قصہ شاہ جن یا افسانہ عجائب وغرائب ہے۔ جو نواب اودھ سید واجد علی شاہ کے ایک چالباز کے ہاتھوں لٹنے کی داستان ہے۔ جس کا دعویٰ تھا کہ اس نے جنات کو تسخیر کیا ہوا ہے۔

ایک ہے طوطی نامہ، ایک نایاب نسخہ نخشی کی نظم اور ساتھ میں فرانسز گلیڈون کا انگریزی ترجمہ۔

اس کے علاوہ حال ہی میں کئی پینٹنگز اور ڈرائنگز کا اضافہ بھی ہوا ہے۔ یہ بعض لائبریریوں نے اس قومی لائبریری کو تحفتاً دی ہیں یا بعض خاندانوں نے اپنے ذاتی اثاثے میں سے عطیاً دے دی ہیں۔

متعدد تصاویر، نقشوں اور تحائف کا اضافہ بھی اسی طرح ان ریکارڈز اور لائبریری میں ہوتا رہتا ہے۔

17 فروری 1943ء کو میانی (سندھ) میں ہونے والی جنگ میں فوجی پوزیشن کا ایک نقشہ بھی ایک یادگار ہے۔ سر چالس نیپئر کی کمان میں انگریز فوج نے حیدرآباد میں یہ لڑائی لڑی تھی۔ یہ نقشہ اس جنگ میں شریک ایک انگریز فوجی کیپٹن رابرٹ ہینڈرسن کے ہاتھ کا بنا ہوا ہے۔ جو دریائے پھیلیلی شکارگاہوں، سر لیجو گاؤں، کوٹری کی پوزیشن واضح کرتا ہے۔ دشمن کے کیمپ بھی بتاتا ہے۔ کہاں کہاں ہیں۔

ایک تحریر کسی ولیم ہسکے کی ہے۔ جس نے ایک انگریز فوجی فلپ فرانسس کی طرف سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک ملازم کی فرانسیسی بیوی مسز گرانڈ پر ڈورے ڈالنے کی دلچسپ داستان بیان کی ہے۔

بنگال، برما، پنجاب، مدراس اور کئی دوسرے علاقوں کے بارے میں اب تک جو خطوط، مسودے شائع ہو رہے ہیں۔ وہ بھی لائبریری میں شامل کیے گئے ہیں۔ جس کتاب میں تحقیقی مواد کا تعلق 1947ء سے پہلے کے برصغیر اور جنوبی ایشیا سے ہو، وہ اس ریکارڈ کا لازمی حصہ بن جاتی ہے۔

یہاں محفوظ ریکارڈ میں صرف کاغذ پر مطبوعہ یا لکھی ہوئی دستاویزات ہی نہیں ہیں۔ کھجور کے پتوں پر نقش، لکڑی پر کندہ، کپڑے پر لکھی، دھات پر کندہ دستاویزات بھی ہیں۔

اب ڈاکٹر ہنگل نے ہمیں اپنے ایک اور رفیق کار کے حوالے کیا ہے۔ جو ہمیں تیزی سے ایک دورہ مختلف سیکشنوں کا کرائیں گے۔ اس کے بعد ہم نمائش ہال پہنچیں گے جہاں ڈاکٹر ہنگل سے دوبارہ ملاقات ہوگی۔

برصغیر میں انگریز کے چار سو سال ان الماریوں اور شیلفوں میں سانس لے رہے ہیں۔ کتنے ہی طالع آزماؤں کی داستانیں، ایک دوسری قوم کو بزور اسلحہ مطیع بنانے کی کہانی۔ فریب اور دھوکے سے شیشے میں اتارنے کی سازشیں، ایسٹ انڈیا کمپنی سے لے کر برطانوی تاج کے تحت راج کے قصے۔

یوروپین سیکشن میں یورپ کی تاریخ کی اہم دستاویزات بھی ہیں۔ نپولین کی موت کا سرٹیفکیٹ، برطانیہ کے مشہور ادیبوں، شاعروں کے قلمی نسخے، مخطوطات۔

اس سیکشن میں انڈیا میں فوج یا سول ملازمت کرنے والے افراد کے کوائف کی فائلیں ہیں۔ انتہائی ترتیب کے ساتھ۔ نام سے بھی فائل مل سکتی ہے۔ علاقہ جہاں کام کرتا ہے۔ اس کے حوالے سے بھی۔ یا پھر تاریخ اور سنن کے حوالے سے، عام خاندانوں کے لیے دلچسپی کا سیکشن یہی ہے۔

کتابوں اور دستاویزات کو موسموں کی سختی اور تندی سے۔ دیمک سے بارش سے محفوظ کرنے کے لیے بڑے سخت اقدامات ہیں۔ سکیورٹی کے اقدامات بھی بہت سخت ہیں۔

الماریوں کے درمیان موجود طویل راہداریوں سے

ہوتے۔ صدیوں کو کاغذات میں سانس لیتے، بادشاہوں، وائسرایوں، سیاستدانوں، سائنسدانوں، مؤرخوں، اساتذہ، جنرلوں، کرنلوں کو دستاویزات سے جھانکتے دیکھتے ہوئے ہم نمائش ہال میں آ پہنچے ہیں۔

صدیوں کی ان دستاویزات کو دیکھنے کے لیے کئی برس چاہئیں۔ یوں چند ساعتوں میں کیا دیکھا اور پڑھا جاسکتا ہے۔

نمائش ہال میں نمائش لگی ہے۔ ہم ادھر اُدھر دیکھ رہے ہیں کہ پتا چلے کہ یہ نمائش کب سے جاری ہے۔ کب تک رہے گی۔ ڈاکٹر ہنگل پھر اپنی سنجیدہ مسکراہٹ کے ساتھ موجود ہیں۔

یہ نمائش کتنے دن سے جاری ہے۔

''یہ تو آپ کے لیے خاص طور پر لگائی گئی ہے۔''

''اس ذرہ نوازی کا شکریہ۔''

''نہیں ہمارے ہاں یہ معمول ہے کہ جب کوئی مہمان اس طرح آتا ہے۔ تو اس کی دلچسپی کی کتابیں، مخطوطات تحریریں اور نقشے، اور ڈرائنگز لگائی جاتی ہیں۔''

''اوہ! یہ سب کچھ ہمارے لیے ہے۔''

ایک انگریز خاتون ہماری رہنمائی کر رہی ہیں۔ ایک ایک دستاویز کی تفصیل بتا رہی ہیں۔ ان کا حصہ ختم ہو جاتا ہے۔ تو ایک صاحب جو ہمارے ہم وطن ہیں۔ وہ اپنی ذمہ داری سنبھال لیتے ہیں۔ اس طرح ڈاکٹر ہنگل کے اسٹاف کے چار پانچ سینئر خواتین اور حضرات نے ہمیں یہ اہم دستاویزات دکھائی ہیں۔ جن میں قائداعظم کا ایک نایاب خط ہے۔ برصغیر کے بارے میں دورِ قدیم کی شائع شدہ کتابیں۔ اور ایک انگریز خاتون کے ہاتھوں حیدرآباد کی بنی ہوئی پنسل ڈرائنگ، سندھ کے حکمراں تالپور، میروں کے پورٹریٹ، 1781ء کا بنگال گزٹ نمائش گاہ میں ہماری دلچسپی کی اور بہت سی تصاویر، کتابیں اور پوسٹر بھی ہیں۔

ہم حیرت میں ہیں کہ اپنے میزبان ڈاکٹر ہنگل کا شکریہ کیسے ادا کریں۔ انہوں نے کتنی محنت کی ہے۔ ہمیں یادوں اور حقیقتوں کے اس عظیم خزانے سے روشناس کرانے میں، کتنی دلچسپی لی ہے۔ کہ یہ صحافی سندھ سے آئے ہیں۔ اس لیے انہیں سندھ کا ماضی دکھایا جائے۔ کراچی ٹھٹھہ کی جھلک دکھائی جائے۔

ہم ان سے اجازت لے رہے ہیں۔ ان کا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔

مگر وہ ہمیں نیچے استقبالیہ تک چھوڑ کر آنے اور وہاں سے الوداع کہنے پر آمادہ ہیں۔ علوم و فنون کے اس سمندر میں غوطہ زنی کے بعد اب ہمارا رخ بی بی سی کی طرف ہے۔

## جہاں آمریت وہاں بی بی سی

**...وی سلطنت ختم ہو چکی ہے لیکن بی بی سی کے ... بھی دنیا پر اسی طرح راج کر رہا ہے ... راج جاری ...**

برٹش براڈکاسٹنگ کارپوریشن جس کی نشریات ایشیا کے تمام ملکوں میں اپنے قومی ریڈیو سے زیادہ سنی جاتی ہیں۔ آمریت استحصال، گھٹن، جبر اور تشدد کے موسم میں بی بی سی کی نشریات ہی ہوا کا تازہ جھونکا بنتی ہیں۔

بش ہاؤس، سٹرینڈ، ڈبلیو سی۔ 2 میں مسٹر کولین سی بروک، انٹرنیشنل پریس آفیسر اور مسٹر بیری لینگرج ایسٹرن سروس کے سیکشن ہیڈ ہمارے منتظر ہیں۔

بی بی سی ایک عظیم نشریاتی ادارہ ہے۔ جو برسوں سے کامیابی سے نہ صرف برطانیہ بلکہ دنیا بھر کو باخبر رکھ رہا ہے۔ پہلے تو ہمارا واسطہ صرف بی بی سی ریڈیو سے ہی تھا کہ جب ملک میں ہنگامے شروع ہوتے۔ تحریکیں چلتیں، ہم نے اگر سب کچھ بھی اپنی آنکھوں دیکھا ہوتا پھر بھی شام ہوتے ہی ریڈیو کھول کر بی بی سی تلاش کرنے۔ اور کان لگا کر بیٹھ جاتے۔ کیوں کہ یقین ہوتا تھا کہ اپنے ریڈیو ٹیلی ویژن تو کیا۔ اخبارات میں بھی یہ خبریں نہیں آئیں گی۔ یا یہ ہوتا تھا کہ اپنے شہر کی خبر بھی اخبار بی بی سی لندن کے حوالے سے دیتے تھے۔ کیسے کیسے جبر کے موسم گزرے ہیں ہمارے ہاں بھی۔ ایک بار تو ایسا بھی ہوا کہ 1974ء میں لس بیلا میں لیویز اور مینگل قبیلے کے درمیان تصادم ہوا۔ بی بی سی کا نمائندہ اسلام آباد سے جہاز سے چلا۔ انٹر کانٹی نینٹل میں سامان رکھ کر کرایے کی کار لے کر لسبیلہ پہنچا۔ حالات معلوم کیے۔ واپس آکر اس نے ہوٹل کے کمرے سے بی بی سی کو خبر لکھوائی۔ وہ خبر ساڑھے آٹھ بجے شام اور کی اردو

نشریات میں تفصیل سے سنائی گئی۔ اگلی صبح کراچی سے شائع ہونے والے کثیر الاشاعت اور کثیر الوسائل روزنامہ جنگ کی شہ سرخی یعنی لیڈ اسٹوری وہی تھی۔ صرف پینتیس چالیس میل دور بھی اخبار اپنا نمائندہ نہ بھیج سکا۔ بی بی سی نے اپنے نمائندے کو اسلام آباد سے کراچی روانگی کی ہدایت کی۔ پھر اس نے خود جا کر یہ سب کچھ دیکھا۔ اور خبر دی، اپنی انہی کوششوں اور پالیسیوں سے بی بی سی نے دنیا میں اپنا مقام بنایا ہے۔

اب ہانگ کانگ کے ذریعے بی بی سی ٹیلی ویژن بھی ہم تک پہنچ رہا ہے۔ تازہ ترین خبریں تازہ ترین فلموں کے ساتھ۔

ہماری ٹیکسی بی بی سی کے سامنے رُکی ہے۔ بش ہاؤس، یہ امریکی صدر جارج بش نہیں بلکہ امریکہ کے ایک بڑے تاجر ارونگ ٹی بش کی کمپنی بش ٹرمینل کمپنی آف نیویارک کے نام پر ہے۔ ارونگ ٹی بش کا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ بش ہاؤس میں کوئی نشریات ادارہ قائم کرے۔ اس نے تو یہاں ایک نیا تجارتی مرکز قائم کرنا چاہا تھا۔ وہ پہلی جنگ عظیم کے بعد یہاں آیا تھا۔ اس مرکز میں اس کا خیال تھا کہ کچھ مستقل نمائش ہال ہوں گے سیل اور شوروم جہاں تیار کنندگان اپنی مصنوعات دنیا بھر سے آنے والے خریداروں کو دکھا سکیں گے۔ 1923ء میں پہلا بلاک تعمیر بھی ہو گیا۔ بہت پُرشکوہ، سنگ مرمر سے مزین، لیکن تاجر حلقوں کو یہ اسکیم پسند نہیں آئی اور پھر مجبوراً اس عمارت کو عام روایتی دفاتر کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ پھر یہ عمارت مختلف ہاتھوں میں فروخت ہوتی رہی۔ نام وہی رہا۔ بی بی سی کے کچھ دفتر پہلی بار یہاں 1940 میں آئے۔ جب ان کے اپنے براڈ کاسٹنگ ہاؤس میں بم تباہی مچا گئے۔

بی بی سی والے بھی اس بلڈنگ میں اپنے آپ کو تنگ محسوس کر رہے ہیں۔ مغربی لندن میں ٹیلی ویژن سینٹر کے نزدیک نئے وائٹ سٹی میں بی بی سی کو منتقل کرنے کے لیے محکمہ خارجہ سے بات چیت ہو رہی ہے۔ جلد یہ خواب حقیقت میں تبدیل ہو جائے گا۔

محکمہ خارجہ کا بی بی سی پر کتنا کنٹرول ہے۔

بی بی سی خبریں دینے میں کتنا آزاد ہے۔

اس کے فنانسر کہاں سے آتے ہیں۔

یہ سوالات میرے ذہن میں ہیں۔ پہلے ہمیں ایک فلم دکھائی جا رہی ہے۔ جس سے یہ اندازہ ہو رہا ہے کہ بی بی سی ریڈیو اور ٹیلی ویژن کس طرح خبروں اور فلموں کے انتظامات کرتے ہیں۔ عالمی رہنما بی بی سی کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ یہ بی بی سی کی اپنی دستاویزی فلم ہے۔ جو ایک طرح سے بنیادی پالیسی دستاویز بھی ہے۔ اس میں پاکستان کی سابق وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کے تاثرات بھی دوسرے عالمی رہنماؤں کے ساتھ شامل کیے گئے ہیں۔

جہاں جہاں ڈکٹیٹر شپ ہے۔ وہاں بی بی سی زیادہ بے تابی اور شوق سے سنا جاتا ہے۔ وہیں حکومتیں کوشش کرتی ہیں کہ بی بی سی کی نشریات جام کی جائیں۔ بی بی سی سننے پر پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔ برما میں بی بی سی سننے پر 3 سال قید بامشقت دی جاتی ہے۔ کئی نوجوان یہ سزائیں برداشت کر رہے ہیں۔

بی بی سی کے حروف پہلی بار 1922ء میں استعمال کیے گئے جب برٹش براڈ کاسٹنگ کمپنی تشکیل دی گئی اور روزانہ صوتی نشریات کا آغاز ہوا۔ پانچ سال بعد 1927ء میں یہ کمپنی برٹش براڈ کاسٹنگ کارپوریشن بن گئی۔ نہ سرکاری محکمہ اور نہ تجارتی ادارہ۔

عالمی نشریات کا آغاز قیام سے دس برس بعد شروع ہو سکا۔ حکومت نے تجرباتی نشریات کی اجازت تو دے دی۔ لیکن فنڈز فراہم کرنے سے انکار کر دیا۔ بات چیت چلتی رہی۔ لیکن پانچ سال بعد بی بی سی نے خود ہی عالمی نشریات کا آغاز کر دیا۔ اس کا نام اس وقت بی بی سی 'ایمپائر سروس' رکھا گیا۔ یہ 19 دسمبر 1932ء کی بات ہے۔ پھر 6 دن بعد شاہ جارج پنجم کا کرسمس کے موقع پر تاریخی پیغام پوری برطانوی سلطنت میں سنا گیا۔ 1934ء میں الگ سے نیوز سیکشن قائم کیا گیا۔

بی بی سی کی تاریخ کے یہ اوراق کچھ فلم الٹ رہی ہے۔ اور کچھ انٹرنیشنل پریس آفیسر زبانی بتا رہے ہیں۔

ایمپائر کی ضروریات نے بی بی سی کی توسیع میں ڈرامائی مدد کی۔ پہلے عالمی نشریات کے لیے فنڈز پر حکومت سخت ٹال مٹول سے کام لیتی رہی۔ لیکن ایک ایسا

وقت آیا جب 1937ء میں اٹلی کی فاشسٹ حکومت نے ایتھوپیا پر حملہ کیا۔ اور وہیں ایک ریڈیو اسٹیشن قائم کر کے عربی میں نشریات شروع کر دیں۔ مشرقی وسطیٰ اس کا ہدف تھا۔ یہاں برطانیہ کے مفادات بھی بہت زیادہ تھے۔ اب جب برطانیہ کی حکومت پر الزامات کی بوچھاڑ ہونے لگی تو اس نے فیصلہ کیا کہ بی بی سی کی عربی نشریات ہونی چاہئیں۔ اب ظاہر ہے کہ فنڈز کی کمی کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

انہی دنوں میں محکمہ خارجہ اور بی بی سی کے درمیان خبروں پر بالادستی کا تنازع شروع ہوا۔ محکمہ خارجہ کا خیال تھا کہ نشریات ان کے کنٹرول میں ہونی چاہئیں۔ اور یہ بھی کہ جو خبریں برطانوی مفادات سے متصادم ہوں۔ انہیں نشر نہ کیا جائے۔ بی بی سی کے پہلے ڈائریکٹر جنرل لارڈ ولیتھ نے اس موقف کی سخت مزاحمت کی اور آزاد پالیسی پر اصرار کیا۔

نازی جرمنی نے بھی اٹلی کی طرح لاطینی امریکہ میں پروپیگنڈہ مہم شروع کر دی تھی۔ 15 مارچ 1988ء کو ہسپانوی اور پرتگیزی زبانوں میں لاطینی امریکی سروس شروع کی گئی۔ اس سال میونخ کے بحران نے بی بی سی کو فرانسیسی جرمن اور اطالوی نشریات جاری کرنے پر مجبور کیا۔

دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوا۔ تو بی بی سی انگریزی اور سات دوسری زبانوں میں نشریے پیش کرتا تھا۔ لیکن مقبوضہ یورپ ریڈیو اسٹیشن جرمن ہاتھوں میں آ جانے سے بی بی سی کو اپنے نشریوں میں بہت بڑے پیمانے پر توسیع کرنا پڑی اور یورپ سے باہر کے کئی ممالک کے لیے بھی نشریات شروع کی گئیں۔ چھ برس بعد جب جنگ ہوئی تو بی بی سی دنیا سے 45 زبانوں میں محو تخاطب تھا۔

1946ء میں بی بی سی کی ایکسٹرنل سروس کا رسمی آغاز ہوا۔ اسی سال روسی زبان میں ایک پروگرام شروع کیا گیا جس کا مقصد سوویت عوام کو برطانوی عوام سے روشناس کرانا تھا۔ لیکن جب روس اور آزاد دنیا کے درمیان سرد جنگ کا آغاز ہوا تو اس روسی زبان کے پروگرام کی اہمیت دوسرے پہلوؤں سے بڑھ گئی۔

سرد جنگ کے اپنے تقاضے تھے۔ بی بی سی کے پروگراموں کا رُخ مشرقی یورپ کی طرف ہو گیا۔ مغربی یورپ کے لیے پروگرام محدود ہوتے چلے گئے۔ عالمی نقشے پر سیاسی تبدیلیاں بی بی سی کے پروگراموں میں بھی تبدیلیاں لاتی رہی ہیں۔ ٹرانسسٹر انقلاب آیا تو بی بی سی نے افریقہ کے لوگوں کے لیے ہواسا، سواحلی، سومالی زبانوں میں پروگرام شروع کیے۔ افریقہ ہی کے لیے ایک سروس فرانسیسی میں بھی نشر ہونے لگی۔ 1969ء میں ایک نیپالی سروس کا اضافہ ہوا، پشتو زبان 1981ء میں بی بی سی کی زبانوں کی فہرست میں شامل ہوئی۔ اب وسطی ایشیائی ممالک کی زبانیں بھی بی بی سی کے پروگراموں کا وسیلہ بن رہی ہیں۔

اب 'بی بی سی عالمی سروس' کہلانے والی نشریات کے نام بھی تبدیلیوں کا سامنا کرتے رہے ہیں۔ سب سے پہلے یہ بی بی سی ایمپائر سروس تھی۔ پھر 1938ء سے اوورسیز سروس کہلانے لگی۔ جب انگلش کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی نشریات ہونے لگیں۔ پھر اسے بی بی سی ایکسٹرنل سروسز کہا جانے لگا۔ جو یہ 36 سال تک کہلائی۔ 1988ء میں بی بی سی کے مینجنگ ڈائریکٹر جان تو سنہ نے کہا کہ دنیا والے تو اسے بی بی سی ورلڈ سروس ہی کہتے اور سمجھتے تھے۔ ہم اسے ایکسٹرنل سروس کہتے رہے ہیں۔

اب بی بی سی کے پروگرام دنیا کے ہر براعظم میں ہر ملک میں سنے جاتے ہیں۔ 39 زبانوں میں نشریات کا اہتمام لندن سے کیا جاتا ہے۔ 25 سال بعد اب آرمینی زبان میں بھی نشریات شروع ہو گئی ہیں۔

بی بی سی عالمی سروس کے سامعین کی تعداد کا اندازہ 120 ملین یعنی 12 کروڑ کے قریب لگایا گیا ہے۔ جن میں سے 10 کروڑ 36 مختلف زبانوں کے سامعین ہیں اور 2 کروڑ بی بی سی کی عالمی نشریات انگلش میں سنتے ہیں۔

بی بی سی نے اپنے سامعین کے جائزے کے لیے ایک باقاعدہ ادارہ قائم کر رکھا ہے۔ جو مختلف شعبوں میں تحقیق کرتا رہتا ہے۔ بی بی سی کی عالمی نشریات کے سب سے زیادہ سامعین جنوبی ایشیا میں ہیں۔ جہاں صرف بھارت میں 5 کروڑ سامعین ہیں۔

بی بی سی کی پالیسیوں کے بارے میں سوالات اٹھتے

رہتے ہیں۔ بی بی سی والے کہتے ہیں کہ ہم آزاد ہیں۔ ہماری پالیسی پر حکومت کا کوئی کنٹرول نہیں ہے۔

ہمارے سوال پر بتایا گیا کہ بی بی سی کو ایک بورڈ آف گورنرز چلاتا ہے۔ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے 12 خواتین اور مرد شامل ہیں۔ جنہیں ملکہ وزیراعظم کی سفارش پر محدود مدت یعنی 5 سال کے لیے مقرر کرتی ہیں۔ پریوی کونسل میں موجود ملکہ کی طرف سے تقرری کے طریق کار کے باعث وزیراعظم بورڈ میں اپنی مرضی کے افراد کا تعین نہیں کرسکتا۔ بی بی سی کی حتمی کنٹرولنگ اتھارٹی یہی گورنرز ہیں۔ ایک پالیسی بنیادی طور پر طے کرلی جاتی ہے۔ اس پر عملدرآمد ڈائریکٹر جنرل کی صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ویسے تو گورنرز اور ڈائریکٹر جنرل کے درمیان مسلسل رابطہ رہتا ہے۔ تاہم اگر نئے مسائل سامنے آئیں تو باقاعدہ اجلاس بھی ہوسکتا ہے۔

بی بی سی کے اخراجات کون برداشت کرتا ہے؟ یہ بھی ایک سوال ہے۔ جو بی بی سی کے سامعین کے ذہن میں اکثر کروٹیں بدلتا ہے۔

بی بی سی کی اندرون ملک سروس دو رنگین ٹیلی ویژن چینل۔ پانچ قومی ریڈیو نیٹ ورک، علاقائی ٹیلی ویژن



مرکزی لندن کا مصروف ترین علاقہ، بائیں جانب انڈیا آفس لائبریری کی عمارت

اور ریڈیو سروسز اور 38 مقامی ریڈیو اسٹیشن چلاتی ہے۔ اندرون ملک تمام اخراجات ٹیلی ویژن رکھنے والے گھروں کو لائسنس فروخت کرکے پورے کیے جاتے ہیں۔ ریڈیو کے لائسنس 1971ء میں ختم کردیے گئے تھے۔ باقی آمدنی بی بی سی انٹرپرائز کے منافع سے حاصل ہوتی ہے۔ جس میں بی بی سی پبلی کیشنز، اوپن یونیورسٹی کو براڈ کاسٹنگ سروسز کی فروخت شامل ہے۔

31 مارچ 1991ء کو ٹیلی ویژن لائسنسوں سے ہونے والی آمدنی 1289.6 ملین پونڈ تھی۔ بی بی سی عالمی سروس کو پارلیمنٹ سے گرانٹ ان ایڈ ملتی ہے۔ 1990-1991ء میں گرانٹ ان ایڈ 134 ملین پونڈ تھی۔

وہ بتا رہے ہیں کہ اپنی پالیسی کے سلسلے میں بی بی سی پارلیمنٹ کو جوابدہ ہے۔ عام طور پر 3 سال کے لیے منصوبہ بندی کرتی ہے۔ اپنے ناظرین کی آراء جاننے کے لیے بی بی سی سروے کرتی رہتی ہے۔ بی بی سی کو روزانہ ہزاروں خطوط موصول ہوتے ہیں۔ ان کی سائنسی انداز میں مانیٹرنگ کی جاتی ہے۔ بوسنیا کے سلسلے میں سب سے زیادہ شکایت آمیز خطوط ملتے ہیں۔ انہیں اس وقت تک 25 ہزار خطوط دنیا بھر کے مسلمانوں کی طرف سے مل چکے ہیں۔ جن میں یہ تنقید کی گئی ہے کہ بی بی سی کا رویہ غیر جانبدارانہ نہیں ہے اور حقائق نے بے خبر رکھا جارہا ہے۔ مغرب کو کویت کے مسلمانوں کی جتنی فکر تھی۔ بوسنیا کے غریب اور مظلوم مسلمانوں کی فکر نہیں ہے۔ ان خطوط کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ ان کی روشنی میں بی بی سی نے کافی حد تک بوسنیا کے سلسلے میں اپنی پالیسی کو مزید متوازن بنایا ہے۔

بی بی سی والے بڑے فخر سے بتاتے ہیں کہ سوویت یونین کمیونزم کے خاتمے سے قبل 800 ملین پونڈ مغربی ریڈیوز کی نشریات جام کرنے پر خرچ کرتا تھا۔ اب یہی

رقم وہاں مقامی ریڈیو اسٹیشن چلانے پر خرچ کی جارہی ہے۔ لیکن 1987ء سے ہی روس نے یہ سلسلہ ختم کردیا تھا۔ اس کے بعد سے ہی موجودہ تبدیلیوں کی راہ ہموار ہوئی۔

بی بی سی ایشیا بی بی سی عالمی سروس ٹیلی ویژن لمیٹڈ کا حصہ ہے۔ جو 1991ء میں قائم ہوا۔ اور 1993ء کے آخر تک سب براعظموں میں پہنچنے کا پروگرام ہے۔ ایشیا میں یہ اسٹار ٹی وی کے سٹیلائٹ کے ذریعے تمام ملکوں میں دیکھا جارہا ہے۔

بی بی سی عالمی سروس ٹیلی ویژن کا انحصار حکومت پر نہیں ہے۔ اور نہ ہی لائسنس فیس پر۔ یورپ میں یہ سروس اپریل 1991ء میں پہنچی۔ پھر پورے یورپ میں مشرقی یورپ سمیت دیکھا جانے لگا۔

ایشیا میں یہ ہچ وژن کے اسٹار ٹی وی کے ذریعے پہنچا ہے۔ اسٹار ٹی وی ہچ وژن ڈیموا گروپ کے زیر اہتمام ہے۔ یہ گروپ ہانگ کانگ کے اسٹاک مارکیٹ کی سرمایہ کاری میں 15 فیصد کی نمائندگی کرتا ہے۔

اسٹیرن سروس میں شفیع نقی جامعی سے ایک عرصے بعد ملاقات ہورہی ہے۔ مہ پارہ صفدر خبریں پڑھنے جارہی ہیں۔ علی احمد خان سے دوبارہ ملاقات، سری نگر سے یوسف جمیل آئے ہوئے ہیں۔

بی بی سی اسٹوڈیو، جہاں سے روزانہ خبریں، سیربین شب نامہ نشر ہوتا ہے۔ جو ہم برسوں سے سنتے آئے ہیں آج اس اسٹوڈیو میں خود ہم پہلی بار بیٹھے ہیں صرف دیکھنے اور سننے کے لیے۔

برطانیہ کی ایمپائر ختم ہوچکی ہے۔ لیکن بی بی سی کے ذریعے برطانیہ اب بھی دنیا پر اسی طرح راج کررہا ہے۔ راج جاری ہے۔ اس کا حریف صرف سی این این ہے۔ مقابلہ تیزی سے جاری ہے۔ دیکھیں یہ اسے کب زیر کرتا ہے۔

## پارلیمانوں کی ماں

**ویسٹ منسٹر پیلس گیارہویں صدی میں قائم ہوا۔ باقاعدہ پارٹی [illegible] کا آغاز 17 ویں صدی میں ہوا۔**

مسز فیسراب ہمیں پارلیمنٹ ہاؤس لے آئی ہیں۔

باہر سے تو پارلیمنٹ ہاؤس ہم نے کئی بار دیکھا ہے۔ آج اس میں ہم داخل ہورہے ہیں۔ یہ برٹش پارلیمنٹ، دنیا بھر کی پارلیمانوں کی ماں کہلاتی ہے۔ دنیا نے پارلیمانی نظام یہیں سے اپنایا ہے۔ پارلیمانی آداب یہیں سے سیکھے ہیں۔

دریائے ٹیمز کے کنارے واقع پارلیمنٹ ہاؤس اپنے طرز تعمیر کے اعتبار سے بھی ایک منفرد عمارت ہے۔ کتنی ندرت ہے اس کی ڈیزائننگ میں کتنے ماہرین کی راتیں اور دن اس کی نذر ہوئے ہوں گے۔

سکیورٹی کے مراحل یہاں بھی طویل ہیں۔ ان دنوں تو اجلاس نہیں ہورہا ہے۔ اس لیے دیر نہیں لگ رہی ہے۔ اس برآمدے میں دونوں طرف برطانیہ کی تاریخ نقش کاری اور مجسموں سے عبارت ہے۔ کہیں بادشاہ ایستادہ ہیں کہیں ملکائیں۔ کہیں دربار کے مناظر ہیں۔ ہماری ملاقات پارلیمنٹ کے رکن سرجان وہیلر سے طے ہے۔ وہ ذرا مصروف ہیں۔ اس لیے ہم پارلیمنٹ کے مرکزی گنبد کے نیچے انتظار گاہ میں ان کے منتظر ہیں۔ یہاں بھی دیواروں، ستونوں پر سینٹ کھڑے ہیں۔ بادشاہ ہیں۔ جن کے نام اور ادوار نیچے درج ہیں۔ پھر ایک طرف پارلیمنٹ کے قیام کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

ویسٹ منسٹر پیلس گیارہویں صدی میں قائم ہوا تھا۔ باقاعدہ پارٹی سسٹم کا 17 ویں صدی میں آغاز ہوا۔ موجودہ بلڈنگ 1830ء میں مکمل ہوئی۔

پارلیمنٹ ہاؤس میں ایک طرف ہاؤس آف کامنز دارالعوام ہے۔ دوسری طرف ہاؤس آف لارڈز، دارالامراء انہوں نے اچھا کیا یہ وضاحت کردی ہے۔ ہمارے ہاں تو قومی اسمبلی ہو یا سینٹ ایوان زیریں ہو یا ایوانِ بالا، دونوں ہی دارالامراء ہیں۔ عوام کو تو یہاں تک پہنچنا ہی نصیب نہیں ہوتا۔

دارالامراء میں سرخ قالین بچھایا گیا ہے۔ جبکہ دارالعوام میں سبز قالین ہے۔ عوام کو تو سبز باغ ہی دکھانے چاہئیں۔ دارالعوام کے صرف ایک کمرے میں خاص طور پر سرخ قالین بچھایا گیا ہے۔ یہ کوئی خاص کمیٹی روم ہے۔ سرجان ڈینیل وہیلر ہمیں اسی روم میں لے آئے ہیں۔ پہلے دیر سے آنے کی معذرت۔

سرجان ڈینیل وہیلر ویسٹ منسٹر نارتھ سے

پارلیمنٹ کے رکن ہیں۔ یکم مئی 1940ء کی پیدائش۔ 12 دسمبر 1927ء کو جارج فریڈرک لنکلے این آر سی ایس کی بیٹی لارا مارگریٹ سے شادی ہوئی۔ 1968ء سے 1974ء تک اسسٹنٹ پرزن گورنر رہے۔ پھر ہوم آفس میں ہی 76-1974 کے دوران ریسرچ آفیسر۔ پھر 1976ء سے 1988ء تک برٹش سکیورٹی انڈسٹری ایسوسی ایشن کے ڈائریکٹر جنرل۔ 1982ء میں نیشنل انسپکٹریٹ آف سکیورٹی گارڈ پٹرول اور ٹرانسپورٹ سروسز کے چیئرمین۔ امور داخلہ پولیس اور جیل خانہ جات کے معاملات پر اتھارٹی کی حیثیت۔ ہوم افیرز سلیکٹ کمیٹی کے ممبر 1979ء میں اور 1987ء میں کمیٹی کے چیئرمین۔ 1980ء اور 1987ء کے دوران ہوم

کر رہے ہیں۔ ہمارے سوالوں کے جوابات دے رہے ہیں۔ انہیں پاکستان میں منشیات اور اسلحے کے بڑھتے ہوئے استعمال پر سخت تشویش ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس سے آپ کے معاشرے کا تار و پود بکھر جاتا ہے۔ انہوں نے اسلحے کے لائسنس جاری کرنے پر بھی تنقید کی۔

اسلحے کے حصول کی آزادی کے پیش نظر امریکہ میں ہر سال کم از کم 22 ہزار افراد بندوق سے ہلاک ہوتے ہیں۔ برطانیہ 1920ء سے سخت کنٹرول چلا آ رہا ہے۔ ہمارے ہاں گزشتہ 15 سال میں صرف ایک دو مقدمات ایسے آئے ہیں۔ جن میں اسلحے کا استعمال ہوا۔

انہوں نے کہا کہ ہم ان لعنتوں کے خاتمے کے لیے پاکستان کے ساتھ مل کر کام کرنے کو تیار ہیں۔ جب




لندن کے اسٹروڈ کورٹ اور ٹوٹنگ مارکیٹ کا ایک منظر

افیرز سلیکٹ کمیٹی کے اور نسلی تعلقات اور امیگریشن کی سب کمیٹی کے چیئرمین بعد ازاں 1988ء میں اسی کمیٹی کے چیئرمین۔ صدر پاکستان نے 1991ء میں انہیں ہلال قائداعظم کے اعلیٰ ترین اعزاز سے نوازا۔

1979ء سے 1983ء کی معیاد میں سٹی آف ویسٹ منسٹر بیڈنگٹن سے ممبر پارلیمنٹ۔ پھر 1983ء سے ویسٹ منسٹر نارتھ کے رکن چلے آ رہے ہیں۔

وہ پاکستان کے دوست ہیں۔ کئی اہم مسائل پر پاکستان کے حق میں آواز بلند کر چکے ہیں۔ پاکستان کئی بار سرکاری دورے پر آ چکے ہیں۔ کھڑکی سے دریا آہستہ بہتا نظر آ رہا ہے۔ وہ انتہائی دوستانہ لہجے میں بات

ناجائز اسلحہ اور ناجائز منشیات مل جاتے ہیں۔ تو وہ معاشرے کے لیے انتہائی خطرناک ہو جاتے ہیں۔ پاکستان میں اب یہی ہو رہا ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ یہ دونوں افغان جنگ کا ورثہ ہیں۔ اب بھی آپ کے ہاں 35 لاکھ کے قریب افغان پناہ گزین موجود ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جنرل ضیاء نے افغانستان سے روس کی فوجیں واپس بھیجنے پر بہت زور دیا تھا۔ روس تو کراچی کے گرم پانیوں تک آنا چاہتا تھا۔ لیکن افغانستان نے روس کی طاقت کا شیرازہ بکھیر دیا۔ افغان جنگ کے اور بھی منفی نتائج پاکستان کو برداشت کرنا پڑے ہوں گے۔ لیکن یہ سب سے زیادہ نقصان دہ رہے ہیں۔

پھر بات چل پڑتی ہے برطانیہ میں غیر قانونی طریقوں سے آنے والوں کی۔ سر جان وہیلر کا کہنا ہے کہ برطانیہ تارکین وطن کے لیے ہمیشہ ایک محبوب ملک رہا ہے۔ جن ملکوں میں برطانیہ کی کبھی حکمرانی تھی۔ وہاں کے نوجوان اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ کا رُخ ہی اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ کو ٹرانسپورٹ اور کئی صنعتوں میں کام کرنے والوں کی ضرورت تھی۔ اس لیے برصغیر اور دوسرے ملکوں سے لوگ بڑی تعداد میں آئے۔ لیکن اب ضرورت سے زیادہ ہوگئے ہیں، اور ان میں سے اکثر یہیں قیام پذیر ہوگئے ہیں۔

اس لیے اب قوانین سخت کیے جارہے ہیں۔

وہ کہنے لگے کہ پاکستان میں بے روزگاری کا مسئلہ بھی ہے۔ اور صنعتی ترقی نہ ہونے کا بھی۔ پھر وہاں کٹر مذہبی عناصر زیادہ حاوی ہورہے ہیں۔ اس لیے ملک کی معیشت خطرے میں ہے۔ سود کے مسئلے پر حکومت بحران کا شکار ہے۔

پھر بات ہوئی طویل المعیاد منصوبہ بندی پر۔ ان کا کہنا ہے کہ ویسے تو یہ ضروری ہے لیکن غیر متوقع اور پہلے سے تصور نہ کیے گئے واقعات اس طرح رونما ہوتے ہیں کہ سارے منصوبے دھرے رہ جاتے ہیں۔ آپ کے ہاں ساری منصوبہ بندی تباہ کن سیلابوں کے باعث متاثر ہوگئی۔ آپ کو امدادی کاموں میں بہت رقم دینا پڑی جس سے آپ کے رواں ترقیاتی منصوبے متاثر ہوں گے۔ ایسی ناگہانی آفات سے پانچ سالہ منصوبے بھی زد میں آجاتے ہیں۔ آپ کی کپاس بھی بارش اور سیلاب سے برباد ہوئی ہے۔ آپ جیسا ترقی پذیر ملک اب کس طرح اپنی معیشت سنبھال سکتا ہے۔

انہوں نے کہا کہ طویل المعیاد منصوبہ بندی کے ساتھ ساتھ فوری نوعیت کی منصوبہ بندی ناگزیر ہے۔ جو آپ کو وقت کی بدلتی صورت حال کے ساتھ ساتھ کام چلانے کا موقع دے سکتی ہے۔

سر جان وہیلر کو اب کہیں جانا ہے۔ اس لیے وہ اجازت لے رہے ہیں۔ ان کا ارادہ ہے جلد ہی پاکستان آنے کا، لیکن پہلے ان کے وزیر خارجہ آئیں گے۔ وہ بھی کسی وقت کراچی، لاہور، پشاور، اسلام آباد دوبارہ دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔

ہم اجازت لے کر پارلیمنٹ ہاؤس سے باہر آتے ہیں۔ اب شام کے سائے پھیل رہے ہیں۔ مسز کلیئر ہم سے اور ہم ان سے اجازت لے رہے ہیں۔ ہم ان کی رفاقت کا شکریہ ادا کررہے ہیں۔ کتنی صدیوں میں سے وہ ہمیں ساتھ لیے گزری ہیں۔ ان کے چہرے پر ایک لمحے بھی بیزاری یا تناؤ کا احساس نہیں ہوا ہے۔

ہم اسٹاک ویل واپس پہنچ گئے ہیں۔ دن بھر اتنی اہم اور یادگار چیزیں دیکھی ہیں کہ ٹیوب میں کچھ دیکھنے کو جی نہیں چاہا۔

## ہمارے جام صاحب

بیلسائز پارک کے کبوتر اب بھی فٹ پاتھ پر اترتے ہیں لیکن اس بنچ پر وہ اب کسی کو نہیں پاتے۔ اب انہیں اتنی باقاعدگی سے کوئی دانہ نہیں ڈالتا۔

ہمیں صفدر ہمدانی کے ہاں پہنچنا ہے۔ جہاں جام صادق علی مرحوم کو یاد کرنے والے احباب جمع ہیں۔ جن میں مقامی لوگ بھی شامل ہیں۔ جام صاحب ایک طویل عرصہ یہاں گزار کر گئے ہیں۔ اس لیے ان کی یادیں اب بھی لوگوں کے سینوں میں محفوظ ہیں۔

پیٹر اون، اور ان کی بیگم جام صاحب کو سب سے زیادہ یاد کرتے ہیں۔ وہ گیارہ برس سے زیادہ عرصے تک ان کے ہمسائے رہے ہیں۔ بیلسائز پارک میں جام صاحب کے گھر سے چند قدم کے فاصلے پر پیٹر صاحب کا فلیٹ ہے۔ وہ ان سے روزانہ ہی ملتے تھے۔ کبھی وہ جام صاحب کے گھر آجاتے۔ کبھی جام صاحب ان کے ہاں آتے۔

میں انہیں صبح صبح کبوتروں کو دانہ ڈالتے دیکھتا۔ وہ سڑک کے کنارے ایک بنچ پر بیٹھ جاتے۔ اور کبوتر فٹ پاتھ پر اترنے لگتے ایک عجیب سماں ہوتا تھا۔ اس وقت جام صاحب کسی کی طرف سے خلل پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ دانہ کبوتروں کو ڈال رہے ہوتے تھے۔ لیکن وہ کہیں اور کھوئے ہوتے۔ وطن کی یادیں انہیں گھیر لیتی تھیں۔

اس طویل جلاوطنی میں انہیں اپنے شہر کراچی کو ایک

بار دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ بھی صرف جہاز کی کھڑکی سے۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔

مجھے یاد ہے جب محمد خان جونیجو وزیر اعظم کی حیثیت سے لندن کے دورے پر آئے۔ تو وہ ہر شام کسی پروٹول کے بغیر جام صادق علی سے ملنے آجاتے تھے۔ انہوں نے کئی بار جام صاحب سے کہا کہ آپ پاکستان واپس کیوں نہیں آجاتے۔

جام صاحب ہمیشہ جواب دیتے۔ جن کی خاطر اتنی جلاوطنی برداشت کی ہے۔ جب وہ کہیں گے تب ہی گھر جاؤں گا۔

متحدہ عرب امارات کے حکمران ان کے ذاتی دوست تھے۔ انہوں نے کئی بار کوشش کی کہ ان کی حکومت پاکستان سے صلح ہو جائے۔ جنرل ضیاء سے مصالحت ہو جائے۔ لیکن انہوں نے صاف انکار کیا کہ جنہوں نے میرے لیڈر کو قتل کیا ہے۔ ان سے ہاتھ نہیں ملاؤں گا۔

لیکن جب وقت آیا۔ ان کے لیڈر کی بیٹی نے حکومت بنائی۔ تو وہ انتظار کرتے رہے کہ انہیں بلاوا آئے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ بہت دکھی تھے۔ یہی تاریخ میں بیٹی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ جس سے حالات وواقعات نے بالکل ہی مختلف رُخ اختیار کر لیا۔

میں 1984ء میں پاکستان گیا۔ ان کے گاؤں بھی گیا۔ انہوں نے یہیں سے سب انتظامات کیے۔ ان کی عدم موجودگی کے باوجود میرا ہر طرح سے خیال رکھا گیا۔ ہر سہولت فراہم کی گئی۔

پھر میں اس وقت گیا جب وہ خود پاکستان پہنچ چکے تھے۔ تو اسلام آباد ایئر پورٹ پر وہ خود مجھے لینے آئے۔

وہ لندن میں تھے۔ تنگدستی کے باوجود اخراجات کی کوئی فکر نہیں کرتے تھے۔ پاکستان سے کوئی بھی اہم شخص آتا یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ انہیں ملے بغیر واپس جائے۔ اور پھر وہ ان کا مہمان ہی بن جاتا تھا۔

وہ ہمارے لیے کرسمس پر پارٹی کا انتظام کرتے تھے۔ وہ ہر شخص کو خوش دیکھنا چاہتے تھے۔ ہم نے پاکستان کے ہر بڑے شخص کو ان کے گھر پر دیکھا۔ غلام مصطفیٰ جتوئی، محمد خان جونیجو۔

مس بھٹو سے ہماری ملاقات ان کے ہاں ہوئی۔ اتفاق سے یہ وہی دن تھے۔ جب جتوئی پارٹی سے الگ ہو رہے تھے۔ ان کے صاحبزادے پرانتی جتوئی بھی یہاں تھے۔ بے نظیر ان سے پوچھ رہی تھیں۔ تمہارے والد ہمیں کیوں چھوڑ رہے ہیں۔

وہ سندھ کے وزیر اعلیٰ نہیں تھے۔ حاکم سندھ تھے۔ مجھے انہوں نے اپنی بیٹی کی شادی میں شرکت کے لیے بلایا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کی زندگی کا چراغ بجھنے والا



بی بی سی لندن آفس کا بیرونی منظر

ہے۔ وہ موت کی وادیوں میں جانے والے ہیں۔ لیکن انہوں نے بے مثال ہمت کا مظاہرہ کیا۔ وہ کہتے تھے کہ ہر ایک کو ایک دن مرنا ہے۔ کیوں نہ جرأت مندی سے مقابلہ کیا جائے۔

وہ ایک زبردست میزبان تھے۔ ہر شخص کے مزاج کا انہیں علم ہوتا تھا۔ کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دیتے تھے۔

پاکستان کی بدقسمتی کہ جناح صاحب بھی بہت جلد انتقال کر گئے۔

اور اب جام صاحب جیسا حکمراں ملا۔ وہ بھی جلدی رخصت ہو گئے۔

پیٹر اون اور ان کی بیگم کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ وہ جام صاحب کی جدائی شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔

جام صاحب کو یاد کرنے والے دوسرے بھی پیٹر ہی ہیں۔ پیٹر فریزر۔ ان کا تعلق ٹریڈ یونین سے ہے۔ وہ جام صاحب کو اس لیے پسند کرتے تھے کہ وہ ایک فوجی ڈکٹیٹر کے خلاف جدو جہد کر رہے تھے۔ لندن میں ٹریڈ یونین کے سرگرم رہنما اور کارکن بڑی تعداد میں جام صاحب سے ملتے تھے۔ ان کی عزت اس لیے کرتے تھے کہ وہ آمریت کیخلاف برسرپیکار ہیں۔

وہ ہم سے پہروں بات چیت کرتے تھے۔ پوچھتے

تھے کہ کیا کیا جائے۔ جدوجہد کس طرح جاری رکھی جائے۔ ہم انہیں یہی مشورہ دیتے تھے کہ جاگیرداری نظام ختم ہوگا تو پاکستان میں جمہوریت زیادہ مستحکم ہو سکے گی۔

انہیں یاد آ رہا تھا کہ انہوں نے پاکستان میں انسانی حقوق کی پامالی کے خلاف ایک سیمینار کا اہتمام کیا تھا۔ جس میں لندن کے ٹریڈ یونین رہنماؤں نے بھی تقریریں کیں۔ اور پاکستان کے عوام کی کھل کر حمایت کی۔ جام صاحب اس روز بہت خوش تھے۔ ہماری شرکت اور حمایت پر شکریہ ادا کر رہے تھے۔

وہ برطانیہ کی سیاست کا بھی گہرا مطالعہ کرتے تھے۔ بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ اسی طرح امریکی سیاست پر بھی ان سے طویل گفتگو ہوتی تھی۔ عالمی معاملات پر ان کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

پاکستان میں خواتین کے حقوق پر بھی وہ اکثر بات کرتے تھے کہ یورپ والے ہمارے مسائل سمجھ ہی نہیں سکتے انسانی حقوق کے اعتبار سے ہم بہت پسماندہ ہیں۔

پی پی پی کے پوسٹر، ہینڈ بل تیار کروانے میں بڑی دلچسپی لیتے۔ مظاہروں میں خود حصہ لیتے۔ برطانوی انتخابات میں بھی وہ سرگرمی سے حصہ لیتے۔ لیبر پارٹی کے امیدوار کے لیے انہوں نے ہمارے ساتھ مل کر کام کیا تھا۔

یہ عجیب بات ہے کہ تیسرے صاحب بھی پیٹر ہیں۔ پیٹر سپٹلنگ' وہ اپنے علاقے سے کونسلر بھی رہ چکے ہیں۔ وہ بھی جام صاحب کی آمریت کے خلاف جدوجہد کے باعث ان کے قریب تھے۔ پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کے لیے وہ جام صاحب کے ساتھ کئی میٹنگوں اور جلسوں میں شریک ہوئے۔

مسز لڈی بھی پرنم آنکھوں سے جام صاحب کو یاد کر رہی ہیں۔

وہ بہت ہی دوست، فراخدل، اور اپنے رفیقوں سے ہمیشہ وفا کرنے والے تھے۔ وہ اپنے خاندان سے بھی بہت وابستگی رکھتے تھے۔ اور انتہائی وفادار، مخلص، انہیں انسانوں کے چہرے پڑھنے کا ملکہ حاصل تھا۔ وہ گفتگو سے، قیافے سے اندازہ کر لیتے تھے کہ یہ شخص کتنا مخلص ہے۔ اور اس کی باتوں میں کتنی صداقت ہے۔

لوگوں کی مدد کرنے میں انہیں ہمیشہ خوشی محسوس ہوتی تھی۔

اپنے خاندان کے بہت زیادہ گرویدہ، اپنے بھائی جام انور علی کو ہمیشہ بہت یاد کرتے تھے۔ ان کی تصویر لے کر بیٹھتے رہتے اور روتے رہتے کیونکہ وہ ان کی تدفین میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔

مسٹر بھٹو کی پھانسی کی خبر آئی تو بھی بہت افسردہ رہے۔ بہت روئے، بار بار کہتے تھے کہ یہ پاکستان میں کیا ہو گیا۔

جام صاحب کو یاد کرنے والے یہ سب لوگ انہیں بابا کہہ کر یاد کر رہے تھے۔ بابا پاکستان کے لیے ایک اثاثہ تھا۔ پی پی پی والوں کے لیے ایک اثاثہ تھا۔

بیلسائز پارک کے کبوتر اب بھی فٹ پاتھ پر اترتے ہیں۔ لیکن اس بنچ پر وہ اب کسی کو نہیں پاتے۔ اب انہیں اتنی باقاعدگی سے کوئی دانہ ڈالنے نہیں آتا۔

بیلسائز پارک کے دکاندار بھی جام صاحب کو دل سے یاد کرتے ہیں۔ انہوں نے جام صاحب کو ہر حال میں دیکھا ہے۔ جب ان کے پاس ہزاروں پونڈ ہوتے تھے۔ جب وہ بالکل خالی ہاتھ ہوتے تھے۔ اس وقت وہ ان سے اُدھار لینے آتے تھے۔ کئی کئی سو پونڈ کا سامان وہ اُدھار لیتے تھے۔ یہ ان کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ ان کی مہمان نوازی کا تقاضا تھا۔ ان کے اپنے کھانے کو ان کے پاس نہ ہوتا لیکن وہ مہمان نوازی ترک نہیں کرتے تھے۔ ہر کھانے کے وقت روزانہ ان کے پاس چار پانچ سے زیادہ مہمان ہوتے تو وہ خوش رہتے ورنہ وہ بے چین ہوتے تھے۔

یہ ریستوران اور بار ہے۔ اینڈی تھیول کہہ رہے ہیں۔ وہ بہت ہی نفیس شخصیت تھے۔ سخاوت شعار، ہماری روزانہ ہی ملاقات ہوتی تھی۔ انہیں مہمان نوازی سے عشق تھا۔ مہمانوں کی خدمت کر کے بے انتہا مسرت محسوس کرتے تھے۔ وہ ہمارے کچن میں جاتے۔ دیکھتے کہ کیا پک رہا ہے۔ کیسے پک رہا ہے۔ پھر وہ اپنے ہاں کھانے خود تیار کرتے۔ ہمیں یہیں خوشبو آتی تھی۔

لورین بائیو تھوطیما ارن، ایک ہی نام ہے۔ اتنے

لبے نام والی لڑکی دبلی پتلی اور سیاہی مائل رنگت کی ہے۔ یہ کیمسٹ اور جنرل اسٹور کی سیلز گرل ہے۔

آپ جام کے ملک سے آئے ہیں۔ کیا آدمی تھا وہ، خوش رہنا چاہتا تھا۔ خوش رکھتا تھا۔ دوستوں کا دوست اپنی بیگم سے بہت زیادہ پرخلوص، زندگی کو ہنسی خوشی گزارنے کا قائل، اس کے بیوی بچے یہاں آتے تو اس کی خوشی دیدنی ہوتی تھی۔ وہ انسانیت نواز تھا۔

سب سے اچھے لمحات وہ ہوتے تھے۔ جب وہ کبوتروں کو دانہ کھلاتا تھا۔ بڑے انہماک سے بڑی محبت سے وہ صاحب ذوق تھے۔ حسین چہروں کو پسند کرتے تھے۔ وہ اپنے وطن کے شاعروں، صوفی شاعروں کے شعر سنا کر حسن کی داد دیتے تھے۔

ہر ایک کی عزت کرتے تھے، احترام سے پیش آتے تھے۔

یہ ان سے کرایہ اور کھانے کی قیمت وصول کرتے ہیں۔ کچھ مہمانوں سے تو یہ اسٹور والے پوچھ بھی لیتے تھے کہ آپ کتنے کرایے پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ جب بتاتے کہ ہم تو مہمان ہیں تو وہ حیران ہوتے کیونکہ مغرب میں تو اتنے بڑے پیمانے پر مہمان نوازی کا تصور نہیں ہے۔ جام صاحب کے گھر تو بیک وقت پندرہ لوگ بھی قیام پذیر ہوتے تھے۔ ان کے پاس پیسے نہیں بھی ہوتے۔ تب بھی ہو لوگوں کو زبردستی مہمان ٹھہراتے۔ آس پاس کے اسٹورز سے اُدھار سامان خریدتے۔ مہمانوں کی خاطر تواضع میں کمی نہ آنے دیتے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

اسے یوں پڑھ لیجیے کہ افسوس تم کو جام سے صحبت نہیں رہی۔



پارلیمنٹ ہاؤس لندن کا اندرونی منظر

دریائے ٹیمز کا خوبصورت نظارہ

ہمارے پاس وقت کم ہے۔ جام صاحب کی یادیں، بیلسائز پارک میں ہر گام پھیلی ہوئی ہیں۔ کتنا طویل عرصہ جلاوطنی میں انہوں نے یہاں گزارا۔ نہ جانے کس کس کیفیت سے وہ گزرے ہوں گے۔ لیکن سب ان کی دریا دلی کو سخاوت کو یاد کررہے ہیں۔ وہ اپنے مہمانوں کی خاطر مدارات کے لیے جس طرح سامان خریدتے تھے۔ اس سے بعض دکاندار تو یہ سوچتے تھے کہ شاید انہوں نے کوئی ہوٹل بنا رکھا ہے۔ جہاں لوگ قیام کرتے ہیں۔ اور

ہم ان کی جلاوطنی کے دور میں تو لندن نہیں آسکے کیونکہ ہم وطن سے باہر نہیں جاسکتے تھے۔ ہم پہلی بار بیلسائز پارک کی یہ رہائش گاہ دیکھ رہے ہیں۔ اس وقت اس کے دروازے کو لکڑیاں ٹھونک ٹھونک کر بند کیا گیا ہے۔ کیونکہ جام صاحب نے اپنے آخری دنوں میں اس کی تزئین و آرائش کروائی۔ وال پیپر لگوایا۔ قالین بچھوائے۔ مکان خالی تھا۔ اس لیے لندن کے بے گھر اس میں گھس گئے۔ برطانیہ میں قانون کچھ ایسا ہے کہ گھر اگر

خالی ہو۔ اور اس پر بے گھر قبضہ کرلیں۔ تو اسے آسانی سے خالی نہیں کروایا جاسکتا۔ بے گھر لوگوں کا حق فائق سمجھا جاتا ہے۔ اور جب تک ان بے گھروں کے لیے رہائش کا انتظام نہ ہو جائے تو قبضے والے گھر سے انہیں بے دخل نہیں کروایا جاسکتا۔ یا پھر خالی گھر کو اسی طرح بند کر کے رکھنا پڑتا ہے۔ جام صاحب کی اس رہائش گاہ کو بے گھروں سے بڑی مشکل سے خالی کروانا پڑا۔ اپنے قیام کے دوران وہ وال پیپر پھاڑ گئے۔ فرنیچر کو نقصان پہنچا گئے۔ یہ بھی احساس محرومی کا ایک ردعمل ہوتا ہے۔

ہم پینراون سے اجازت لے رہے ہیں۔ وہ بار بار پوچھ رہے ہیں۔ آپ جام صاحب کے بارے میں تفصیل سے کب لکھیں گے۔ آپ کی کتاب کس زبان میں ہوگی۔ اسے انگریزی میں بھی ضرور شائع کروایئے گا۔ یہاں کافی لوگ جام صاحب کے بارے میں پڑھنا چاہیں گے۔

## لندن کی مرکزی مسجد

بڑے ہال میں [illegible] ہر نسل کے مسلمان جمع ہیں۔ [illegible] بھی ہیں نوجوان بھی بزرگ بھی۔ خواتین کے لیے بھی نماز کا الگ [illegible]

آج جمعہ ہے۔ آج ہی سے خنکی میں اضافہ ہو رہا ہے۔

اسٹروک کورٹ کے سبزہ زاروں میں جوگنگ اسی طرح ہو رہی ہے۔ مائیں بچوں کو اسکول بسوں تک چھوڑنے آرہی ہیں۔

جمعہ کی نماز اسلامی کلچرل سینٹرل اور لندن سینٹرل موسق (اسلامی ثقافتی مرکز اور لندن کی مرکزی مسجد) میں پڑھنے کا ارادہ ہے گزشتہ جمعے ہم آلٹن ٹاورز میں تھے۔ اور نماز جمعہ کی ادائیگی سے محروم رہ گئے تھے۔ مجید عباسی نمازوں کا اہتمام باقاعدگی سے کرتے ہیں۔ انہیں گزشتہ جمعے سے ہی بڑا قلق ہے۔ آج وہ ہر صورت میں مسجد میں وقت پر پہنچنا چاہتے ہیں۔

ٹیوب سے بیکر اسٹریٹ اسٹیشن پر اتر کر ہم تیزی سے مسجد کی طرف رواں ہیں۔ ہم صراط مستقیم پر ہیں۔ پھر بھی ہم راستے میں پوچھتے جاتے ہیں۔ انگریز بڑے خلوص سے ہمیں پتا بتا رہے ہیں۔ ساتھ ساتھ یہ بھی پوچھتے ہیں۔ جمعہ کی نماز پڑھنی ہے؟ انہیں احساس ہے کہ مسلمان جمعہ کی دوپہر نماز جمعہ زیادہ اہتمام سے پڑھتے ہیں۔

جوں جوں لندن کی مرکزی مسجد قریب آرہی ہے۔ مختلف ممالک کے مسلمان پیدل، گاڑیوں میں مسجد کی طرح رواں دکھائی دے رہے ہیں۔ مسجد کے قریب عرب مسلمانوں کی دکانیں بھی ہیں۔ مسجد کے باہر فٹ پاتھ پر ایک صاحب کپڑے کی ٹوپیاں، تسبیحیں، کتابیں اور ویڈیو کیسٹ فروخت کر رہے ہیں۔ ہم مسجد کے احاطے میں داخل ہو رہے ہیں۔ ایک عظیم اجتماع ہے۔ جن میں کالے بھی ہیں گورے بھی۔ گندمی بھی عربی لباس میں بھی۔ شلوار قمیض میں بھی، سوٹوں میں بھی۔ رنگ اور نسل کے لحاظ سے تم میں سے کسی کو کسی پر فوقیت نہیں ہے۔

تم سب اپنے تقویٰ کے اعتبار سے اللہ کے نزدیک ہو گے۔

لندن کے عین قلب میں اذان کی آواز۔ گونجتی ہوئی کتنی اثر انگیز محسوس ہو رہی ہے۔

ماحول پر ایک تقدس چھا رہا ہے۔

ایک طرف کچھ فلسطینی اپنا لٹریچر تقسیم کر رہے ہیں۔

اپنے وطن سے محروم۔ اپنی زمین سے بے دخل بہادر اور جرات مند لوگ نہ جانے کتنے برس سے وطن کے حصول کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ قربانیاں دے رہے ہیں۔ خون کے نذرانے دے رہے ہیں۔ کتنی نسلیں اس مقدس جدوجہد کی نذر ہو چکی ہیں۔ مگر انہوں نے حوصلے نہیں ہارے ان کی ہمت نے جواب نہیں دیا ہے۔ ان کی نئی نسل بھی حریت کی مشعل اسی طرح روشن کیے ہوئے ہے۔ ان کی پیشانیاں اسی طرح چمک رہی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں جذبوں کی قندیلیں اسی طرح جگمگا رہی ہیں۔

مسجد کے احاطے میں سبھی ایک ہیں۔ سعودی بھی، سوڈانی بھی، مصری بھی، اردنی بھی فلسطینی بھی، ترک بھی۔ پاکستانی بھی، ہندوستانی مسلمان بھی، بنگلہ دیشی بھی، افریقہ کے مسلمان بھی، سفید فام مسلمان بھی۔

مصر، ترکی، اور ایران میں شائع شدہ کتابیں بک

رہی ہیں۔ تصویریں بھی، ویڈیو کیسٹ بھی۔

مسجد کے بڑے ہال میں ہر براعظم کے ہر نسل کے مسلمان جمع ہیں۔ جن میں بچے بھی ہیں۔ نوجوان بھی بزرگ بھی۔ خواتین کے لیے بھی نماز کا الگ انتظام ہے۔ وہ باجماعت جمعہ ادا کریں گی۔

مسلمان پوری دنیا میں آج کل ابتلاؤں سے دوچار ہیں۔ کہیں آپس میں برسر پیکار ہیں۔ کہیں دوسروں کے آلہ کار ہیں۔ کہیں غیر مسلموں کے جبر کا شکار ہیں۔ لیکن یہاں سب ایک ہیں۔



بش ہاؤس لندن کے مختلف مناظر

خطیب منبر پر بیٹھ چکے ہیں۔ ان کی تقریر انگریزی میں بھی ہے۔ عربی میں بھی۔ وہ مسلمانوں میں اتحاد پر زور دے رہے ہیں۔ وہ کسی خاص ملک یا حکومت کا نام نہیں لے رہے ہیں۔ وہ پوری مسلم امہ کے اتحاد کی بات کر رہے ہیں۔ جدید عالم کا ذکر کر رہے ہیں۔ ان کی تقریر میں بہت توازن ہے۔ الفاظ کا انتخاب انتہائی موزوں، مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا ذکر، مستقبل کے استحکام اور اتحاد کی توقعات۔

خوش قسمت ہیں مسلمان کہ انہیں لندن کے عین وسط میں۔ بلکہ یورپ کے عین قلب میں اتنی بڑی جگہ نصیب ہوگئی ہے۔ جہاں انہوں نے اپنی مسجد بھی تعمیر کرلی ہے۔ اور ایک مرکز ثقافت بھی قائم کرلیا ہے۔

جہاں نہ صرف وہ اپنے معبود حقیقی کے سامنے سربسجود ہو سکتے ہیں۔ اپنے لیے۔ مسلم امہ کے لیے دعائیں کر سکتے ہیں۔ اپنے لیے مغفرت کی درخواست کر سکتے ہیں۔ بلکہ اپنی ثقافت کے فروغ کے لیے عملی کوششیں بھی کر سکتے ہیں۔

نمازیوں کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔

مسجد کا ہال بھرتا جا رہا ہے۔

تقریر ختم ہو چکی ہے۔

سنتیں ادا کی جا رہی ہیں۔

اذان کی آواز گونج رہی ہے۔

جمعہ کا خطبہ، اس میں بھی عربی کے ساتھ انگریزی زبان۔

سنتیں اور نوافل کی ادائیگی کے بعد باہر آتے ہیں۔ تو بہت سے لوگ کتابیں خرید رہے ہیں۔ جو انگریزی میں بھی دستیاب ہیں اور عربی میں بھی۔ زیادہ تر فلسطین کے مسئلے پر ہیں۔ مشرق وسطیٰ کی تاریخ، غریب وسادہ ورنگین ہے داستان حرم۔ مسلم ممالک کی تصاویر بھی دستیاب ہیں۔

لنچ بھی یہاں پیک ڈبوں میں فروخت ہو رہا ہے۔

بہت سے خاندان اپنا کھانا لائے ہوئے ہیں۔ وہ مسجد کے باہر احاطے میں نیچے تہ خانے میں بیٹھ کر کھا رہے ہیں۔ ایک سیلف سروس ریستوراں بھی ہے۔ کھانا کھانے میں مصروف خاندان زیادہ تر سیاہ فام ہیں۔ افریقہ سے تعلق رکھنے والے، ان میں ملازمت پیشہ بھی ہیں۔ کارخانوں میں کام کرنے والے بھی۔ اور اعلیٰ تعلیم

حاصل کرنے کے لیے مختلف ممالک سے آئے ہوئے طلبہ بھی۔

نماز جمعہ لندن اور اس کے گردو نواح میں مقیم مسلمانوں کو ہفتے میں ایک بار یک جا ہونے کا موقع دیتی ہے۔ وہ یقیناً ایک دوسرے کے مسائل سے بھی آگاہ ہوسکتے ہیں۔ مسلمانوں کو درپیش مسائل کا حل بھی تلاش کرسکتے ہیں۔

کتنے عظیم لوگ ہیں جنہوں نے اس مرکز ثقافت اور مرکزی مسجد کی تعمیر کے لیے کوششیں کیں۔ اور جن کی محنت اور دولت سے یہ عبادت گاہ معرض وجود میں آئی۔ جہاں سے اللہ اکبر کی صدا اہل کلیسا کے عین قلب میں گونجتی ہے۔

ادائیگی فرض کے احساس سے مطمئن ہم مسجد سے باہر نکل رہے ہیں۔ اور مسلمانوں کے دمکتے چہرے دیکھ رہے ہیں۔

ریجنٹ پارک سے اب ہمیں ریجنٹ پیلس پہنچنا ہے۔ جہاں حبیب الرحمٰن ہمارا انتظار کررہے ہیں۔

ہم سب کو پھر حبیب بینک کی لندن برانچ میں پہنچنا ہے۔

ارشد میر حبیب بینک لندن کے سربراہ ہیں۔ بینکوں کے صدر دفاتر تک پہنچنے کے لیے زیر زمین ریلوے اسٹیشن بھی بینک ہی کہلاتا ہے۔ دیارِ غیر میں اپنے ملک سے وابستہ دفاتر دیکھ کر کتنی خوشی ہوتی ہے۔ یہ انہی لوگوں کو معلوم ہے جو وطن سے دور اِن مقامات کو دیکھ چکے ہوں۔ سبز پرچم کہیں لہرا رہا ہو تو محسوس ہوتا ہے کہ ہم سمندر کے طویل سفر کے بعد خشکی پر پہنچ گئے ہیں۔ پی آئی اے، حبیب بینک، نیشنل بینک، یونائیٹڈ بینک، الائیڈ بینک، مسلم کمرشل بینک دیکھ کر ایسی ہی مسرت ہوتی ہے۔

لندن برانچ میں اپنے ہی پاکستانی بھائی زیادہ نظر آرہے ہیں۔ حبیب الرحمٰن کو تو پورا لندن جانتا ہے۔ وہ ایک ایک سے ملوا رہے ہیں سب نے ہمارا نام بھی سن رکھا ہے۔ ''اخبار جہاں'' کے حوالے سے ''معیار'' کے حوالے سے۔ شاعری کے ذریعے۔ حسن مشرق بھی یہاں کشش ہے۔ پاکستان کی خواتین اپنے روایتی لباسوں میں بڑی دلچسپی سے بینکنگ میں مصروف ہیں۔

ارشد میر بینکنگ کے پرانے ماہر ہیں۔ لندن جیسے تجارتی مرکز میں بینک چلانا۔ وہ بھی قومی تحویل میں لیا گیا بینک۔ بڑا سخت مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ پرائیویٹ بینکوں کی طرح آزادیاں نہیں ہیں۔

ارشد میر کا کہنا ہے کہ حکومت پاکستان کی نئی اقتصادی پالیسیوں کے باعث اب پاکستان میں سرمایہ کاری کی طرف کافی رجحان ہے۔ ہمیں بھی اپنے بینک کے لیے کام کرنا نسبتاً آسان ہورہا ہے۔ فارن ایکس چینج سے پابندیاں ہٹائے جانے کے باعث اب پاکستان کے نیشنلائزڈ بینکوں کو بھی ڈیپازٹ مل رہے ہیں۔ پہلے جو پاکستانی پابندیوں کے باعث پاکستانی بینکوں میں اکاؤنٹ نہیں کھلواتے تھے۔ اب بے خوف و خطر اکاؤنٹ کھلوا رہے ہیں۔ اگر ایسی ہی پالیسیاں اپنائی جاتی رہیں تو انشاء اللہ پاکستانی بینکوں کے ڈیپازٹ اور بڑھ جائیں گے۔

ہم آج پھر جنگ لندن کے دفتر جارہے ہیں۔ آج کا دن اس لیے اہم ہے کہ حبیب الرحمٰن صاحب سولہ برس بعد جنگ کے دفتر آئے ہیں۔ ایک طویل جدائی اپنے انجام کو پہنچ گئی ہے۔ حبیب صاحب اب پھر جنگ سے وابستہ ہونے والے ہیں۔ آج کے دن اس کی شروعات ہورہی ہیں۔ جنگ لندن میں کچھ لوگ اس پر حیران ہیں۔ کچھ پریشان، کچھ خوش کہ پرانے لوگ واپس آرہے ہیں۔

میر شکیل الرحمٰن برسوں کا فاصلہ منٹوں میں طے کرنے کے قائل ہیں۔ وہ ایک صاحب سے کہہ رہے ہیں آپ جانتے ہیں حبیب صاحب کو۔ یہی تو ہیں جنہوں نے 'جنگ' یہاں شروع کیا تھا۔

میر شکیل الرحمٰن آج بھی اسی طرح پاکستان سے رابطے میں ہیں۔ کبھی ٹیلیکس کے ذریعے تازہ ترین رپورٹ، کبھی فون پر کراچی ''نیوز'' سے۔ کبھی جنگ لاہور سے رابطہ۔

جنگ گروپ آف نیوز پیپرز کے ایڈیٹر انچیف کے لیے اسی طرح حالات سے لحہ لحہ آگاہی ضروری ہے۔

مخدوم امین فہیم اپنے والد مخدوم زمان طالب المولیٰ

کے ساتھ لندن میں مقیم ہیں۔ مخدوم طالب المولیٰ اپنے علاج اور چیک اپ کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ بھارتی کورٹ۔ اتنی خوبصورت عمارت والوں نے کانوں بھرا نام کیوں رکھا ہے۔ یہ معلوم نہیں۔ اس کثیر منزلہ عمارت کے مختلف اپارٹمنٹس میں کئی کئی ماہ کرائے پر رہنے والے خاندان رہتے ہیں۔ ایک اپارٹمنٹ مخدوم خاندان نے لے رکھا ہے۔ قبلہ سائیں کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ ڈاکٹر چیک اپ کررہے ہیں۔ دوائیں تجویز کررہے ہیں۔ بیٹے انتہائی سعادت مندی سے ان کی خدمت میں مصروف ہیں۔

ایک اپارٹمنٹ میں رفیق کا چیلو اپنے اہل خانہ کے ہمراہ مقیم ہیں۔ رفیق کا چیلو سندھ کے ایک صاحب طرز زمیندار ہیں۔ ان کے فارم کے آم تو دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ ان کے باغ کے صحتمند آموں پر "کا چیلو" کے اسٹکر آموں کی عمدگی کی ضمانت ہوتے ہیں۔ زمیندار اور بھی ہیں۔ لیکن وہ جس نفاست اور اسٹائل سے زندگی گزارتے ہیں۔ وطن میں ہوں یا باہر۔ کراچی میں ہوں یا گاؤں میں ان کا اپنا ایک انداز رہتا ہے۔ وہ عبوری حکومت میں وزیر بھی مقرر کیے گئے تھے۔ لیکن وزارت ان کے لیے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔ سندھ کے اعلیٰ سیاسی اور سرکاری حلقوں میں ان کا اپنا ایک مقام رہا ہے۔ سول بیوروکریسی ہو یا ملٹری بیوروکریسی ان کے سب سے روابط ہیں۔ اس لیے ہمیشہ باخبر رہتے ہیں۔

لندن میں ان کے ساتھ یہ شام یادگار ہوتی جارہی ہے۔ ساتویں منزل پر ان کے اپارٹمنٹ کے دریچوں سے لندن کی روشنیاں دور دور تک پھیلی نظر آرہی ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ کہکشاں زمین پر بچھ گئی ہے۔ ہلکی ہلکی موسیقی ابھر رہی ہے۔ اس پس منظر میں سندھ کی سیاست پر بات چیت ہورہی ہے۔

رات آہستہ آہستہ ڈھل رہی ہے۔ لیکن لندن کی روشنیاں بجھ نہیں رہی ہیں۔ لندن اور حسین ہورہا ہے۔ اب پھر اختتام ہفتہ آگیا ہے۔ آج کی رات پھر لندن میں رونق رہے گی پھر دو روز کی چھٹیاں ہیں۔ آج سے لوگ لندن کی سڑکوں پر آجائیں گے۔ زیادہ تر باہر چلے جائیں گے۔

پانچ دن یہ لوگ مشین بنے رہے۔ ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ اپنے ملک کی معیشت کو رواں اور طاقت ور رکھنے کے لیے خوب محنت سے کام کیا ہے۔ اور وہ دو دن اپنے گھر والوں کے ساتھ آپس میں گزاریں گے۔

لیکن وہ بے چارے بے گھر، جو پارکوں میں۔ خالی جگہوں میں پناہ لینے پر مجبور ہیں ان کے لیے اختتام ہفتہ یا ہفتہ وار تعطیلات کوئی معنی نہیں رکھتیں ہیں۔ انہیں تو یہ احساس ہے کہ ہوا کتنی خنک ہے۔ سردی کتنی قائم ہے۔ جو برچھیوں کی طرح ان کے جسموں سے گزر جاتی ہے۔

## ٹیمز کی لہریں کچھ کہتی ہیں

**زندگی ملتی ہے تو اتنی مختصر کیوں ملتی ہے**
**[illegible]**
**جب کی شاخ اتنی جلدی کیوں سوکھ جاتی ہے**

اب لندن سے جانے کا وقت آرہا ہے۔ تو لندن اور خوبصورت محسوس ہونے لگا ہے۔ اسٹرڈوک کورٹ کے سبزہ زاروں سے۔ دریچوں سے انسیت ہورہی ہے۔ ناشتا آج ناگرہ نے اور بھی زوردار بنایا ہے۔ اجنبی دیس میں آپ کو پراٹھا مل جائے۔ اور آلو کی بھجیا۔ تو اور کیا چاہیے۔ ولائتی اور دیسی ناشتے کا امتزاج یوں۔ کہ ساتھ میں اورنج جوس کا کاغذی پیک۔ اور بی بی سی ٹیلی ویژن سے گڈ مارننگ کا پروگرام۔ آج کچھ شاپنگ کا مرحلے بھی طے کرنا ہے۔ گھر جاکر بھی کچھ جواب دینا ہے۔ وہاں تو کچھ ملبوسات۔ برقی آلات سے۔ چاکلیٹوں سے لدے پھندے پہنچیں گے تبھی سرخروئی ہوگی۔ وہاں تو برطانیہ کی حسین وادیوں۔ ندیوں اور سرسبز پہاڑوں کے تذکروں سے کام نہیں چلے گا۔

شاپنگ کی مہارت تو خواتین کو ہوتی ہے۔ ہم اپنے وطن میں تو کبھی شاپنگ نہیں کرتے ہیں۔ اس لیے غیر ممالک میں خریداری کے وقت ہر چیز اچھی بھی لگتی ہے۔ اور سستی بھی، چاہے اپنے ملک میں عین وہی مصنوعات ملتی ہوں۔ اور کم نرخوں پر ملتی ہوں۔ وہ تو جب آپ ساری شاپنگ کرکے خوش خوش وطن پہنچتے ہیں، اپنے تعلقات کے ذریعے یا اخبار نویس ہونے کے ناتے کسٹم والوں سے بچ کر گھر پہنچتے ہیں۔ چیزوں کی قیمتیں پوچھی جاتی ہیں۔ اور ان کا جب پاکستانی روپے میں حساب لگایا

جاتا ہے۔ تو بتایا جاتا ہے کہ یہ چیز تو صدر میں اتنے کی مل رہی ہے۔

اکثر اس تجربے کے بعد بھی شاپنگ کرنی ہی پڑتی ہے۔ وطن خالی ہاتھ لوٹنا اچھا نہیں لگتا ہے۔

انگریز کی اقتصادی حالت اتنی خراب ہوگئی ہے کہ وہ اپنی چھٹیوں کی قربانی بھی دینے لگا ہے۔ اکثر شاپنگ سینٹر اب ہفتے اور اتوار کو بھی کھلے رہتے ہیں۔ کیونکہ ہفتے بھر میں اتنی سیل نہیں ہوتی کہ دکانداروں کے اخراجات پورے ہوسکیں۔ پکاڈلی سرکس میں ہفتے کے باوجود رونق ہے۔ اگرچہ خریدار زیادہ تر غیر ملکی سیاح ہیں۔ کتابوں، کیسٹوں کی دکانیں کھلی ہیں۔ کرسمس کارڈز کی خریداری ہورہی ہے۔ میڈونا کی کتاب ایک ہفتے بعد دستیاب ہوگی۔ اس کی بکنگ ابھی سے ہورہی ہے۔ ہم تو دو روز بعد جارہے ہیں۔ ہم میڈونا کی تصنیف سے محروم رہ جائیں گے۔ اس نے اپنی ذات کی جن نادیدہ دنیاؤں کی سیر کروانا چاہی ہے۔ ہم ان سے گزر نہیں سکیں گے۔

کتابوں کی دکانوں میں بھی خوب رونق لگی ہے۔ زیادہ ہجوم ناولوں پر ہے۔ یا شو بزنس کے حصے میں، ادبیات اور شاعری یہاں بھی ایک گوشے میں خریداروں کو ترس رہی ہے۔

جوان سال جوڑے کرسمس کارڈز اور سال نو کی مبارک باد کے کارڈز خریدنے میں مصروف ہیں۔

فٹ پاتھ پر موجود لندن کے سووینئر فروخت کرنے والوں کے خوانچوں پر بھی رش ہے۔ لندن سے آنے والے اپنے وطن جاتے وقت ایسی ٹی شرٹ مگ لے جانا پسند کرتے ہیں۔ جن پر لندن کی ٹیوب کا نقشہ، یونین جیک، پارلیمنٹ ہاؤس یا بکنگھم پیلس بنا ہو۔ گھر میں یہ آرائشی چیزیں آویزاں ہوں تو آنے والوں پر آپ کے ولایت پلٹ ہونے کا رعب تو پڑتا ہے۔

مہنگائی بہت زیادہ ہوچکی ہے۔ پاؤنڈ کی حالت مستحکم نہیں ہے۔ اس لیے چیزیں اور بھی مہنگی ہورہی ہیں۔ عام طور پر مشورہ یہی ہے کہ ملبوسات، برقی مصنوعات نہ خریدی جائیں کہ وہ لندن میں بہت زیادہ گراں ہیں۔

ٹروکیڈرو۔ لندن کے عین قلب میں دنیا کا سب سے بڑا لیزرگن گیم سینٹر ہے۔ شاپنگ کرتے کرتے آپ کو کچھ تفریح کی خواہش ہے۔ کھیلنا چاہتے ہیں۔ لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ تو پکاڈلی سرکس میں موجود اس وسیع المقاصد تفریحی مرکز میں آجائیے۔ سینما بھی ہے ڈوجم کاریں بھی ہیں۔ کمپیوٹر گیم بھی ہے۔ ٹین پن باؤلنگ بھی ہے۔

ہم گھبرا رہے ہیں کہ داخلے کا ٹکٹ نہ جانے کتنے کا ہوگا۔ ادھو داخلہ تو مفت ہے۔ تین منزلہ اس مرکز تفریح میں شاپنگ بھی حسب دلخواہ کی جاسکتی ہے۔ بھوک لگی ہے یا پیاس تو اسنیکس بھی موجود ہیں۔ یہ کولیسر ہے۔ یہاں آپ اپنے دشمنوں پر گولیاں چلاسکتے ہیں۔ گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈز والوں کی طرف سے یہاں نمائش بھی لگی رہتی ہے۔ دنیا کے طویل القامت، قلیل القامت، مختلف ریکارڈ توڑنے والے اور دوسرے امتیاز حاصل کرنے والوں کے یہاں ماڈل بھی ہیں۔ ویڈیوز بھی، سینما میں تازہ ترین فلمیں دیکھیے۔ ''فن لینڈ'' میں سکے ڈالتے جائیے کھیلتے جائیے۔

بچے یہاں خوب لطف اندوز ہورہے ہیں۔ زندگی سے بھرپور قہقہے۔

دکانوں میں شاید ہفتے کے باعث غیر ملکی سیلز گرلز اور سیلز بوائے زیادہ ہیں۔ انگریز خود تو آج چھٹی منارہے ہوں گے۔ ایشیائی، افریقی اور عرب اوور ٹائم لگا رہے ہیں۔ چشموں اور گھڑیوں کی دکان پر سیلز گرل یمن کی رہنے والی ہے۔ وہ اوور ٹائم لگا کر خوش ہے کہ وہ اپنے گھر کچھ زیادہ زرمبادلہ بھیج سکے گی۔

جرابوں اور اسکارف کے اسٹال پر سیلز گرل کا تعلق انڈونیشیا سے ہے۔ کسی دکان پر ہندوستان سے آیا ہوا سیلز بوائے ہے کہیں پاکستان کا۔ کہیں بنگلہ دیش کا۔

''ہم کیسے چھٹیاں مناسکتے ہیں۔ ہم تو یہاں کمانے کے لیے آئے ہیں۔ خرچ کے لیے نہیں۔'' ہم ایشیائیوں کے ہاں چھٹی منانے کا رواج ہے ہی نہیں۔ اپنے وطن میں بھی چھ دن کام کرکے یہ سوچتے ہیں کہ اگر ہفتہ وار تعطیل پر بھی اوور ٹائم لگ جائے تو اچھا ہے۔ ہم سب کی آمدنی اپنے اخراجات سے بہت کم ہے۔ یا تو ہمیں اوور ٹائم لگانا پڑتا ہے۔ یا پھر بالائی آمدنی کا انتظام کرنا پڑتا

ہے۔ جن لوگوں کو اپنے چھ دن کے دوران ہی کچھ بالا بالا آمد ہو جاتی ہے۔ وہ تو چھٹی کا دن آرام سے گزار لیتے ہیں دوسروں کے لیے مشکل ہوتا ہے۔

بالائی آمدنی کا سلسلہ ہمارے ہاں کچھ بڑھتا ہی جارہا ہے۔ اس کے بغیر زندگی کا تصور اب نامکمل ہے۔ آپ کو اگر اس کا شوق اور تجربہ نہیں ہے۔ تو دوسرے آپ کو مجبور کرتے ہیں۔ مشورے دیتے ہیں۔

یہ لوگ یہ یہاں ہفتہ وار تعطیل کے دن بھی کام کررہے ہیں۔ اپنی تفریح اور راحت کی قربانی دے رہے ہیں۔ صرف اس لیے کہ ان کی ضروریات اپنی آمدنی سے زیادہ ہے۔ انہیں اپنے بڑے خاندانوں کا پیٹ بھرنا ہے۔ اپنے ملک زرمبادلہ بھیجنا ہے۔

شاپنگ میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا ہے۔

اسٹرڈوک کورٹ کی شام بھی صبح ہی کی طرح حسین ہے۔ بلکہ زیادہ رونقیں بکھری ہیں۔ یہاں کونسل فلیٹوں میں زیادہ تر غیرملکی رہتے ہیں۔ جنہیں لندن سے باہر ہفتہ وار تعطیلات گزارنے کی عادت ہے نہ ان کی مالی حالت اجازت دیتی ہے۔ وہ سب یہیں ان فلیٹوں کے عقب میں لانوں میں چہل قدمی کر لیتے ہیں۔ ایک دوسرے کا دکھ درد جان لیتے ہیں۔ ہمیں بھی یہاں پانچ چھ روز سے دیکھنے والے یہ سمجھ رہے ہیں کہ سیاسی پناہ مانگنے والوں میں شاید کچھ اور اضافہ ہونے والا ہے۔ دور دراز ملکوں سے ہونے کے باوجود یہاں ایشیائی افریقی اور لاطینی امریکہ والے ایک دوسرے کے بہت قریب ہوجاتے ہیں۔ ان سب کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات ایک جیسے ہیں۔ اس لیے وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ حکومتوں کے جبر سے بھی بخوبی آگاہ ہیں۔ یورپ والے اور خاص طور پر برطانیہ والے بھی اب یہ سمجھنے لگے ہیں کہ جمہوری ملک ہونے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ان جیسی جمہوریت وہاں رائج ہے۔ اور وہاں انسانی حقوق اسی طرح حاصل ہیں۔

☆......☆......☆

آج ہمارا آخری دن ہے۔ لندن میں۔ اگلے روز ہمیں وطن واپس روانہ ہونا ہے۔ کچھ شاپنگ رہ گئی ہے۔ ہمارے میزبانوں کا مشورہ ہے کہ پکاڈلی جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہیں ٹوٹنگ میں چلے جائیں۔ وہاں بھی کافی بڑا شاپنگ ایریا اتوار کو کھلا رہتا ہے۔ ضرورت کی ہر چیز مل جائے گی۔ دام بھی مناسب ہیں۔

ان کی بات صحیح نکلی ہے۔ شاپنگ ایریا کچھ کیا سارا ہی کھلا ہے۔ اور یہاں کی دکانوں پر مقامی برطانوی باشندے بھی موجود ہیں اور یہ سیر و تفریح کے لیے نہیں گئے۔ ہمارے پاؤنڈز اور پنس کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ بہت سے ایسے جوڑے بھی خریداری کررہے ہیں جو ہفتہ بھر ملازمت میں مصروف رہتے ہوں گے۔ آج وہ ہفتے بھر کا راشن لے کر ڈال دیں گے۔

آج حبیب الرحمٰن صاحب نے لنچ کے لیے گھر پر بلایا ہے۔ ان کا گھر بھی دیکھنا ہے۔ گھر کا کھانا بھی کھانا ہے۔ شیر لیتھم میں گھر ہے۔ انتظام یہ ہے کہ دوسرے مدعوئین میں سے کوئی ہمیں فلیٹ سے لے گا۔ لیکن ہم شاپنگ میں اتنے اُلجھ گئے کہ کئی بار فون آچکا۔ دو مدعوئین بھی آکر پوچھ کر جاچکے۔ اب ہمیں اپنے طور پر پہنچنا ہے۔ ٹیکسی والے کو پتا بتاتے ہیں۔ وہ کافی دور آچکا ہے۔ لیکن اب وہ ٹیکسی روک دیتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وہ کہے گا اب جائیے کوئی اور ٹیکسی لے لیجیے۔ پھر وہ اپنا چلتا ہوا میٹر بند کردیتا ہے۔ پھر لندن کا نقشہ پھیلا کر ہمارے پتے کو دیکھتا ہے۔ تین چار منٹ کے بعد کہتا ہے۔ درست ہے۔ اب سمجھ میں آگیا کہ یہ کس طرف ہے (اب وہ میٹر دوبارہ چالو کرتا ہے۔ اتنی دور ہم بے خبری میں آئے۔ اس کا کرایہ وہ چارج نہیں کرتا۔ یہ ہے دیانت اور اصول پرستی۔ ٹیکسی ڈرائیور حبیب صاحب کے گھر کے عین سامنے لے آتا ہے۔ پھر وہ کال بیل بھی خود ہی دباتا ہے۔ جب گھر سے نکلنے والے صاحب اور ہمیں ایک دوسرے کو اچھی طرح ملتے۔ سلام دعا کرتے دیکھتا ہے۔ تو وہ کرایہ وصول کرکے چل پڑتا ہے۔ لندن کے ٹیکسی ڈرائیور بڑے منفرد اور ذمہ دار ہیں۔ انہیں لندن کا ایک ایک حصہ پہلے تربیت کے دوران دیکھنا پڑتا ہے۔ نقشے سے محل وقوع سمجھنے کی مشق کرنا پڑتی ہے۔ تب لائسنس جاری ہوتا ہے۔

حبیب الرحمٰن صاحب کا گھر دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ لندن کے روایتی ون یونٹ۔ کھپریل کی جھکی چھتیں، اوپر نیچے کمرے پیچھے لان۔ ان کے مکان کے پیچھے ایک پرائیویٹ سڑک ہے۔ جو عام گزرگاہ نہیں ہے۔ یہاں بچے کھیل سکتے ہیں۔ خواتین چہل قدمی کرسکتی ہیں۔ انتہائی پرسکون رہائشی علاقہ۔ ہمیں حبیب صاحب اور ان کے اہل خانہ پر رشک آرہا ہے۔ کتنے پرامن علاقے میں رہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے عقبی لان میں پاکستان سے پودے لاکر لگائے ہوئے ہیں۔ جو وطن کی مٹی ساتھ لائے ہیں۔ ان پودوں نے لندن کی مٹی کی قید قبول کرنے میں پہلے کچھ دیر لگائی تھی۔ لیکن جب انہیں خون دیا گیا تو انہوں نے اپنی جڑیں پھیلانی شروع کردیں۔

کھانے پر صبغت اللہ قادری سے ملاقات ہورہی ہے۔ شیر شاہ قریشی بھی ہیں۔ طارق عظیم بھی ہیں۔

پرتکلف اور لذت بھرے کھانے کے بعد عظیم طارق پیشکش کررہے ہیں کہ دریائے ٹیمز میں کشتی کی سیر کی جائے۔ اس کے بغیر لندن کا دورہ مکمل نہیں ہوسکے گا۔

سب ان کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں۔ ذرا سا یہ خدشہ ہے کہ وہاں تک پہنچتے پہنچتے لانچیں بند کرنے کا وقت نہ ہوجائے کیونکہ اتوار کو جلد یہ سلسلہ بند ہوجاتا ہے۔

دریائے ٹیمز کی تاریخ لندن ہی کی طرح پرانی ہے۔ ٹیمز نے نہ جانے کتنی صدیاں دیکھی ہیں۔ کتنی بادشاہتیں دیکھی ہیں۔ کتنی جنگیں دیکھی ہیں۔ ہمارے علامہ اقبال کو بھی اس دریا نے انسپائر کیا تھا۔ انہوں نے بھی اس کے کنارے بیٹھ کر نظمیں کہی ہیں۔ ٹیمز لندن کے لیے تجارت کا بھی ایک ذریعہ ہے۔ اس میں پہلے بڑے جہاز بھی آیا کرتے تھے۔

اب تو اس میں لانچیں، سیاحوں کو گھمانے کے لیے چلتی ہیں۔ اس کے کناروں پر دونوں طرف بڑی بڑی تاریخی اور اہم عمارتیں موجود ہیں۔ جن میں پارلیمنٹ ہاؤس بھی ہے۔ کئی تجارتی مراکز بھی ہیں۔ اور جدید ترین عمارتیں بھی۔ جو اب یورپ کی بلند ترین عمارتوں میں شمار ہوتی ہیں۔

ٹیمز میں کئی پرانے جہازوں پر ریستوراں بنے ہوئے ہیں۔ کئی میں بڑے بارونق نائٹ کلب ہیں۔ اس دریا سے برطانیہ والوں نے ہر طرح سے فائدہ اٹھایا ہے۔ یہ تجارتی مقاصد کے لیے اب بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور سیاحوں کو اس دریا میں سیر کرواکے بھی کافی زر مبادلہ کمایا جاتا ہے۔ دن بھر یہ سفر جاری رہتے ہیں۔ ٹیمز پر نہ جانے کتنے پل بنے ہوئے ہیں۔ اکثر تو شہر کے مختلف حصوں کو آپس میں ملاتے ہیں لیکن کچھ آرائشی پل بھی ہیں۔ جو صرف حسن میں اضافے کے لیے ہیں۔

ہماری لانچ چل رہی ہے۔ ایک گائیڈ بھی باقاعدہ موجود ہیں۔ وہ دریا کے دونوں کناروں پر موجود عمارتوں کے بارے میں دلچسپ قصے بتارہے ہیں۔ سیاحوں کے لیے دلچسپی پیدا کرنے کی خاطر کچھ قصے گھڑے بھی جاتے ہیں۔ یہ دریا ویسے خاموشی سے بہتا ہے۔ لیکن جب اتنے جہاز، کشتیاں اور لانچیں چل رہی ہوں۔ تو دریا میں ہلچل بہت ضروری ہے۔

مجھے اپنے دریا یاد آرہے ہیں۔ سندھ، چناب، جہلم۔

ٹیمز تو ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ اتنے بڑے بڑے دریا ہیں۔ یہ تو سیاحوں کے لیے بہت زیادہ پرکشش اور دلچسپ رہ سکتے ہیں۔ غیر ملکی سیاحوں کے لیے ہی نہیں خود ملکی سیاحوں کے لیے بھی یہ باعث تفریح ہوں گے۔ بڑی لانچوں کے ذریعے اگر باقاعدہ دریائی سفر کا اہتمام کیا جائے۔ تو بہت سے لوگ اس وسیلہ سفر کو اختیار کریں گے۔ سفر کا سفر اور تفریح کی تفریح۔ مال برادری کے لیے بھی یہ محفوظ اور تیز رفتار سفر ہوسکتا ہے۔

لانچ میں دوسرے سیاح بھی موجود ہیں۔ جن میں یورپ والوں کی تعداد زیادہ ہے۔ فرانس اور جرمنی سے زیادہ تر بزرگ جوڑے ہیں۔ جو اس عمر میں اپنی تمام ذمہ داریوں سے فارغ ہوکر ملکوں کی سیاحت پر نکلتے ہیں اور اپنے سفر کے ایک ایک لمحے پر لطف اٹھاتے ہیں۔ ان کے چہرے کھل رہے ہیں۔ کسی دوسرے جہاز کے گزرنے سے دریا میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ ہماری لانچ بھی ہلتی ہے تو یہ سیاح بھی کھل اٹھتے ہیں۔ تصویریں بناتے ہیں۔ دوسرے سیاحوں سے بھی دریافت کرتے ہیں کہ وہ لطف اٹھا رہے ہیں یا نہیں۔

کچھ پلوں کو قمقموں سے سجایا گیا ہے۔ کچھ کی تزئین از سر نو ہو رہی ہے۔ کہیں کہیں پرانے زمانے کی لکڑی کی جیٹیاں بھی موجود ہیں۔ لندن والے روایات کے امین ہیں۔ روایات کا خواب تحفظ کرتے ہیں۔

یہ سفر کتنا پُرلطف ہے۔ لندن کی سیر اس کے بغیر ادھوری رہتی۔ ہم طارق عظیم کا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔ ان کا خیال بڑا ولولہ بخش تھا۔ اب ہم دریا کے کنارے کنارے جس فٹ پاتھ پر چل رہے ہیں۔ اس کے نیچے ایک اور فٹ پاتھ بھی ہے۔ ایک زیر زمین پورا نظام موجود ہے۔ جو جنگِ عظیم کے زمانے میں قائم کیا گیا تھا۔ جنگ کے دور میں پورا لندن زیر زمین چلا جاتا تھا۔ وزیر اعظم کا سیکریٹریٹ، وزارت دفاع کے دفاتر۔

آکسفورڈ سرکس لندن کا مہنگا ترین تجارتی مرکز ہے۔ یہاں ایک کمرشل بلڈنگ کی عین آخری منزل پر طارق عظیم کا دفتر بھی ہے۔ اور رہائشی انتظامات بھی۔ یہاں سے شہر کو دیکھیں تو کچھ اور ہی رنگ نظر آتا ہے۔ بڑی تجارتی فرمیں اس قسم کے پینٹ ہاؤس بناتی ہیں۔ جہاں سے لندن کی شام زیادہ روشن اور زیادہ رنگین دکھائی دیتی ہے۔ رنگینی تو انسان کے اپنے اندر ہوتی ہے۔ زندگی سے محبت ہو تو رنگینی اور خوشبوئیں مل ہی جاتی ہیں۔

لندن میں آخری شام کے لیے ایسا مقام ہی موزوں ہے۔ جہاں زندگی کا ہر کیف موجود ہے۔ پہلے نصرت فتح علی کا نغمہ آڈیو کیسٹ، دم مست قلندر۔

پھر اس دور کا ایک مقبول ترین نغمہ۔ ایریک کلاپٹن کا لکھا ہوا۔ اسی کا گایا ہوا۔ اس گیت کو اس سال امریکہ میں کئی ایوارڈ ملے ہیں۔ بہت ہی دکھی دل سے گایا ہے۔ یہ واردات قلب ہے۔ سچی داستان ہے۔ جو ایریک کے اپنے ساتھ گزری ہے۔

''آسمان پر آنسو۔''

ایریک کلاپٹن۔ اس وقت سنجیدگی سے لکھنے اور انتہائی پُرسوز آواز میں بیٹھ کر گانے والوں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ کرسی پر بیٹھے ہوئے ان کی انگلیاں گیٹار پر ہوتی ہیں۔ سوچیں آسمان پر۔ اور آواز نہ جانے کتنے دل چیرتی ہوئی کراں تا کراں پھیلتی رہتی ہے۔ اس کے ساتھی بھی اپنے اپنے آلات سے ایسی دھنیں ہی بلند کرتے ہیں۔

ایرک کو گزشتہ سال ایک ذاتی المیے سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کا ایک چھوٹا بیٹا بارہ منزلہ فلیٹ سے نیچے گر کر ہلاک ہو گیا۔ یہ صدمہ کسی بھی باپ کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا۔ ناقابل برداشت۔ یہ صدمہ جب ایرک کے شعروں میں ڈھل گیا۔ تو وہ صرف اس کا ذاتی المیہ نہیں رہا۔ سب سننے والوں کا دکھ بن گیا۔ اس نے دل کی گہرائیوں میں اپنے آنسوؤں سے اسے لکھا۔ پھر ڈوب کر گایا۔ پہلے وہ اس کو اپنی ذات تک ہی محدود رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن پھر دوستوں نے کہا سنا۔ مشورہ دیا تو وہ اسے پبلک میں لے آیا۔ وہ تو شیلے نے بھی کہا تھا۔

ہمارے سب سے میٹھے نغمے وہی ہوتے ہیں جو ہمارے اُداس ترین خیالات سناتے ہیں۔ یہ دکھی نغمہ اب امریکہ ہی نہیں یورپ میں بھی گونج رہا ہے۔ ایک غم زدہ دل کی داستان اب کائنات میں پھیل گئی ہے۔

آسمانوں پر آنسو۔

وہ آسمانوں پر پہنچ گیا ہے۔ اس کے آنسو بھی آسمانوں پر ہیں۔

دل ریزہ ریزہ ہو گیا ہے۔
زندگی ملتی ہے تو اتنی مختصر کیوں ملتی ہے۔
یہ داستان ادھوری کیوں رہ جاتی ہے۔
معصوم معصوم چہروں کو اوپر کون لے جاتا ہے۔
پیار کرنے والوں کو ایک دوسرے سے کیوں جدا کر دیا جاتا ہے۔
محبت کی شاخ اتنی جلدی کیوں سوکھ جاتی ہے۔

اتنی بلندی پر یہ نغمہ، اس کی موسیقی۔ اور اس کے پس منظر میں ایک ذاتی غم۔

ماحول اُداس ہو رہا ہے۔ ہمیں صبح واپس جانا ہے۔ ہم سب سے اجازت لے رہے ہیں۔ رخصت ہو رہے ہیں۔

اتنے دن ہم اچھی بری سب خبروں سے دور رہے ہیں۔ نہ وزیر اعظم اور صدر کی کشمکش۔ نہ آٹھویں ترمیم۔ نہ اپوزیشن کے ارکان کی فلور کراسنگ۔ نہ منافقت۔ نہ کمرشلز۔ نہ صرف دولت کی پرستش۔

☆......(ختم شد)......☆

[illegible]

# عداوت



جاوید راہی



فیوڈل سسٹم کے ایک اور باغی کی بہادری کی داستانِ الم، راہی رنگ کا ایک اور شاہکار

ٹھائیں......ٹھائیں......ٹھائیں، سیون ایم ایم کی کرخت آواز نے رات کے سکوت کا سینہ چیر ڈالا حویلی میں یکدم بھگدڑ مچ گئی۔ کئی کمرے روشن ہو گئے بڑے دالان کی بوگن ویلیا کی جڑ کے پاس کرم علی کی لاش تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ جب تک گاؤں جاگتا وہ گھوڑے کو نہر کی بڑی کچی سڑک پر ڈال چکا تھا اور سیون ایم ایم کی رائفل اس نے گلے میں ڈال کر مضبوطی سے بغل میں دبا رکھی تھی۔ میاں صاحب کے آدمی جب تک اس کا پیچھا کرتے وہ ان کی دسترس سے بہت دور نکل آیا تھا۔

کیکر کے ایک درخت کی اوٹ لے کر اس نے اپنے پیچھے کے راستے کا جائزہ لیا صرف اس کے گھوڑے کے پاؤں کی دھول چاندنی رات میں اُڑ رہی تھی۔

''کب تک بچو گے میاں؟'' اس نے منہ میں بڑبڑاتے ہوئے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور ایک دو بھرپور کش لے کر دھواں ایک طرف پھینکتے گھوڑے کو آگے بڑھایا۔

اب اس کا رُخ ذخیرے کی طرف تھا۔ اسے ذخیرے میں بھٹکتے دوسرا سال شروع ہو چکا تھا۔ اس کا

یہ دوسرا قتل تھا۔

پہلا قتل اس نے اس وقت کیا تھا جب وہ ایک محنت کش تھا اور نوری کے پیار میں سرشار ہر وقت وہ میاں نیاز علی کے کھیتوں میں کام کرتا اور شام کو حویلی کے بڑے ڈیرے پر گر پڑتا۔ جب نوری حویلی سے نکل کر اسے روٹی دینے آتی تو اس کے تمام دن کی تھکن پل بھر میں ہوا ہو جاتی اور وہ آنکھوں میں ٹھاٹھیں مارتا محبت کا سمندر لئے نوری کے استقبال کے لیے اُٹھتا اور روٹی والے برتن اس کے ہاتھ سے پکڑ لیتا۔

نوری اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں پل بھر کو دیکھتی اور یوں سمٹ جاتی جیسے چھوئی موئی کی ڈالی اور جلدی سے ڈیرے کا اندرونی دروازہ پھلانگ جاتی۔ توکل مسکراتا ہوا روٹی کھانے میں مشغول ہو جاتا۔ توکل کے ماں باپ کب کے مر چکے تھے وہ کئی دروازوں پر گرتا پڑتا بڑی حویلی کے دروازے کا ہو کر رہ گیا۔ دوسرے کئی ملازموں کے ہمراہ وہ بھی حویلی کا بے دام غلام ہو گیا۔

حویلی کا قانون باہر کے قانون سے ذرا مختلف تھا۔ یہاں نوکروں کو صرف دن کام کرنے اور رات

آرام کرنے کی اجازت تھی۔ ان کے نزدیک کوئی خوشی اور دکھ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ سال میں دو تین بار لباس ملتا اور گاؤں کے موچی سے دو بار جوتے۔ حویلی کے اندر کام کرنے والی نوکرانیاں بڑی بی بی جی کے ماتحت تھیں کیا مجال جو بڑی بی بی جی کی مرضی کے خلاف کام ہو سکے۔ میاں صاحب کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی جو شہر میں پڑھ رہے تھے۔ وہاں ان کی دوسری بیوی کے پاس رہتے جس کو چھوٹی بی بی جی کا رتبہ حاصل تھا۔ میاں صاحب اپنے علاقے کے بااثر آدمی مانے جاتے۔ نوری میاں صاحب کے پرانے ملازم علی محمد کی چھوٹی بیٹی تھی۔ بڑی بیٹی اس نے ساتھ کے گاؤں میں بیاہ دی تھی اور لڑکا شہر میں میاں صاحب کی کوٹھی پر رہتا تھا۔

توکل اور نوری ایک ساتھ پروان چڑھے تھے اس لئے اندر ہی اندر ایک دوسرے کو دل دے بیٹھے۔ اکثر توکل نوری سے کہتا کہ نوری میں تیرے بابا سے تیرا ہاتھ مانگ لوں مگر بڑی بی بی جی سے ڈر لگتا ہے۔ پتہ نہیں وہ تیرے لئے کیا سوچتی ہیں؟''

''میں کیا جانوں؟'' نوری چاروں طرف دیکھ کر دھیرے سے جواب دیتی۔

''اچھا جاؤ، کوئی دیکھ نہ لے'' نوری اسے جانے کا کہتی اور توکل ٹھنڈی سانس بھرتے دوسری طرف نکل جاتا۔

ایک روز باتیں کرتے ہوئے کرم علی نے دیکھ لیا اور اس نے خشی کو بتایا۔ جو میاں صاحب کیلئے کھلی آنکھیں اور کھلے کان کا درجہ رکھتا تھا۔ اس نے جھٹ یہ خبر میاں نیاز کے گوش گزار کر دی بس پھر کیا تھا اندر نوری کی اور باہر توکل کی شامت آ گئی۔

بڑی بی بی جی نوری کے دونوں ہاتھ چارپائی کے پائیوں کے نیچے رکھوا کر اوپر خود بیٹھ گئیں۔ نوری کی مارے درد کے چیخیں بلند ہونے لگیں۔ کیا مجال تھی جو محمد علی زبان سے اُف بھی کرتا۔ اس کی بیٹی کے ساتھ اس کی موجودگی میں وحشیانہ سلوک کیا جا رہا تھا مگر وہ بے بس تھا۔ وہ حویلی کے قانون کو بخوبی جانتا تھا۔



اُدھر ڈیرے پر توکل کو چارپائی سے باندھ کر اس کی پیٹھ پر لاٹھیاں برسائی جارہی تھیں۔ میاں صاحب تخت پوش پر حقے کی نلی منہ میں لئے اس کی چیخوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جب اپنے دل کی حسرت نکال چکے تو اسے آزاد کرنے کا اشارہ کیا پھر حکم ملا کہ آج سے تیرا حویلی میں آنا جانا بند۔ تُو صرف ڈھاری پر رہے گا اور مال ڈنگر کی رکھوالی کرے گا، دودھ دوہے گا اور گوبر سنبھالے گا۔ نوری اس کی آنکھوں سے دور ہوگئی۔ وہ تڑپ کر رہ گیا منشی اور کرملی پر اسے قہر کا غصہ تھا مگر بے بس تھا۔

کبھی کبھار ملک تصدیق کے آدمی میاں نیاز علی کا ڈھور ڈنگر چوری کر کے لے جاتے پھر میدان لگتا۔ دونوں طرف خوب رسہ کشی ہوتی یہ سلسلہ دونوں طرف سے چلا آرہا تھا۔ توکل کو ڈھاری پر آئے کئی ماہ گزر چکے تھے، اگر توکل کا نوری بنا بُرا حال تھا تو نوری بھی اس کیلئے پریشان تھی مگر دونوں بے بس تھے۔

☆......☆......☆

ایک رات وہ ڈھاری پر اکیلا ہی تھا سنجوار کسی کام کی غرض سے شہر گیا ہوا تھا۔ گرمی کی راتیں بڑی جان لیوا ہوتی ہیں۔ مچھروں نے اسے تنگ کر رکھا تھا۔ اس نے مال سے ذرا ہٹ کر چارپائی ڈالی ہوئی تھی اور قریب ہی دھواں کر رکھا تھا تاکہ مچھر دور رہیں۔ ابھی اسے لیٹے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ کتے نے زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا۔ وہ تیزی سے اُٹھ گیا مگر چند قدم دور آٹھ نو آدمیوں کو دیکھ کر وہیں ٹھٹک گیا۔ وہ آدمی اسلحہ سے لیس منہ پر کپڑے باندھے ہوئے تھے۔ دو آدمی اس کے قریب آگئے۔

''اگر آواز نکالی تو بھون کر رکھ دیں گے۔''

وہ سہم گیا مگر جلدی سنبھل کر اس نے حالات کا جائزہ لیا اور فوری فیصلہ کرتے ہوئے اس نے اس کو مخاطب کیا۔

''اگر تم ملک صاحب کے آدمی ہو تو میں خود یہ مال تمہارے ساتھ لے جانے کو تیار ہوں۔ ورنہ جان دے دوں گا مگر تم ڈنگر میری زندگی میں نہیں کھول سکتے۔''

''تم ملک صاحب کے پاس کیوں جانا چاہتے ہو؟''

''اس لئے کہ میں پناہ چاہتا ہوں'' توکل نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

انہوں نے چند پل آپس میں مشورہ کیا اور اسے ساتھ لے جانے پر رضامند ہوگئے۔ ساری ڈھاری کا مال اکٹھا کر کے ایک انتہائی خوفناک فیصلہ کرتے وہ ان کے ہمراہ چل پڑا۔ اس کے دل میں نیاز علی کیلئے جو نفرت کا طوفان دبا ہوا تھا اسے صرف ملک تصدیق کی پناہ میں ہی رہ کر پورا کیا جاسکتا تھا۔

دوسرے روز جب اسے ملک صاحب کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے ساری داستان کہہ سنائی۔ لوہا گرم دیکھ کر ملک تصدیق نے چوٹ لگائی۔

''توکل! فکر مت کر، تیرا اور میرا ایک ہی دشمن ہے جلد نمٹا لیں گے۔ تم ابھی کچھ روز آرام کرو۔ جاؤ رفیق اسے ذخیرے میں لے جاؤ باقی میں سنبھال لوں گا اور مال بارڈر پار بھجوا دو۔''

''بہتر ملک صاحب!'' رفیق نامی آدمی نے احترام سے جواب دیا اور توکل کو ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

تقریباً ایک ماہ کے عرصہ میں توکل ہر ٹریننگ میں ماہر ہوگیا۔ اس دوران وہ ملک کے آدمیوں کے ہمراہ دو تین بار چوری چکاری بھی کرنے گیا۔ وہ سارے گر سیکھ چکا تھا۔ ملک تصدیق نے ایک روز اسے بلا بھیجا۔ وہ دوسری بار ملک صاحب کے پاس کھڑا تھا۔

''جی ملک صاحب!'' توکل نے نظریں جھکاتے پوچھا۔

''اپنا انتقام یاد ہے یا بھول چکے ہو؟''

''ملک صاحب یہ کوئی بھولنے والی بات ہے۔ جس نے ساری عمر کی خدمت کا یہ صلہ دیا ہو، اسے کیسا بھولنا؟'' توکل کے لہجے میں سارے جہان کی نفرت اُبھر آئی۔

''تو ٹھیک ہے آج رات تیار رہنا تم دو آدمی اپنے ساتھ لے جاسکتے ہو مگر واپس آؤ تو تمہارے ہاتھوں سے لہو کی بو آنی چاہیے۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ بزدل اور ناکام آدمی مجھے پسند

نہیں۔"
"ایسا ہی ہوگا ملک صاحب!"
"اب تم جا سکتے ہو"۔

☆......☆......☆

توکل نے اس سے بیشتر چوری ڈکاری میں تو ملک صاحب کے آدمیوں کا ساتھ دیا تھا مگر جس کام کے لیے وہ جانے والا تھا اس کا تجربہ اس کیلئے نئی بات تھی۔ اس کے اندر ایک طرح کا خوف سا اُٹھ رہا تھا مگر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اپنے بھروسے کے دو آدمی ساتھ لئے گھوڑے کو میاں نیاز علی کے گاؤں کی طرف کر دیا۔ اسے معلوم تھا کہ رات دس گیارہ بجے تک میاں ڈیرے میں ہی لوگوں کے ساتھ بیٹھا رہتا تھا، اس کے بعد وہ حویلی کے بڑے دالان والے دروازے سے گزر کر اندر چلا جاتا تھا۔ توکل نے ڈیرے کی پچھلی دیوار کا انتخاب کیا تھا وہ اس لئے کھیتوں کے راستے ڈیرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دونوں آدمی اس نے پیچھے ہی چھوڑ دیے اور خود رینگتا ہوا ڈیرے کی عقبی دیوار تک پہنچ گیا۔ رائفل اس نے دیوار کے اوپر رکھی اور بغیر آواز پیدا کیے اندر کود گیا۔

دیوار کے اندر لگی کارڈینا کی باڑ کی اوٹ لیتا ہوا رائفل کو مضبوطی سے تھامے اس طرف بڑھنے لگا جہاں میاں نیاز علی بیٹھا نظر آرہا تھا۔ اس وقت میاں صاحب کے پاس تین چار نوکروں کے علاوہ گاؤں کے کچھ لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ منشی میاں صاحب کی ہی چارپائی پر بیٹھا شاید اخبار پڑھ کر سنا رہا تھا۔ فاصلہ کم کر کے توکل نے پوزیشن درست کی اور رائفل کا منہ میاں نیاز علی کے سر کی طرف کر کے لبلبی دبا دی۔

"ٹھائیں" کی خوفناک آواز کے ساتھ ایک شور پڑ گیا۔ اس نے اندھا دھند کئی فائر کیے اور دیکھے بغیر کہ کون مرا ہے بھاگ کر دیوار پھلانگ کر کھیتوں کی طرف بھاگنے لگا۔ جب تک میاں صاحب کے آدمی اسلحہ وغیرہ لاتے وہ تینوں گھوڑے دوڑاتے گاؤں کو پیچھے چھوڑ آئے۔ میاں نیاز علی تو بچ گیا مگر منشی پہلی گولی لگتے ہی ڈھیر ہو گیا۔

دوسرے روز ملک صاحب نے اسے بلا کر بتایا کہ "تمہارا نشانہ خطا گیا بہرحال تمہاری گولی نے منشی کا کام تمام کر دیا ہے۔ یہ بھی تمہاری کامیابی ہے۔ اپنے اندر حوصلہ پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا نشانہ بھی درست کرو کیونکہ اب تم قاتل بن چکے ہو۔ اکثر پولیس تمہارے پیچھے رہے گی اور ہو سکتا ہے تمہیں اپنی حفاظت کیلئے پولیس سے مقابلہ بھی کرنا پڑے اس لئے تمہارا نشانہ سچا ہونا ضروری ہے جاؤ اور خوب پریکٹس کرو، بارود کی تمہیں کوئی کمی نہیں"۔ ملک صاحب نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

"بہتر ملک صاحب!" توکل نے جھک کر شکریہ ادا کیا اور واپس ذخیرہ میں آگیا اپنے دو ساتھیوں کے پاس۔



☆......☆......☆

توکل دن بہ دن ملک صاحب کے قریب ہوتا گیا۔ ملک صاحب اس پر ہر طرح کا بھروسہ کرنے لگے۔ ڈپٹی کمشنر گوگیرہ مٹر بر کلے بڑھتی ہوئی وارداتوں کے ہاتھوں بڑا پریشان تھا مگر ہزار کوشش کے باوجود اسے گرفتار نہ کروا سکا۔ میاں نیاز علی توکل کے خوف سے ڈیرہ پر کم ہی بیٹھتا تھا جب باہر نکلتا تو اپنے ساتھ اسلحہ سے لیس آدمی رکھتا۔ منشی کا پرچہ توکل کے خلاف درج کر لیا گیا۔ میاں کوشش کے باوجود ملک تصدیق کو اس قتل میں ملوث نہ کر سکا۔

اِدھر نوری کی شامت آئی رہتی۔ بڑی بی بی جی نے اس کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ ہر وقت طعنہ زنی کرتی رہتی کہ یہ سب کچھ تیرے پیروں سے اُٹھا ہے۔ نہ تو اس حرام خور سے رابطہ بڑھالی اور نہ یہ دن دیکھنے نصیب ہوتے۔

نوری دل میں کڑھتی رہتی مگر زبان پر حرف شکایت نہ لاتی۔ اُدھر توکل ہر رشتے سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ وقت نے اس کے ماتھے پر گہری ناکامیوں کی داستان رقم کر دی۔ اس کے دل میں صرف میاں نیاز علی کے قتل کی خواہش تڑپتی رہتی جس کو پورا کرنے کیلئے وہ آج بھی حویلی آیا اور مداخلت کرنے پر اس نے کرم علی کو بھون ڈالا۔



کرم علی میاں نیاز علی کا باڈی گارڈ تھا جو ہر وقت

اس کے ساتھ رہتا۔ بڑے دالان میں اس کی چارپائی تھی جو عین میاں صاحب کے کمرے کے آگے تھی۔ توکل آگے بڑھتا مگر وہ جاگ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی بندوق پکڑتا توکل نے چیتے کی سی پھرتی سے اوپر تلے فائر کر کے اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا اور اس بار بھی وہ صاف بچ نکلا۔

☆......☆......☆

ذخیرہ پہنچ کر وہ جھگی میں بچھی پیل پر گر پڑا۔ تھکن سے اس کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ سجاول جو سب آدمیوں کیلئے کھانا وغیرہ بناتا تھا اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ توکل خالی نہیں لوٹا۔

''کیوں توکل کیسا رہا ہے؟'' سجاول نے اس کی ٹانگ دبانے کیلئے اپنی طرف کرتے ہوئے دریافت کیا۔

''اس بار بھی بچ نکلا ہے کمینہ مگر اس کا آدمی بھون ڈالا'' توکل نے سگریٹ سلگاتے ہوئے جواب دیا۔

''کب تک بچے گا؟ ایک روز تیرے ہاتھوں اس کو ختم ہونا ہی پڑے گا۔ صبح ملک صاحب کو خبر مل جائے گی اور ہاں شاید اب یہ جگہ بھی تبدیل کرنی پڑے۔ ملک صاحب کو اطلاع ملی ہے کہ پولیس جلد ذخیرہ کا گھیراؤ کرنے والی ہے ہوسکتا ہے بارڈر کی طرف نکلنا پڑے ملک صاحب سے صبح بات ہوگی۔''

ملک صاحب نے توکل سمیت اپنے سارے آدمی خشک بیاس بار بھیج دیے۔ پولیس نے سارا ذخیرہ چھان مارا مگر کوئی بھی آدمی ہاتھ نہ لگا میاں نیاز علی کو اس بات کا بھی صدمہ ہوا کیونکہ اس نے بڑی مشکل سے انگریز ڈپٹی کمشنر برکلے کو راضی کیا تھا اور اس بات کی ضمانت بھی دی تھی کہ ملک تصدیق کے آدمی ذخیرہ میں چھپے ہوئے ہیں۔ ملک صاحب کو اپنے خاص پولیس کے آدمی سے اس کارروائی کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی ورنہ اس بار میاں نیاز علی خاصا ہاتھ مارتا۔

اس آپریشن کے بعد علاقہ میں امن عامہ کی صورتحال کچھ ماہ کیلئے بہتر ہوگئی۔ میاں نیاز علی کو بھی یقین ہوگیا کہ اب ملک تصدیق کی تخریبی کارروائیاں رُک گئی ہیں حالانکہ بات اس کے برعکس تھی۔

☆......☆......☆

توکل کو اطلاع ملی کہ نوری کی شادی نیاز علی نے اپنے ایک ملازم شہاور ماچھی سے کر دی ہے توکل کے دل پر چھریاں چل گئیں وہ چیخ اُٹھا اس کے دل کے اندر کچھ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گیا اسے یوں لگا جیسے ساری دنیا اس کی آنکھوں میں اندھیر ہوگئی ہے۔ وہ پاگلوں کی طرح سارا دن جنگل میں بھٹکتا رہا وہ اس خبر کیلئے بالکل تیار نہ تھا مگر یہ سنتے ہی کہ نوری کی شادی ہوگئی ہے وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا پھر اس نے فیصلہ کر لیا۔

وہ ملک صاحب کے اگلے پیغام کے انتظار سے پہلے ہی ایک رات چپکے سے اپنے ساتھیوں سے آنکھ بچا کر اسٹین گن سمیت بھاگ نکلا گھوڑا اگر کھولتا تو ان کو شک ہو جاتا اس لئے پیدل ہی نکل کھڑا ہوا۔

تمام رات سفر کرتا وہ بہت دور آ گیا تھا۔ دن کو تھوڑی دیر ایک جگہ آرام کرنے کے بعد دریا کی کندھی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اسے سفر جاری رکھتے ہوئے کوئی خطرہ نہ تھا کیونکہ یہ علاقہ انسان نام کے کسی سائے سے بھی پاک تھا اس لئے وہ بغیر کسی خوف وخطر کے آگے بڑھ رہا تھا۔

گن اس نے اپنی چادر کے نیچے چھپا رکھی تھی اسے ایک گھوڑے کی ضرورت تھی مگر راستے میں ابھی تک کسی گاؤں کا نشان تک بھی نہیں آیا تھا۔ دن ڈھلنے تک وہ بمشکل مچھیروں کی جھگیوں تک پہنچ سکا۔ وہ بھوک سے نڈھال ہو چکا تھا یہاں اسے کھانا مل گیا اور رات بسر کرنے کیلئے جگہ بھی۔

☆......☆......☆

دوسرے روز وہ منہ اندھیرے نکل کھڑا ہوا۔ توکل کو اگلے سفر کیلئے ان لوگوں سے خاصی معلومات مل چکی تھیں۔ دوپہر تک وہ بہادر سنگھ گاؤں کے قریب پہنچ چکا تھا۔ تھوڑی دیر تازہ دم ہونے کے بعد اس نے گن ایک جگہ چھپائی اور گاؤں میں داخل ہوگیا۔ وہ گھوم پھر کر جائزہ لینا چاہتا تھا کہ وہ گھوڑا کہاں سے چوری کر سکتا ہے۔ پھر ایک ڈیرہ پر اسے گھوڑی بندھی نظر آ گئی۔ بڑی سبک رفتار گھوڑی رکھی ہوئی تھی توکل سر ہلاتا راستے کو ذہن نشین کرتا واپس چل پڑا۔

گاؤں سے واپسی پر اس نے کھانے کیلئے کچھ

چیزیں خریدی تھیں، پیٹ کا دوزخ بھرنے کے بعد وہ دریا کنارے درختوں کے جھنڈ میں لیٹ کر بے خبر سو گیا۔ رات گئے تک وہ سوتا رہا پھر اُٹھ کر اس نے جھاڑیوں میں سے اپنی اسٹین گن نکالی اور گاؤں کی جانب قدم بڑھانے لگا جہاں گھوڑی بندھی تھی۔

اس ڈیرہ تک جانے میں اسے کوئی مسئلہ درپیش نہ آیا۔ کئی منٹ تک وہ دیوار کی اوٹ میں کھڑا ہو کر اردگرد کا جائزہ لیتا رہا پھر وہ لکڑی کا جنگلا پھلانگ کر دبے قدموں چلتا ہوا کھرلی تک آ گیا۔ گھوڑی نے ناک کی پھنکار سے توکل کو دیکھ کر ناراضگی کا اظہار کیا اور اپنے دونوں کان پیچھے کی جانب کھینچ کر کھونٹے پر اِدھر اُدھر بدکنے لگی۔ دور چارپائی پر لیٹا ہوا آدمی ایک دم سے اُٹھ کر بیٹھ گیا اور چاروں طرف دیکھ کر دوبارہ کروٹ لیتا ہوا لیٹ گیا۔ توکل کچھ دیر ساکت و جامد وہیں پڑا رہا پھر رینگتا ہوا گھوڑی کے قریب پہنچ گیا آہستہ آہستہ اس نے گھوڑی کی گردن سہلائی اور پھر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگا گھوڑی نے اپنے اصیل ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے کان ہلانے شروع کر دیے۔ توکل نے رَسّہ کھولا اور اس کے دونوں پچھلے پاؤں آزاد کرتے ہوئے گھوڑی کو لے کر باہر نکل آیا۔

گاؤں کا جو راستہ اس نے منتخب کیا تھا وہ آبادی سے باہر جاتا تھا ایک جگہ پر رُک کر توکل نے رَسّے کی باگ بنائی اور گھوڑی کی پیٹھ پر سوار ہو کر اسے ایڑ لگا دی۔

گھوڑی کمان سے نکلے تیر کی طرح سرپٹ دوڑنے لگی۔ توکل گھوڑ سواری میں اتنا ماہر ہو چکا تھا کہ بغیر کسی تکلیف کے مسلسل سفر کرنے کی طاقت رکھتا تھا۔ راستے میں ایک دو بار رُک کر اس نے راستے کا تعین کیا اور پھر صحیح سمت کا اندازہ کر کے مطمئن انداز میں آگے بڑھتا رہا۔

وہ اذان ہونے سے پیشتر میاں نیاز علی کے گاؤں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اب جس راستے پر وہ چل رہا تھا وہ اس کا دیکھا ہوا تھا اس لئے آگے بڑھنے میں اسے کوئی دقت نہیں ہو رہی تھی۔ اب وہ دریا کی کندھی چھوڑ کر ذخیرہ کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ گھوڑی نے شاید پہلی بار اتنا لمبا سفر کیا تھا۔ اس کا سارا بدن پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔

جوں جوں توکل آگے بڑھ رہا تھا اس کے سینے میں میاں نیاز علی کیلئے نفرت کا الاؤ اتنا ہی شدت اختیار کرتا جا رہا تھا گاؤں سے باہر رُکتے ہوئے اس نے گھوڑی ایک درخت کے ساتھ باندھ دی اور اپنی اسٹین گن کو اچھی طرح چیک کرتے ہوئے حویلی کی طرف پیدل ہی چل پڑا وہ بغیر کسی خوف سے تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

فجر کی اذان کب سے ہو چکی تھی۔ گاؤں میں نمازی مسجد کی طرف آ جا رہے تھے۔ وہ حویلی کے دروازے پر پہنچ کر رُکا اور پھر گھوم کر ڈیرے کی طرف آ گیا۔ سامنے دالان کے بڑے تھڑے پر میاں نیاز علی بیٹھا مسواک کر رہا تھا اور ایک نوکر پانی کا لوٹا پکڑے قریب کھڑا تھا توکل نے اسٹین گن کا لیور کھینچا اور ایک دم میاں نیاز علی کے سامنے آ گیا۔

''میاں! دیکھو میری طرف تمہاری موت بن کر آیا ہوں۔ تمہیں کہا تھا نا کہ کسی بے قصور پر ظلم مت کرو...... مگر تو اپنی فطرت سے مجبور فرعونیت کا دعویدار بنتا تھا۔ تو نے مجھ پر بے شمار ظلم کئے، نوری کو مجھ سے جدا کر دیا۔ شاید اپنے انجام سے بے خبر تھا۔ تُو نے میرے گَنّی پکڑنے والے ہاتھوں میں بندوق پکڑا دی''۔

اس سے پیشتر کہ میاں نیاز علی بھاگتا توکل نے اندھا دھند فائرنگ کر کے میاں کے پرخچے اُڑا دیے۔ فائرنگ کی آواز پر میاں کے پالتو اسلحہ لے کر بھاگے۔ توکل نے دوسری بار جو فائرنگ کی تو اس سے میاں کے تین آدمی اور ڈھیر ہو گئے مگر توکل اپنے پیچھے سے بے خبر تھا۔ بارہ بور کے ایک ہی ایل جی کارتوس نے توکل کا بھیجا اُڑا دیا وہ چکرا کر گرا اور ٹھنڈا ہو گیا۔

دوسرے لوگوں کے ہمراہ نوری بھی وہاں پہنچ گئی۔ توکل کی لاش دیکھ کر اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے دو آنسو پھسل کر اس کے گالوں پر رینگنے لگے۔ لیکن اِن آنسوؤں میں ایک فخر و انبساط بھی چھپا تھا۔ اُس کا محبوب جاتے جاتے اُسے محبت کا فخر عطا کر گیا تھا۔

☆☆......☆☆

سچی کہانیوں کا وہ سلسلہ
جس میں مرد ہی نہیں خواتین بھی مردوں کے اس معاشرے میں
اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات ہمارے پاس بھیج سکتی ہیں

# اَپالو

## شانی خالمان

اُس حسن پرست کو صرف حسین چیزیں ہی پسند تھیں

آج جب میں اپنی گلی سے گزرا تو لوگوں کی ہمدردانہ کچھ کی طنزیہ نظروں نے گھر تک میرا پیچھا کیا۔ لوگوں کی ان طرح طرح کی نگاہوں نے مجھے توڑ کر رکھ دیا۔ یہ وہی گلی ہے جس میں آتے جاتے میں نے بچپن اور پھر جوانی کے دن پوری آن بان اور شان سے گزارے ہیں۔ مگر اب سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ میں لوگوں کی سوالیہ نظروں کا جواب نہیں دے سکتا۔ مگر اس سوال کا جواب ہے میرے پاس۔

میں نے آزاد کشمیر کی حسین وادی میں آنکھ کھولی۔ پانچ بہنوں کے بعد میری آمد گھر بھر کے لیے ہفتِ اقلیم سے کم نہ تھی۔ دادی نظر اتارتے نہ تھکتی۔ تو والدہ سینے سے لگائے لاڈ اٹھائے رہتی۔ والد کام سے واپسی پر ڈھیروں چیزوں لاتے جو سب میری جھولی میں ڈال دی جاتیں۔ بہنیں پریوں کی طرح اپنے پر پھیلائے مجھے بہلاتی رہتی تھیں۔ اسی لاڈ و پیار ناز و نعم میں بچپن گزرا۔ خوبصورت میں بچپن سے ہی تھا۔ جوانی کی بہار اپنی پوری رعنائیوں، رنگوں کے ساتھ مجھ پر آئی تو سونے پر سہاگہ والی بات ہوئی۔ میرے چوڑے شانے، چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، کھلتی ہوئی گندمی رنگت اور تاب دار بالوں نے مجھے کسی یونانی دیوتا کے روپ میں ڈھال دیا۔ یہاں تک کہ میرے یار دوستوں نے میری وجاہت اور خوبصورتی کی وجہ سے مجھے اَپالو کہنا شروع کر دیا۔

میں خود بھی حسین تھا اور میں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے اردگرد میں حسن ہی حسن دیکھا۔ میری ماں، دادی، ابو بہنیں اور خاندان کے لوگ حسن میں اپنی مثال آپ تھے۔ ہمارا گھر بے حد خوبصورت تھا۔ یہاں تک کہ گھر کے باہر حد نگاہ تک خوبصورتی ہی خوبصورتی تھی۔ خوبصورتی کی ایسی بہتات نے مجھے بلا کا حسن پرست بنا ڈالا اور خود پسندی میری شخصیت کا خاصہ بن چکی تھی۔ میری حسن سرپرست طبیعت پر معمولی سادھب بھی گراں گزرتا۔ میں اُن لوگوں ہی سے دوستی کرتا جو حسین ہوتے، کم صورت لوگ اکثر میری تضحیک کا نشانہ بنتے، جن میں وہ سرفہرست تھی۔

☆......☆......☆

میں اکثر اُس کی تضحیک کا نشانہ بنتی تھی۔ وہ کوئی موقع میری تضحیک کا گنوانے نہ دیتا، مگر اس کا رویہ و انداز میں ہمیشہ نظرانداز کر دیتی کہ وہ مجھے شروع ہی سے اچھا لگتا تھا۔ میرے بڑے بھائی سے اس کی دوستی بچپن ہی سے تھے۔ ایک ہی گلی میں گھر ہونے کے

باعث ہمارے گھرانوں میں بہت اچھے تعلقات تھے۔
اور آزادانہ ایک دوسرے کے گھر آنا جانا معمول تھا۔

مجھے محبت کے حوالے سے تو زیادہ کچھ معلوم نہیں بس اتنا
ضرور تھا کہ اُسے دیکھتے ہی میرے اندر خوشی و انبساط



کے جھرنے سے بہنے لگتے تھے، مگر وہ حسن کا دیوتا اپنے آگے کسی کو ٹھہرنے ہی نہیں دیتا تھا۔ خدا جب حسن دیتا ہے، نزاکت آ ہی جاتی ہے، مگر یہاں تو یہ محاورہ لڑکیاں اُس اَپا لو کے لیے استعمال کرتی تھیں۔

میں اکثر بہانے بہانے سے خالہ جی اور اُن کی بیٹی جو کہ میری بہت اچھی دوست بھی تھی سے ملنے جاتی تھی کہ کسی نہ کسی طور اس کے درشن ہوں۔ مگر مجال ہے جو کبھی اُس نے مجھے نظر بھر کے دیکھا ہو۔ اس کی وجہ اس کی شرافت نہیں بلکہ اس کا غرور تھا۔

میں جانتی تھی، اس کی نظروں میں میری کوئی وقعت نہیں کیونکہ میں ایک عام سی شکل وصورت و دبتی رنگت والی لڑکی تھی۔ مگر میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ جو صبح وشام اس کے نام کی مالا جپتا تھا۔ محبت کی دھیمی دھیمی کسک ہر آن مجھے بے چین کیے رکھتی۔ ایک روز میں خالہ جی سے ملنے گئی تو وہ اپالو تنہا صحن میں بچھے تخت پر لیٹا ہوا، جانے کیا سوچ رہا تھا۔

''سنیے۔'' میں نے اُس کی محویت توڑتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔'' وہ چونک کر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

''وہ خالہ جی اور صبا وغیرہ گھر پر نہیں ہیں کیا۔'' میں نے پوچھا تھا۔

''نہیں گھر پر کوئی نہیں اور تم جاؤ یہاں سے۔''

اس نے یہ جملہ اتنی نفرت وحقارت سے ادا کیا کہ میرے تن بدن میں آگ سی دہک اٹھی۔ میں سخت غصے سے بھری اٹھی۔

''تم..... تم سمجھتے کیا ہو خود کو۔'' میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا تو مارے طیش کے میں نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔

''نہ کرو یوں میرے ساتھ، میرے معصوم جذبوں کے ساتھ۔ میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں، بہت زیادہ۔ تم یوں مجھے رد نہیں کر سکتے۔'' ابھی میں اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ اُس نے میری کلائیاں تھام کر ایک جھٹکے سے مجھے خود سے الگ کیا تو میں دور جا پڑی۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ مجھے تم سے اور تمہاری اس صورت سے نفرت ہے۔ میں اور تم سے شادی کروں گا۔'' اس نے طنز و رعونت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''محبت کرنے سے پہلے آئینہ تو دیکھ لیتی تو تمہیں اپنی اوقات نظر آتی کہ تم کیا ہو۔ کیا ہے تمہارے پاس۔'' اس سے پہلے کہ وہ مزید زہر اگلتا میں چلا اٹھی۔

''بس کرو! خدا کے لیے بس کرو۔ میں نے تم سے محبت ضرور کی ہے مگر تمہیں یوں میری تذلیل کرنے کا کوئی حق نہیں۔ تم جو خود کو 'یوسف ثانی' سمجھتے ہو یہ بھول گئے کہ ہم سب مٹی کے مادھو ہیں۔ بنانے والے نے جیسے چاہا بنا دیا۔ کسی کو گورا، کسی کو کالا، کسی کو شبنم تو کسی کو شعلہ۔ یہ تو اس کی حکمتیں ہیں، جس کو جاننا سمجھنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ اس کے نزدیک فوقیت ہے تو صرف تقویٰ کو۔ یاد رکھو مسٹر احمد! خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ تم صرف میرے ظاہر کی وجہ سے میری توہین کر رہے ہو۔ تمہاری خود پسندی اور غرور، میری اور میری محبت کی نفی کر رہا ہے۔ مسٹر احمد ہر عورت خوبصورت ہوتی ہے۔ اس کا عورت ہونا ہی اس کی خوبصورتی کی دلیل ہے۔ مگر تم جیسے انا پرست نادان مرد کیا جانیں۔ تم تو چڑھتے سورج کے پجاری ہو۔ مگر یاد رکھو کہ انسان کا ظاہر جتنا بھی انمول وحسین کیوں نہ ہو، نری خاک ہے۔ اندر زندہ رہتا ہے۔ تمہارا دیا ہوا یہ زخم مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ اور ضرور وہ منصف ہے۔ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر میں تمہیں ضرور یاد آؤں گی۔''

''تقریر تم اچھی کر لیتی ہو۔'' اُس نے طنز کا ایک اور وار کیا، میرے احساسات و جذبات کے جواب میں۔

''ٹھیک ہے احمد! میں تمہاری زندگی سے جا رہی ہوں مگر میری زندگی میں تم موجود رہو گے۔ میں تم کو اب کبھی نظر نہیں آؤں گی۔'' میں روتے ہوئے وہاں سے لوٹ آئی۔

☆......☆......☆

اُس دن کے بعد سے مریم مجھے دوبارہ نظر نہ آئی۔ وقتی طور پر اس جذباتی ردعمل پر مجھے ندامت ہوئی مگر فطری خود پسندی عود کر آئی تو میں سب کچھ بھول گیا

اور اپنی دنیا میں مگن ہو گیا۔
ان ہی دنوں والدہ اور میرے گھر والوں کو میرے سر پر سہرا سجانے کا خیال آیا۔ گو وہ کافی عرصے سے میرے لیے لڑکی کی تلاش میں تھیں، مگر کوئی چہرہ کوئی سراپا میرے معیار پر پورا اُتر کر ہی نہ دیتا تھا۔ یہاں تک کہ بہنیں زچ ہو گئیں۔

''اُف بھائی جان! آخر آپ کو کوئی لڑکی پسند کیوں نہیں آتی، آپ کو ہمارا کچھ خیال نہیں! کتنا ارمان ہے ہم بہنوں کو آپ کی شادی کا۔ کتنی لڑکیاں دکھائی ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک، مگر کوئی آپ کو بھاتی ہی نہیں۔'' ایک روز تنگ آ کر سب سے چھوٹی صبا نے کہا۔

''ہاں بیٹا صبا ٹھیک کہہ رہی ہے۔ کوئی بھی انسان مکمل نہیں ہوتا۔ میں چاہتی ہوں صبا کے ساتھ ہی تمہاری شادی بھی کر دوں، تاکہ ایک بیٹی گھر سے جائے تو دوسری آ جائے اور مجھے تنہائی محسوس نہ ہو۔'' امی نے صبا کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

اچھا ٹھیک ہے بابا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
اور بالآخر بہت تلاش اور جستجو کے بعد مجھے وہ چہرہ مل ہی گیا جو میرے تصور و خیال کے عین مطابق تھا۔

☆......☆......☆

شادی کی پہلی رات اس نے مجھے دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ میں جو حسن و جمال کا شاہکار تھی۔ مجھے بھی اپنی قسمت پر رشک آ رہا تھا کہ وہ اپالو جو کتنے دلوں کی دھڑکن تھا۔ خدا نے اُسے میرے نصیب میں لکھا۔ وہ مجھے کانچ کی گڑیا کی طرح سنبھال سنبھال کے رکھتا۔ ہماری جوڑی بالکل پرفیکٹ تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی رفاقت پا کر بے حد خوش تھے۔ ہر دن عید، ہر رات شب برات تھی۔ شادی کے چند ماہ بعد ہی جب میں نے احمد کو اپنے آنگن میں پھول کھلنے کی نوید دی تو وہ خوشی سے بے قابو ہو گیا۔ آنے والے کی آہٹ پا کر وہ پھولے نہ سماتا۔

''سنو ہمارے گھر پہلی بیٹی ہو گی۔ بالکل تمہاری طرح۔'' احمد نے شوخی سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''جی نہیں ہمارے ہاں بیٹا ہو گا بالکل اپالو جیسا۔'' میں نے بھی جواباً شوخی سے کہا تو احمد ہنس پڑے۔

''ارے پگلی بیٹا ہو یا بیٹی تم پر ہو یا مجھ پر، ہو گا تو حسین ہی۔'' احمد نے بڑے فخر سے کہا تھا۔

وہ دن بھی آ گیا۔ جس کا احمد کو اور مجھے انتظار تھا۔ درد کے لامتناہی صحرا کو پار کر کے میں نے

جس بچی کو جنم دیا۔ اُسے دیکھ کر میں شدید حیرانی و پریشانی میں گھر گئی۔

''نہیں یہ میری بیٹی نہیں ہے۔'' میں نے لیڈی ڈاکٹر کو جھنجھوڑ کر کہا تھا۔

دیکھیے محترمہ اس بچی کو آپ ہی نے جنم دیا ہے۔ آپ یوں محسوس نہ کریں یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ کہ عام سی صورت والے ماں باپ بے حد حسین بچے کے والدین بن جاتے ہیں اور بہت خوبصورت والدین کم صورت بچوں کو جنم دیتے ہیں۔''

''آپ ٹھیک کہتی ہیں، میں ماں ہوں۔ یہ جیسی بھی ہے میری ممتا کی حق دار ہے۔ میرے جگر کا ٹکڑا ہے، میرا احمد اسے دیکھ کر کیا محسوس کرے گا۔ کیا گزرے گی ان پر۔'' میں نے مغموم ہو کر کہا کہ میں احمد کو جانتی تھی اور میرا خیال ٹھیک ثابت ہوا۔

بچی کی پیدائش کی خبر پا کر احمد بڑی بے تابی سے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

''ثناء تمہیں نہیں پتا میں آج کتنا خوش ہوں۔ احمد جذباتی لہجے میں کہتے ہوئے کاٹ میں لیٹی بچی کی طرف بڑھتے ہوئے بولے تھے۔ احمد کی خوشی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی، جب انہوں نے اُسے دیکھا۔ ایک پل میں کئی سائے احمد کے چہرے پر آئے اور گزر گئے۔ وہ گم صم سے حیران کھڑے رہ گئے۔

☆......☆......☆

مارے صدمے کے مجھ سے بات تک نہ ہو سکی۔ میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے اور اس کے کہے آخری الفاظ خالی گنبد میں کسی گونج کی طرح میرے کانوں کے اطراف رقص کر رہے تھے۔

''میں زندگی میں کسی نہ کسی موڑ پر تمہیں ضرور یاد آؤں گی۔'' کیونکہ کاٹ میں لیٹی بچی نہ میری جیسی تھی نہ ثناء جیسی۔ وہی گہری رنگت..... میں کتنی ہی دیر تک خاموش کھڑا رہا۔ مجھے ادارک ہو گیا تھا کہ میری 'سزا' شروع ہو گئی ہے۔ میں جو اپنی انا اور غرور کی دنیا میں گم، سب کچھ بھلائے بیٹھا تھا۔ خدا کی لاٹھی کو حرکت میں آتے محسوس کر کے کانپ اٹھا تھا۔ ایک پل میں میرے اندر کی دنیا بدل کے رہ گئی۔ میں اپنی 'میں' سے نکل چکا تھا۔ گو بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں نے کاٹ سے بچی کو اٹھا کر بے تحاشا پیار کیا۔ پدرانہ شفقت، میرے تمام غلط احساسات نگل گئی۔ وہ مجھے اپنی کم رُوئی سمیت اچھی لگی۔ آخر وہ میرا ہی تو خون تھی۔ جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی گئی، میری اور ثناء کی آنکھوں کا تارا بنتی گئی۔ اس کی معصوم شرارتوں، کلکاریوں سے ہمارا آنگن مہکنے لگا۔

گل کے بعد ہمارے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ جس کا مجھے کبھی ملال نہ ہوا۔ میرے اور ثناء کے لیے گل ہی کل کائنات تھی۔

اُس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو مجھے اور ثناء کو اُس کی شادی کی فکر لاحق ہو گئی۔ بہت سے لوگ آتے مگر صرف ایک بار..... کوئی پلٹ کر دوسری بار نہ آتا۔ برسوں پہلے بوئی گئی میرے اعمال کی فصل پک کر تیار ہو گئی تھی۔ جسے کاٹتے کاٹتے نہ صرف میں بلکہ گل بھی ادھ موئی ہو گئی۔ ڈرائنگ روم کی اذیت نے اُسے چاٹنا شروع کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

زندگی میرے لیے ایک عذاب بن گئی ہے۔ نجانے کس جرم کی سزا مجھے مل رہی ہے۔ یا خدا! میرا کیا دوش تُو نے جیسے چاہا بنایا۔ لوگوں کی طنزیہ نگاہیں مجھے توڑ کر رکھ دیتی ہیں۔ میں تنگ آ گئی ہوں روز روز کے اس 'رد' کیے جانے سے۔ میرے والدین مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں، مگر میری برداشت کی حد اب ختم ہو گئی ہے۔'

پھر ایک دن جب گل کی قوت برداشت ختم ہو گئی۔ تو اس نے خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کر لی۔

مریم اُپالو کی بے حسی سہہ گئی تھی، مگر میری گل نہ سہہ سکی۔''

یہ کہہ کر احمد انکل پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے اور میں سوچ رہی ہوں کہ یہ کہانی ان لوگوں کے لیے عبرت ہے اور سوچنے کا مقام جو خود کو اُپالو جانتے ہیں۔ ان کے گرد بھی مریم جیسی کوئی معصوم ہستی ضرور رہتی ہو گی، ہو سکتا ہے یہ پڑھ کر وہ مریم سے وہ سلوک نہ کریں۔ جو احمد انکل نے کیا۔ اپنے حسن و جوانی کے زعم میں، نہ دکھائی دینے والا۔

☆☆......☆☆

# گواہ



مقصود احمد بلوچ

اُس مرد کی کہانی، جسے اپنی بیوی کے نکاح پر گواہ بنا دیا گیا مگر......



آج سے پانچ سال پہلے مظہر کا نکاح اس کی چچا کی بیٹی عارفہ سے ہوا تھا۔ لیکن ابھی تک رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ مظہر اپنی کزن سے بہت محبت کرتا تھا۔ عارفہ کے والدین کراچی میں رہتے تھے اور مظہر ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ لیکن گاؤں میں رہتے ہوئے بھی مظہر نے ایم اے انگلش تک تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ بھی مظہر بہت محنتی اور لائق انسان تھا۔ اتنی زیادہ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود بھی مظہر کو کوئی اچھی جاب نہیں ملی تھی۔ وہ ایک پرائیویٹ جاب کرتا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ سرکاری نوکری کی تلاش میں بھی رہتا تھا۔

مظہر کا چھوٹا بھائی اس وقت ایف ایس سی پارٹ ون میں پڑھ رہا تھا۔ جس کا نام منصور تھا۔ وہ بھی اپنے بڑے بھائی کی طرح بہت محنتی اور ذہین تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ مظہر کا عارفہ کے ساتھ نکاح ہوئے پورے تین سال کا عرصہ بیت گیا۔ اب مظہر نے اپنے والدین سے اصرار کیا کہ چچا سے رخصتی کے بابت بات کرنی چاہیے کیونکہ نکاح ہوئے اتنا عرصہ بیت چکا ہے۔

مظہر کے والدین نے جب عارفہ کے باپ سے اس کی رخصتی کی بات کی تو عارفہ باپ ٹال مٹول سے کام لینے لگا۔ عارفہ کا باپ کرامت علی بہت زیادہ امیر شخص تھا۔ جب وہ ٹال مٹول سے کام لیتا تو مظہر کے والدین خاموش ہو جاتے۔ کہ چلو ایک نہ ایک دن رخصتی تو ہونی ہی ہے۔

شروع شروع میں تو عارفہ مظہر کو بہت زیادہ یاد کرتی۔ اس سے پیار محبت کی باتیں کرتی۔ ماشاء اللہ دونوں کی جوڑی بھی بہت خوبصورت تھی۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پتا نہیں عارفہ کو کیا ہو گیا۔

نکاح کے بعد جب عارفہ گاؤں میں آتی تو مظہر کا بہت زیادہ خیال رکھتی تھی۔ عارفہ کے والد کرامت علی اور مظہر، ان کا ایک ہی تو گھر تھا۔ جب کرامت علی گاؤں سے کراچی آتا تو اسی گھر میں رہتا تھا۔

مظہر کا عارفہ کے ساتھ نکاح ہوئے تقریباً تین سات بیت گئے مگر رخصتی نہ ہو سکی۔

☆......☆......☆

مظہر کے دل میں اب بہت سارے خیالات جنم لینے لگے تھے کہ آخر اس سب کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ چاچا کرامت علی کیوں ٹال مٹول سے کام لے رہے ہیں؟ بس مظہر ہر وقت ان ہی سوچوں میں گم رہتا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مظہر کا چھوٹا بھائی منصور بی ایس سی کر کے آرمی میں بطور سیکنڈ لیفٹیننٹ بھرتی ہو گیا تھا۔

کرامت علی کو منصور کی اس جاب کا علم ہوا۔ تو اُس کا جھکاؤ مظہر کے بجائے منصور کی جانب ہو گیا تھا۔ اب اُس کے دل میں یہ بات تھی کہ مظہر تو پڑھا لکھا ہے لیکن اس کی باقاعدہ کوئی سرکاری جاب نہیں تھی۔

کیوں نہ عارفہ کا رشتہ منصور سے جوڑ لیا جائے۔ کرامت علی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی عارفہ کی شادی کبھی بھی مظہر سے نہیں کرے گا۔ بلکہ وہ اُس کی شادی مظہر کے چھوٹے بھائی منصور سے کرے گا۔ اس لیے مظہر کے والدین جب بھی کرامت علی سے عارفہ کی رخصتی کی بات کرتے۔ اُن سے سیدھے منہ بات نہ کرتا۔

آخر کب تک کوئی کسی کا انتظار







کرتا۔ مظہر کے والدین بھی آخر کار تنگ آ کر اس کے گھر کراچی چلے گئے۔ تا کہ وہاں آمنے سامنے بیٹھ کر اس مسئلے کا کوئی حل نکالا جائے کہ آخر کرامت علی عارفہ کی رخصتی کیوں نہیں دے رہا۔ جب کراچی پہنچ کر کرامت علی سے بات چیت کی۔ تو کرامت علی نے کہا کہ میری بیٹی نہیں مانتی کہ وہ مظہر سے شادی کرے۔ میں اپنی بیٹی کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ مظہر سے کہیں کہ وہ میری بیٹی عارفہ کو طلاق دے۔ بس آپ لوگ اب ہمارا اور انتظار نہ کرو۔''

کرامت علی کی یہ بات سن کر مظہر کی والدہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ کہ اس شخص نے ہمارے ساتھ یہ کیسا مذاق کیا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر مظہر کے والدین کو اس چیز کا دکھ تھا کہ کرامت علی

ہمیں نے کتنا زیادہ انتظار کروایا۔ کاش یہ بات پہلے ہی بتا دیتا۔ مگر کیا کیا جا سکتا تھا۔

☆......☆......☆

مظہر کو بڑی بے چینی سے اپنے والدین کے آنے کا انتظار تھا کہ وہ آئیں اور کوئی اچھی خبر سنائیں۔ خیر وہاں سے آنے مظہر کی ماں نے سب کچھ صاف صاف مظہر کو بتا دیا۔ جو کرامت علی نے ان کی عزت افزائی کی تھی۔

مظہر نے جب یہ بات سنی تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اور وہ پریشانی کے عالم میں ماں سے پوچھنے لگا کہ آخر کیوں انہوں نے ایسے کیا۔ آخر میرا قصور کیا تھا؟''

مظہر ایک انتہائی شریف انسان تھا اور نہایت نرم مزاج تھا۔ مظہر کو اب صرف اور صرف اس بات کا دکھ تھا کہ آخر میں نے کون سی غلطی کی تھی۔ جس کی اتنی بڑی سزا مجھے میرا چاچا دینا چاہتا ہے۔ مظہر نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ چاچا سے خود بات کرنا چاہتا ہے۔''

اس کے بعد مظہر نے کرامت علی کو کئی بار کال کی مگر اس نے کال اٹینڈ نہیں کی۔ کئی بار ٹرائی کرنے کے بعد سیٹھ کرامت نے مظہر کی کال اٹینڈ کی تو اس نے اُسے ٹکا سا جواب دے دیا کہ عارفہ تم سے شادی کرنے کے لیے رضامند نہیں۔ اس لیے ہم مجبور ہیں۔ آئندہ ہمیں اس معاملے میں پریشان نہ کرنا۔''

☆......☆......☆

آخر کار تنگ آ کر ایک دن مظہر نے عارفہ کو طلاق دے دی۔ اور اس دن وہ بہت رویا۔ کیونکہ وہ ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا، مگر حالات نے اُسے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی سے عارفہ کو ہمیشہ کے لیے دور کر دیا تھا۔ وقت گزرتا رہا اور کچھ عرصے بعد مظہر کے لیے ایک رشتہ آیا۔ جسے باآسانی قبول کر لیا گیا۔ مختصر سی رسم کے بعد اُس کی شادی ہو گئی۔ مظہر کی بیوی نے مظہر کو بہت زیادہ پیار دیا۔ لیکن اُس کے باوجود مظہر کے دل میں ایک نامعلوم سی کسک رہتی تھی۔ اس کی شادی ہوئے چار سال کا عرصہ بیت گیا۔ ان چار سالوں میں اللہ تعالیٰ نے مظہر کو دو بیٹوں سے نوازا تھا۔

وقت اپنی چال چلتا رہا۔ منصور کی ترقی ہو گئی اور اب وہ آرمی میں بطور کیپٹن تھا۔

اب سیٹھ کرامت علی نے آہستہ آہستہ پھر سے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ کہ عارفہ تم سے شادی کرنا چاہتی ہے۔'' وہ منصور سے بات کرتا اور اُسے کہتا کہ آپ اپنے گھر والوں کو کہو کہ میں عارفہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

منصور نے اُس کے کہنے پر اپنے والدین سے بات کی کہ میں عارفہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ منصور کی یہ بات سن کر اُس کے بھائی اور والدین آگ بگولہ ہو گئے۔ اور انہوں نے اُس سے کہا کہ آج کے بعد اگر تم نے عارفہ کا نام لیا تو ہم سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ کیا تم کو شرم نہیں آتی کہ ایک بھائی کو انہوں نے بیٹی نہیں دی اور تم اسی سے شادی کرنا چاہتے ہو۔''

منصور ان کی باتیں سن کر چپ ہو گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ سیٹھ کرامت علی اب ہر روز ان کو فون کرتا۔ اور ان کے ساتھ اپنی بیٹی عارفہ کے بارے میں بات کرتا لیکن وہ ہر بار انکار کرتے کہ اب یہ ناممکن ہے۔

آپ نے پہلے بھی ہمارے ساتھ بہت برا مذاق کیا ہے۔ اب ہم یہ ہرگز نہیں کریں گے۔'' اب ان دو خاندانوں کے درمیان ہر وقت یہی کشمکش رہتی۔

اسی دوران مظہر کے سسرال والے اُس کے گھر آئے اور مظہر کی بیوی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ اور وہاں جا کر انہوں نے بہت بھاری رقم کا مطالبہ کر دیا۔ کہ اگر آپ ہمیں اتنے پیسے دو گے تو ہم آپ کی بیوی کو گھر واپس آنے دیں گے۔ نہیں تو بس آپ موج کرو۔'' مظہر کا پہلا ملا غم کیا کم تھا، جو دوسرا پھر اس کو دے دیا گیا۔ اور وہ بھی پہلے سے بڑھ کر۔

اب مسئلہ یہ تھا مظہر کے پاس اتنی زیادہ رقم نہیں تھی۔ جو ان کو دے کر وہ اپنی بیوی کو واپس لا سکتا۔

مظہر کو سب سے زیادہ اپنے بیٹوں کی یاد ستاتی۔ ہر وقت غم میں نڈھال رہتا۔ زندگی بھی نہ جانے اس انسان کے ساتھ کیا تماشا کر رہی تھی۔ اس نے بہت دفعہ اپنی بیوی کو فون کیا کہ تم واپس گھر آ جاؤ۔ لیکن وہ

کیسے آتی۔ وہ تو مجبور اور بے بس تھی۔ اس بے چاری کو اس کے والدین آنے دیتے تو وہ آتی۔ مظہر کی بیوی سے جدا ہوئے ایک سال کا عرصہ بیت گیا لیکن وہ نہ آئی۔

آخر کار مظہر نے کسی نہ کسی طریقے سے رقم کا بندوبست کرلیا اور ایک سال بعد اُس کی بیوی واپس گھر آئی۔

مظہر نے جب بیٹوں کو دیکھا تو کافی دیر تک اُن سے لپٹ کر روتا رہا۔ اس دنیا میں اگر کوئی انمول چیز ہے تو وہ انسان کے لیے اولاد ہے۔

☆......☆☆......☆

سیٹھ کرامت علی تو پہلے دھیرج سے عارفہ کے رشتے کی بات کرتا تھا۔ پھر اُس نے جیسے چوکھٹ ہی پکڑ لی۔ اب ہر روز فون کرتا اور کہتا اگر میری بیٹی کا نکاح منصور کے ساتھ نہ ہوا تو وہ بھی مر جائے گی اور میں خود بھی مر جاؤں گا۔''

سیٹھ کرامت علی کے ساتھ ساتھ جب بھی منصور چھٹی پر آتا تو اپنے والدین سے یہی کہتا کہ میں نے شادی تو عارفہ کے ساتھ ہی کرنی ہے۔ نہیں تو میں ہرگز شادی نہیں کروں گا۔'' دراصل منصور بھی رفتہ رفتہ عارفہ سے محبت کرنے لگا تھا۔

ایک دن منصور نے اپنے والدین سے یہ بات کہہ ڈالی کہ اگر میرا رشتہ عارفہ سے نہ ہوا تو میں اپنے آپ کو گولی مارلوں گا۔''

یہ بات سنتے ہی اُس کے والدین بڑے پریشان ہوگئے۔ ایک طرف تو ان کو اپنا بیٹا نظر آتا تھا اور دوسری طرف سیٹھ کرامت علی کے ساتھ وہ دکھ جو اس نے ان کو دیا تھا۔

آخر کار معاملہ مظہر تک پہنچ گیا۔ اس سے پوچھا کہ ہم منصور کی بات مانیں یا پھر تمہارے ساتھ ہوئی زیادتی کا بدلہ لیں۔'' یہ ساری بات سن کر مظہر نے رسان سے جواب دیا۔

''امی جان میری قسمت میرے ساتھ تھی۔ آپ منصور کی خوشی کی خاطر اس کا رشتہ وہیں کردو جہاں وہ چاہتا ہے۔ اور اُس کی خوشی کی خاطر میں سب کچھ برداشت کرلوں گا۔''

اور یوں منصور کی خوشی کے آگے سب نے ہتھیار ڈال دیے۔ اور وہ دن بھی آگیا۔ جس دن عارفہ اور کیپٹن منصور کا نکاح تھا۔

پورا گھر بچوں عورتوں اور چھوٹے بڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں لیکن وہ مظہر کی نہیں کسی اور کی رہی تھی۔

مولوی صاحب آئے نکاح کی رسم شروع ہوئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد انہوں نے عارفہ کو منصور کے عقد میں باندھ دیا۔ اور نکاح نامے پر جو چار گواہ تھے۔ ان کے دستخط باقی تھے۔

وقت انسان کو کہاں سے کہاں لے آتا ہے۔ اور آج وقت مظہر کے ساتھ بھی تماشا کررہا تھا۔ جو چار گواہ تھے ان چار گواہوں میں ایک نام مظہر کا بھی تھا۔ جس سے وہ قطعاً لاعلم تھا۔

سب نے باری باری اپنے دستخط کردیے۔ جب مظہر کو بلایا گیا تو وہ ششدر رہ گیا۔ بھلا ایسے کیسے ممکن تھا۔ اُس نے سہرا باندھے اپنے بھائی کو دیکھا اور پھر دوسری طرف اپنے باپ کو...... محبت نے دل بھیجا مگر...... یہ تو تھا ہی غلط، وہ کس طرح اس کام میں حصے دار بن سکتا تھا۔

''معاف کیجیے گا مولوی صاحب! میں اس نکاح میں گواہ نہیں بن سکتا۔ میری آپ سے ہی نہیں بلکہ تمام مسلمانوں سے گزارش ہے کہ نکاح سے پہلے زبردستی گواہوں کے نام پُر کرنے سے پہلے، اُن کی رائے کا احترام بھی ملحوظ رکھنا چاہیے اور مولوی صاحب! منصور بھائی میرا ہے۔ لیکن جس سے اس کی شادی ہورہی ہے، کیا آپ کو علم نہیں کہ اُس منکوحہ سے میرا کون سا رشتہ رہ چکا ہے۔''

یہ کہہ کر مظہر رُکا نہیں بلکہ اس گھر سے کیا، اس شہر ہی سے ناتا توڑ گیا۔ آج مظہر اور اس کی فیملی جہاں بھی ہیں خوش ہیں۔

بھلا بیوی کا گواہ وہ کس قانون اور ریت سے بن سکتا تھا۔

☆☆......☆☆

تیسری سرد کہانی

# ہاں وہ پاگل تھا

حاتم وقاص

وہ پاگل ہجی دھجی اپنی کٹیا سجاتا رہتا تھا مگر ایک ہی وار میں جب اُس کا آشیانہ جلا تو......

کئی برس قبل ریل گاڑی راولپنڈی سے چکوال کے لیے بھی چلتی تھی۔ مگر اب وہ ریلوے لائن ختم ہو چکی ہے۔ اور کوئی گاڑی نہیں چلتی۔ یہ ان ہی دنوں کی بات ہے۔ جب ریلوے گاڑی چلا کرتی تھی۔ چکوال کے ریلوے اسٹیشن پر اتر کر جب آپ سرکلر ریلوے اسٹیشن کی طرف جائیں تو ایک پتلی سی سڑک پر سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس سڑک کے ایک طرف مذبح خانہ تھا اور دوسرے طرف چند چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں۔ پیٹرول پمپ سے آگے جا کر سڑک جہاں اچانک ختم ہو جاتی تھی۔ وہاں ایک پرانا اور سوکھا ہوا درخت نظر آتا تھا۔ اس کا تنا ٹنڈ منڈ ہو چکا تھا۔ اور سوائے چند سیاہی مائل ننگی شاخوں کے کچھ بھی باقی نہ تھا۔ وہ درخت...... درخت سے زیادہ بھوت کی صورت کا تھا۔ اس درخت کی وہاں موجودگی کا واحد مقصد یہی نظر آتا تھا کہ وہ ایک مفلس شخص کے جھونپڑے پر اپنا بے فیض سایہ کیے رکھے۔ وہ سایا جس میں سرسبز پتوں کی تراوٹ کا نام ونشان تک نہ تھا۔ جو تسکین بخش سائے کے بجائے نحوست کی علامت محسوس ہوتا تھا۔

میں اور میری بیوی جب بھی اس جگہ سے گزرتے تو اس شخص کو وہاں ضرور دیکھتے۔ وہ ایک عام سا شخص تھا۔ اور بظاہر اس میں کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ نابینا بھی تھا۔ ہم وہاں سے گزرتے وقت اس کے بارے میں کوئی نہ کوئی بات ضرور کرتے تھے۔ کیونکہ اُس کی گھاس پھوس سے بنی جھونپڑی ایسی نہ تھی کہ انسان اس پر سرسری توجہ دے کر آگے بڑھ جائے۔ وہ خاص توجہ چاہتی تھی۔ اس نابینا اور غریب شخص نے اپنا رہنے کا ٹھکانہ بنانے میں معمولی محنت سے کام نہیں لیا تھا۔ آنکھوں سے محروم ہونے کے باوجود وہ اپنے اس جھونپڑے کو پہلے سے زیادہ بہتر اور دیدہ زیب بنانے کے لیے مصروف رہتا تھا۔ وہ جھونپڑا محض گھاس پھوس کا ہی نہیں تھا بلکہ اس کے بنانے میں درختوں کی شاخیں پرانے ڈبے، ٹین، گتا، رنگین کاغذ، قسم قسم کے چیتھڑے، غرض جو شے بھی اس شخص کو میسر آ سکی استعمال کی گئی تھی۔

اور بوڑھے نابینا کو بھی مصروف کار دیکھنا ایک دلچسپ فعل تھا۔ وہ انتہائی لگن سے، محویت سے اِدھر اُدھر سے اپنے جھونپڑے کے لیے مختلف چیزیں جمع کرتا رہتا تھا۔ کبھی وہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں سے چھڑیاں اور چیتھڑے اٹھا رہا ہوتا تھا۔ اور کبھی وہ زمین سے کاغذ اٹھا رہا ہوتا تھا۔ نہ جانے کہاں کہاں سے وہ طرح طرح کے ٹکڑے اور ریزے اکٹھے کرتا رہتا اور انہیں محبت سے صاف کر کے جھونپڑے کی چھت پر ڈال دیتا اور وہ چھت

بھی کون سی اونچی تھی۔ زمین سے مشکل اس کی اونچائی ساڑھے چار فٹ ہوگی۔ چیتھڑوں اور گتوں کے ٹکڑوں سے وہ مسلسل اپنے جھونپڑے کی دیواروں کے شگاف پُر کرتا رہتا۔ اور یوں اپنے آپ کو ساون بھادوں کی ظالم بارشوں سے محفوظ رکھنے کے لیے مستقل طور پر جھونپڑے کو مضبوط بناتا رہتا۔

سڑک پر سے گزرتے ہوئے اس کے جھونپڑے کے اندر بھی دیکھا جا سکتا تھا۔ جہاں اس نے چند اینٹوں اور پتھروں کی مدد سے ایک چھوٹا سا چبوترہ بنایا ہوا تھا۔ وہ اس کے لیے رات کو بستر اور دن کو چوکی کا کام دیتا تھا۔ اکثر وہ اس چبوترے پر گیلی مٹی کی تہہ جما دیتا۔ وہ جھونپڑے کی آرائش اور چبوترے پر مٹی لگانے کے کام اس طرح سرانجام دیتا۔ جیسے وہ کوئی ماہر تعمیرات ہو۔ اور اس کے سامنے ایک معمولی جھونپڑا نہیں بلکہ کوئی فلک بوس عمارت ہو۔

وہ کمزور سا جھونپڑا اس مفلس شخص کا واحد ٹھکانہ تھا۔ جب مون سون کی قیادت خیز بارشیں شروع ہو جاتیں۔ تو بوڑھا اپنے جھونپڑے کے دروازے پر ٹین کی ایک چادر تان کر اندر بند ہو جاتا۔ کئی کئی دن اگر بارشیں ہوتی رہتیں تو وہ باہر نہ نکلتا بلکہ بوریا اوڑھ کر اندر ہی لیٹا رہتا۔ جب تک وہ اذیت ناک موسم ختم نہ ہوتا۔ وہ اندر ہی رہتا۔

ہم نے کبھی بھی اُسے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے نہیں دیکھا تھا۔ لوگ اُسے خیرات ضرور دیتے تھے، لیکن وہ دست سوال دراز کرتے ہوئے شاید شرماتا تھا۔ جو کچھ اس کے سامنے پھینک دیا جاتا، وہ اس کو اپنا مقدر سمجھ کر قانع ہو جاتا تھا۔ ہاں البتہ ایک چیز کے لیے ہاتھ پھیلاتے ہوئے وہ کوئی جھجک محسوس نہ کرتا تھا۔ بیڑی پینا اس کی کمزوری تھی اور اکثر وہ بڑے دردناک انداز میں..... ''ایک بیڑی کا سوال ہے بابا..... صرف بیڑی پلا دو بابا۔'' کہا کرتا تھا۔

ہم وہاں سے گزرتے ہوئے اکثر اس جھونپڑے



کے باہر چپ چاپ بیٹھ کر دیکھتے تھے۔ کبھی کبھار اس کے ہونٹوں میں سگریٹ یا بیڑی موجود ہوتی تھی اور اس کی بے نور آنکھیں آسمان کی طرف لگی ہوتیں۔ جیسے خدا سے کوئی شکوہ کر رہی ہوں۔ اس کے ہونٹ ہمیشہ متحرک ہوتے تھے۔ جیسے وہ دل ہی دل میں اپنے آپ سے گفتگو کر رہا ہو۔ آخر اس کے دل میں بھی جذبات ہوں گے۔ وہ بھی کچھ سوچتا ہوگا۔ کبھی کبھی وہ ہمیں جھونپڑے کے اندر آلتی پالتی مارے بیٹھا نظر آتا، ہلکے ہلکے گنگناتے ہوئے، سر ہلاتے ہوئے وہ صبر وقناعت کی تصویر نظر آتا تھا۔ نہ جانے اس کے دل میں ناآسودہ خواہشات اور تشنہ تمناؤں کا آتش فشاں کس کس طرح پھٹتا ہوگا۔ اس نے بھی زندگی سے کیا کچھ طلب کیا ہوگا۔ لیکن اُسے ملا کیا......؟ کبھی کبھی شاید اسے اپنی محرومیوں کا شدید احساس ہوتا ہوگا۔ اس لیے ایسے عالم میں وہ زور زور سے ماتھے پر ہاتھ مارتا تھا۔ اس کی بے نور آنکھوں میں نمی نظر آتی تھی، جیسے وہ درد دل کو آنکھوں کی راہ سے نکالنے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔ بھلا آنسو بہانے سے بھی احساس کا جہنم سرد ہوسکتا ہے؟

ہوا جب درختوں کی شاخوں سے گزرتی تو یوں لگتا کہ وہ بوڑھے نابینا کی حالت پر نوحہ خواں ہو۔ یا جیسے بوڑھے کو اپنی مایوسی اور تشنہ روح چیخ پکار کرتی ہوئی ہواؤں کے ساتھ اس کے جھونپڑے پر منڈلا رہی ہو۔ صبح جب درختوں کے پتوں سے شبنم کے شفاف قطرے گرتے تو یوں محسوس ہوتا کہ پتے بھی اس شخص کے دکھ سے آشنا ہیں اور آنسو بہا رہے ہیں۔ بوڑھے کا سوائے ایک سوکھے ہوئے درخت کے کوئی بھی دوست نہ تھا۔ اکثر میرے ذہن میں خیال آتا کہ آخر یہی ایک درخت کیوں سوکھ گیا ہے؟ ارد گرد کے درخت تو بدستور ہرے بھرے ہیں؟ یہ درخت کیوں اس بوڑھے کی طرح سیاہ جھریوں زدہ ہوگیا ہے۔ ان دونوں کی تقدیر ایک جیسی ہی کیوں ہے؟ کیا بوڑھے نے جان بوجھ کر اس درخت کو ہمراز بنایا ہے؟ کیا اس درخت نے اپنے جیسے محروم شخص کے لیے اپنا دامن وا کیا ہے؟ کس کی نحوست کسے لے ڈوبی۔ اس درخت پر پتے کیوں نہیں اُگتے؟ اس بوڑھے کے مقدر کے اندھیروں میں کوئی کرن کیوں نہیں چمکتی؟

کبھی کبھی میری بیوی پوچھتی...... آخر اس بے چارے کو کون سا غم کھائے جا رہا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا کہ وہ کوئی بہت بڑا صدمہ دل میں چھپائے ہوئے ہے۔''

''ہاں ......'' میں جواب دیتا۔'' اس کے دل میں ناآسودہ خواہشات کا سمندر ہے۔''

''لیکن ایک نابینا کے دل میں کون سی خواہشات پیدا ہوسکتی ہیں۔ اس نے تو اس حسین دنیا کو دیکھا ہی نہیں ہے۔ جب انسان کسی چیز کو دیکھ ہی نہ سکتا ہو۔ تو پھر اس کی تمنا کیسی؟'' میری بیوی مجھ سے سوال کرتی۔

''سب سے بڑی تمنا تو یہی ہوسکتی ہے کہ وہ ایک عام انسان کی طرح زندگی کیوں نہیں گزار سکتا۔ وہ آنکھوں سے محروم کیوں ہے؟''

''لیکن اگر اسے آنکھیں مل بھی جاتیں تو شاید اس کے مقدر میں اندھیرے ہی ہوتے۔ وہ اسی طرح زندگی سے محروم رہا ہوتا۔ پھر ایسی زندگی کی خواہش کیا کرنا؟''

''زندہ رہنا بجائے خود ایک بہت بڑی تمنا ہے۔ زندگی مسرت ہی تو ہے۔'' میں جواب دیتا۔

''شاید اس کے دل میں ایک گھر، ایک خاندان کی خواہش بھی پیدا ہوتی ہوگی۔''

''یہ جھونپڑا اس کی خواہش کی تسکین کر دیتا ہے۔ اسی لیے تو وہ اس سے اتنی محبت سے سنوارتا رہتا ہے۔''

''یہ بے چارہ اس عمر میں آرام کا حق دار ہے۔ ہر وقت اسے اپنے زندہ رہنے کے لیے کتنی تگ و دو کرنی پڑتی ہے۔'' اس نے تو اپنی جوانی بھی کتنی مشقت میں گزاری ہوگی۔'' میں نے جواب دیا۔

''اگر اس کے بچے ہوتے تو آج اسے اتنی مصیبت نہ ہوتی۔'' میری بیوی نے کہا۔

''لیکن یہ بھی تو ممکن ہے وہ بے چارے ایسی ہی قابل رحم زندگی گزارتے۔'' میں بولا۔

''اُف!'' میری بیوی نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔'' اس دنیا میں بھی کتنی تکلیفیں اور کتنے مصائب ہیں۔'' شاید اس کا زندگی پر اعتماد، جڑوں تک ہل گیا ہے۔

''پیدا کرنے والے کے ڈھنگ نرالے ہیں۔'' میں نے اُداس مسکراہٹ سے یہ کہتے ہوئے اس موضوع کو ختم کر دیتا تھا۔

☆☆......☆......☆☆

اس روز جب میں اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔ تو جیسے اچانک میرے قدم زمین پر گڑ کر رہ گئے۔ کیونکہ مجھے وہاں سے گزرتے ہوئے بہت بڑی تبدیلی کا احساس ہوا۔ میں نے اُس جگہ کو بالکل سنسان اور ویران پایا۔ وہ جھونپڑا کدھر گیا؟ وہ بوڑھا آدمی کہاں ہے؟ کہیں وہ اچانک مر تو نہیں گیا؟

میرے ذہن میں بے شمار خیالات گردش کرنے لگے۔ وہ تو اپنے جھونپڑے سمیت اسی جگہ سے یوں غائب ہو چکا تھا۔ جیسے وہ کسی اور دنیا میں چلا گیا ہو۔ کسی اور سرزمین میں جا بسا ہو۔ یا پھر ان دونوں کو زمین نے نگل لیا ہو۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آیا کہ یکسر بوڑھے اور اُس کے وجود غائب ہو جائے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ کیا زمین اپنے سینے پر مفلسی کا اتنا سا بھی بوجھ برداشت نہیں کر پائی؟

☆☆......☆......☆☆

میں دفتر میں سارا دن اداس اور پریشان رہا۔ اور ان ہی کے بارے میں سوچتا رہا کہ وہ کہاں ہیں۔ کیا انہیں کوئی دیو اٹھا کر لے گیا۔ یا وہ کسی خوفناک طوفان کی لپیٹ میں آ کر کہیں دور جا بسے ہیں۔ میں نے سوچا کہ واپسی پر اپنی بیوی کو اس بارے میں ضرور بتاؤں گا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ وہ ایک عام سا اور ہمارے لیے اجنبی تھا۔ لیکن نہایت پُر اسرار طریقے سے وہ ہماری زندگی کا ایک حصہ بن چکا تھا۔ غیر محسوس طریقے سے ہم اُسے روزانہ دیکھتے تھے۔ ہمیں یہ خیال بھی نہ تھا کہ اُس کی غیر موجودگی اتنی شدت سے محسوس ہوگی۔ اچانک ہی جیسے ہمارے وجود کا ایک حصہ ٹوٹ کر علیحدہ ہو گیا تھا اور نہایت ہی المناک واقعہ لگ رہا تھا۔

جب میں شام کو واپس گھر پہنچا تو میری بیوی بھی بڑی اُداس تھی۔ میں ابھی اُس سے کچھ کہہ بھی نا پایا تھا کہ وہ غم ناک لہجے میں بولی۔

''مجھے سب معلوم ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا ہے۔''

''کیا؟ کیا دیکھا تھا تم نے۔'' میں بے صبری سے بولا۔

پھر اُس نے مجھے سب کچھ بتایا کہ صبح سویرے ہی کمیٹی کا ٹرک سڑک کے ناجائز تجاوزات گرانے آیا تھا۔ اِن لوگوں نے اپنے پہلے شکار کے طور پر اس مفلس اندھے کی جھونپڑی کا انتخاب کیا اور ایک ہی وار کر کے وہ جھونپڑا مسمار کر دیا۔ جسے بنانے میں بوڑھے نے اپنی زندگی کے قیمتی لمحات بھینٹ چڑھائے تھے۔

اور اس کے بعد بیچارے کا برا حال تھا'' میری بیوی نے سسکیاں لیتے ہوئے بتایا۔

''وہ جگہ اس کے رہنے کی ہی نہیں تھی، بلکہ وہ تو اس کے بدن کا ایک حصہ بن چکی تھی۔ وہ اندھا تھا لیکن جیسے اُسے جھونپڑے کے مسمار ہونے کا منظر صاف طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ وہ جھونپڑے کو زمیں بوس ہوتے دیکھ کر چیختا چلاتا رہا۔ ان لوگوں کی منتیں کرتا رہا۔ لیکن ان لوگوں نے سختی سے ڈانٹ کر اُسے پرے ہٹا دیا۔ وہ ایک انتہائی دلخراش منظر تھا۔ وار جھونپڑے پر ہوتے اور چیخیں بوڑھے کی نکلتی تھیں۔

قانون اپنا فرض ادا کر رہا تھا۔ دیکھنے والے چپ چاپ کھڑا رہنے کے اور کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔ جھونپڑے کا سارا کوڑا کرکٹ ایک جگہ کر کے اسے آگ لگا دی گئی۔ اور بوڑھا بے چارہ روتا رہا۔ جیسے اُسے زندہ جلایا جا رہا ہو۔''

میری بیوی نے بڑی مشکل سے اپنی سسکیوں پر قابو پایا اور پھر بولی۔

''پھر وہ بوڑھا اسی طرح روتا ہوا نہ جانے کدھر چلا گیا۔ قریب ہی ایک اور فقیر بیٹھا ہوا تھا اور بار بار اپنے پھوڑوں بھرے بدن کو کھجا کر زوردار قہقہہ لگاتا اور کہتا۔

''ہونہہ...... بے وقوف اس کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیے تھا۔ غریب ہو کر امیروں کی طرح رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ ہر وقت جھونپڑے کو سجاتا رہتا۔ پاگل...... غریب تھا تو غریبوں کی طرح رہا ہوتا۔ یہ کہتے ہوئے وہ زور سے ہنس دیتا۔'' میری بیوی یہ کہہ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆☆......☆......☆☆

آج بھی میں جب روزانہ دفتر سے آتے جاتے اس سیاہ درخت کے پاس سے گزرتا ہوں تو وہ مجھے اپنی تنہائی پر ماتم کناں نظر آتا ہے۔ لیکن اس کا دوست...... وہ نابینا شخص کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اور کالے درخت کی تنہائی کبھی دور نہ ہوگی۔

☆☆......☆☆

کراچی سے پہلی حکایت

# فضلو کی جورو

ارم ناز

جوان عورت جب بیوہ ہو جائے تو......

''کیسی نصیبوں والی ہے بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی۔ چاروں بچے ابھی چھوٹے ہی ہیں۔'' آپ سوچ رہیں ہوں گے میں کیسی باتیں کر رہی ہوں۔ خوش نصیبی کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ قصہ سن لیجیے اور اندازہ لگا لیجیے۔

فضلو تھا جگت بھیا تو اس اُس کی جورو بھی جگت بھابی ہوئی۔ غریب فضلو غبارے بیچتا تھا۔ صبح تڑکے ہی گھر سے ڈنڈے پر رنگ برنگے غبارے لگائے نکلتا اور رات گئے گھر آتا۔ فضلو کی غیر حاضری میں اس کی جورو رو کھا سوکھا ناشتہ بچوں کو کرواتی اور گھر کے باہر تھڑے پہ آ کر بیٹھ جاتی۔ ہر آنے جانے والے سے خیریت لیتی مجو بیگم اس کو پورے محلے کی رام کہانی سنا دیتی۔

مجو ہر بات سے واقف تھی۔ اشرف کے لونڈے کا چکر شکن کی لونڈیا سے چل رہا ہے۔ شہزادی خالہ کے پاس اس مہینے کس کی کمیٹی کھلنے والی ہے۔ حمیدہ کی بیٹی مہینہ بھر سے میکے میں بیٹھی ہے۔ شہناز کی لڑکی چھلہ گزارنے آئی ہے۔ غرض یہ کہ مجو تھڑے پہ بیٹھ کر محلے کے ہر گھر کا راز پا لیتی۔ وہ پھٹے پرانے لان کے کپڑے پہنے رہتی۔ ان کپڑوں کا پرنٹ اس کے اچھے دنوں کی طرح اڑ گیا تھا۔ نہانا یا منہ دھونا اُسے پسند نہ تھا۔ سارا وقت سر سے جوئیں نکال کر مارتی رہتی۔ رنگ بالکل سیاہ تھا۔ ماتھا باہر کو نکلا ہوا۔ حد درجہ بدشکل تھی۔ وہ بچے بھی ماں کی پرچھائیں تھے۔ سوکھی سڑی مجو اور سوکھے سڑے تیلی تیلی ٹانگوں والے بہتی ناک والے اُس کے بچے، سارا دن محلے میں گھومتے پھرتے نظر آتے۔

☆......☆......☆

ایک دن سننے میں آیا کہ فضلو بھیا بیمار ہے۔ بیمار کیا ہے؟ سمجھ سے باہر تھا۔ فضلو کا پیٹ دن بدن غبارے کی طرح پھولتا جا رہا تھا۔ بچے مذاق اڑاتے کہ فضلو بھیا نے پیٹ میں غبارے بھر لیے ہیں۔ ایک تو غربت اوپر سے یہ خطرناک بیماری۔ محلے والوں نے مل کر سرکاری اسپتال میں فضلو بھیا کا بہت علاج کروایا مگر ایک رات فضلو کے غبارے سے ہوا نکل گئی۔ فضلو بھیا نے دنیا کے جھنجٹ سے جان چھڑا لی۔ غربت کو مات دے دی۔ مر کر ہی سہی۔

فضلو کے گھر کے آگے دریاں بچھ گئیں۔ مجو دھاڑے مار مار کر رونے لگی۔ محلے والوں نے کفن دفن کے لیے چندہ جمع کرنا شروع کیا۔ جب ہی علاقے کے سب سے معزز شخص عرف بڑے صاحب حرکت میں آ گئے۔ فرمانے لگے۔ ''چندہ جمع کرنے کی ضرورت نہیں میں تمام انتظام کر لوں گا۔'' اور ہوا بھی یہی کفن دفن سے لے کر کڑوے کھانے تک کا انتظام انہوں نے کیا۔ بہتر سالہ یہ معزز ہستی صاحب بڑی گھاگ تھی۔ فضلو کے کفن دفن میں اپنا سارا پیسا ڈپازٹ کر دیا۔ اب یہ رقم مجو سے وصولنا تھی۔ طریقہ کار ذرا مختلف ہوتا کیونکہ مجو تو جگت بھابی تھی ناں۔ اب تو تیس سالہ مجو بہتر سالہ بڑے صاحب کی بھابی بن گئی۔ ☆☆

فضلو کیا مرا۔ مجو کے تو دن ہی پھر گئے۔ بڑے صاحب کے لیے تو مجو دیسی چوزے کی یخنی کی طرح تھی۔ جس سے وہ گاہے بگاہے طاقت حاصل کرتے رہتے۔ پھر اب کیوں نہ

ہوتے آخر فضلو کے کفن دفن کا خرچہ اٹھایا تھا۔ یہ پیسہ کسی بینک میں ڈپازٹ کرتے تو ماہانہ منافع حاصل ہوتا۔ مگر مجو سے تو جب من چاہتا منافع وصول کر لیتے۔

مجو کی تو کایا ہی پلٹ گئی تھی۔ اب تو نہا دھو کر تر گلابی کپڑے پہنتی اور تو اور رنگ گورا کرنے والی کریم جس کا اشتہار ٹی وی پر بار بار چلتا، روز تین ٹائم منہ دھو کر رگڑ لیتی۔ آنکھ میں بلا ناغہ کاجل ڈالتی۔ سج بن کر تھڑے پر بیٹھ جاتی۔ روز کا سودا سلف بڑے صاحب دے جاتے۔ زکواۃ کمیٹی کی ماہانہ رقم بھی بڑے صاحب کی مہربانی سے مل جاتی۔ ایک بڑے صاحب پر ہی کیا موقوف اس محلے میں بڑے صاحب جیسے اور بھی مرد تھے۔ مجو جواب سوکھی سڑی نہ رہی تھی۔ اچھی خوراک اور بے فکری نے بدشکل مجو کو بدل کے رکھ دیا تھا۔ سوکھا سڑا جسم کیسا گداز ہو گیا تھا۔ اچھے اچھوں کی رال ٹپک جاتی تھی۔

فضلو کی زندگی میں جن کھانوں کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا، وہ اب میسر تھے۔ بچوں کے پاس کھلونے اور کپڑے بھی تھے۔ اور مجو کے پاس شوخ رنگوں کے سات آٹھ جوڑے بھی اکٹھے ہو گئے تھے۔ گھر میں ٹی وی بھی آ گیا تھا۔ بڑے اچھے دن گزر رہے تھے۔ مجو نے اپنی سمجھداری سے غربت کو پچھاڑ دیا تھا۔ بر وقت بیوگی نے مجو کی زندگی میں کیسا کمال دکھایا تھا۔ جب وہ سہاگن تھی تو اتنے ہمدرد نہ تھے، جتنے بیوہ ہونے پر تھے۔ مجو خود بھی بڑی خوش اخلاق تھی۔ مجال ہے جو کبھی کسی ہمدرد کو مایوس کیا ہو۔ ☆☆

کچھ دنوں سے مجو کو اپنے اندر تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔ تبدیلی کیا تھی بیوہ مجو کے لیے خطرے کی گھنٹی تھی۔ معاشرے نے فضلو بھیا کا پھولا ہوا پیٹ تو قبول کر لیا تھا، مگر بیوہ مجو کا پھولا ہوا پیٹ اسے ذلیل خوار کر سکتا تھا۔

ساجھے دار کو تو معاف کر دیا جاتا مگر عورت تھی۔ اس کا گناہ تو پانی میں پلاسٹک کی طرح تیرتا نظر آ جاتا۔ اس پر پردہ داری نہیں ہو سکتی تھی۔ فوراً بچے کو بڑے صاحب کی طرف دوڑایا۔ گناہ گار تو بہت تھے، مگر بر وقت مدد صرف بڑے صاحب ہی کر سکتے تھے، کیونکہ وہ موٹی اسامی تھے۔ بڑے صاحب بھی بوڑھے ہوئے بچے کے پیچھے چلے آئے۔

پھر کیا تھا مجو نے تمام ماجرا کہہ سنایا۔ معزز آدمی منہ کھول کر کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اُس کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس عمر میں یہ چھکا اُس نے مارا ہے۔ مجو نے کہا بڑے صاحب تم نے وہ مثال نہیں سنی کہ مرد اور گھوڑا کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ یہ تو تمہارا ہی گناہ ہے محلے میں پتا چلے گا تو ذلیل و رسوا ہو جاؤ گے اور...... اب تمہارا اور میرا بھلا اسی میں ہے کہ اس کا حل ڈھونڈو۔''

مجو کو گمان تھا کہ وہ اس سے نکاح کر لے گا۔

مگر وہ بیوقوف نہ تھا۔ وہ تو اسے بغیر نکاح کے ہی حاصل تھی۔ پھر کیا ضرورت تھی، گلے میں ڈھول ڈال کر پیٹنے کا اور اگلے ہی دن بڑے صاحب نے مسئلے کا حل ڈھونڈ لیا۔ ولایتی این جی اوز کے تحت چلنے والے ایک زنانہ کلینک کی ڈاکٹر نے مجو کے بطن سے حرام کا نطفہ نوچ پھینکا۔ مجو بیگم ہو گئیں آزاد۔ آئی مصیبت ٹل گئی۔ آئندہ احتیاط کا عہد کر کے لیڈی ڈاکٹر سے جان چھڑوائی۔ معزز آدمی نے موٹی رقم ادا کر کے ڈاکٹر کی مٹھی گرم کر دی۔ کچھ وقت گزرا اور پھر وہی سب روز۔ بھوک بڑی ظالم شے ہے۔ اور بھوکے کی زندگی میں گناہ و ثواب کا فرق مٹ جاتا ہے۔ اور جوان عورت جب بیوہ ہو جائے تو وہ دونوں طرح کی بھوک کا شکار ہو جاتی ہے۔

مجو بھی ان ہی حالات کا شکار تھی۔ اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے کہ مجو کے قصے میں قصوروار کون تھا۔

معاشرہ تو سفید پوش کے ہاتھ پھیلانے کا انتظار کرتا ہے۔ یا بڑے صاحب جیسے لوگ جو امداد کی آڑ میں اپنی جوانی تازہ کرتے ہیں۔

☆☆......☆☆



# وہ اِک بھول

صالحہ ناصر

اسکول کا راستہ تو پانچ یا چھ منٹ کا تھا، مگر وہ عورتیں......




یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میرے نویں جماعت کے فائنل ایگزام ہونے والے تھے۔ اُس وقت میری عمر لگ بھگ 15 سال ہوگی۔ میں پہلی بار بورڈ کے ایگزام دینے جارہی تھی۔ لہٰذا کافی جوش و خروش سے امتحانات کی تیاری میں مصروف تھی۔ بالآخر وہ دن بھی آ پہنچا، جس دن میرا پہلا پیپر تھا۔ میں ابا جان کے ساتھ بورڈنگ سینٹر جانے کے لیے روانہ ہوئی۔ انہوں نے مجھ سے سینٹر کا نام پوچھا جو کہ میں نے جلد بازی میں کچھ اس طرح بتایا۔

"Model Girls High School"

جس میں سے ایک لفظ میں Miss کر گئی۔

دراصل سینٹر کا پورا نام یہ تھا۔ "Muslim Model Girls High School"

کاش ایسا نہ ہوتا کیونکہ یہی وہ ایک لفظ تھا جس کا مجھے بہت بڑا بھگتان بھگتنا پڑا۔ ابا جان نے میری بتائی ہوئی مطلوبہ جگہ پر مجھے چھوڑا اور واپسی کی ٹائمنگ پوچھ کر چلے گئے۔

سینٹر کے اندر جا کر میں بھی باقی تمام لڑکیوں کی طرح ایک آخری نظر کتاب پر ڈالنے میں مصروف ہوگئی۔

جب پیپر شروع ہونے میں تقریباً 10 منٹ رہ گئے تو تمام طلباء اپنے رول نمبر کے مطابق پیپر دینے کے لیے کلاسوں میں جانے لگے۔

میں بھی اپنی مطلوبہ جگہ تلاش کرنے لگی۔

قریب ہی ایک ٹیچر کھڑی تھیں۔ میں نے اُن کو اپنا ایڈمٹ کارڈ دکھا کر روم نمبر پوچھا۔

تو وہ کہنے لگیں۔ "اوفو! بیٹا یہ آپ درست جگہ پر نہیں آئی ہیں۔ آپ کا سینٹر یہاں سے دوسرے اسکول میں ہے، جو یہاں سے تقریباً 5 سے 6 منٹ کے فاصلے پر ہے۔ آپ جلد سے جلد وہاں چلی جائیں، کہیں آپ کا پیپر نہ رہ جائے۔"

میں وہاں کھڑی خود کو اس صورت حال پر نہایت بے بس محسوس کررہی تھی۔ لہٰذا میں وہیں کھڑی رونے لگی کہ دو عورتیں میرے پاس آئیں ان عورتوں کے وجہ پوچھنے پر میں نے انہیں اپنی تمام تر صورت حال سے آگاہ کردیا۔

ان میں سے ایک عورت کہنے لگی۔

"بیٹا پریشان ہونے والی بات نہیں۔ چند ہی منٹ کا فاصلہ ہے۔ ہم آپ کو چھوڑ دیتی ہیں۔"

میں نے شکریہ کہہ کر انکار کردیا۔ "آپ کی بہت مہربانی ہوگی اگر ایک کال کرادیں۔"

ایک نے کہا۔ "بیٹا ضرور کرادیتی پر میرے موبائل میں بیلنس نہیں۔" اور دوسری نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ اس کا موبائل بند جارہا ہے۔"

دونوں خواتین میں سے ایک کہنے لگی۔

''بیٹا ہم بھی تمہاری ماں کی جگہ ہیں آپ کو باحفاظت سینٹر تک پہنچادیں گی۔''

دیر بہت ہوچکی تھی۔ پیپر شروع ہونے میں بمشکل پانچ سے چھ منٹ رہ گئے تھے۔لہٰذا میں رضا مند ہوگئی اور ان کے ساتھ باہر آ گئی۔ جہاں ایک بلیک کار کھڑی تھی۔ جس میں ایک سڈول جسم کا آدمی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ ایک عورت اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور دوسری عورت جس نے میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا مجھے لے کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ہمارے بیٹھتے ہی اس آدمی نے گاڑی چلا دی۔

مجھے گاڑی میں بیٹھے پندرہ سے بیس منٹ ہو گئے تھے لیکن دور دور تک سینٹر کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ بالآخر گھبراہٹ کے عالم میں میں نے کہا۔

''آنٹی راستہ تو بمشکل 5 سے 10 منٹ کا تھا، اب تو بیس منٹ ہونے کو ہیں۔ میرا سینٹر کہیں نظر نہیں آ رہا۔ آنٹی برائے مہربانی آپ مجھے یہیں اُتار دیں۔ میں خود چلی جاؤں گی۔'' یہ کہنے کی دیر تھی کہ اس عورت نے میرے منہ پر ایک زبردست طمانچہ رسید کیا اور میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ''اے لڑکی خاموشی سے بیٹھ جا نہیں تو انجام اچھا نہیں ہوگا۔''

کار کی رفتار مزید تیز ہوچکی تھی۔ ایسے حالات میں کیا کروں، میری کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔ اچانک جھماکے سے ایک خیال میرے ذہن میں آیا اور میں نے اس پر عمل کرنے میں ایک سیکنڈ کی بھی دیر نہ لگائی۔

میں نے جھٹکے سے اس عورت سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور گاڑی سے باہر چھلانگ لگا دی۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ہسپتال میں پایا جہاں ابا اماں میرے سرہانے کھڑے تھے۔

اماں زاروقطار رو رہی تھیں۔ میرے جسم میں بہت گہری چوٹیں آئی تھیں، لیکن خوش قسمتی سے جسم کا کوئی حصہ ناکارہ نہیں ہوا۔ اس حادثے کا مجھ پر کافی گہرا اثر ہوا۔ میں کتنے ہی دنوں بیمار رہی لیکن شاید تقدیر کو یہی منظور تھا۔

آج بھی جب وہ واقعہ میرے ذہن میں آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

میں اپنے پڑھنے والے تمام قارئین سے درخواست کرتی ہوں کہ زندگی میں چاہے کتنی بڑی مشکل یا مصیبت آن پڑے، خدارا کسی غیر پر اعتبار نہ کیجیے گا۔

☆☆......☆☆





# وہ رات...

الیاس امتیاز احمد

میں نے اُس دردبھری رات اُس کی معصوم آواز تو سنی مگر......

عورت کی سب سے حسین رات زندگی میں صرف ایک بار آتی ہے۔ مگر میری زندگی میں یہ رات آئی مگر یادگار نہ بن سکی۔ میں آج بھی کلیجے پر ہاتھ رکھتی ہوں تو جسم میں ایک ٹھنڈی لہر دوڑ جاتی ہے۔ وہ رات ناگن بن کر مجھ پر آلپٹی تھی۔ میں ایک بوڑھے چیڑاسی کی حسین لڑکی تھی۔ اب تو اس غریب کو مرے ہوئے بھی مدت گزر گئی ہے۔ اس بات کو بھی دس سال ہو گئے ہیں۔ ان دنوں میری عمر بھی پندرہ سولہ سال تھی۔ دو جوان بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ ذات برادری میں ناچنا گانا پرانا پیشہ تھا۔ پاکستان آنے کے بعد ساری برادری کے باہمی فیصلے سے یہ پیشہ ختم کر دیا۔ مردوں نے معمولی جگہوں پر نوکریاں کر لیں اور عورتیں گھر بار میں لگ گئیں۔ ہم لڑکیاں بالیاں بالکل بے کار ہو گئیں۔ پورے شہر میں دو پرائمری اسکول تھے۔ ہماری پڑھائی لکھائی کا کسی کو بھی خیال نہ تھا۔ دن بھر گلی میں آنکھ مچولی کھیلتے پھرتے، عمر نے رگ رگ میں بجلیاں بھر دیں۔

سچ ہے فطرت مشکل سے بدلتی ہے۔ ناچنا گانا ہمارا آبائی پیشہ تھا۔ برادری کی لڑکیاں اکٹھی ہو کر ڈھولک کے گرد بیٹھ جاتیں اور ہم جی بھر کر ناچتے۔ دو چار سال بعد پیسے کی قلت ہوئی تو ہمارا ناچنا گانا ہی کام آیا۔ جہاں کسی اچھے گھرانے میں شادی بیاہ کی اطلاع ملتی ہماری چوکڑی وہاں پہنچ جاتی۔ ہمیں ڈھیروں پیسے بھی ملتے۔ کام شوقیہ ہوتا اور ہمارا وقت بھی اچھا گزر جاتا۔ گھر کے بزرگوں نے بھی ہمیں بخوشی اجازت دے دی تھی، لیکن میرے بڑے بھائی کسی اچھے دفتر میں اردلی ہو گئے تھے۔ انہیں اپنی اکلوتی بہن کا ناچنا پسند نہیں



تھا۔ جبکہ مجھے ناچنے گانے سے عشق تھا۔ مار پیٹ کر انہوں نے مجھے روک دیا اور اپنے بڑے بابو کے بھائی کے سامنے جو ایک اسکول میں ماسٹر تھے۔ پڑھانے بٹھا دیا۔ ان موٹے سے ماسٹر کا ایک لکڑیوں کا ٹال بھی تھا۔ وہ شام کو لکڑیوں کے ٹال پر بیٹھ جاتے اور محلے کے دو چار معمولی گھرانے کے بچے ان سے سبق پڑھتے۔

بات بہت دور نکلی جا رہی ہے۔ اگر پورا دکھڑا رونے بیٹھ جاؤں تو اُس رات کا ذکر دور چلا جائے گا۔ ان موٹے ماسٹر نے میری زندگی میں بڑا اہم رول ادا کیا۔ انہوں نے بھانپ لیا تھا۔ میں پڑھنے لکھنے کے لیے پیدا نہیں ہوئی۔ انہوں نے مجھے ماسٹرنی کے پاس کام کرنے کے لیے بھجوا دیا۔ جب بھی میں پڑھنے جاتی مجھے بہانے سے گھر بھجوا دیتے۔ وہاں ماسٹرنی مجھے برتن دھلوانے یا مسالا پیسنے بٹھا دیتی۔ مجھے پڑھنے سے زیادہ یہ کام اچھا لگتا، کام نہ ہوتا تو ماسٹرنی مجھ سے گانا سنتی۔ بھائی سمجھ رہے تھے کہ بہن پڑھ رہی ہے۔ وہاں میرے دن مزے کے گزر رہے تھے۔ پھر اچانک وہ دن آ گیا جب میرے دل میں عجیب سے جذبات نے دستک لی۔

موٹے ماسٹر کا لڑکا نہ جانے کہاں سے آ گیا۔ دیکھنے میں دبلا پتلا ڈرپوک نظر آتا تھا، مگر میرے لیے شیر نکلا۔ میں بہانے بہانے سے اس کے پاس جانے لگی اور وہ بہانے بہانے سے مجھے اپنے پاس بلانے لگا۔ امیروں کے لیے تو ہر بات کھیل ہوتی ہے۔ میری محبت بھی اس نے کھیل سمجھی۔ دو چار مہینے مجھ سے کھیل کر وہ بنا اطلاع دیے نو دو گیارہ ہو گیا۔ مجھے کیا پتا تھا یہ کھیل مجھے اتنا مہنگا پڑے گا۔ میں چند ہی دنوں میں گلاب سے سرسوں کا پھول بن گئی۔ دل ہر وقت بیٹھا بیٹھا رہتا آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے۔

ماسٹرنی کی تیز نگاہیں سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ اس نے اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے مجھے یہاں سے چلتا کر دیا تھا اور اپنے گھر آنے سے منع کر دیا تھا۔ موٹے ماسٹر نے ٹال پر بچے پڑھانے بند کر دیے تھے۔ اب میں کیا کرتی۔ گھر بیٹھی تو ماں نے سر پیٹ لیا۔ اس نے مجھ سے اس ناگہانی بپتا کا حال پوچھا۔ میں نے رتی رتی بات ماں کو بتا دی۔ ماں غریب عورت فقیرنی بن کر موٹے ماسٹر کے گھر گئی اور اپنی لٹی عزت کی فریاد کرنے لگی۔ ماسٹر کو کچھ سمجھ نہ آیا تو انہوں نے دو سو روپے دے کر ماں کو چپ کرا دیا۔

ماں نے کون سے شرافت کے دن گزارے تھے۔ وہ بھی تو اپنی جوانی میں کسی نواب کے دربار میں ناچنے گانے میں لگی ہوئی تھی۔ اس نے خاموشی سے یہ سودا قبول کر لیا۔ اور مجھے میری خالہ کے پاس بھجوا دیا۔ وہاں اس نے مجھے پناہ دی۔ مجھے ہر ایک کی نگاہوں سے خالہ نے بچائے رکھا۔ اور میں چار پانچ ماہ وہاں چھپی رہی۔ وہیں اس یادگار رات نے جنم لیا۔ جس نے میرے گناہ پر پردے ڈالنے کی ناکام کوشش کی۔

مجھے یہ رات زندگی بھر نہ بھولے گی۔ صبح کے وقت خالہ کی جھونپڑی میں، میں نے ٹمٹماتے چراغ کی مدھم روشنی میں اپنے گناہ کا خمیازہ جنم دیا تھا۔ صبح کے چار بجے کے قریب میرے کانوں نے ننھے بچے کی آواز سنی اور میں سمجھی اب جینا آسان ہو گیا مگر خالہ نے مجھے کہے سنے بغیر بچے کو اٹھایا اور باہر نکل گئیں۔ اس کے بعد میں نہیں جانتی کیا ہوا۔ میں اکیلی اندھیرے میں ڈر اور دکھ سے کانپتی رہی۔ خالہ واپس آئی اور مجھے کچھ پینے کو دیا اور میری آنکھیں آپ ہی بند ہو گئیں۔

جب میری آنکھ کھلی تو محلے کی دو عورتیں میرے پاس بیٹھی تھیں اور خالہ میرے سرہانے بیٹھی تھیں۔ میری بیماری کو لمبے تپ کا نام دے دیا گیا۔ یہ سوال میری خالہ کے ساتھ ہی مر گیا۔ میں جیتے جی بھی اُس سے پوچھ نہ سکی کہ اُس رات میں نے جو آواز سنی تھی وہ کہاں گم ہو گئی۔

خالہ کو مرے چھ سال ہو گئے ہیں۔ میری شادی پھوپی زاد بھائی سے، جو ایک آنکھ کا کانا تھا ہنگامی طور پر کر دی گئی۔ میں خان پور کٹورا میں اپنے شوہر کے پاس چلی گئی۔ میرا باپ بدنامی سے ٹھٹھر کر وقت سے پہلے ہی مر گیا۔ بھائیوں نے جیتے جی مجھے نہ دیکھنے کی قسم کھائی۔ صرف میری ماں ہے جو کبھی کبھار مجھے دیکھنے آ جاتی ہے۔ خالہ کی بیماری کا سن کر میں نے لاکھ چاہا کہ اس سے جا کر پوچھوں کہ اُس رات جس سانس نے مجھ سے سرگوشی کی تھی، اُسے تُو نے کہاں چھپا دیا ہے۔ لیکن کانے شوہر سے مجھے بے حد ڈر لگتا تھا۔ خالہ مر گئی اور یہ راز بھی مر گیا۔ میرے اب پانچ بچے ہیں۔ میں ان میں اس رات کے اندھیرے اور چاندنی کو ڈھونڈتی ہوں، لیکن میں نہیں جانتی میری خالہ نے اُسے کہاں چھپا دیا ہے۔ یہی رات میری زندگی کی کبھی نہ بھولنے والی رات ہے۔ جب میں ماں بن کر بھی ماں نہ کہلا سکی۔

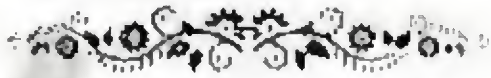
☆☆......☆☆☆

واہ کینٹ سے چوتھی حکایت

# برزخ

شبانہ اکبر

کیا بدصورت لڑکی کا مقدر صرف......

وہ متوسط طبقے کا گھر تھا بڑی بیٹی حسین و جمیل مگر اس کی شادی ایک ان پڑھ شخص سے کردی گئی۔ نصیب اللہ کے حوالے کردیا۔ لڑکے کے پاس نہ گھر اور نہ ہی کوئی مناسب نوکری، لمبی چوڑی سسرال اوپر سے لڑکا بددماغ۔

دوسری بیٹی کی شادی کم عمری میں اس کی عمر کے دگنے شخص سے کردی۔ نصیب پھر وہی اللہ کے حوالے آٹھ برس تک اولاد سے محروم رہی آخرکار خدا کو ترس آ گیا اور اس کی گود ہری ہوگئی۔

تیسری بیٹی اللہ جانے کس پر چلی گئی۔ کوتاہ قد، بھرا ہوا جسم، سانولی رنگت اور معمولی شکل و صورت۔ اب اس کے لیے تو دگنے عمر کا مرد اور ان پڑھ آدمی بھی نہ ملے۔

پھر باپ نے بڑی مہارت سے ایک لڑکے کو شیشے میں اتارا۔ عمدہ نوکری اور شادی کے اخراجات کا لالچ دیا یہاں تک کہ یہ بھی کہا کہ لڑکی تعلیم یافتہ ہے۔ تمہارے پورے گھر کا کام بھی کرلے گی اور اخراجات میں بھی ہاتھ بٹائے گی۔ شادی بیاہ کے موقعے پر اکثر لڑکی والے مجبوراً یہ جھانسے لڑکے والوں کو دیتے ہیں اور انھیں لگتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لڑکا لڑکی میں ہم آہنگی ہو جائے گی۔ ان کی اولادیں ہو جائیں گی اور حالات خود بخود بہتر ہو جائیں گے۔ لڑکا حسن پرست تھا بدصورت لڑکی سے نکاح کرنے سے پہلے سوچ بچار میں پڑ گیا۔ عشق لڑانے کے لیے حسینائیں تو بہت مل جائیں گی نیٹ، موبائل، یونیورسٹی ہر جگہ حسن و عشق کے قصے عام ہیں مگر گھر سنبھالنے اور اخراجات میں ہاتھ بٹانے کا کام حسن والی نہیں کرسکے گی، اس لیے اس نے شادی کرلی۔

اس شادی پر بہت سے لوگوں کو حیرت ہوئی۔ معقول صورت لڑکا بدصورت دلہن۔ یہ کیسا جوڑا ہے مگر اس نے آنے والے وقت کو دیکھا تھا لوگوں کی حیرتوں کی اس اسے کوئی پروا نہ تھی۔

حسب وعدہ لڑکی کے والد نے اسے شادی کے اخراجات کا چیک تھمایا اور اپنی جان چھڑالی۔

نئی دلہن کو سسرال میں کوئی پروٹوکول نہیں ملا سچ ہے کہ بننا سنورنا، نخرے اٹھوانا سب حسن والوں کو زیب دیتا ہے اور بدصورت لڑکی کا تو تماشا ہی بنتا ہے۔ نہ اسے میاں نے گھمایا پھرایا نہ سسرال والوں نے دعوتیں دیں۔

تین ماہ گزر گئے جب گھر میں پہلا جھگڑا ہوا گھر

کے کاموں کو بنیاد بنا کر اس کے کام میں کیڑے نکالے گئے اور گھر کے اخراجات میں سے اسے حصہ تھما دیا۔ ساس نے حکم نامہ جاری کر دیا ایک بندہ گھر کا راشن اور بل دے گا اور دوسرا مکان کا کرایہ جو اس دور کے حساب سے خاصی رقم تھی لڑکی کے سر ڈال دی۔
کسی اسکول جاب سے تو وہ ہرگز اسے نہ بھر سکتی تھی اس لیے شہر سے دور انڈسٹریل ایریا کی سائیڈ اسے نوکری ملی۔ 9 گھنٹے کی سخت نوکری دو گھنٹے کا سفر۔ آنکھوں سے گنگا جمنا بہتی رہی اور وہ اکثر سوچتی آخر اسے ہی کیوں اس سزا کا حصہ بنا تھا۔
یہ سب بھی قابل قبول تھا اگر شوہر اچھا ہوتا مگر وہ تو ایک نظر بھی اس پر نہ ڈالتا بدصورت عورت کا خطاب دے کر اپنی جان چھڑاتا اپنے دوستوں سے اسے چھپاتا کہ مبادا کوئی مذاق نہ بن جائے۔ بیوی نے اخراجات تو آدھے سنبھال لیے تھے چنانچہ لڑکے نے نوکری چھوڑ دی اور بس گھر کا خرچہ چلانے کی خاطر چھوٹے موٹے کام کر کے باقی وقت سونے، نیٹ پر دوستیاں کرنے اور موبائل سے تفریح کرنے میں گزارنے لگا۔
اس دوران ایک حادثہ پیش آیا۔ نوکری سے واپسی پر اسے بس میں چوٹ لگ گئی اور خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اسے اسپتال داخل کیا گیا جس کے بعد اس کے والد نے اس کے ماہانہ اخراجات اور مکان کا کرایہ اپنے ذمے لے لیا اور لڑکی نے استعفیٰ دے دیا مگر بچے کی پیدائش پر تمام اخراجات کرنے کے بعد والد صاحب کا بھی دم نکل گیا۔ انھیں پتا لگ گیا تھا کہ داماد نے تو ایک پائی بھی بیٹی پر خرچ کرنا حرام کر دیا ہے اس لیے اپنی ہی اولاد پر سختی کی جاسکتی ہے چنانچہ ایک بار پھر تان بدصورت لڑکی پر آ کر ٹوٹی۔
''دوبارہ نوکری کر لو بچے کو ساس کے پاس چھوڑ جایا کرو'' والد نے حکم نامہ جاری کر دیا مگر ساس نے صاف انکار کر دیا۔ طے پایا لڑکی اپنے بچے کو اپنے والد کی ماسی کے پاس چھوڑ جایا کرے گی اور بچے کے سامان اور اخراجات کے علاوہ ماہانہ ایک ہزار روپے ماسی کو دیا کرے گی۔



اب اس لڑکی کا اکلوتا بیٹا بڑا ہو گیا تھا اسے اسکول میں ڈال کر وہ دو نوکریاں بھی کر رہی تھی ایک سے سسرال والوں کی ڈیمانڈ پوری کر رہی تھی۔ مکان کے کرایہ کے لیے اور دوسری نوکری سے اپنے اور اپنے بیٹے کے اخراجات۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ حسین و جمیل دولھا میاں نے بیٹے کے اخراجات اٹھانے سے بھی صاف انکار کر دیا تھا۔
وہ لڑکی آج بھی نا کردہ گناہوں کی سزا کاٹ رہی ہے شوہر نے ہر طرف سے بائیکاٹ کر رکھا ہے۔ اچھا کھانا، اچھا پہننا اور گھومنا پھرنا صرف اس کے لیے خواب ہے۔ پیٹ کی آگ بجھانا اور بچے کو باپ کا نام دیے رکھنا اس چیز کی کتنی بڑی قیمت چکا رہی ہے کوئی اس سے پوچھے۔
مجھے قارئین سے صرف ایک سوال کرنا ہے خوب صورتی اور بدصورتی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے اگر کوئی لڑکی دبلی پتلی لمبی گوری اور خوبصورت نہیں تو کیا آپ اس سے جینے کا حق چھین لیں گے؟ کب تک وہ اپنے ارمانوں کا خون کرے گی یا تو ماں باپ کے گھر پر طلاق کا داغ سجا کر بیٹھ جائے گی یا پھر نا کردہ گناہوں کی سزا یونہی بھگتتی رہے گی۔

☆☆.....☆☆

ایبٹ آباد سے پانچویں حکایت

# شیشے پر لکیر

ظفری بلند خان

نورین جو بدنامی کی کالک منہ پر پوت آئی تھی......

آ۔ا خالہ بانو کے گھر میں دو نو تکیاں ہوئیں اور مجھے دو دن بعد پتا چلا۔ خالہ بانو جن کے چھ بچے تھے۔ سب سے بڑا کامران دوسرے نمبر پر ارم تیسرے نمبر پر شاہد چوتھے نمبر پر دانیال پانچویں نمبر پر نوشین اور سب سے چھوٹی نورین۔ ماشاء اللہ بہت ہی خوشحال گھرانہ تھا۔ ناصر خالو کی گورنمنٹ جاب تھی۔ شام کو گھر آنے کے بعد وہ آ کر رکشہ چلاتے اور پرندوں کا الگ کاروبار کرتے تھے اور خالہ بانو کو جب دیکھو دین کی باتیں کرتیں۔ نمازی بھی تھیں۔ لیکن ان میں ایک بہت بری عادت تھی۔

وہ دوسروں کی بیٹیوں پر گندے گندے الزام لگاتی تھیں۔ چاہے وہ لڑکی کتنی ہی نیک کیوں نہ ہو۔ اُن کی نظروں میں وہ گندی تھی۔ ایک اسی برائی نے ان کے پورے گھر کو تباہ کر دیا تھا۔



ارم جو بہنوں میں سب سے بڑی تھی۔ اسکول جاتے ہوئے ماں سے بولی۔

"اماں آج میں اپنی دوستوں کے ساتھ جاؤں گی شاہد راستے میں مجھے بہت تنگ کرتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ گھر سے نکل گئی۔ اتنے میں شاہد آ گیا اور کہنے لگا۔

"اماں مجھے پیسے دو ورنہ میں اسکول نہیں جاؤں گا۔" خالہ بانو چلا کر بولیں۔ "جا جا کر اپنے ابا سے لے، تیرے ابا نے کیا میرے پاس پیسوں کا درخت لگایا ہوا ہے۔" پیچھے سے کامران چلا کر بولا۔

اماں تُو نے ارم کو اکیلے بھیج دیا۔ تجھے پتا نہیں ہے کہ وہ اسکول کے

بہانے کہاں کہاں جاتی ہے۔ اور اس کی اسکول کی گلی کے کونے پر زاہد نکھٹو اس کا انتظار کرتا ہے۔ اور دو دن پہلے ہی میں نے اسے زاہد نکھٹو کے ساتھ پارک میں دیکھا تھا۔ میں تجھے بتانے ہی والا تھا کہ آج پھر وہ اکیلی چلی گئی۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کچھ الٹا سیدھا کر بیٹھے اور تو سر پکڑ کر بیٹھ جائے۔''

خالہ بانو چلا کر بولیں۔ ''یہ تو تیری پھوپو کو سوچنا چاہیے کہ اُس کا بیٹا دوسری لڑکیوں کے ساتھ گھومتا رہتا ہے اور نہ ہی اُسے ارم کی پروا ہے۔ اب تُو بتا کہ میں کیا کروں۔ آجائے وہ کمینی میں اُسے بتاتی ہوں۔'' اتنے میں ناصر خالو بھی آ گئے۔ اور ان کی بات ادھوری رہ گئی۔

''آج میری بہن آ رہی ہے ارم کی تاریخ لینے۔ ذرا کھانا اچھا پکا لینا۔'' خوشی اُن کے رگ رگ سے عیاں تھی۔ وہ تو کہہ رہی ہے کہ دو مہینے کے اندر اندر ہی ارم کو اُن کی بہو بنا دو۔'' ان کی بات سُن کر چلا کر بولیں۔

''تمہارا بھتیجا تو کسی اور لڑکی کے چکر میں ہے، تو میں کہاں سے شادی کر دوں۔''

''وہ آج شام کو آ رہے ہیں جا جا کر جلدی سے تیاری کر اُن کے گھر آنے کی۔'' خالہ بانو جل بھن کر اٹھیں اور خاموشی سے باورچی خانے میں گھس گئیں۔

سچ تو یہ تھا کہ عمران جو کہ ارم کا منگیتر تھا وہ اب سدھر چکا تھا کیونکہ وہ جس لڑکی کو پسند کرتا تھا اُس کی کسی اور سے شادی ہو چکی تھی۔ اور اس کے دو مہینوں بعد ہی ارم بہو بن کر اپنی پھوپو کے گھر آ گئی۔ ان کے بعد نوشین کی باری آئی وہ بھی اپنے سسرال کی ہو گئی۔ لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

شادی کے اگلے سال ہی نوشین ایک بیٹی کے ساتھ طلاق کا داغ لے کر واپس آ گئی۔ اُس کی لاپروائی کی وجہ سے دو مہینے میں ہی اُس معصوم بچی کا انتقال ہو گیا۔ دوسری طرف خالہ بانو کی سب سے چھوٹی بیٹی نورین بھی جانے کس طرح ہاتھ سے نکل گئی پتا ہی نہ چلا۔

ایک دن رات خالہ بانو کی آنکھ کھلی تو نورین گھر میں موجود نہ تھی۔ پھر کیا تھا ناصر خالو کو دل کا دورہ پڑ گیا اور وہ بیچارے دو دن اسپتال میں رہ کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔

نورین کو پورے ایک مہینے کے بعد اُس کے چچا جو پولیس میں تھے اُسے سکھر سے پکڑ کر لائے۔

وہ لڑکا اُسے بیچنے ہی والا تھا جو اُسے شادی کا جھانسہ دے کر گھر سے بھگا لے گیا تھا۔ عزت تو گئی اور ساتھ ناصر خالو بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

اب تو اُن کے حالات بہت برے ہو گئے، فاقوں کی نوبت آ گئی تھی خالو ناصر کی جگہ اب دانیال کو جاب مل گئی تھی۔ لیکن وہ اب پوری طرح بگڑ چکا تھا۔ وہ نوکری کیسے کرتا اور کامران کو تو پہلے ہی نشے کی لت لگی ہوئی تھی۔ اور شاہد کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ وہ تو پہلے بھی چوری چکاری کرتا اور اپنا اُلو سیدھا کرتا تھا۔ ایک بار پھر نورین گھر سے بھاگ گئی۔ پھر کیا تھا اُسے ایک بنگلے سے پکڑا گیا جو وہاں ملازمہ کا کام کر رہی تھی۔ کیونکہ اب جو اُسے لے کر بھاگا تھا وہ اُسے ایک امیر آدمی کو بیچ چکا تھا۔ اور اُس آدمی نے اُسے ملازمہ کی نوکری دی تھی اور پھر اُسے پکڑ کر ایک کمرے میں اُس کی عزت کی دھجی دھجی کر کے بند کر کے رکھا تھا۔ مگر نورین جو بدنامی کی کالک منہ پر پوت کر آئی تھی وہ کبھی نہ مٹ سکتی تھی۔

نوشین کی شادی دوبارہ کروا دی گئی تھی۔

خالہ بانو کی اُن کے بچوں کی نظر میں کوئی عزت نہ تھی۔ وہ خالہ بانو کو گالیاں دیتے۔ پھر اُن کی پریشانیوں نے انہیں یہاں تک مجبور کیا کہ اُن کو اپنا آدھا گھر بیچنا پڑا۔ اور دو ہی مہینے بعد کامران کا انتقال ہو گیا۔ کامران کے انتقال کے چار پانچ مہینے پہلے ہی نورین کی شادی کر دی گئی تھی۔

ہائے ری قسمت! جو بیماری کامران کو ہوئی وہی بیماری نورین کو بھی لگ گئی تھی۔ وہ بھی نشہ کرنے لگی تھی۔ نورین کے شوہر نے اُس کا علاج کروانے کے بجائے اُسے گھر سے نکال دیا تھا۔ اور کامران کے انتقال کے دو ہفتے بعد ہی نورین کا انتقال ہو گیا تھا۔ پھر تو خالہ بانو پر دکھوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے اور ایک سال بعد ہی خالہ بانو بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

آج خالہ بانو عبرت کی مثال بن کر ہر گھر کا موضوع ہیں۔ خدا بہتان لگانے والوں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ بیٹی ذات تو آبگینے کی طرح ہوتی ہے۔ اُن پر لگائے گئے الزام اِس آبگینے میں دراڑیں ڈال دیتے ہیں۔ شیشے پر آئی لکیر کبھی ختم نہیں ہوتی۔ احتیاط کریں کہیں ہم میں سے کوئی اور بھی خالہ بانو کا کردار تو نہیں ادا کر رہا۔

☆☆......☆☆

# ہر طرف اُداسی ہے

محمد اسد علی بھٹی

ہڈالی کی وہ شخصیت جو اپنی یاد تا قیامت چھوڑ گئی.....

کیا لکھوں کیسے لکھوں۔ لکھنے بیٹھوں تو ذہن ماؤف ہو جاتا ہے، ہاتھ لرزنے لگتا ہے، قلم کانپ اٹھتا ہے اور ہمت جواب دے جاتی ہے، لیکن جذبات الفاظ کا روپ دھار کر صفحہ قرطاس پر بکھرنے کے لیے بے چین ہو جاتے ہیں، تو قلم کو بھی جنبش ہوتی ہے۔

افسردہ سی گلیاں ہیں درو بام ہیں خاموش
شاید کہ میرا شہر کوئی چھوڑ گیا ہے

شہر کی فضا اور ہزاروں سوگوار چہرے دیکھ کر وہ خونی منظر آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ جب دن دیہاڑے سفاک درندوں نے ظلم و بربریت کا خونی کھیل کھیلتے ہوئے ایک ایسا چراغ گل کر دیا۔ جس کی لو سے ہڈالی کے سیکڑوں گھر روشن تھے۔ اس چراغ کے گل ہوتے ہی ان گھروں کی روشنی ماند پڑ گئی اور ہزاروں لوگ غم واندوہ کی گہری وادی میں ڈوبتے چلے گئے۔ علاقہ بھر میں صفِ ماتم بچھ گئی اور تمام شہر تاریکی میں ڈوب گیا۔ یہ چراغ نعیم اللہ وڈھل کی صورت میں سارے شہر کو منور کیے ہوئے تھا۔ ظلم کی آندھی نے لمحہ بھر میں بجھا کر ہنستے بستے شہر کو ویران کر دیا۔

ملک نعیم اللہ وڈھل 18 جولائی 1958 کو ہڈالی کی معروف زمیندار فیملی میں سابق ایس ایس پی ملک



سیف اللہ وڈھل مرحوم کے گھر پیدا ہوئے۔ نعیم اللہ سے بڑے ان کے دو بھائی نعمت اللہ اور مظہر انور تھے۔ جن میں سے ان کے سب سے بڑے بھائی نعمت اللہ وفات پا چکے ہیں جبکہ مظہر انور بقید حیات ہیں۔ نعیم اللہ کے نانا مرحوم ملک بہادر اہلِ علم اور صاحب بصیرت آدمی تھے اور ملک نعیم اللہ کی تمام تر تربیت بھی ان کے نانا مرحوم کے زیر سایہ ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ اتنے بڑے خاندان کا بیٹا تمام تر دنیاوی آسائشوں اور سہولیات کے مہیا ہونے کے باوجود بھی دنیا کی رنگینیوں میں نہ ڈھل سکا۔ اور ہمیشہ حسن اخلاق کا پیکر شرافت کا مجسمہ اور سادگی وعاجزی کا نمونہ رہا۔ خلق خدا کی خدمت کو فرض عین سمجھتا اور دریا دل ایسا کہ کبھی بھی کوئی ضرورت منداس کے دروازے سے خالی نہ گیا۔

ملک نعیم اللہ صحیح العقیدہ اسلامی ذہن رکھنے والا ایک صاف گو انسان تھا۔ وہ کوئی بھی کام کرنے سے قبل اور فیصلہ کرتے وقت اس بات کی تحقیق کرتا کہ اس میں اللہ اور اس کے رسول کا کیا حکم ہے۔ ہر کام اسلامی روح کے مطابق کرتا اور باقاعدہ علماء سے رجوع کرتا۔ آمدن واخراجات کا باقاعدہ حساب رکھتا اور عشر وزکوٰۃ باقاعدگی سے نصاب کے مطابق وقت پر ادا کرتا۔ ملک نعیم اللہ مرحوم ایسی بے شمار خوبیوں کا مالک تھا جن کا شمار مشکل ہے۔ وہ سیکڑوں گھرانوں کی خاموش کفالت کرتا۔

ملک نعیم اللہ نے کبھی بھی کوئی کام دنیا کے دکھاوے کے لیے نہیں کیا بلکہ خاص اللہ کی رضا، انسانیت کی خدمت کے کام کرتا۔ تشہیر کو سخت ناپسند کرتا۔ وہ غریبوں کا ہمدرد وغمگسار اور مظلوموں کا ساتھی تھا۔ ظالم کو ظلم سے روکتا اور مظلوم کی دادرسی کرتا۔

ملک نعیم اللہ کا گھر کے نوکروں کے ساتھ گھر کے فرد جیسا سلوک ہوتا جو خود کھاتا انہیں بھی وہی کھلاتا۔ جو خود پہنتا نوکر بھی وہی پہنتے۔

ملک نعیم اللہ کی مہمان نوازی مشہور تھی اور ہر وقت اس کے ہاں مہمانوں کا مجمع لگا رہتا۔ اور ہر چھوٹے بڑے آنے جانے والے کو خوش اخلاقی سے ملتا اور عزت واحترام سے پیش آتا۔

نعیم اللہ کے دوستانہ تعلقات بہت وسیع تھے اور ان کا حلقہ احباب پورے پاکستان میں پھیلا ہوا تھا۔ لوگ ملک نعیم کے پاس اپنے ذاتی مسائل لے کر آتے تو وہ بحسن خوبی انہیں حل کر دیتے۔ لوگوں کے معاملات نمٹانے میں انصاف کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے فیصلہ کرتے اور لوگ ان کا فیصلہ بخوشی قبول کر لیتے۔ کبھی کسی شخص کو ان کے فیصلے پر اعتراض کرتے ہوئے نہیں سنا۔ کیونکہ لوگوں کا خیال ہے کہ ملک نعیم اللہ جو بھی فیصلہ کرتا ہے۔ وہ حق وانصاف پر مبنی ہوتا ہے۔ اس لیے ان کے فیصلے کو ترجیح دی جاتی۔

ملک نعیم رفاحی وفلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ وہ شہدائے اسلام فاؤنڈیشن رجسٹرڈ پاکستان کے ٹرسٹی اور شباب ملی ضلع خوشاب کے سرپرست اعلیٰ بھی تھے۔ فلاحی تنظیموں میں ہر سال باقاعدگی سے دل کھول کر عطیات دیتے۔ انہوں نے کئی پُلیں اور راستے بنوائے اور مساجد اور مدارس کی تعمیر کے لیے امداد کرتے۔ مدرسہ عید گاہ ہڈالی کے طالب علموں کے لیے صبح وشام دونوں وقت کا دودھ ملک نعیم کے گھر سے جاتا اور یہ سلسلہ 20 سال سے جاری ہے۔

نعیم اللہ کی غریب پروری کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ محلہ میں بہت سے غریب گھرانوں میں صبح وشام کا دودھ ان کے گھر سے جاتا ہے۔ درجنوں مستحق گھرانوں میں سالانہ مستقل طور پر خاموشی سے سال بھر کے لیے گندم بھجواتے، درجنوں بیوگان اور مستحق لوگوں کو مستقل وظیفہ دیتے۔ ملک نعیم اللہ کو اگر پتا چلتا کہ کسی غریب بیٹی کی شادی وسائل نہ ہونے کی وجہ سے نہیں ہو رہی تو وہ فوراً اُس کی شادی کے لیے مدد کرتے۔ انہوں نے کئی یتیم بچیوں کی شادیوں کا بھی بندوبست کیا۔

ملک نعیم اللہ اگر کسی کام کرنے کا وعدہ کرتے تو خلوص نیت سے اس کام کو پورا کرتے اور اگر کسی کام کے لیے کہیں جانا پڑتا تو اُس کے تمام تر اخراجات بھی اپنی جیب سے ادا کرتے۔ خود کسی پر بوجھ نہ بنتے بلکہ دوسروں کا بوجھ بخوشی اٹھاتے۔ اگر کسی سے کوئی وعدہ

کرتے تو پھر ہر حالت میں وعدے کی پابندی کرتے۔ آج تک کوئی یہ نہیں کہہ سکا کہ ملک نعیم اللہ نے کہیں عہد شکنی کی ہے۔ اسی وجہ سے مخالفین کے ساتھ لیے گئے عہد کی پاسداری کرتے ہوئے خود تو مخالفین کی بدترین بدعہدی کا شکار ہو گئے، لیکن اپنا عہد نہ توڑا۔

ایثار کا یہ حال ہے کہ جس دن وفات پائی اس دن صبح گھر میں ناشتا کر رہے تھے کہ پڑوسیوں کی ایک یتیم بچی جو کہ ہمیشہ دودھ لینے کے لیے آتی تھی۔ اس بچی کو اپنے حصے کا سارا دودھ دے دیا۔ اور خود پیاسے رہنے لگے کیونکہ اس وقت ڈیرے سے گھر میں دودھ نہ پہنچا تھا۔ گھر والوں کو کہنے لگے۔ بچی کو میرے حصے کا دودھ دے دو یہ خالی ہاتھ نہ جائے۔ میں بعد میں آ کر دودھ پی لوں گا۔"

ملک نعیم اللہ بعض اوقات ایسے بھی کرتے کہ کسی کھیت سے 80/90 بوری گندم اٹھائی اور وہیں پر غریبوں میں تقسیم کروا دی اور خالی ہاتھ گھر واپس آ گئے۔ ملک نعیم اللہ معذور اور مستحق بیماروں کے علاج کے لیے ذاتی دلچسپی لے کر علاج کرواتے اور ان کی مالی مدد کرتے۔

وہ ہڈالی کی سیاست کا محور تھے اور ہڈالی کی سیاست انہی کی شخصیت کے گرد گھومتی رہتی۔ ہڈالی کے لوگ نمائندوں کو دیکھ کر ووٹ نہیں دیتے تھے۔ بلکہ وہ نعیم اللہ کو دیکھ کر ووٹ دیتے کہ جس نمائندے کی سپورٹ ملک نعیم اللہ کر رہے ہوتے لوگوں کو اس نمائندے سے دلچسپی نہ ہوتی بلکہ وہ ملک نعیم اللہ کو ووٹ دیتے حالانکہ ملک نعیم اللہ خود عملی طور پر سیاست میں حصہ نہیں لیتے تھے۔

ان کے دو ہی شوق تھے۔ ایک مطالعہ اور دوسرا زمینداری۔ انہیں زمینداری کا جنون کی حد تک شوق تھا، اسی وجہ سے ان کا شمار پنجاب کے بڑے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ ملک نعیم اللہ کے مطالعے کا یہ عالم تھا کہ وہ تمام اخبارات پڑھتے، حالات حاضرہ سے باخبر رہتے۔ گھر میں ان کی اپنی نہایت کی ضخیم لائبریری تھی۔ ملک نعیم اللہ کا وسیع مطالعہ تھا۔ وہ ہر موضوع پر ہر شخص سے اس کے علم کے مطابق بات کرتے۔ مذہب، سیاست، حالاتِ حاضرہ، صنعت و تجارت، طب و سائنس، زراعت، معیشت و معاشیات، اخلاقیات، عالمی حالات، تاریخ، جغرافیہ، حقوق غرض کہ کوئی بھی شعبہ حیات ایسا نہیں جس پر ملک نعیم اللہ کو عبور حاصل نہ ہو۔ ملک نعیم اللہ تاریخِ اسلامیات خصوصاً مولانا مودودیؒ کی تحریریں شوق سے پڑھتے تھے۔

ملک نعیم اللہ اپنے گھریلو معاملات میں بھی خصوصی دلچسپی لیتے اسی وجہ سے ملک نعیم اللہ کے گھر کا ماحول مکمل طور پر اسلامی ہے۔ ملک نعیم کا ایک بیٹا اور سات بیٹیاں ہیں۔ جن میں سے بیٹا اور تین بیٹیاں حافظِ قرآن ہیں۔ جبکہ وہ اپنے تمام بچوں کو حافظ قرآن بنانا چاہتے تھے۔

ملک نعیم اللہ کی گھر والی بھی اللہ کی بندی صوم وصلوٰۃ کی پابند ایسی خدا ترس اور نیک سیرت خاتون ہیں۔ جن کی سخاوت ضرب المثل ہے۔ بچوں کی اچھی تربیت اور ملک نعیم اللہ کی شخصیت کے نکھار میں ان کا بہت بڑا عمل دخل ہے۔

بہر حال جانے والے تو چلے جاتے ہیں اور اپنی یادوں کے انمٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں، لیکن ملک نعیم اللہ جیسے لوگوں کے چلے جانے سے جو خلا پیدا ہوتا ہے۔ وہ کبھی بھی پُر اثر نہیں ہو سکتا۔

ہر آرزو دل سے گریزاں تیرے بغیر
کتنا حسین شہر ہے ویران تیرے بغیر

16 فروری 2005 کو دوپہر ڈیڑھ بجے کے قریب ملک نعیم اللہ اپنے ڈرائیور حفیظ اللہ اور گن مین سید رسول کے ساتھ اپنے کھیتوں سے واپس آ رہے تھے تو ہڈالی شہر میں داخل ہوتے ہی گھات لگائے ہوئے انسانیت کے دشمنوں نے دہشت گردی کی انتہا کر دی اور گولیوں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے نہ صرف ہڈالی کی تاریخ کا ایک باب بند کر دیا بلکہ سیکڑوں بہنوں کے سر سے آنچل بھی نوچ لیے اور ہزاروں غریبوں کا سہارا بھی چھین لیا۔

ملک نعیم اللہ کے ساتھ اس بے ہیمانہ واردات میں ان کا جانثار وفادار ڈرائیور حفیظ اللہ بھی شامل تھا، جو ایک انتہائی نیک سیرت و ہر دلعزیز نوجوان تھا۔ جبکہ اس خونیں ڈرامے میں دہشت گردی کا شکار ہونے والے سابق کونسلر ملک حمید اللہ ڈھل بھی نہایت ہی مخلص سماجی کارکن اور ہر دل عزیز شخصیت کے مالک تھے۔

ظالموں نے ہڈالی کے چمن سے وہ پھول توڑے جن کی خوشبو سے سارا علاقہ معطر تھا۔

☆☆......☆☆

# لاعلاج

نزہت ناز

جرم ناسور بن جائے تو لاعلاج ہو جاتا ہے......

ظلِ ہما گزشتہ کئی ہفتوں سے نہ جانے کہاں گم رہتی تھی۔ وہ خیالوں ہی خیالوں میں کہیں سے کہیں نکل جاتی تھی۔ اُس کے شوہر نے بھی اس کو سمجھنے کی بہت کوشش کی مگر وہ ٹال گئی۔ اختر بشیر انتہائی سلجھی ہوئی شخصیت کے حامل تھے۔ وہ ایک کامیاب بزنس مین اور اپنے گھر والوں کا پورا پورا خیال رکھنے والے انسان تھے۔ انہوں نے ہما کی کیفیت کو محسوس تو کیا تھا، مگر اس کے Ignore کرنے کی وجہ سے زیادہ اس پر زور نہ دیا تھا۔

آج رات ظلِ ہما نے پھر وہی خواب دیکھا تھا جو وہ متواتر کئی ہفتوں سے دیکھ رہی تھی۔ ہر مرتبہ خواب دیکھنے کے بعد اُسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس خواب میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہے، لیکن! وہ سچائی تک کیسے پہنچے؟ یہ ہی خیال اُسے پریشان کیے دے رہا تھا، کیوں کہ اختر صاحب ایک حقیقت پسند انسان تھے اور خوابوں اور واہموں پر اُن کا یقین بالکل نہ تھا، اس لیے وہ ان کے پوچھنے کے باوجود ٹال گئی تھی، اور ابھی انہیں کچھ بتانا اس نے مناسب نہ سمجھا تھا، لیکن تواتر کے ساتھ قسط وار خواب کا آنا اور پھر ان کا Repeat ہونا، اُسے بے چین کر دیتا تھا۔

31 جنوری 2014ء کو جب وہ صبح پانچ بج کر دس منٹ پر بیدار ہوئی تو وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ آج وہ اس حقیقت کو ضرور جان کر ہی رہے گی۔ ساڑھے سات بجے اختر صاحب ناشتا کر کے آفس چلے گئے، پھر اس نے اپنی ساس کو ناشتا دیا اور پھر سودا لانے کے لیے وہ بازار جانے کا کہہ کر طارق روڈ پہنچ گئی۔

دیکھتے ہی دیکھتے اچانک اس کو وہی جگہ نظر آ گئی، جو اُس نے خواب میں دیکھی تھی۔ ایک دم اس کے منہ سے نکلا۔ "Oh My God" یہ تو بالکل وہی جگہ ہے۔ اب



میں اس کی پہلی منزل تک کیسے پہنچوں؟'' پھر اللہ نے اُس کی مدد کی اور اچانک اُس کے دماغ میں ایک خیال آیا۔ اس نے دیکھا کہ اُس عمارت کے سامنے ایک ٹرک کھڑا ہوا تھا اور اس وقت ڈرائیور اس میں موجود نہیں تھا۔ اُس نے اپنی کار ٹرک کے پیچھے کھڑی کر دی۔

آج جمعے کا دن تھا اور اس وقت دور دور تک کوئی موجود بھی نہیں تھا۔ اُس نے ہمت کی، پھر وہ اپنی کار سے نکلی اور پھر ٹرک کے اوپر چڑھ گئی۔ جب وہ ٹرک کے عین درمیان میں پہنچی تو اس نے شیشے کی بڑی کھڑکی سے عمارت کے اندر جھانک کر دیکھا تو اُسے اندر کا منظر بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ وہاں وہ لرزہ خیز منظر بھی اس کی نظر کے سامنے تھا۔ جو وہ خواب میں بار بار دیکھ چکی تھی۔ پانچ منٹ تک کھڑکی سے عمارت کے اندر جھانکنے کے بعد وہ خاموشی سے ٹرک سے نیچے اُتر آئی۔ واپس آتے ہوئے ٹرک سے کار تک کا فاصلہ اُسے صدیوں پر محیط لگا تھا۔ جب وہ اپنی کار میں بیٹھی تو پسینے پسینے ہو رہی تھی اور اُس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اب اس کی پریشانی مزید بڑھ چکی تھی۔ اب وہ اس معاملے کو اپنے تک محدود نہیں رکھ سکتی تھی۔ اختر بشیر کو بتانا ناگزیر ہو چکا تھا۔ کس طرح وہ گھر تک پہنچی تھی، یہ تو اُس کا ہی دل جانتا تھا۔

جمعے کے دن اختر بشیر ''جمعہ کی نماز'' کے بعد گھر آ جاتے تھے۔ آج جب وہ گھر آئے تو ظل ہما بری طرح بخار میں پھنک رہی تھی۔ کوئی نہ کوئی بات تو ضرور تھی جو کہ وہ چھپا رہی تھی اور یہ اختر بشیر کو بھی بری طرح بے چین کیے دے رہی تھی۔ بخار تیز دیکھ کر اختر بشیر نے ہما کو دوائیں دیں اور سر پر پٹیاں رکھنے لگے تو اچانک ہما نے اُن کا ہاتھ پکڑا اور کہا کہ بشیر مجھے آپ سے ایک بات کہنی ہے۔ لیکن آپ وعدہ کریں کہ آپ اس کو صحیح اور سچ سمجھیں گے اور حتی الامکان اس کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ اختر بشیر تو خود اس انتظار میں تھے کہ کب ظل ہما اپنی خاموشی توڑے گی۔ اور ان سے اپنی پریشانی شیئر کرے گی، پھر انہوں نے اس بات کا وعدہ کیا تو ظل ہما نے تمام بات اختر بشیر کو بتا دی اور کہا کہ آپ اس معاملے میں اپنے دوست انسپکٹر جنید کو بھی شریک کر لیں تاکہ وہ معاملے کو بہتر طور پر سنبھال سکیں۔

پہلے تو اختر بشیر یہ سب کچھ سن کر سناٹے میں آ گئے، پھر انہوں نے خود پر قابو پا کر ہما کو تسلی دی کہ وہ اس معاملے کو اب اپنے طور پر حل کریں گے، پھر اختر بشیر ہما سے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے تاکہ ہما کا ذہن کچھ تبدیل ہو اور اس کا دل کچھ دوسری طرف ہو۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے دوست کے بھائی کا واقعہ بھی اس سے شیئر کیا کہ اختر بشیر کے دوست کے بھائی شیراز جمالی کو بھی ڈاکٹرز نے جواب دے دیا تھا۔ وہ شدید تکلیف میں تھے۔ پھر وہ علاج کے لیے ایک حکیم صاحب کے پاس پہنچے۔ وہ ماہر نباض تھے اور نبض دیکھ کر مرض کو پہچان لیا کرتے تھے۔ انہوں نے پندرہ دنوں تک تو شیراز جمالی کو حکیمی دوائیں دیں، پھر اچانک کہا کہ اب آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ اب آپ کو جو کچھ کھانا ہے بے دھڑک کھائیں اور آپ کو اب کسی دوا کی ضرورت نہیں ہے، جب کہ شیراز جمالی شدید نقاہت محسوس کر رہے تھے اور ان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ لیکن! حکیم صاحب کے کہنے پر جب وہ ان کے مطب سے باہر آئے تو انہوں نے سوچا کہ حکیم صاحب بہتر جانتے ہیں اور کافی دنوں سے وہ پرہیز کر کے عاجز آ چکے تھے۔ اب شیراز جمالی کی موٹر سائیکل کا رُخ اُس ہوٹل کی طرف تھا جہاں کا قورمہ انہیں بہت پسند تھا۔ اندر گلیوں سے ہوتے ہوئے وہ ہوٹل تک پہنچے اور قورمہ روٹی کا آرڈر دیا۔ آج شیراز جمالی بہت خوشی محسوس کر رہے تھے اور اپنا پسندیدہ کھانا کھا کر شیراز جمالی بہت سکون محسوس کر رہے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد ان کو کافی فرحت محسوس ہوئی۔ بس پھر کیا تھا! اتنے دنوں کے بعد جو پرہیز ٹوٹا تو تقریباً روزانہ ہی ان کی موٹر سائیکل کا رُخ ہوٹل کی طرف ہوتا اور رفتہ رفتہ ان کی طبیعت بہتر ہوتی چلی گئی۔ تقریباً ایک ماہ کے بعد شیراز جمالی حکیم صاحب کا شکریہ ادا کرنے ان کے مطب گئے اور ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ حکیم صاحب آپ واقعی بہترین نباض ہیں۔ آپ نے جب مجھ سے کہا تھا کہ اب تمہاری طبیعت ٹھیک ہے اور تم سب کچھ کھا سکتے ہو تو مجھے یقین نہیں آ رہا تھا، کیوں کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی اور میں اس وقت شدید نقاہت بھی محسوس کر رہا تھا اور بہت تکلیف میں تھا، لیکن آپ کی بروقت تشخیص اور مشورے سے اب دیکھیے میں بالکل ٹھیک ہوں اور اب مجھے کوئی تکلیف بھی نہیں ہے۔

حکیم صاحب نے شیراز جمالی کی نبض چیک کی تو وہ بھی حیران رہ گئے کہ شیراز جمالی بالکل ٹھیک ہو چکے تھے۔ حکیم

صاحب نے اپنی حیرانگی چھپاتے ہوئے پوچھا کہ آپ نے کیا کیا؟ تو شیراز جمالی نے حکیم صاحب کو بتایا کہ جب آپ نے پرہیز کرنے سے منع کر دیا تھا تو میں نے اپنے پرہیز ختم کر دیا اور آپ کے مطب سے نکل کر رات کا کھانا اپنا پسندیدہ قورمہ ہوٹل میں بیٹھ کر کھایا اور جب سے اب تک بلا ناغہ وہ مزے دار قورمہ کھاتا ہوں اور اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

اختر بشیر نے ظل ہما کو یہ بھی بتایا کہ کل دفتر سے واپسی پر میں بھی حکیم بتاشی کے پاس گیا تھا۔ مجھے کچھ گیسٹرک کا درد تھا۔ میں نے اُن سے دوا لی۔ اُس وقت چوں کہ رات کا وقت تھا اور سردی بھی خاصی تھی، اس لیے اُن کے مطلب میں کوئی رش بھی نہیں تھا۔ حکیم صاحب نے مجھے ایک عجیب بات بتائی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ شیراز جمالی کو جو بیماری تھی، اس کا کوئی علاج نہیں تھا اور وہ لاعلاج ہو چکے تھے۔

اُن کی بیماری کا صرف ایک ہی علاج تھا اور وہ علاج وہ کر نہیں سکتے تھے۔ میں نے حکیم صاحب سے پوچھا کہ حکیم صاحب وہ علاج کیا تھا؟ حکیم صاحب نے بتایا کہ شیراز جمالی کی بیماری کا صرف ایک علاج تھا اور وہ تھا ''انسانی گوشت'' ہاں! صرف اور صرف یہ ہی گوشت کھانے سے اُن کی جان بچ سکتی تھی اور یہ علاج میں انہیں تجویز نہیں کر سکتا تھا، لہٰذا میں نے سوچا کہ اب زندگی کے بقیہ دن وہ ہنسی خوشی گزار لیں، لہٰذا میں نے اُن کی دوا بند کر کے اُن کو سب کچھ کھانے کی اجازت دے دی۔ اُس کیفیت میں ان کا ایک ہفتہ زندہ رہنا بھی محال تھا، لیکن جب ایک ماہ بعد شیراز سالی نے آ کر اپنی صحت یابی کی خوشخبری سنائی تو میں حیران رہ گیا۔ جب میں نے شیراز صاحب سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ انہوں نے ہوٹل میں جا کر روزانہ اپنا پسندیدہ قورمہ کھایا ہے اور اب وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ حکیم صاحب نے بتایا کہ انہوں نے شیراز جمالی کی نبض کو اچھی طرح سے چیک کیا ہے اور اب وہ بالکل ٹھیک ہیں۔

کل حکیم صاحب کا واقعہ اور آج تمہاری بات سن کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انسپکٹر جنید سے رابطہ کروں اور ان کو اعتماد میں لے کر اس کیس کی تحقیقات کرواؤں، کیوں کہ تمہاری بات اور حکیم صاحب کے واقعے کی کڑیاں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اب جب کہ آج تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا ہے تو یہ تمہارا محض خواب ہی نہیں ہے، بلکہ اس کی سچائی بھی سامنے آ چکی ہے۔ تم بے فکر رہو میں جلد ہی اس کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔

اب ظل ہما کو ایک گونہ سکون ملا تھا کہ کم از کم اختر بشیر نے اس کی بات کو غلط نہیں سمجھا تھا، بلکہ اس کی حقیقت کو بھی محسوس کیا تھا اور اس کی مکمل چھان بین کا بھی وعدہ کیا ہے۔

صبح تک ظل ہما کا بخار اُتر چکا تھا، اب صرف نقاہت باقی تھی۔ صبح جاتے وقت اختر بشیر کہہ کر گئے تھے کہ آج وہ انسپکٹر جنید سے بات کریں گے اور ظل ہما سرتاپا دعا گو تھی کہ اس کی حقیقت جلد از جلد دنیا پر آشکارا ہو اور اس مذموم کام میں ملوث لوگ جلد از جلد کیفر کردار تک پہنچیں۔

ظہر کی نماز پڑھ کر ظل ہما مصروفِ دعا تھی کہ اچانک اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ خدایا خیر! یہ کال اختر بشیر کی تھی۔ وہ بتا رہے تھے کہ انہوں نے انسپکٹر جنید سے بات کر لی ہے۔ وہ ضروری کارروائی میں مصروف ہیں اور آج ہی اس جگہ چھاپہ مارا جائے گا، جو کہ ہما دیکھ کر آئی تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ ایک چھاپہ مار ٹیم ہوٹل کی طرف بھی روانہ کی جائے گی تاکہ جلد از جلد اس معاملہ کو حل کرنے کا موقع مل سکے۔ ہما نے انسپکٹر جنید اور ان کی ٹیم کی کامیابی کے لیے دعا کی تھی اور پھر مطمئن سی ہو گئی تھی۔ ابھی ہما عصر کی نماز پڑھ کر فارغ ہی ہوئی تھی کہ اختر بشیر کا فون آ گیا۔ انہوں نے بتایا کہ پولیس کی دو ٹیموں نے بیک وقت ہوٹل اور اُس دکان پر چھاپہ مارا تو اس کی دو کڑیاں جا کر ایک ہی گروہ سے ملیں اور وہ گروہ اُس دکان پر لاوارث لوگوں کو مار کر اُن کی بوٹیاں کر کے اُس ہوٹل کو سپلائی کرتا تھا اور اُس ہوٹل میں انسانی گوشت کا قورمہ پکا کر فروخت کیا جاتا تھا۔ یہ بات ہوٹل کے مالک کو بھی معلوم تھی اور اس نے تھوڑی ہی چھان بین اور ہلکے سے چھتر دل سے ہی سب کچھ اگل دیا تھا۔ اب وہ اور ہوٹل میں کام کرنے والے تمام لوگ گرفتار ہو چکے ہیں۔ اب مزید کارروائی کی جا رہی ہے، جلد ہی اُن کے گروپ کے تمام لوگوں کو سزا ملے گی۔

ظل نے سجدہ شکر ادا کیا کہ اتنی جلد اللہ تعالیٰ نے اُس کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشا تھا اور ملزم کیفر کردار تک پہنچ گئے تھے۔

رات کو اختر بشیر جب گھر واپس آئے تو ذرا تھکے ہوئے تھے، لیکن چہرے پر بشاشت اور اطمینان موجود تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ظل ہما کی نشاندہی پر اُس دکان کی پہلی منزل سے تین لوگوں کو زندہ بازیاب کروالیا گیا ہے، شاید اُن لوگوں کی کوئی نیکی کام آ گئی ہے جو وہ زندہ بچ گئے، ورنہ اب ان کی باری تھی۔ یوں ظل ہما اور اختر بشیر دونوں پُرسکون تھے کہ بروقت عمل سے تین معصوم لوگوں کی جان بچ گئی اور اس بات پر جتنا شکر ادا کیا جاتا کم تھا۔

سچ ہے کہ جسے اللہ رکھے..... اُسے کون چکھے؟

☆☆......☆☆

# قصور میرا



ممتاز احمد

صرف نفس کی پیاس بجھانے کے لیے، اُس نے ایک
چھوٹا سا ڈرامہ کیا، جس کی قیمت وہ تا عمر چکا رہا ہے

میرا نام خرم شہزاد ہے۔ میرا گارمنٹس کا بہترین منافع بخش کاروبار تھا۔ میری شاپ پر مردانہ، زنانہ اور بچوں کے ریڈی میڈ ملبوسات کی بے شمار ورائٹی ہوتی تھیں۔ تین چار سیلز مین رکھے ہوئے تھے۔ اپنا ذاتی مکان تھا جس کا ایک پورشن کرائے پر دیا ہوا تھا۔ میں شادی شدہ تھا اور دو بچے تھے۔ زندگی بڑے آرام سکھ چین اور خوشحالی سے گزر رہی تھی۔ میں مہینہ میں دو یا تین چکر فیصل آباد کے لگاتا تھا۔ جہاں سے مجھے اچھی کوالٹی اور ورائٹی کا کپڑا کم قیمت پر مل جاتا تھا۔ فیصل آباد آنے جانے کے لیے ہمیشہ ٹرین میں سفر کرتا تھا۔

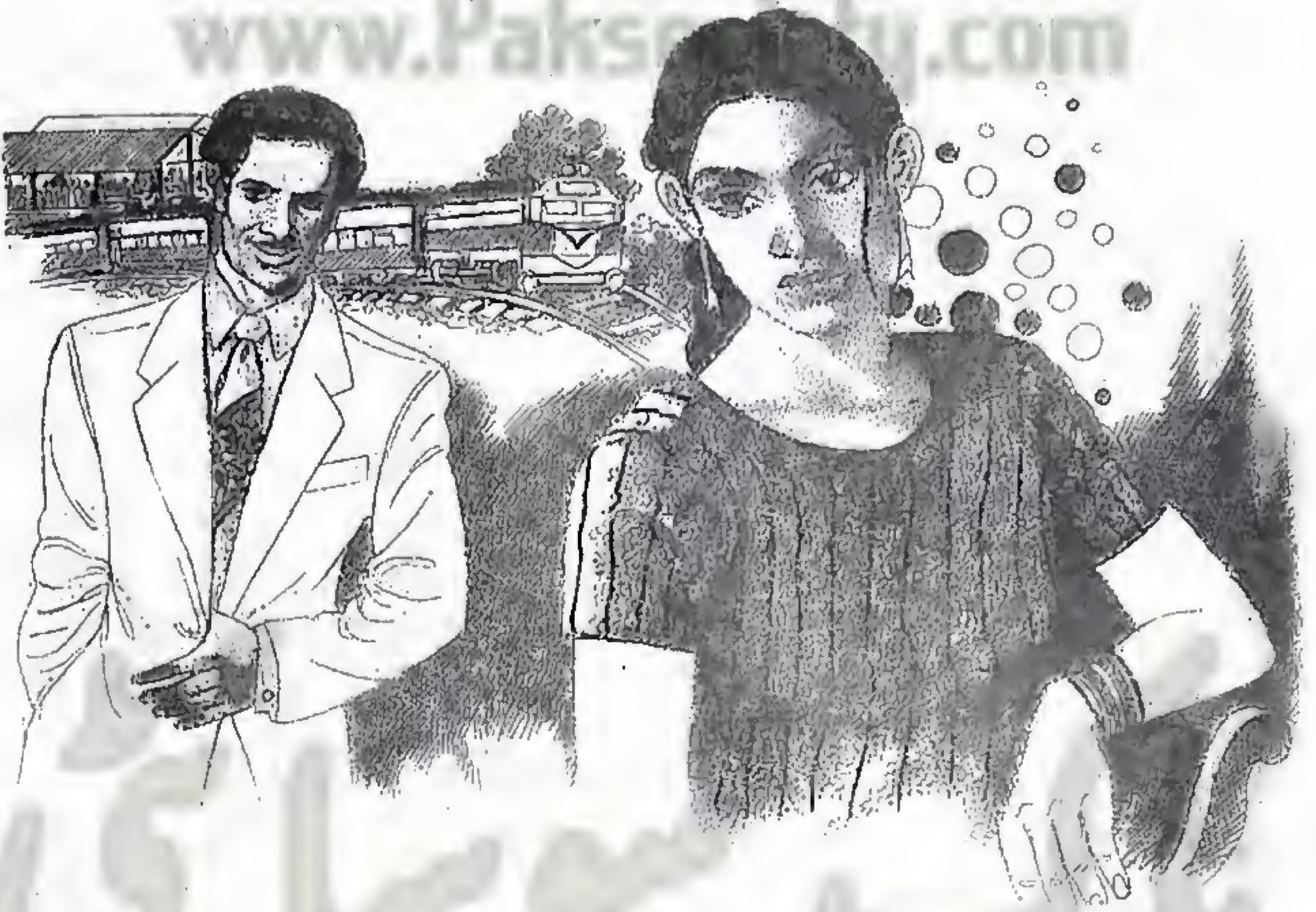
ایک دن میں خریداری مکمل کر کے اور مال بک کروا کر واپس اپنے شہر آنے کے لیے فیصل آباد ریلوے اسٹیشن پر آیا تو پتا چلا کہ ٹرین آدھا گھنٹہ لیٹ ہے۔ خیر میں ٹکٹ لے کر پلیٹ فارم پر آیا اور ایک خالی بینچ پر بیٹھ کر ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔

میرے پاس انگریزی کا اخبار تھا تو وقت گزاری کے لیے اخبار پڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک لڑکی جس کا گورا رنگ، لمبا قد، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں تھیں، وہ آ کر میرے سامنے والی خالی بینچ پر بیٹھ گئی۔ اس وقت ہم دونوں اکیلے بیٹھے تھے۔ کوئی اور مسافر پاس نہ تھا۔ میں نے تین چار بار لڑکی کی طرف دیکھا تو وہ بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ دراصل میری پرسنالٹی بہت زبردست ہے اور میں صنفِ مخالف کے لیے زبردست کشش رکھتا ہوں۔ اُس وقت میری عمر بتیس (32) سال تھی، لمبا قد، گورا رنگ، کلین شیو زبردست ہیر اسٹائل اور خوش لباس، جس پر مہنگا پرفیوم لگاتا۔ اپنے حلیے بول چال سے میں بہت بڑا سرکاری آفیسر لگتا تھا۔ ایم اے تک تعلیم تھی۔ کچھ دیر کے بعد لڑکی نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کہا۔

”ایکسکیوزمی پلیز اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو مجھے ذرا اپنا موبائل دیں گے...... دراصل میرے موبائل میں بیلنس نہیں ہے۔ تو صرف ایک کال کر کے گھر والوں کو بتانا ہے کہ گاڑی لیٹ ہے تاکہ وہ پریشان نہ ہوں۔“

”تو میں نے کہا کہ کوئی بات نہیں۔“ اور پاکٹ سے موبائل نکال کر اسے دے دیا۔

پہلے اُس نے ایک نمبر پر کال ملائی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد ایک اور نمبر پر کال ملائی۔ جب آگے سے کسی نے کال اٹینڈ کی تو اُس نے بتایا کہ راحیلہ بول



رہی ہوں اور فیصل آباد ریلوے اسٹیشن پر بیٹھی ہوں۔ ٹرین تھوڑی لیٹ ہے تو اس وجہ سے گھر پہنچنے میں کچھ تاخیر ہو جائے گی۔ پریشان نہیں ہونا او کے۔'' یہ کہہ کر اُس نے بات ختم کر دی اور میرا موبائل واپس کر کے شکریہ ادا کیا اور کہنے لگی کہ بڑے بھائی کو فون کر کے بتایا ہے۔'' اس کے بعد ہماری رسمی سی ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔

مجھے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ تو میں نے دو بوتلیں منرل واٹر اور دو بوتلیں جوس کی منگوائیں اور ایک پانی کی اور جوس کی بوتل اُس کو دے دی پہلے تو اُس نے انکار کیا مگر دوسری بار میرے کہنے پر لے لیں۔ ہم دونوں نے پہلے تھوڑا سا پانی پیا پھر جوس۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ آپ نے کہاں جانا ہے؟''

تو راحیلہ نے بتایا کہ وہ چک جھمرہ تک ٹرین میں جائے گی اور وہاں گاڑی سے اُتر کر آگے بذریعہ بس یا ویگن اپنے گاؤں جائے گی۔'' چک جھمرہ سے اُس کا گاؤں پچیس تیس کلومیٹر کی مسافت پر ہے اور لوکل روٹ ہے۔ بس دو گھنٹے میں اُس کے گاؤں پہنچتی

مزید تعارف پر راحیلہ نے بتایا کہ اُس نے ایم اے کیا ہوا ہے اور وہ کچھ مزید کورس کر رہی ہے اور فیصل آباد میں ہوسٹل میں رہتی ہے۔ اُس کے ماں باپ بہت غریب ہیں تو وہ اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے دوپہر تین بجے سے شام سات آٹھ بجے تک مختلف کلاسز کے بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی ہے۔ اب تین دن کی چھٹی پر اپنے ماں باپ بہن بھائیوں سے ملنے کے لیے اپنے گھر جا رہی ہے۔ پھر اسی طرح میں نے بھی اُسے اپنے بارے میں مختصر بتا دیا۔ تو اسی اثناء میں ٹرین آ گئی۔ ہم دونوں ایک ہی کمپارٹمنٹ میں سوار ہوئے۔ اُسے خواتین کے ساتھ بیٹھنے کے لیے جگہ مل گئی اور مجھے تھوڑا آگے مردوں کے ساتھ سیٹ مل گئی۔

پھر ٹرین چل پڑی اور وہ چک جھمرہ ریلوے اسٹیشن پر اُتر گئی جبکہ میں اپنے شہر آ گیا اور آتے ہی اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

☆......☆......☆

کوئی پانچ یا چھ دن گزرے تو رات کے نو بجے کے قریب میرے موبائل پر نامعلوم نمبر سے ایک کال

آئی۔ اُس وقت میں اپنی شاپ پر تھا اور کاؤنٹر پر فارغ بیٹھا تھا کیونکہ اُس وقت کوئی کسٹمر نہیں تھا۔

خیر میں نے کال ریسیو کی تو ایک لڑکی نے پہلے سلام کیا اور میرا حال پوچھا تو میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''محترمہ آپ کون بول رہی ہیں؟'' تو اس پر اُس نے کہا۔

''جناب خرم صاحب میں راحیلہ بول رہی ہوں۔ پانچ روز پہلے فیصل آباد ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔''

تو مجھے یاد آ گیا مگر میں نے حیران ہوتے ہوئے راحیلہ سے پوچھا کہ آپ کے پاس میرا نمبر کہاں سے آیا؟''

تو وہ ہنستے ہوئے کہنے لگی کہ آپ کے موبائل سے میرے پاس آپ کا نمبر آیا۔'' پھر اُس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''جب میں نے آپ سے موبائل لیا تھا تو پہلے اپنے نمبر پر کال ملائی، جب آپ کا نمبر میرے موبائل پر آ گیا تو میں نے کال کاٹ کر دوبارہ اپنے بھائی کا نمبر ملا کر بات کی اور آپ کا موبائل آپ کو واپس کر دیا۔''

تو میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''راحیلہ صاحبہ آپ تو بڑی چالاک اور ہوشیار ہیں۔'' پھر میں نے پوچھا کہ آپ نے کس لیے میرا نمبر لیا۔'' تو وہ کہنے لگی۔

''آپ مجھے اچھے لگے تھے اور بھلے آدمی محسوس ہوئے تو بہانے سے گھر بات کرنے کے لیے آپ سے موبائل مانگا اور اپنے نمبر پر مس کال دی۔''

یہیں سے ہماری دوستی کا آغاز ہو گیا۔ میں نے راحیلہ کو بتایا کہ میرا گارمنٹس کا بزنس ہے تو سارا دن مصروفیت میں گزرتا ہے، بس رات دس بجے کے بعد کچھ فرصت ملتی ہے، جب ملازم سارا سامان سمیٹ کر شاپ کلوز کرتے ہیں تو اُس وقت کال پر بات ہو سکتی ہے۔ رات گیارہ بجے گھر جاتا ہوں مگر گھر میں بات کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ بیوی اور بچوں کی موجودگی میں بات نہیں ہو سکتی۔ راحیلہ نے کہا کہ وہ بھی رات نو بجے کے بعد ہی فارغ ہوتی ہے الغرض اس طرح ہماری روزانہ کال پر بات ہونے لگی۔

چار پانچ روز کے بعد میں نے پھر فیصل آباد جانا تھا تو اپنے آنے کا راحیلہ کو بتایا تو وہ بہت خوش ہوئی۔ پھر میں اپنی روٹین کے مطابق فیصل آباد گیا اور راحیلہ کے لیے ایک قیمتی ریڈی میڈ سوٹ اور ایک بغیر سلا سوٹ، بیگ اور پرفیوم کا گفٹ لے کر گیا۔

اس بار میں نے خریداری اور دیگر معاملات پہلے کی نسبت جلدی نمٹائے اور راحیلہ کو ایک ریسٹورنٹ میں بلایا جہاں ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا اور پھر وہاں سے ریلوے اسٹیشن آ گئے اور پلیٹ فارم پر اُسی بینچ پر آ کر بیٹھ گئے جہاں پہلی دفعہ ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ ٹرین کے آنے میں ابھی گھنٹہ ڈیڑھ پڑا تھا۔ تو آرام اور سکون سے خوب باتیں ہوئیں۔

ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ہم اس لیے ملاقات کے لیے بیٹھے تھے کہ کسی کو شک نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسرا اگر کوئی واقف کار یا جاننے والا دیکھ بھی لیتا تو وہ یہی سمجھتا کہ واپسی کے لیے ٹرین کا انتظار کر رہا ہوں۔ اسی طرح راحیلہ پر بھی کوئی حرف نہ آ سکتا تھا۔ میں نے راحیلہ کو گفٹ دیا جسے لے کر وہ بہت خوش ہوئی۔

ٹرین آنے تک ہماری خوب باتیں ہوئیں۔ جب ٹرین آئی تو راحیلہ واپس اپنے ہوسٹل چلی گئی اور میں اپنے شہر آ گیا۔

☆......☆......☆

ہماری موبائل پر روزانہ رات کو خوب باتیں ہوتیں۔ اب آہستہ آہستہ ہماری بے تکلفی بڑھنے لگی۔ اب ہم ہر موضوع پر اور خاص طور پر سیکس پر کھل کر باتیں کرتے۔ راحیلہ نے بتایا کہ اُس کی عمر چھبیس سال ہے اور اُس کو شادی کا بہت شوق ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ جلد از جلد اُس کی شادی ہو جائے تاکہ اُسے ہر روز مرد کا پیار ملے مگر اُس کے گھر کے حالات ایسے ہیں کہ مزید پانچ سال تک اُس کی شادی کا کوئی چانس نہیں ہے کیونکہ اُس کی دو بہنیں اور ایک بھائی اُس سے بڑا ہے۔ جب تک اُن کی شادی نہیں ہو جاتی تب

تک راحیلہ کی شادی نہیں ہوسکتی۔ دوسرا گھر میں بہت غربت ہے اور مالی حالات بہت تنگ ہیں۔''

راحیلہ کی شادی کے شوق کو دیکھتے ہوئے اب روزانہ ہم موبائل پر کال سیکس کرتے۔ راحیلہ بہت بے چین رہنے لگی تھی۔

وہ مجھ سے کہتی کہ خرم پلیز مجھ سے شادی کرلو میں تمہارے پیار کی بھوکی ہوں۔ مجھے اپنالو اور میرے جسم وجان کے مالک بن جاؤ۔''

''میں راحیلہ کو سمجھاتا کہ دوسری شادی کرنا میرے لیے ناممکن ہے۔ میری بیوی کبھی مجھے دوسری شادی کی اجازت نہیں دے گی۔ اگر چوری چھپے تم سے نکاح کر بھی لوں تو کبھی نہ کبھی پتا چل جائے گا اور پھر دنگا فساد ہوگا، اولاد پر اچھا اثر نہیں پڑے گا۔ باقی ہمارا معاشرہ خاندان برادری دوسری شادی کرنے والے کے متعلق طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔''

راحیلہ کہتی۔ ''خرم! بس مجھے کچھ نہیں پتا۔ میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔''

دو تین ماہ میں ہماری چار یا پانچ ملاقاتیں فیصل آباد کے ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ہوئیں۔ اب راحیلہ کہنے لگی کہ خرم! پلیٹ فارم پر ملاقات کا مزہ نہیں آتا کسی ایسی جگہ پر ملاقات کا بندوبست کیا کرو جہاں مکمل تنہائی اور سکون ہو۔ کوئی تیسرا نہ ہو۔ میں کسی ہوٹل کا کمرہ بھی بک کروا کر راحیلہ سے ملاقات کرسکتا تھا مگر میں یہ رسک نہیں لینا چاہتا تھا کہ پولیس کا چھاپہ بھی پڑسکتا ہے اور کیا معلوم ہوٹل کے کمرے میں کوئی خفیہ کیمرہ لگا ہو اور وہ ہمارے رنگین لمحات ریکارڈ کرلیں اور بعد میں بلیک میلنگ کرتے رہیں۔

''میں راحیلہ سے کہتا کہ میں تمہارا عاشق ہوں اور تمہارے خوبصورت جسم سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں بس جیسے ہی کوئی مناسب جگہ کا بندوبست ہوا تو ضرور ملاقات کریں گے۔ بس تھوڑا صبر کرو۔ احتیاط اچھی چیز ہے۔''

اُس کا جواب یہی ہوتا کہ مجھے نہیں پتا اگر مجھ سے نکاح نہیں کرسکتے تو مجھے عارضی بیوی بنالو اور یہاں کوئی چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر لے لو جہاں ہم میاں بیوی کی حیثیت سے رہیں گے۔''

''تمہاری تجویز تو معقول ہے۔ میں اس پر غور کروں گا۔''

الغرض ہماری اس طرح کی باتیں اور فون سیکس چلتا رہا۔ میں ہر ملاقات پر راحیلہ کو پیسے، تحفے تحائف لے کر دیتا اور دل کھول کر اپنی دولت لٹا رہا تھا۔

☆......☆......☆

کوئی پندرہ بیس روز گزرے تو ہوا یوں کہ ہمارے دور کے رشتہ دار جو کہ میرے ہی شہر میں رہتے تھے۔ انہوں نے ایک نئی آبادی میں ایک نیا اور خوبصورت گھر بنایا اور وہ وہاں شفٹ ہوگئے۔ ہمارے رشتے دار کا نام جہانگیر تھا۔ اُس کی بیوی کراچی کی رہنے والی تھی۔ اُن کے چار بچے تھے۔

جہانگیر کے سالے کی شادی تھی اس لیے وہ لوگ ایک ہفتے کے لیے شادی میں شرکت کے لیے کراچی چلے گئے اور گھر لاک کر کے چابیاں مجھے دے گئے کہ ہمارے آنے تک گھر کا خیال رکھنا اور دن میں ایک آدھ بار چکر لگالیا کرنا کیونکہ وہ نئی کالونی تھی اور ابھی آبادی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ خیر میں نے چابیاں رکھ لیں اور دو تین دن چکر لگا کر گھر کو دیکھتا رہا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک شیطانی خیال آیا کہ جہانگیر کے گھر سے زیادہ کوئی اور محفوظ اور پُرسکون جگہ نہیں ہوسکتی۔ گھر خالی ہے تو کیوں نہ راحیلہ کو یہاں بلالوں۔

اب اتفاق سے اگلے روز سے تین اکٹھی سرکاری چھٹیاں آرہی تھیں تو میں نے فوراً منصوبہ بنایا کہ ان تین دنوں میں راحیلہ کے ساتھ موج مستی کی جائے۔ اب ایسا تھا کہ اُن دنوں کاروبار بھی کچھ ڈاؤن تھا تو میں نے یہ ساری صورت حال راحیلہ کو فون پر بتائی تو وہ فوراً آنے کے لیے تیار ہوگئی۔ اُس نے اپنے گھر فون کردیا کہ وہ اِن تین چھٹیوں میں گھر نہیں آئے گی کیونکہ وہ اپنے کورسز کے ایگزام کی تیاری ہوسٹل میں رہ کر کرے گی۔''

میں نے اپنے گھر والوں کو بتایا کہ کاروباری میٹنگ اور کچھ ضروری سامان خریدنے لاہور جارہا

ہوں اور تین دن کے بعد واپس آؤں گا۔ چونکہ میں مہینے میں تین چار چکر دوسرے شہروں کے لگاتا رہتا تھا تو میرے لاہور جانے کا سن کر کسی نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا۔

اُسی شام میں نے راحیلہ کو فون کر کے کہا کہ کل صبح تم بذریعہ A.C کوچ ہمارے شہر آجاؤ تو اُس نے کہا کہ وہ ناشتے کے بعد چل پڑے گی اور دس گیارہ بجے تک پہنچ جائے گی۔

پھر میں نے بازار سے گوشت، سبزی، پھل اور دودھ وغیرہ خریدا اور جہانگیر کے گھر جا کر تمام اشیاء کو فریج میں رکھ دیا۔

''اگلی صبح میں نے ناشتا کیا اور ایک سفری بیگ میں دو تین کپڑوں کے جوڑے اور تولیہ وغیرہ رکھا۔ چھوٹا بھائی اُن دنوں فارغ تھا اُس کے ایگزام ہو چکے تھے۔ وہ رزلٹ کے انتظار میں تھا تو اُسے کہا کہ میری غیر موجودگی میں شاپ کا سارا کام سنبھالنا۔''

اُدھر راحیلہ فیصل آباد سے چل پڑی تھی فیصل آباد سے ہمارے شہر کا سفر دو اڑھائی گھنٹے کا تھا۔ ہمارا مسلسل رابطہ موبائل میسج کے ذریعے تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ ساڑھے دس گیارہ بجے تک پہنچ جائے گی۔ میں نے دس بجے بیگ اٹھایا اور بھائی سے کہا کہ مجھے ویگن اسٹینڈ پر چھوڑ آؤ۔ چنانچہ بھائی نے مجھے ویگن اسٹینڈ پر ڈراپ کر دیا اور خود شاپ پر چلا گیا۔ میں اسی کمپنی کے ویگن اسٹینڈ کے ویٹنگ روم میں جا کر بیٹھ گیا۔ جس کوچ میں راحیلہ آرہی تھی۔ میں نے راحیلہ کو کال کر کے بتایا کہ میں ویگن اسٹینڈ پہنچ چکا ہوں اور ویٹنگ روم میں بیٹھا اُس کا انتظار کر رہا ہوں۔''

پونے گیارہ بجے راحیلہ پہنچ گئی پھر ہم رکشہ پر بیٹھ کر جہانگیر کے گھر پہنچ گئے۔ میں نے گھر کے مین گیٹ کو باہر سے تالا لگا دیا اور چھوٹے گیٹ کو اندر سے بند کر کے روم میں آگیا۔ راحیلہ پہلے تو تھوڑی نروس ہوئی مگر جلد ہی وہ نارمل ہو گئی۔ راحیلہ نے کچن میں جا کر چائے بنائی اور ہم ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کر چائے پینے لگے۔

میں نے گھر کے مین گیٹ کو باہر سے تالا اس لیے لگایا تھا کہ کوئی ہمیں ڈسٹرب نہ کرے۔ اگر کوئی جہانگیر کا ملنے والا آئے گا بھی تو وہ تالا دیکھ کر واپس چلا جائے گا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔'' جب ہم چائے پی چکے تو میں نے راحیلہ سے کہا۔

''جان آؤ بیڈ روم میں چلتے ہیں۔'' تو اُس نے جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے کہا۔

''خری وہ کس لیے؟'' تو میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''جان من سہاگ رات منانے کے لیے۔'' تو وہ بولی۔

''ابھی تو دن ہے رات کہاں ہے؟'' چنانچہ اس طرح کی فضول اور لچر باتیں کرتے ہوئے ہم بیڈ روم میں چلے گئے جہاں راحیلہ ایک کنواری لڑکی سے عورت بن گئی اور شیطان کا وار کاری گیا۔

بدکاری کے بعد ہم دونوں بغیر لباس کے گہری نیند سو گئے۔ کوئی تقریباً اڑھائی تین بجے کے قریب ہماری آنکھ کھلی تو ایک بار پھر اس قبیح فعل کے مرتکب ہوئے۔ پھر راحیلہ نے کچن میں جا کر کھانا بنایا جو کہ ہم نے مل کر کھایا۔ اس کے بعد دو دن اور دو راتیں ہم زنا کے مرتکب ہوتے رہے۔

☆......☆......☆

آج تیسرا دن تھا تو راحیلہ نے کہا کہ خری میں بہت خوش ہوں کہ تم نے مجھے ایک مکمل عورت بنا دیا ہے۔'' جبکہ میں بھی اندر سے بہت خوش اور مسرور تھا کہ جو پیسے اب تک راحیلہ پر خرچ کیے تھے اُس کی ایک ایک پائی اس کے کنوارے، حسین اور جوان بدن سے وصول کر رہا ہوں۔

راحیلہ صبح کا ناشتا اور دوپہر رات کا کھانا بناتی ہر چیز فریج میں موجود تھی اب پروگرام یہ بنا کہ آج کی رات گزار کر صبح نہا دھو کر راحیلہ واپس فیصل آباد چلی جائے گی۔ اُس کو کوچ میں بٹھا کر میں بذریعہ رکشہ اپنے گھر پہنچ جاؤں گا۔ اس طرح کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی کہ میں کیا کھیل کھیل کر آیا ہوں۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ہم نے پھر شیطانی کھیل کھیلا اور میں

اُٹھ کر باتھ روم میں چلا گیا۔

گھر کے مین گیٹ کو تالا لگا ہوا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ گھر والے لمبے عرصے کے لیے کہیں گئے ہوئے ہیں اور گھر خالی ہے۔ تو ہوا یوں کہ دو یا تین ڈاکو اسلحے سمیت ڈاکہ ڈالنے کے لیے گھر کی بیرونی دیواریں پھلانگ کر اندر آ گئے۔ اُن کا پروگرام یقیناً یہ ہوگا کہ سکون سے پورے گھر کی تلاشی لے کر لوٹ مار کریں گے۔ ڈاکو جب T.V لاؤنج کے راستے بیڈ روم میں داخل ہوئے تو بیڈ پر راحیلہ بغیر لباس کے لیٹی تھی۔ راحیلہ نے جب ڈاکوؤں کو دیکھا تو وہ ایک دم گھبرا کر چیخیں مارنے لگی اور شور مچا دیا۔ ڈاکو اس قسم کی صورت حال کے لیے ہرگز تیار نہ تھے۔

میں نے جب راحیلہ کی چیخوں کی آواز سنی تو فوراً باتھ روم سے باہر نکلا اور پوچھنے ہی والا تھا کہ راحیلہ کیا ہوا؟ جب میں نے ڈاکوؤں کو دیکھا تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ راحیلہ فوراً برہنہ حالت میں چیختی میری طرف بڑھی تو ایک ڈاکو نے گھبراہٹ میں پسٹل سے فائرنگ شروع کر دی۔ ایک گولی راحیلہ کی پسلیوں میں اور ایک گردن میں لگی جس کے نتیجے میں راحیلہ خون میں لت پت بیڈ پر گر گئی جبکہ میں محفوظ رہا۔ ڈاکو اسی وقت وہاں سے فرار ہو گئے اور فائرنگ کرنے والے ڈاکو نے پسٹل وہیں پھینک دیا۔

شور، چیخوں اور فائرنگ کی آواز سُن کے ہمسایوں نے پولیس کے ایمرجنسی نمبر 15 پر کال کر دی۔ راحیلہ بیڈ پر تڑپ رہی تھی پورا بیڈ اور کمرے کا فرش خون سے سرخ ہو گیا۔ میں بھی ننگا بُت بنا کھڑا تھا۔ اِس واقعے نے میرے ہوش و حواس گم کر دیے تھے۔ میری یہ حالت تھی کہ کاٹو تو خون نہیں ہے۔ اسی اثناء میں پولیس موبائل کے سائرن کی آواز آئی راحیلہ دم توڑ چکی تھی۔ سائرن کی آواز سن کر مجھے کچھ ہوش آیا تو میں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے۔ باہر کا چھوٹا گیٹ کھلا تھا پولیس اندر آ گئی۔ پولیس کے ساتھ کچھ محلے دار بھی تھے جن کی نشاندہی میں پولیس اندر آئی۔ سب انسپکٹر نے اندر آ کر راحیلہ کی برہنہ لاش دیکھا تو سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا

### قولِ حضرت علیؓ

میں جنت کے شوق میں عبادت نہیں کرتا۔ یہ تجارت ہے اور نہ ہی جہنم کے خوف سے کرتا ہوں کہ یہ غلامی ہے۔ میں صرف اور صرف اس لیے عبادت کرتا ہوں کہ میرا رب لائق عبادت ہے۔

☆......☆......☆......☆

اپنی سوچ کو پانی کے قطروں کی طرح شفاف رکھو۔ کیونکہ جس طرح قطروں سے دریا بنتا ہے اسی طرح سوچوں سے ایمان بنتا ہے۔

مرسلہ: رازِ عدن۔ بحرین

اور پوچھا کہ کیا معاملہ ہے اور لڑکی کو قتل کس نے کیا ہے؟''

تو میں نے ہکلاہٹ میں کہا وہ جی ڈاکو آئے تھے۔ وہ مار کر گئے ہیں۔''

''سب انسپکٹر نے پوچھا کہ یہ تمہارا گھر ہے اور اس لڑکی سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟''

میں خاموش رہا تو ہمسایوں اور محلے داروں نے بتایا کہ یہ گھر اس کا نہیں ہے۔ گھر کے مالک تو جہانگیر صاحب ہیں۔'' تو اس پر تھانیدار نے پوچھا کہ میں کون ہوں تو میں نے بتایا کہ جہانگیر کا رشتہ دار ہوں اور وہ شادی میں شرکت کے لیے کراچی گئے ہوئے ہیں اور یہ لڑکی میری دوست ہے۔'' تھانیدار کے سوال جواب جاری تھے کہ راحیلہ کے موبائل پر کال آنے لگی۔ راحیلہ کا موبائل بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر پڑا تھا۔ تو تھانیدار نے موبائل فون اُٹھا کر کال اٹینڈ کی۔

کال کرنے والا راحیلہ کا بھائی تھا۔ تھانیدار نے مجھ سے مقتول لڑکی کا نام پوچھا تو میں نے بتا دیا۔

تھانیدار نے اپنا بتایا کہ وہ سب انسپکٹر ہے اور ابھی تھوڑی دیر پہلے راحیلہ قتل ہو چکی ہے اُس کے سامنے راحیلہ کی لاش پڑی ہے اور وہ موقع واردات پر موجود ہے۔ اسی طرح تھانیدار کی راحیلہ کے بھائی

سے بات ہوتی رہی۔ تھانیدار نے راحیلہ کے بھائی سے کہا کہ وہ فلاں شہر کے فلاں پولیس اسٹیشن آجائیں۔''

پھر اُس نے کال بند کردی اور متعلقہ پولیس اسٹیشن فون کرکے واردات کی پوری صورت حال بتاکر ایمبولینس منگوائی پھر پورے کمرے کی تلاشی لی تو انہیں پسٹل مل گیا، جس کی گولیوں سے راحیلہ ہلاک ہوئی تھی۔

میرا موبائل فون اور راحیلہ کا موبائل فون سب انسپکٹر نے قبضے میں لے کر مجھے حراست میں لے لیا۔ تھوڑی دیر بعد ایمبولینس آگئی جس میں راحیلہ کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے سول اسپتال کے مردہ خانے بھیج دیا گیا پھر پورا گھر سیل کردیا گیا اور مجھے گرفتار کرکے متعلقہ پولیس اسٹیشن کے حوالات میں بند کردیا گیا۔

راحیلہ کے ورثاء کے پہنچنے تک ایس ایچ او نے مجھ سے واردات کی پوری تفصیل پوچھی تو میں نے شروع سے آخر تک سب سچ سچ بتادیا۔

کوئی تین چار گھنٹے کے بعد راحیلہ کے ورثاء پولیس اسٹیشن پہنچ گئے۔

تو ایس ایچ او نے انہیں ساری بات بتائی کہ راحیلہ کس طرح یہاں آئی اور ڈاکوؤں کی فائرنگ سے ہلاک ہوئی ہے۔

مگر انہوں نے یہ بات ماننے سے انکار کردیا۔ مجھے خوب گالیاں دیں اور مرنے مارنے پر اُتر آئے اور تھانے میں خوب ہنگامہ کیا اور مجھ پر راحیلہ کے اغواء، آبروریزی اور قتل کا پرچہ درج کرنے پر زور دینے لگے اور ایس ایچ او کو دھمکی دی کہ اگر اُن کی مرضی کی ایف آئی آر درج نہ کی گئی تو وہ میڈیا کو بلالیں گے اور بتائیں گے کہ پولیس میرے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ اگر احتجاج کرنا پڑا تو وہ راحیلہ کی لاش کو سڑک پر رکھ کر روڈ بلاک کردیں گے۔''

میرے گھر والوں اور خاندان میں ابھی کسی کو بھی اس بات کا پتا نہیں چلا تھا۔ ایس ایچ او نے مجھے دوبارہ حوالات میں بند کردیا اور راحیلہ کے ورثاء کے واویلا کرنے اور احتجاج وغیرہ اور میڈیا کو بلانے کی دھمکی سے مجبور ہوکر میرے خلاف راحیلہ کے اغواء، حبس بے جا، آبروریزی اور قتل کی ایف آئی آر درج کردی۔

پھر رات گئے راحیلہ کی لاش کا پوسٹ مارٹم ہوا اور اُس کے ورثاء تدفین کے لیے راحیلہ کی لاش اپنے ساتھ لے گئے۔ پھر ساری رات تفتیش ہوتی رہی۔ ایس ایچ او نے میری اور راحیلہ کی تمام فون کالز کا ریکارڈ نکلوایا۔

☆......☆......☆

اگلی صبح تمام اخبارات کے پہلے صفحے پر میری رنگ رلیوں کی داستان شائع ہوئی۔ اگلے روز ایس ایچ او نے مجھے عدالت میں پیش کرکے ریمانڈ لیا اور چالان مکمل کرکے عدالت میں بھیج دیا اور مجھے جیل بھیج دیا گیا۔ جب اس تمام واردات اور صورتِ حال کی اطلاع میرے گھر والوں کو ملی تو میرے والد صاحب جو کہ دل کے مریض تھے۔ جب انہیں پتا چلا کہ خرم نے لڑکی اغواء کرکے قتل کردی ہے اور جیل میں ہے تو اُن کو شدید ہارٹ اٹیک ہوا جو جان لیوا ثابت ہوا اور اُن کا انتقال ہوگیا۔ مجھے جب والد صاحب کی موت کی اطلاع ملی تو میں جیل میں پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ اگلے دن مجھے والد صاحب کے جنازے میں شرکت کے لیے پیرول پر دو گھنٹے کے لیے رہائی ملی تو پولیس مجھے ہتھکڑی لگاکر جنازہ گاہ لے گئی۔

جہانگیر اپنی فیملی کے ساتھ کراچی سے واپس آچکا تھا۔ اُس نے مجھ پر خوب لعن طعن کی کہ تمہیں گھر کی چابیاں اس لیے تو نہیں دے کر گیا تھا کہ تم میرے گھر کو عیاشی کا اڈہ بنادو۔''

نمازِ جنازہ کے بعد والد صاحب کی تدفین ہوگئی تو مجھے واپس جیل بھیج دیا گیا۔

اس کے بعد کی داستان بہت لمبی ہے۔ پولیس تفتیش کرتی رہی اور بالآخر راحیلہ کے قتل کے مقدمے کا ٹرائل شروع ہوگیا۔

ہر ماہ دو تاریخیں پڑتیں اور مجھے عدالت میں پیش کیا جاتا۔ میری ضمانت کی درخواست مسترد کردی

گئی۔ پورا ایک سال جیل میں رہا۔ جب کچھ معاملہ تھوڑا ٹھنڈا پڑا تو میرے بھائی اور کچھ دوسرے رشتے دار راحیلہ کے گاؤں گئے اور راحیلہ کے ورثاء سے ملے اور اُن کو ساری صورت حال اور سچائی بتائی کہ خرم بے قصور ہے۔ راحیلہ کی دوستی خرم سے تھی۔ وہ اپنی مرضی سے خود ملنے آئی تھی اور اُس کو ڈاکوؤں نے قتل کیا ہے۔ خرم کو کیا ضرورت تھی راحیلہ کو قتل کرنے کی۔''

مگر وہ اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے مگر دو تین مہینے کی مسلسل کوشش اور علاقے کے معززین کے سمجھانے اور پولیس کی تفتیش اور تمام اصل حقائق بتانے کے بعد وہ مقدمہ ختم کرنے پر رضامند ہوئے مگر اس کے لیے انہوں نے ایک کروڑ روپیہ مانگا۔ مزید کوششوں اور منت ترلوں کے بعد بالآخر ساٹھ لاکھ تاوان پر وہ رضامند ہوئے۔

گو کہ میں نے راحیلہ کو نہ تو اغواء کیا تھا اور نہ ہی قتل مگر زنا جیسے قبیح فعل اور گناہ کبیرہ کا مرتکب تو ہوا تھا۔ مجھے اگر سزائے موت نہ بھی ہوتی تو پندرہ بیس سال کی قید تو ضرور ہو جاتی۔

راحیلہ کے ورثاء کو تاوان کی رقم دینے کے لیے گھر فروخت کر دیا گیا۔ بیوی کا سارا زیور بھی بیچنا پڑا تو اس طرح ساٹھ لاکھ روپے کا بندوبست ہوا اور رقم راحیلہ کے ورثاء کو ادا کر دی گئی۔ پھر معافی نامہ اور صلح نامہ تیار کیا گیا بالآخر اس مقدمے سے میری خلاصی ہوئی اور ڈیڑھ سال کے بعد مجھے جیل سے رہائی ملی۔

☆☆......☆☆

اس سے آگے کی داستان بڑی دردناک ہے۔ وہ اس طرح کہ تمام رشتہ داروں، عزیز و اقارب نے مجھ پر خوب تھو تھو کی میرے کردار پر کیچڑ اچھالا جاتا۔ اگر میں راحیلہ سے شرعی طور پر نکاح کر لیتا تو شاید میرا یہ حشر نہ ہوتا۔ وہ بے چاری کہتی رہی خرم پلیز مجھ سے نکاح کر لو مگر میں معاشرے کے ڈر سے اُس کے ساتھ نکاح نہ کر سکا اور اب یہی معاشرہ مجھے حقارت اور نفرت سے دیکھ رہا تھا۔ میں مجرم تھا۔ شادی شدہ دو بچوں کا باپ تھا مگر میں نے گناہِ کبیرہ کیا۔ راحیلہ ناپاکی اور پلیدی کی حالت میں برہنہ قتل ہوئی۔ اُس کا جسم کتنے لوگوں نے دیکھا تو یہ سب میرا قصور اور جرم تھا۔ مجھے کبھی سکون نہ ملا۔ بیوی بچوں کے سامنے شرمسار ہوں۔

پھر خاندان رشتہ داروں اور معاشرے کے طعنوں سے تنگ آ کر میں نے اپنا شہر چھوڑ دیا اور بیوی بچوں کو لے کر لاہور آ گیا۔ جہاں ایک گارمنٹس شاپ پر سیلز مین کی ڈیوٹی کرتا ہوں۔ کرائے کا چھوٹا سا مکان ہے۔ میری بیوی ایک وفا کی دیوی ہے۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود اُس نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا اور کھلے دل سے مجھے معاف کر دیا۔ وہ پڑھی لکھی ہے تو اُس نے ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر کی جاب کر لی ہے اور اسکول ٹائم کے بعد محلے اور اردگرد کے علاقوں میں رہنے والے بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی ہے۔ اس طرح ہماری گزر بسر اچھی ہو جاتی ہے مگر میں تنہائی میں خوب گڑگڑا کر روتا ہوں کہ ایک تو عزت خاک میں مل گئی۔

دوسرا کاروبار تباہ ہو گیا۔

کل تک میں مالک تھا کئی ملازمین کا باس تھا۔ خوشحالی تھی۔ آج میں خود ایک ملازم ہوں۔

تیسرا یہ کہ اتنا شاندار گھر اپنا تھا۔ جس کا ایک پورشن کرائے پر دے رکھا تھا وہ بک گیا اور آج ہم خود کرائے دار ہیں۔ اب دور دور تک اس مہنگائی کے دور میں اپنا گھر بنانے کے نہ تو کوئی آثار ہیں اور نہ سکت۔

بس ہم دونوں میاں بیوی کی محنت اور ملازمت سے مکان کا کرایہ، بجلی گیس کے بل اور کھانے پینے کے اور دیگر اخراجات بمشکل پورے ہوتے ہیں۔ مجھے کسی پل چین اور قرار نہیں ملتا۔ ہاں میں مجرم ہوں وہ ایسے کہ راحیلہ اگر نادان تھی مگر میں تو نادان نہیں تھا۔ ایک میچور مرد تھا۔ میری وجہ سے ہی وہ جس حالت میں قتل ہوئی اُس کا ذمے دار میں ہی تو ہوں۔ یہی احساس مجھے دن رات تڑپاتا ہے اور بے چین رکھتا ہے۔ میری ندامت کے آنسو اب تک میری اس کیفیت اور حالت کا مداوا نہیں کر سکے۔

☆☆......☆☆

ناول

کاشی چوہان

# زہرِ عشق

خوف اور رگوں میں لہو جما دینے والے مناظر سے بھرپور، عشق کی ایک
ایسی ناقابلِ یقین داستان، جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ
یہ سچی کہانی ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔

## اسرار کی نئی دنیا میں لے جانے والے، پُراسرار سلسلے کی ساتویں قسط

وہ دروازے میں سے داخل ہوا تو اس کے باپ ابراہیم کی نظر اس پر سب سے پہلے پڑی۔ اس کی پھولی ہوئی سانسوں کو دیکھ کر اس کے باپ کے چہرے پر ایک لمحے میں ڈھیروں پریشانی جمع ہوگئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا یا استاد ریحان اور نگران اس سے کوئی باز پرس کرتے اس کا باپ ابراہیم بے پناہ محبت سے اپنی کرسی سے اٹھا اور تیزی سے آگے بڑھ کر اسے گلے لگاتے ہوئے بولا۔

''میرے بیٹے سلیمان شکر ہے کہ تم بالکل خیریت سے ہو۔ میں تو ڈر رہا تھا کہ تمہیں کہیں کچھ ہو تو نہیں گیا۔ تمہیں دیکھنے کو نظریں ترس گئی تھیں۔ شکر ہے خدا کا کہ تم کامل خیریت سے ہو۔ تمہیں کچھ نہیں ہوا۔''

''جی بابا میں ٹھیک ہوں۔'' اس کے منہ سے بمشکل یہ الفاظ ادا ہوئے۔

''تم نہیں جانتے تمہاری ماں کی تمہارے فراق میں کیا حالت ہے۔ اس نے رات دن تمہیں یاد کیا اور مجھے ہر روز مجبور کیا کہ میں تمہارے پاس جاؤں اور تم سے مل کر تمہاری خیریت کا پتا کر کے آؤں۔ وہ تو خود آنا چاہتی تھی مگر تم جانتے ہو وہ نہیں آسکتی۔ ویسے بھی مدرسے میں عورتوں کا آنا کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس بات کی یہاں اجازت بھی ہے یا نہیں۔ اسے تمہاری فکر نے کافی کمزور کر دیا ہے۔ اس کے پاس بس یہی ایک کام ہے کہ دن رات تمہیں یاد کرتی ہے۔ تمہیں دیکھنے کو ترستی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تمہارے اس طرح غائب ہونے پر۔ دو ہفتے سے گھر نہ آنے پر میں تمہیں سخت ڈانٹ پلانے والا تھا مگر یہ وہ ہی تھی جس نے مجھ سے چلتے وقت وعدہ لیا تھا کہ میں تم سے کچھ نہ کہوں اور جتنا بھی غصہ مجھے آئے اسے اپنی بے حساب محبت سے بدل دوں۔''

ابراہیم اس کے رخسار چومتا رہا اور بے تکان بولتا رہا۔ اپنی ماں کی حالت اور بے کلی کے بارے میں جان کر سلیمان کو دل کے اندر تک ماں کی شدید یاد آئی اور اس کے لبوں سے صرف یہ ایک لفظ نکلا ''ماں'' اس کی آنکھیں بھر آئیں اور پھر اس کی روکنے کی کوشش کے بعد بھی اس کے آنسو نہیں رک سکے۔ اس کے چہرے کو بھگوتے ہوئے اس کے آنسو اس کے باپ کے سینے میں جذب ہونے لگے۔

ابراہیم نے اس کی طرف دیکھا تو اسے دکھ ہوا۔ اس کا دل مچل کے رہ گیا۔ ''میں نے تو تمہیں کچھ کہا نہیں پھر کیوں رو رہے ہو؟'' اس سے رہا نہیں گیا۔



''امی کی بہت یاد آ رہی ہے۔ ان ہی کو یاد کرنے سے آنسو نکل پڑے۔ میں خود پر قابو نہیں رکھ سکا۔'' سلمان نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''اگر اتنا ہی پیار کرتے ہو اپنی ماں سے تو پھر کیوں گھر نہیں آئے۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ تم یوں دو ہفتے تک غیر حاضر رہو، پھر اب ایسا کیا ہو گیا میرے بیٹے؟''

سلمان کو لگا کہ جیسے اس کے پاس اپنے باپ کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا۔ ظاہر ہے سچ تو وہ بتا ہی نہیں سکتا تھا اسے ضرور کوئی جھوٹ ہی بولنا پڑتا۔ اور اس نے جھوٹ کے بارے میں ابھی سوچا نہیں تھا کہ اسے کیا جھوٹ بولنا ہے۔ لیکن ریحان استاد جو دونوں باپ بیٹوں کی وارفتگی کو توجہ سے دیکھ رہے تھے اور باپ بیٹے کے اس ملاپ پر انہیں خوشگوار حیرانی بھی ہو رہی تھی حقیقت میں وہ اس منظر سے پوری طرح متاثر ہو چکے تھے۔

''ابراہیم تمہارا بیٹا اس قدر ذہین اور سمجھدار ہے کہ اس کی تعریف سے یہ پورا مدرسہ گونجا کرتا ہے۔ اس کا کوئی عمل خارج از علت نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ دو ہفتے تک گھر نہیں آیا تو ضرور کسی اندرونی ادھیڑ بن میں مصروف رہا ہوگا۔ ایسے تو وقت کا زیاں یہ کبھی کرتا نہیں ہے۔ انسان کے اندر کے جو معاملات ہوتے ہیں کبھی کبھی وہ اسے اس قدر اپنے قابو میں کر لیتے ہیں کہ اسے دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہیں رہتی۔ اسے معاف کر دو۔ اس کی ہر خطا معافی کے لائق ہوتی ہے۔ تم تو بڑے خوش قسمت باپ ہو جسے ایسا ہونہار سپوت رب تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا ہے۔''

ریحان استاد کے منہ سے اپنے بیٹے کی اس قدر تعریف سن کر ابراہیم پر تو جیسے ایک نشا سا سوار ہو گیا۔ اس کے رونگٹے رونگٹے میں ایسی سرخوشی دوڑ گئی کہ اس نے ایک بار اور پوری شدت سے اپنے بیٹے کو گلے لگا لیا۔

دونوں باپ بیٹے نگراں کے آفس سے اٹھ کر مدرسے کے باغ میں آ گئے اور وہاں ہری ہری گراس پر بیٹھ گئے۔ ابراہیم کے چہرے پر کچھ دیر پہلے جو بیٹے سے ملنے کی جو خوشی اور شادمانی تھی اب اس کی جگہ گہرے تفکرات نے لے لی تھی۔ سلمان جسے یہ اطمینان مل چکا تھا کہ اس کی دو ہفتے کی غیر حاضری سے کوئی بڑا طوفان نہیں آیا تھا۔ قدرت نے اس کی مدد کی تھی اور وہ کسی بڑی مشکل میں پڑنے سے بچ گیا تھا۔ اب اپنے والد کو یوں یکا یک اس طرح خاموش اور پریشان دیکھ کر اندر ہی اندر سلگنے لگا۔

''کیا بات ہے بابا! آپ کچھ دیر پہلے تو کافی بشاش تھے۔ مجھ سے ملنے کی خوشی آپ کے چہرے اور آنکھوں سے چھپائے نہیں چھپتی تھی لیکن اب میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ سب چند لمحوں کی داستان بن کے رخصت ہو چکا ہے اور آپ کے چہرے سے ایک ایسی گمبھیر پریشانی جھانک رہی ہے جس نے مجھے پریشان کر دیا ہے اور میں کافی فکر مند ہو رہا ہوں۔ کیا آپ مجھے اپنی پریشانی کے بارے میں نہیں بتائیں گے؟'' سلمان کی بات سن کر ابراہیم نے اس کے چہرے کی طرف محبت سے دیکھا اور اس کے چہرے کو پیار سے چھو کر بولا۔

''میں چاہوں بھی تو یہ بات تم جو مجھے اندر ہی اندر جلا رہی ہے تم سے چھپا نہیں سکوں گا۔ کیونکہ اگر میں ایسا کرتا ہوں تو اس سے تمہاری پریشانی اور مشکلات میں کمی آنے کے بجائے اور اضافہ ہی ہوگا۔ یہ سوچ کر ڈر رہا ہوں کہ تمہیں کس طرح بتاؤں۔ جان لینے کے بعد تمہارا ردعمل کیا ہوگا۔ تم کیا فیصلہ کرو گے۔ چاہتا تو تھا کہ تمہیں آج ہی اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاؤں تاکہ جو مصیبت تمہارے راستے میں کھڑی ہونے والی ہے اسے کچھ دیر کے لیے ٹالا جا سکتا ہو۔ مگر تم شاید مدرسے سے چھٹی لے کر جانے پر تیار نہیں ہوگے۔ یہی سوچ رہا ہوں اور سوچ نے میرے چہرے کو تفکرات سے بھر دیا ہے۔''

''بابا اس طرح بات کو طول دے کے کر میری پریشانی کو اور مت بڑھائیں... صاف صاف بتائیں کیا بات ہے۔ امی تو ٹھیک ہیں نا؟'' سلمان کی بے چینی سوا ہونے لگی۔

''تمہاری ماں کے پاس تمہاری جدائی سے بڑی کوئی پریشانی نہیں ہے۔ وہ جسمانی طور پر ٹھیک ہے مگر اندر ہی

اندر گھل رہی ہے لیکن تمہاری محبت اور تمہارے شوق کی خاطر اسے یہ دکھ جھیلنا منظور ہے۔'' ابراہیم نے اب بھی بات کو سلمان پر پوری طرح عیاں نہیں کیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ بیٹے کو اس مصیبت سے بچانے کی تدبیر سوچ رہا ہے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے مگر وہ چاہتے ہوئے بھی اس میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔

''جو بھی بات ہے آپ کچھ بھی پروا کیے بغیر مجھے بتا دیں۔ میں ہر مصیبت کا سامنا کرنے کو تیار ہوں بابا!'' سلمان نے حوصلے کی ساری ہمت کو جمع کر کے کہا۔



''پہلے تو ہمیں تمہاری جدائی کا دکھ ہی مارے ڈال رہا تھا اور اب یہ نئی مصیبت اگر تمہارے پیچھے چل پڑتی ہے تو ہمیں تمہاری جان کی فکر بھی ستایا کرے گی۔ کاش تم میری بات مان سکو اور میرے ساتھ ہمیشہ کے لیے گھر چلو'' ابراہیم اپنی بات کہتے کہتے رکا اور آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔

''رب تعالیٰ نے اپنی ساری مخلوقات کو ان کی حدود اور ان کے کاموں کے فرائض کے حساب سے ہی تخلیق کیا ہے کوئی بھی ایسی مخلوق نہیں ہے جو کسی دوسری مخلوق کی جگہ لے سکتی ہو۔ شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی تو پی سکتے ہیں مگر شیر بکری اور بکری کبھی شیر نہیں بن سکتی اسی طرح ہم جنات کو بھی انسانوں سے الگ پیدا کیا گیا ہے۔ ہماری تخلیق کا جو مقصد ہے ہم اس سے باہر نہیں جا سکتے اگر ایسا کریں گے تو ہمیں ایسی مشکلات اور کٹھنائیوں کا سامنا کرنا پڑے گا جن سے نمٹنا ہمارے بس میں نہیں رہے گا۔ تم نے بھی اپنی حد سے باہر جانے کی کوشش کی ہے اور اپنی اس خواہش کی خاطر تم اپنی دنیا سے دور اور انسانوں کے درمیان رہنے لگے ہو۔ لیکن تم جانتے ہو یہ بات کسی بھی طرح ہماری برادری اور قبیلے کے اصولوں کے مطابق نہیں ہے۔ میں اور تمہاری ماں تم سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ ہم نے تمہیں نہ چاہتے ہوئے بھی قبیلے کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے یہاں انسانوں کے بیچ پڑھنے اور رہنے کے لیے بھیج دیا کیونکہ ہم تمہاری ضد اور محبت کے ہاتھوں مجبور ہو گئے تھے۔ تمہیں معلوم ہے یہ ایک ایسا راز ہے جسے ہمیں سب ہی جنات اور قبیلے کی مجلس سے چھپانا پڑتا ہے لیکن اب اس راز کو زیادہ دیر تک چھپایا نہیں جا سکے گا۔ کالاش کو شک ہو گیا ہے اور پچھلے ہفتے میں وہ تمہیں پوچھنے کے لیے کئی بار آ چکا ہے۔''

''کالاش.....!!! یہ کون ہے بابا؟''

''یہ قبیلے کی مجلس کا رکن ہے اور اسے سب ہی جنات کی خبر گیری کا محکمہ دیا گیا ہے اسی کارن وہ ایک دن ہمارے گھر آیا اور باتوں باتوں میں تمہارے بارے میں بھی پوچھنے لگا۔ ہم نے اس سے جھوٹ بولا کہ تم کسی کام سے اپنے ماموں کے گھر گئے ہوئے ہو... دو چار دن میں لوٹ آؤ گے'' وہ چار دن بعد پھر آیا اور... ہمیں اس سے پھر جھوٹ بولنا پڑا۔ اتفاق سے انھی دو ہفتے میں تم نے ناغہ کر لیا گھر نہیں آئے تو کالاش نے کوئی پانچ، چھ چکر لگائے اور مسلسل تمہارے بارے میں پوچھتا رہا۔ اب ایسا لگتا ہے اسے ہماری باتوں پر اعتبار نہیں رہا۔ آخری بار جاتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ اگر کل تک سلمان نہیں آیا تو میں سمجھوں گا کہ آپ اسے مجھ سے ملنے نہیں دینا چاہتے اور شاید آپ نے اسے ضرور کسی غیر قانونی کام میں لگایا ہوا ہے تب ہی آپ اسے مجھ سے چھپا رہے ہیں۔ وہ دھمکی دے کر گیا ہے کہ اگر اگلی بار سلمان نہ ملا تو وہ قبیلے کے سردار سے اجازت لے کر آئے گا اور پھر مجھے اسے اپنے ساتھ اسے تمہارے ماموں کے گھر لے جانا ہوگا۔' جہاں وہ تم سے مل کر اپنی تسلی کرنا چاہتا ہے۔ بصورت دیگر تم جانتے ہو ہمیں سخت سزا دی جا سکتی ہے اور میں نہیں جانتا کہ وہ سزا کیا ہوگی لیکن مجھے معلوم ہے ہمیں سچ اگلنے پر مجبور کر دیا جائے گا..

ہم اس سے بہانہ کر کر کے تھک چکے ہیں اور اب اس بات کو چھپانا ممکن نہیں ہے۔ اسی لیے میں چاہتا تھا کہ تم آج میرے ساتھ گھر چلتے اور کالاش سے ایک بار مل کے اس کا شک دور کر دیتے تا کہ یہ پریشانی کچھ دن کے لیے اور ٹل جاتی۔''

سلمان نے اپنے باپ کی بات دھڑکتے دل کے ساتھ سنی اور پوری بات سن کر اسے اندازہ ہو گیا کہ پریشانی اس کی توقع سے بھی زیادہ خوفناک اور لرزا دینے والی ہے۔ اس کی آنکھوں سے ڈر کی لکیریں جھانکنے لگیں اور وہ سوچ کی اتھاہ میں چلا گیا۔ فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اپنے باپ کی بات کا کیا جواب دے۔ یہ احساس اسے اپنی گرفت میں لینے لگا کہ اس کے معصوم اور بے قصور ماں باپ، اس کی وجہ سے بڑی زبردست مشکل میں پڑنے والے ہیں۔

قبیلے کا سردار بہت سخت دل تھا۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھی ایسی کڑی سزائیں دیتا تھا کہ اس کے خوف سے سارے جنات ہمیشہ ڈرتے رہتے تھے اور اس کا جرم تو ناقابل معافی تھا۔ شاید موت کی سزا بھی اس جرم کے لیے

ناکافی تھی۔ اس پر جو کچھ اس نے صنوبر کی محبت میں کیا تھا۔ اپنا ہم شکل بنانا اور ایک انسان لڑکی سے محبت کرنا، اس کے گھر میں جا کے رہنا اور اس کے لیے کبھی غائب ہونا، کبھی ظاہر ہونا، جس کا مطلب تھا کہ اس کے جن کا بہروپ انسانوں پر افشاء ہوسکتا ہے اور یہ قبیلے کے قوانین کی رو سے بہت بڑا جرم ہے۔

اس کا باپ ابراہیم بھی ابھی تک اس کی صنوبر سے محبت اور ہم شکل اور جو جو اس نے کیا تھا ان سب باتوں سے بے خبر تھا، اوپر سے اب یہ نئی مصیبت اس کے سامنے آ کے کھڑی ہوگئی تھی۔ اب کیا راستا باقی ہے.... بہت جھجکتے ہوئے اس نے اپنے باپ سے پوچھا۔

''بابا اگر ہم وہ قبیلہ چھوڑ دیں اور یہاں انسانوں کے بستی میں انسان بن کے رہیں تو کیا یہ ممکن ہے؟'' سلمان کی بات سن کر ابراہیم کی لہو رنگ آنکھیں پوری طرح خون سے بھر گئیں اور وہ اسی حیرانی سے اپنے بیٹے کو دیکھنے لگا جیسے اس نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہو جو اس کے تصورات سے بھی زیادہ ہیبت ناک ہو۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ یہ تو انہونی ہے۔ تمہارے دماغ میں یہ خیال آیا بھی کیسے۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے ناممکن۔ ایسا نہ پہلے کبھی ہوا اور نہ آئندہ ہوگا۔''

''لیکن بابا کتنے ہی جنات انسانی آبادیوں میں رہتے ہیں۔ وہ انسانوں کو پریشان بھی کرتے ہیں اور ان کی وجہ سے بہت سے انسان پریشان رہتے ہیں۔ اگر وہ رہ سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں رہ سکتے؟'' سلمان نے اپنی بات کے حق میں دلیل دی۔

''چپ ہو جاؤ خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔ ایسا کفر مت کہو جسے سن کر میری روح بھی آلودہ ہو جائے۔ مجھے اس بات کا ہمیشہ ڈر لگا رہتا تھا کہ تم انسانوں کے بیچ رہ کر ان ہی کی طرح سوچنے نہ لگو۔ یہ انسان ہی ہے جو اپنے خالق کے حکم سے سرتابی کر کے بھٹک چکا ہے۔ وہ ایسے سب کام کرتا ہے جو اسے نہیں کرنا چاہئیں۔ وہ اپنے حاکم اور اپنے خالق دونوں کا مجرم بن چکا ہے اور اسے اپنے بھٹکنے کا احساس تک نہیں ہے۔ انسان لالچی ہے اور بہت خود غرض ہے وہ۔ اپنے مقصد کو پانے کے لیے اگر اس کا بس چلے تو اپنے خدا کو بھی نیلام کر دے۔ اسے بس اپنی خوشی سے غرض ہے اور اس کے سامنے کسی چیز کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس نے اپنے رشتوں اور اپنے لوگوں کو پامال کر دیا ہے وہ اپنے خالق سے جھگڑ رہا ہے بیٹا اور تم آج اسی انسان کی سی باتیں کر رہے ہو۔ مجھے تمہاری باتوں سے اسی بغاوت کی بو آ رہی ہے جو انسان کی رگوں میں لہو بن کے دوڑتی رہتی ہے۔ تم نہیں جانتے میرے بچے انسان نے اپنے ہی جیسے انسانوں کی ہلاکت کا ایسا سامان کر دیا ہے کہ شاید خدا کو اب اس پر کسی قیامت کو بھیجنے کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ ایک دوسرے کا حق مارتے ہیں۔ اپنے سے کمزور انسان کو دکھ پہنچاتے ہیں اور ایسا کر کے انھیں کوئی ملال، کوئی ندامت کچھ نہیں ہوتا۔ وہ ہلاکت کے قریب ہیں۔ انسان کا انجام بہت لرزہ خیز اور عبرت ناک ہے اور تم مجھ سے ان ہی کے درمیان آ کے رہنے کی باتیں کر رہے ہو۔ یہ کفر ہے میرے بچے، یہ بغاوت ہے۔''

ابراہیم جیسے چیخ ہی تو پڑا۔ سلمان کو لگا کہ اس نے اپنے باپ کو مشتعل کر دیا ہے۔ ایسا ناقابل تلافی دکھ پہنچا دیا ہے جس کا کوئی ازالہ اس وقت ممکن نہیں ہے۔ پھر وہ جانتا تھا کہ ایک نہ ایک دن اسے اپنے ماں باپ کو یہ جرم، یہ کفر، یہ گناہ کرنے پر مجبور کرنا ہی ہوگا اور اس کے علاوہ اسے صنوبر تک پہنچنے کی اور کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ کیلاش سے بچنے کی خاطر اگر وہ اپنے باپ کے ساتھ واپس چلا جائے تو یہ اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔ کیلاش کو شک ہو چکا ہے اور آج اگر اسے وقتی طور پر مطمئن کر بھی دیا جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ طوفان، یہ آفت ہمیشہ کے لیے ٹل گئی۔ یہ پھر کسی دن سر اٹھائے گا اور ممکن ہے اس وقت اسے اپنے والدین کو آنے والی مصیبت سے بچانے کا موقع بھی نہ ملے اور وہ بے خطا پکڑے جائیں، مارے جائیں۔ اس لیے سلمان اپنی بات پر اڑا رہا اور پھر بولا۔

''مگر بابا وہ جنات جو انسانوں کے بیچ رہتے ہیں وہ بھی تو ہم میں سے ہی ہیں۔؟''

''نہیں... نہیں وہ ہم میں سے نہیں ہیں... وہ تو شیطان کے چیلے ہیں۔ راندۂ درگاہ ہیں۔ دوزخ کی ڈھاٹ ہیں

وہ۔ انھیں ہم سے مت ملاؤ بیٹا۔ نہ ان کی کوئی پہچان ہے اور نہ ہی کوئی زات یا کوئی قبیلہ ہے۔ وہ حرام کھاتے ہیں اور حرام موت ہی مارے جاتے ہیں۔ ان کا انجام بہت برا ہے میرے بچے۔ ان سے تم ہمیں کیوں ملاتے ہو۔ اور میں سمجھ نہیں پارہا کہ تم آخر ایسی باتیں کر ہی کیوں رہے ہو۔ پہلے تو تم نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ ٹھیک ہے تم فوری طور پر میرے ساتھ نہیں جاسکتے، انسانی تعلیم بھی پوری کرنا چاہتے ہو۔ اور اس میں ابھی اور کچھ وقت لگ سکتا ہے تب تک میں کیلاش سے پھر کوئی بہانہ کر کے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کروں گا لیکن جو بات تم کہہ رہے ہو، جو راستہ تم مجھے دکھانا چاہتے ہو وہ تو بغاوت کا شیطانی راستہ ہے۔ اس پر چلنے سے تو بہتر ہے کہ ہم سردار کے ہاتھوں اس کی دی ہوئی سزا کے نتیجے میں مارے جائیں۔ کم سے کم وہ موت ہماری اپنی تو ہوگی اور مرنے کے بعد ہم اپنے قبیلے میں ہی رہیں گے۔ اس طرح ابلیس اور شیطان بن کے بری آتماؤں کی طرح یہاں وہاں تو نہیں بھٹکیں گے۔'' اپنے باپ کی بات سن کر سلمان کو لگا کہ وہ اپنے باپ کو اپنی بات پر کبھی راضی نہیں کر سکے گا۔ اس لیے اس نے بحث سمیٹتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو بابا پھر آپ یہاں بیٹھیں میں ریحان استاد سے بات کر کے آتا ہوں۔ انھوں نے اگر میری مدد کی تو مجھے دو دن کی چھٹی مل سکتی ہے۔ اگر مل گئی تو میں آپ کے ساتھ جا کر کیلاش سے ملاقات کرلوں گا۔'' سلمان کی زبان سے یہ بات سن کر ابراہیم نے مارے خوشی کے اس کا منہ چوم لیا۔

''مجھے خوشی ہے میری بچے کہ میں نے تمہیں بھٹکانے والی باتوں سے بچالیا۔ خدا تمہارے ایمان کی حفاظت کرے۔'' سلمان چلا گیا اور ابراہیم وہیں گھاس پر لیٹ کر وسیع آسمان کو تکنے لگا۔ اس کا دل چند لمحے پہلے تک انجانے وسوسوں سے لرز رہا تھا اب وہ خود کو کچھ زیادہ مطمئن محسوس کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

سلمان تو اپنے باپ کے ساتھ اپنے کیلاش کو یقین دلانے کے لیے قبیلے کی طرف چلا گیا کیونکہ اسے دو دن کی چھٹی ریحان استاد کی سفارش پر دے دی گئی تھی۔ ادھر صنوبر کو ہوش آیا تو اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جو کچھ اس کی ماں درشہوار نے اسے بتایا ہے وہ صحیح کیسے ہوسکتا ہے... اسے ایسی ایک بات بھی یاد نہیں تھی جیسی باتیں اس کی ماں نے اسے بتائی تھیں۔

بہت دیر تک سوچنے کے بعد اس نے سوچا کیا وہ کسی ذہنی بیماری کا شکار ہوچکی ہے...؟ لیکن اس کا دل اس بات کو ماننے کے لیے قطعاً تیار نہیں تھا۔ وہ تو بالکل ٹھیک ہے اور اسے اپنے اندر ایسی کوئی تبدیلی بھی محسوس نہیں ہورہی کہ وہ خود کو بیمار وغیرہ سمجھے۔ لیکن ماما، پاپا اور سلمان اور سلمٰی یہ سب ایک ساتھ مل کر ایسا جھوٹ کیوں بولیں گے۔ جو اسے بیمار اور وہ بھی ایسی عجیب وغریب بیماری میں مبتلا بتانا جس کے بارے میں کوئی بھی یہ تک نہیں جانتا کہ وہ بیماری کیا ہے اور کیسے پیدا ہوئی ہے۔

اس نے سلمٰی کو فون کر کے بلوالیا اور فون پر اسے اطمینان دلایا کہ اب اسے گھبرانے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ اسے ماما نے سب کچھ بتادیا ہے۔ سلمٰی کو یہ سن کر یک گونہ تسلی ہوئی اور وہ ایک گھنٹے میں کام پر واپس آگئی۔ لیکن صنوبر اب بھی بے چین اور پریشان تھی کہ آخر یہ سب کیا ہے وہ ایسی کون سی بیماری کا شکار ہوچکی ہے جس کے بارے میں اسے کوئی ہلکا سا احساس تک نہیں ہے اور باقی اس کے آس پاس رہنے والے سب لوگ اس کی گواہی دے رہے ہیں۔ ان سب کے رویے بھی یہی ظاہر کرتے ہیں کہ کچھ نہ کچھ ایسا ہوا ضرور تھا جو انہونا اور انوکھا تھا۔

شام کو جب آصف گھر آیا تو صنوبر اس کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ اس نے باپ کو کپڑے بھی تبدیل نہیں کرنے دیے اور اس کے پاس کمرے میں جا پہنچی۔

''پاپا مجھے آپ سے کچھ بات کرنا ہے'' اس کے لہجے کی فکر مندی کو آصف نے محسوس کرلیا۔

''لگتا ہے کوئی بہت ضروری بات ہے تب ہی ہماری بیٹی اتنی عجلت میں ہے۔'' آصف نے اسے پکڑ کے اپنے

آپ سے مس کیا۔

''جی پاپا آپ کو اگر زحمت نہ ہو تو مجھے ابھی آپ کے ساتھ چلنا ہے'' صنوبر نے بلا تمہید اپنی بات کہہ دینا ہی ٹھیک سمجھا۔

''کہاں جانا ہے وہ بھی اس قدر عجلت میں؟ میں ابھی آفس سے آیا ہوں۔ ابھی تو میں نے کپڑے بھی تبدیل نہیں کیے۔ تھوڑی دیر بعد نہیں جا سکتے ہم؟'' آصف نے اس کی پریشانی کو اگنور کرنے کی کوشش کی۔

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔ باہر جانے کے لیے آپ کو بعد میں پھر تیار ہونا پڑے گا تو کیوں نہ ہم ابھی چلے چلیں۔ اس طرح تو آپ کا وقت اور بھی بچ سکتا ہے'' صنوبر بدستور اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔

''مجھے وقت کی کوئی پروا نہیں ہے۔ کوئی بھی وقت میری بیٹی سے زیادہ اہم نہیں ہو سکتا۔ مگر پتا تو چلے تم کہاں لے جانا چاہتی ہو مجھے؟'' آصف نے اسے اپنے سامنے بٹھایا۔

''میں کسی نفسیاتی ڈاکٹر کے پاس جانا چاہتی ہوں'' صنوبر نے نظریں جھکا کر بمشکل کہا۔ آصف اس کی اس بات سن کر چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔

''نفسیاتی ڈاکٹر کے پاس!''

''جی... آپ کے تو اتنے جاننے والے ڈاکٹر ہیں مجھے کسی کے پاس بھی لے چلیں پلیز'' صنوبر کے لہجے کی التجا کو محسوس کر کے آصف نے اندازہ لگالیا کہ صنوبر کو کوئی بات معلوم ہوئی ہے جس نے اسے پریشان کر دیا ہے۔

''لیکن یوں اچانک نفسیاتی ڈاکٹر کے پاس جانے کی تمہیں کیا ضرورت پیش آ گئی... کون بیمار ہے۔ تم کیا جاننا چاہتی ہو نفسیاتی ڈاکٹر سے بیٹا؟'' آصف نے ایک ہی بات میں کئی سوال کر دیے۔

''میں.... میں بیمار ہوں.... مجھے اپنے بارے میں جاننا ہے'' صنوبر کی بات نے تصدیق کر دی کہ اسے ضرور اپنی بیماری کے بارے میں پتا چل چکا ہے۔

''لیکن بیٹا یہ اچانک تمہیں کیوں ایسا لگ رہا ہے کہ تمہیں کوئی ایسی بیماری ہے جس کا تعلق نفسیاتی ڈاکٹر سے ہے۔؟'' آصف شاید یہ جاننا چاہتا تھا کہ صنوبر کو کیا پتا چلا ہے اور کس سے پتا چلا ہے۔ اسے اپنی بات کے لیے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے اس لیے وہ احتیاط سے کام لے رہا تھا۔

''مجھے ماما نے سب کچھ بتا دیا ہے میری بیماری کے بارے میں۔ پچھلے دنوں مجھ پر جو کچھ گزری میں وہ سب جان چکی ہوں'' صنوبر نے کہا۔

''اوہ.... تمہاری ماں بھی نا....'' آصف کو فوری طور پر غصہ آنے لگا جسے وہ اپنے اندر دبانے کی کوشش کرنے لگا۔

''آپ ماما پر ناراض مت ہوں۔ انہیں میں نے مجبور کر دیا تھا۔ مجھے سلمٰی نے بتایا تھا گزشتہ دنوں میرے ساتھ کیا کچھ ہوتا رہا ہے۔ اور اس میں سلمٰی کا قصور ہے نہ ہی ماما کا مجھے کبھی نہ کبھی تو یہ بات پتا چلنا ہی تھی پاپا!'' صنوبر کے لہجے میں چھپے ہوئے دکھ کو آصف نے محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''مگر بیٹا وہ وقت گزر چکا ہے اور اب تم بالکل ٹھیک ہو۔ اب کسی بھی نفسیاتی ڈاکٹر کے پاس جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''نہیں پاپا مجھے جانا ہے اگر میں نے کسی نفسیاتی ماہر سے کنسلٹ نہیں کیا تو میں سوچ سوچ کر ہی پاگل ہو جاؤں گی کہ آخر مجھے ہوا کیا تھا۔ اس لیے میرا جانا بہت ضروری ہے۔''

صنوبر نے جس لہجے میں یہ بات کہی آصف کو لگا کہ اگر اس نے صنوبر کی بات نہ مانی اور اسے مطمئن نہ کیا تو وہ اسی طرح پریشان رہے گی۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ آصف اسے نفسیاتی ماہر کے پاس لے جانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اس کی بیٹی ٹھیک ہے تو کہیں ایسا نہ ہو نفسیاتی ماہر اس کے بارے میں کوئی ایسی بات نہ کہہ دے جس سے وہ

نفسیاتی عارضے میں مبتلا ہو جائے۔ ویسے بھی نفسیاتی بیماریاں اس قدر تہہ در تہہ انسان کے دماغ میں موجود ہوتی ہیں کہ اگر وہ کسی بھی معمول کی پریشانی میں نفسیاتی ماہر کے پاس چلا جائے تو ممکن ہے اس کے دماغ میں کچھ ایسا موجود ہو جو اسے نفسیاتی بیمار ثابت کر دے اور ایسی صورت میں مریض کا خود کو نفسیاتی بیمار سمجھنے کا مطلب ہے وہ حقیقت میں کسی نہ کسی نفسیاتی بیماری کا شکار ہو چکا ہے یا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس لیے آصف نے صنوبر کو اس کے ارادے سے باز رکھنے کے لیے ایک اور کوشش کی۔

''دیکھو بیٹا صنوبر! میری بات ذرا ٹھنڈے دل سے سنو اور یہ جو اس وقت تمہاری کیفیت ہے پریشانی والی اس کا نتیجہ کچھ ایسا بھی نکل سکتا ہے جو تمہاری ساری زندگی پر اثر انداز ہو جائے۔ تم بالکل ٹھیک ہو بس اس بات نے تمہیں پریشان کیا ہوا ہے کہ گزشتہ دنوں تم کچھ عجیب و غریب بیماری کا شکار ہو چکی ہو جس کے بارے میں تمہیں خود بھی معلوم نہیں ہے۔ ایسی کیفیت میں اگر ہم نے کسی نفسیاتی ماہر سے کنسلٹ کیا تو مجھے ڈر ہے کہ وہ تم سے کوئی ایسی بات نہ کہہ دے جو تمہیں نفسیاتی بیماری میں مبتلا کر دے۔ اس وقت صرف تمہارا ذہن پریشان ہے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر ایسی ہر پریشانی میں لوگ نفسیاتی ماہر سے رجوع کرنے لگیں گے تو انہیں نفسیاتی بیماریاں لاحق ہو سکتی ہیں۔ ویسے بھی نفسیات کا علم اس قدر باریک ہے کہ کہا جاتا ہے ہر آدمی ہر وقت کسی نہ کسی نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہے۔ میں ڈاکٹر سے کنسلٹ کرنے کے خلاف نہیں ہوں مگر اس طرح لوگوں کو اگر تمہارے بارے میں یہ پتا چل گیا کہ تم نفسیاتی ڈاکٹر سے کسی عام اور معمولی بیماری کا بھی علاج کرا رہی ہو تو وہ تمہیں اس کے باوجود نفسیاتی بیمار قرار دے دیں گے جبکہ تم نہیں ہو۔''

''آپ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر میں نے کسی نفسیاتی ماہر سے رابطہ کیا تو لوگ مجھے پاگل سمجھنے لگیں گے؟'' وہ بات جو اتنی لمبی تقریر کرنے سے بھی آصف کی زبان پر نہیں آ رہی تھی اسے صنوبر نے کہہ کر ساری بات صاف کر دی۔

''تم لڑکی ہو بیٹا اور ہمارے سماج میں لڑکیوں کی پرورش بہت احتیاط اور سمجھداری سے کی جاتی ہے۔ ان کے بارے میں کوئی بھی بات جتنی تیزی سے پھیلتی اور طرح طرح کے معنی پہن لیتی ہے اس کے بعد ماں باپ کے لیے کئی طرح کی مشکلات کھڑی ہو جاتی ہیں۔ تمہاری شادی سے پہلے اگر کسی کو اس بات کی بھنک بھی پڑ گئی کہ تم نفسیاتی ماہر سے کنسلٹ کرتی رہی ہو تو سمجھو تمہاری شادی میں بہت سی رکاوٹیں آ سکتی ہیں۔''

آصف نے بھی اب کچھ زیادہ کھل کے اپنی بات کہہ دی کیونکہ اس کی غلانی باتوں کے باوجود صنوبر وہی کہہ رہی تھی جو وہ اپنے منہ سے نہیں کہنا چاہتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ شادی والی بات سن کر صنوبر کچھ دیر کے لیے چپ ہو گئی جیسے وہ سنجیدگی سے کچھ سوچ رہی ہے۔ صنوبر کو یہ جان کر حیرت ہوئی تھی کہ اس کا نہایت پڑھا لکھا اور روشن خیال باپ بھی اسی طرح سوچتا ہے جیسے مڈل کلاس کے لوگ سوچتے ہیں۔ اسے احساس ہوا کہ لڑکی کسی بھی کلاس میں ہو شادی اس کا ایک بہت بڑا ایشو ہے ایسی لڑکی سے شادی کوئی نہیں کرنا چاہتا جس کے بارے میں غلطی سے بھی یہ بات پھیلا دی گئی ہو کہ وہ پاگل رہ چکی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے سماج میں کسی بھی بیماری کے لیے نفسیاتی ڈاکٹر کے پاس جانے کا مطلب صرف ایک ہی لیا جاتا ہے کہ وہ پاگل ہے یا اس پر پاگل پن کے دورے پڑ رہے ہیں۔ صنوبر کو اپنے باپ سے بھی ایسی ہی فکر مندی کی بو محسوس ہوئی وہ چپ ہو گئی جیسے اس کے پاس کوئی اور بات کہنے کے لیے نہ رہ گئی ہو۔

اس کے دل میں یہ خیال بھی سرسرایا کہ اگر بعد میں پھر کسی وقت وہ اسی قسم کی بیماری کا شکار ہوئی جیسا کہ پچھلے دنوں رہ چکی ہے تو کیا اسے اس کے والدین اس وقت بھی نفسیاتی ڈاکٹر کے پاس لے کر نہیں جائیں گے؟ تب اسے اپنی ماں کی بات یاد آئی کہ اس کے والد اس کے علاج کے لیے اسے امریکا لے جانا چاہتے تھے تاکہ اس کا بہترین علاج ہو سکے۔ امریکا لے جا کر علاج کرانے والی بات اب اس کی سمجھ میں آ چکی تھی اس بات کا یہی مطلب تھا کہ اس کے والد یہاں اپنے ملک میں رہ کر اس کا علاج نہیں کرانا چاہتے تھے اور اس احتیاط کا اس کے علاوہ اور کوئی مطلب نہیں تھا کہ لوگوں کو اس کی نفسیاتی بیماری کی خبر نہ ہو اور وہ ٹھیک ہو کر وطن واپس لوٹے تو کوئی نہیں جان سکے کہ

وہ امریکا میں کس بیماری کا علاج کرا رہی تھی۔ صنوبر اچھی طرح اپنے باپ کی بات کو سمجھ چکی تھی اس لیے وہ آصف کے پاس سے خاموشی سے اٹھی اور ایسے چلتی ہوئی اپنے باپ کے کمرے سے نکلی جیسے اسے کوئی ہوش ہی نہ ہو کہ وہ کہاں ہے اور کہاں جا رہی ہے، جیسے پانی پر چل رہی ہو۔

راستے میں اسے درشہوار ملی اس نے حیرانی سے صنوبر کی طرف دیکھا مگر صنوبر کو جیسے اپنی ماں دکھائی ہی نہیں دی۔ وہ اپنی ہی دھن میں چلی جا رہی تھی۔ درشہوار اسے یوں دیکھ کر کافی پریشان ہوگئی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ فوری طور پر کیا کرے۔ اس لیے وہ صنوبر کو چھوڑ کر تیزی سے آصف کے کمرے میں پہنچی۔ آصف ابھی تک اسی طرح بیٹھا ہوا تھا جیسے اس پر بھی کوئی جادوگر کر کے اسے پتھر کا بنا دیا گیا ہو۔

''آصف... یہ صنوبر کو کیا ہوا؟'' درشہوار کی آواز پر وہ چونکا اور اس نے گھور کے درشہوار کو ایسے دیکھا کہ وہ ڈر گئی۔

''مجھ سے کیا پوچھتی ہو اس کی اس حالت کی ذمہ دار تم ہو تم... تم سے اتنی بات بھی چھپائی نہیں گئی اور اسے سب کچھ بتا دیا تم نے؟ تم سے مجھے کبھی کسی سمجھداری کی امید نہیں رہی۔ تم ایک دم الو کی پٹھی ہو'' آصف کو تو یوں بھی درشہوار پر گرجنے برسنے کے لیے کوئی نہ کوئی وجہ چاہیے ہوتی تھی اور یہ وجہ تو یوں بھی بہت بڑی تھی۔ درشہوار سمجھ گئی اس کا سر ندامت سے جھک گیا۔ اس نے دھیرے سے کہا۔

''میں نہیں بتانا چاہتی تھی مگر...... اس سلمیٰ کے منہ سے نکل گیا''

''سلمیٰ کون ہوتی ہے ہمارے گھر کے معاملوں میں اس طرح دخل دینے والی۔ یہ سب تمہارا ہی قصور ہے، تم نے اسے بہت سر چڑھایا ہے۔ اگر تم اسے پہلے سے منع کر دیتیں تو وہ اپنی زبان کو بند رکھ سکتی تھی مگر تمہیں اس سے یہ کہنا یاد ہی نہیں رہا ہوگا۔'' آصف نے اس بار کوشش کی کہ اس کی آواز نیچی رہے تاکہ صنوبر نہ سن سکے۔

''میں مانتی ہوں یہ میری غلطی ہے مجھے سلمیٰ کو منع کر دینا چاہیے تھا۔ آئی ایم سوری'' درشہوار نے دکھ سے کہا اسے اپنے اوپر غصہ آ رہا تھا کہ اس نے کیوں اس بات کا خیال نہیں رکھا۔ کچھ دیر تک آصف پیچ و تاب کھاتا رہا اور درشہوار خاموشی سے بیٹھی اپنے ہاتھ کی انگلیاں مروڑتی رہی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ اب ایسا کیا ہوا ہے جس پر آصف کو اتنا غصہ ہے اور صنوبر نے آصف سے کیا کہا ہے جس نے اسے اس قدر طیش دلا دیا ہے مگر وہ چاہتے ہوئے بھی اس سے یہ بات پوچھ نہیں سکی۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد آصف بولا۔

''جانتی ہو وہ میرے پاس کیوں آئی تھی۔ وہ پریشان ہو چکی ہے، یہ سب جان کر جو تم نے اسے بتایا ہے۔ اسے اس فکر نے گھیر لیا ہے کہ آخر اسے کیا ہوا تھا وہ کس نفسیاتی بیماری کا شکار ہے جس کے بارے میں اسے کچھ بھی خبر نہیں ہے اور یہی جاننے کے لیے وہ نفسیاتی ماہر سے کنسلٹ کرنا چاہتی ہے۔ وہ اتنی زیادہ پریشان ہے کہ ایک دن، ایک گھنٹہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے ابھی اور اسی وقت نفسیاتی ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہتی تھی۔ میں نے اسے اپنے طور پر اسے مطمئن کرنے کی بہت کوشش کی ہے مگر ایسا لگتا ہے مجھے اپنے مقصد میں پوری کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ اس کا ذہن الجھ چکا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ پھر کہیں اسی فیز میں نہ چلی جائے اور اس بار اس کی ذمہ دار ہوگی تم۔''

درشہوار نے خوف میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے آصف کی طرف دیکھا کوئی اور موضوع ہوتا اور آصف اسے ذمہ دار ٹھہرا رہا ہوتا تو۔ وہ کبھی اس کی بات کو ایسے چپ چاپ نہ سنتی بلکہ وہ اس کی بات کے جواب میں چار باتیں سناتی اور اسے پسپا کر کے ہی اسے چین ملتا۔ لیکن اس وقت وہ ایسے چپ تھی جیسے اس نے اپنا قصور تسلیم کر لیا ہو۔ اسے احساس ہونے لگا کہ اس کا شوہر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس کی ایک چھوٹی سی غلطی نے اس نے اپنی بیٹی کو پھر بڑی مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ درشہوار بھی وہاں سے چپ چاپ اٹھ کر نیچے چلی آئی۔ آصف کو مارے طیش کے یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ درشہوار کا رویہ ماضی کے مقابلے میں کس قدر بدل چکا تھا۔

☆......☆......☆

درشہوار صنوبر کے کمرے میں پہنچی تو وہ اپنے کمرے کی کھڑکی پاس کھڑی جانے کیا سوچ رہی تھی۔ درشہوار کو پھر

اسی خوف نے جکڑ لیا کہ صنوبر ٹھیک ہے یا وہ پھر سے اسی کیفیت میں جا چکی ہے۔اس لیے وہ دھیرے اور احتیاط سے چلتی ہوئی اس کے پاس آئی اور اس کے قریب پہنچ کر بڑے اداسی بھرے لہجے میں بولی۔

''کیا سوچ رہی ہو بیٹا؟'' صنوبر نے ایک نظر گردن گھما کر اپنی ماں کی طرف دیکھا لیکن بولی کچھ نہیں بس خاموشی سے اسی طرح لان میں برستے سناٹے کو دیکھتی رہی۔

''تم نے جواب نہیں دیا صنوبر... کیا سوچ رہی ہو؟'' درشہوار اپنے اس وسوسے کی تصدیق کرنا چاہتی تھی کہ اس وقت صنوبر کی کیفیت کیا ہے وہ ٹھیک ہے یا..... اس سے زیادہ وہ نہیں سوچ سکی۔

''سوچ رہی ہوں کہ انسان جب اپنے قابو میں نہ ہو، اسے خود پر اختیار نہ رہے تو اس کی حالت کیا ہوتی ہے... وہ کیسی کیفیت ہوتی ہے، اس سے کیسی حرکتیں اور اعمال سرزد ہوتے ہیں'' صنوبر نے ایسے کہا جیسے کسی ویران پڑے محل میں کسی روح کی سرگوشی بلند ہوئی ہو۔

''کیوں بیٹا... کیوں تم ایسی باتیں کیوں سوچ رہی ہو... مت سوچو میری جان ایسی باتیں مت سوچو... تمہیں ضرورت بھی کیا ہے۔ تم اب بالکل ٹھیک ہو... اور تمہیں ایسی باتیں سوچنے کی ضرورت ہی نہیں ہے.... چلو آؤ شاباش... میرے ساتھ آؤ ہم کھانا لگاتے ہیں اور پھر سب ساتھ میں بیٹھ کر کھانا کھائیں گے، باتیں کریں گے۔'' درشہوار کی بات سن کر صنوبر نے عجب اجنبیت کی طرح اسے دیکھا اور ایک ہلکی سی مری ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہا ''چلیں''

رات کے دس بج گئے درشہوار نے صنوبر سے ایسی بہت سی باتیں کیں جن میں اس کے لیے ڈھیروں ڈھیر تسلی اور بہت سی دلچسپی سے بھرپور باتیں تھیں۔ سلمان بھی آ گیا تھا اور آصف کا غصہ بھی تحلیل ہو چکا تھا۔ ان کی باتوں میں کچھ دیر کو وہ واقعی سب کچھ بھول گئی تھی اور جب سب اپنے اپنے کمروں میں سونے جانے لگے تو درشہوار کافی مطمئن تھی کہ اس کی بیٹی اب پوری طرح ٹھیک ہے اور اپنی پریشانی کو وہ بھول چکی ہے۔ آصف کو بھی سکون مل چکا تھا اور سلمان اسے تو ویسے بھی کوئی زیادہ فکر نہیں تھی پھر بھی جب درشہوار نے اس سے یہ کہا کہ ''کل سے وہ آٹھ بجے کے بعد کہیں نہ جائے اور درشہوار کے ساتھ رہا کرے۔'' تو اس نے بڑی خندہ پیشانی سے اپنی ماں کی بات پر سر تسلیم خم کر لیا تھا۔

پتا نہیں کیوں آصف کو ساری زندگی میں پہلی بار یہ لگنے لگا تھا کہ اس کا گھر واقعی گھر بنتا جا رہا ہے اور اس کی وجہ اس کی بیٹی صنوبر ہے۔ صنوبر بھی اندر سے خوش تھی کہ وہ جیسا چاہتی تھی اس کا گھر اب اسی طرح کا بنتا جا رہا تھا۔ سب ایک دوسرے کا خیال رکھنے لگے تھے۔ رشتے پھر سے محبتوں کے اینٹ گارے سے تعمیر کیے جانے لگے تھے اور یہ تعمیر نو اس کے گھر کو دھیرے دھیرے رہنے کے لائق بناتی جا رہی تھی۔

دس بجے کے بعد وہ اپنے کمرے میں پہنچی تو اس کی پریشانی اس کے ساتھ نہیں تھی اور وہ کسی حد تک سب کچھ فراموش کر چکی تھی پتا نہیں وقتی یا پھر..... یہ کہنا مشکل تھا۔

☆......☆......☆

سلمان ابراہیم کا ہم شکل اس وقت تو وہاں سے چلا گیا تھا مگر وہ پوری طرح غائب نہیں ہوا تھا۔ اسے سلمان کی ساری مصروفیات کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا۔ وہ یہ بھی جان چکا تھا کہ سلمان ایک انسانی جسم رکھنے والی لڑکی سے محبت کرتا ہے لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ لڑکی کہاں رہتی ہے۔ ہم شکل کو اس وقت یہی پریشانی لاحق تھی اور وہ ایک درخت سے لٹکا ہوا سوچ رہا تھا کہ اس لڑکی تک کیسے پہنچے۔ اس کا پتا کس سے معلوم کرے اس کے ارادے یقیناً خطرناک تھے اور سب سے زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ اصل سلمان کو اس بارے میں کچھ پتا نہیں تھا کیونکہ اصل سلمان اپنے باپ کے ساتھ اپنے قبیلے پہنچ چکا تھا اور اس وقت پہاڑی کی چوٹی پر بیٹھا ہوا انتظار تو کیلاش کا کر رہا تھا لیکن اس کے دل و دماغ پر صنوبر نے قبضہ کیا ہوا تھا۔ اسے صنوبر بہت یاد آ رہی تھی وہ سوچ رہا تھا کہ اس وقت صنوبر کیا کر رہی ہوگی۔ کیا سوچ رہی ہوگی......

''میں نے قاسم کو بھیجا تھا... تم آئے کیوں نہیں؟'' کیلاش نے سلمان کو پہاڑی کی چوٹی پر خاموش دیکھ کر کہا۔

''تمہارے گھر گیا تھا... ابراہیم نے کہا وہ تمہیں بلالاتا ہے۔ پر میں نے منع کر دیا سوچا تمہارے والد بڑے ہیں، تعظیم کے لائق ہیں۔ تو میں خود یہاں آ گیا تم سے ملنے'' کیلاش نے بات جاری رکھی۔ سلمان اپنی محویت سے نکل آیا اور اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

''ویسے بھی تم نے میرے والد کو کافی ڈرایا ہوا ہے۔ کچھ دھمکیاں بھی دی ہوں گی۔ آج ان کی عزت کرنے کا خیال کیسے آ گیا؟'' سلمان کے لہجے میں چھپے طنز کو کیلاش نے پہچان تو لیا مگر وہ اس کی بات کا فوری جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ اسے لگا کہ اس طرح بات اچھے اور خوشگوار ماحول میں نہیں ہو سکے گی۔ اس لیے وہ چپ رہ کر سوچنے لگا کہ اسے ماحول کو اور اپنے اور سلمان کے درمیان در آنے والی کشیدگی کو کم کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔

''یہ تم کس طرح کی باتیں کر رہے ہو سلمان۔ میں انہیں دھمکیاں کیوں دوں گا۔ دیکھو اگر انھیں میری کسی بات سے ایسا لگا ہے تو میں ان سے معافی مانگ لوں گا۔ وہ تو میرے بزرگ ہیں اور ہم جنات اپنے بزرگوں کی توہین نہیں کرتے۔ تم سمجھنے کی کوشش کرو جو کچھ میں نے ان سے کہا تھا وہ میرے عہدے کی ذمہ داری ہے اور اپنی ذمہ داری تو مجھے پوری کرنی پڑتی ہے۔ پھر بھی اگر تمہیں ایسا لگتا ہے کہ میں نے ان سے کوئی گستاخی کی ہے تو میں ان سے اور تم سے دونوں سے معافی مانگتا ہوں۔'' سلمان کو تو اپنے باپ ابراہیم کی باتوں سے ایسا معلوم ہوا تھا جیسے کیلاش کوئی بہت برا اور کینہ توز جن ہے جو بلاوجہ ہاتھ دھو کے ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے مگر اس کی باتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کوئی بہت اچھا جن ہے اور اس میں ایسی کوئی برائی نہیں ہے جس کے بارے میں سوچ سوچ کر سلمان اب تک پریشان ہوتا رہا تھا۔



''اچھا چلو اب چھوڑ دو ان باتوں کو مجھے کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ تم یہ بتاؤ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟'' سلمان نے کسی قدر اپنے چہرے پر خوشگواریت پیدا کرنے کی کوشش کی۔

''ویسے تو مجھے تم سے کوئی خاص کام نہیں تھا لیکن میری ملازمت ہی ایسی ہے مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں بستی کے ہر فرد کی پوری معلومات اپنے دفتر میں لکھ کر رکھوں کہ کون کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ سردار کا کہنا یہ ہے کہ مجلس کو کبھی بھی کسی سے کوئی بھی کام پڑ سکتا ہے اور کسی کو بھی طلب کیا جا سکتا ہے اس لیے میں تمہارے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔'' کیلاش نے نرم خوئی سے کہا۔



''وہ تو ٹھیک ہے لیکن جب تمہیں میرے والد نے یہ بتا دیا تھا کہ میں اپنے ماموں کے گھر ہوں۔ میرے ماموں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو تم نے ان پر دباؤ کیوں ڈالا کہ مجھے فوراً حاضر کیا جائے نہیں تو تم میرا نام مجلس میں پیش کر کے انھیں بتا دو گے میں غیر حاضر ہوں'' سلمان نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی کیلاش بھی اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔

''میں نے بتایا نا یہ میری ذمہ داری ہے تمہارے والد صاحب نے کئی بار پوچھنے پر بھی جب تمہیں نہیں بلایا تو مجھے شک ہوا کہ شاید وہ مجھ سے سچ نہیں بول رہے اس لیے میں نے ان سے کہا کہ ٹھیک ہے اگر سلمان یہاں نہیں آ سکتا تو میں اس کے پاس چلا جاتا ہوں۔ آپ مجھے اس کا مکمل ایڈریس دے دو'' کیلاش کے لہجہ ایسا تھا جیسے وہ اپنی مجبوری بتاتے ہوئے یہ جتانا چاہتا ہے کہ وہ ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا مگر ایسا کرنا اس کی مجبوری تھی۔

''اچھا اب اس قصے کو ختم کرو۔ اب میں آ گیا ہوں اور تم سے مل بھی لیا ہوں تو اب تمہیں کوئی شک نہیں ہونا چاہیے۔'' سلمان نے بات کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے اب تو یہیں رہو گے نا قبیلے میں؟' کیلاش کی بات سن کر سلمان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں جو تردد تھا کیلاش بھی اس کے پیچھے چھپے راز کو تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ سلمان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ فوری طور پر وہ اس کا کیا جواب دے۔ لیکن یہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ یہاں مستقل قیام کرے۔ اسے تو جلد سے جلد اپنی صنوبر کے پاس پہنچنا ہے اس لیے وہ یہ اقرار نہیں کر سکتا کہ وہ اب یہاں قبیلے میں ہی رہے گا۔ اور یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ کیلاش سے جھوٹ بولے یا چپ رہ کر اسے یہ یقین دلائے کہ وہ اب کہیں نہیں جا رہا۔ اسے تو

جانا ہے اور کیلاش اس کے جانے کے بعد اگر پھر آیا وہ گھر پہ نہ ملا تو یہ ضرور اس کے شک کو تقویت ملے گی۔ وہ سلمان کی کھوج میں بھی لگ سکتا ہے اس طرح سلمان کی زندگی میں موجود مشکلات میں اضافہ ہوسکتا ہے۔
''نہیں ایسا نہیں ہے مجھے تو کل ہی جانا ہے۔ میرے ماموں کی طبیعت پوری طرح ٹھیک نہیں ہے اس لیے مجھے جانا ہوگا۔ البتہ میں آتا جاتا رہوں گا'' سلمان نے حتمی انداز سے کہا۔ اس کے لہجے میں ایک ایسی سختی در آئی تھی جس سے وہ جان بوجھ کر کیلاش کو طیش دلانا چاہتا تھا تا کہ کیلاش کو اس کے خلاف جو کچھ بھی کرنے کا ارادہ رکھتا ہو وہ اس کے علم میں آ جائے۔
''اچھا.... یہ بات ہے۔ کیا تمہارے ماموں کی کوئی اولاد نہیں ہے جو ان کا خیال رکھ سکے؟'' کیلاش کا رویہ اب بھی مفاہمت والا تھا۔
''نہیں.... ان کی کوئی اولاد نہیں ہے'' سلمان نے دوٹوک لہجے میں کہا۔
''اچھا تو پھر ایسا کرو میں قاسم کو تمہارے ساتھ بھیج دیتا ہوں تم اسے اپنے ماموں کا گھر دکھا دو۔ جب کبھی تمہاری ضرورت پڑی تو قاسم تمہیں وہاں جا کے پیغام دے آئے گا تا کہ تم بروقت پہنچ سکو'' قاسم کیلاش کے دفتر کا ملازم تھا۔ کیلاش کی اس بات نے سلمان کو پھر ایک نئی مشکل میں ڈال دیا تھا۔ وہ اپنے ماموں کے بارے میں جو جھوٹ بول رہا تھا اس میں اس کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ ان کا گھر کیلاش یا مجلس کے کسی بھی رکن کے علم میں لایا جا سکتا ہو۔
''کیا تم میرے والد کو پیغام نہیں دے سکتے وہ مجھے فوری طور پہنچا دیں گے؟'' سلمان نے کوشش کی کہ کیلاش اس کی یہ بات مان لے تا کہ اس کے جھوٹ کا بھرم قائم رہ سکے۔
''نہیں یہ ممکن نہیں ہے۔ یہ میرے ادارے کا کام ہے کہ مجھے ہر ایک جن کے بارے میں پتا ہو کہ ہمارا کون سا رکن کہاں ہے اور کس حال میں ہے!'' ایسا لگتا تھا جیسے کیلاش سلمان کی اس بات کے بعد یہ جاننے کی دانستہ کوشش کر رہا تھا کہ سلمان کے ماموں کا گھر کہاں ہے۔ شاید اس کے دل میں پلنے والے شک نے پھر سر اٹھا لیا تھا اور سلمان کے اس طرح منع کرنے اور اپنے ماموں کا گھر نہ دکھانے والی بات کے بعد کیلاش کو یقین ہونے لگا تھا کہ سلمان اس سے جھوٹ بول رہا ہے اور یہ کوئی اور ہی چکر ہے۔ اس سوچ نے جیسے کیلاش کی دلچسپی کو ہوا دی اور وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ کچھ بھی ہو میں سلمان کے ماموں کا گھر دیکھ کر ہی رہوں گا۔ سلمان یہ بات جانتا تھا کہ اس کے باپ نے کیلاش کو اس کے ماموں کے گھر کے بارے میں کیوں بتایا تھا۔ اس کے ماموں کا گھر ایک دوسرے قبیلے میں تھا اور سلمان کے قبیلے کی مجلس کا دائرہ اختیار میں اس کے ماموں کا گھر نہیں آتا تھا ورنہ کیلاش اس سے اس کے ماموں کا گھر پوچھنے کی اتنی حجت نہ کرتا وہ خود چلا جاتا اور اسے سب سچ معلوم ہو جاتا۔
''تم شاید اپنے ماموں کا گھر مجھے یا میرے ملازم قاسم کو دکھانا نہیں چاہتے؟'' سلمان کو گہری سوچوں میں دیکھ کر کیلاش نے پھر پوچھا۔
''اصل میں تم شاید جانتے ہو کہ میرے ماموں کا تعلق ہمارے قبیلے سے نہیں ہے اور اسی لیے یہاں ہمارے قبیلے کے کسی قانون کا ان پر اور ان کے گھر پر اطلاق نہیں ہوتا۔ میں سوچ رہا تھا کہ قبیلے کی مجلس کے کسی رکن کو وہ اپنا گھر شاید دکھانا نہ چاہیں۔ ہوسکتا ہے یہ بات اچھی نہ معلوم ہو اس خیال سے میں احتیاط کرنا چاہتا تھا اور کوئی دوسری بات نہیں ہے'' سلمان نے اپنی طرف سے سمجھو بات بنا دی تھی۔
''ویسے تو جس قبیلے سے تمہارے ماموں کا تعلق ہے اس سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو تمہارے والد کو اس قبیلے کی جنی سے شادی کرنے کی اجازت کبھی نہیں ملتی۔ لیکن پھر بھی میں تمہاری بات رکھ لیتا ہوں اور آئندہ جب بھی تمہاری ضرورت پڑی تو تمہارے والد کو خبر کر دوں گا۔ وہ ہی تمہیں میرا اور مجلس کا پیغام پہنچا دیں گے۔ مجھے اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔''
سلمان نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کیلاش کچھ دیر اور بیٹھنے کے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے چلا گیا۔ سلمان کی طرح







کیلاش بھی مطمئن نہیں ہوا تھا۔ اس کے دل میں پلنے والے شک نے سلمان کے انکار کے بعد اور بھی مضبوطی پکڑنا شروع کر دی تھی۔ سلمان بھی یہ سوچ کر پریشان ہو چکا تھا کہ کئی بار ایسا ہو چکا ہے کہ وہ اپنے ہم شکل کو مدرسے میں چھوڑ کر صنوبر کے ساتھ اس کے گھر میں رہتا ہے ایسے میں اگر اس کے والد کسی ایمرجنسی میں اس سے ملنے یا اُسے لینے آئے تو کیا ہوگا۔ وہ بروقت نہیں پہنچا تو یقیناً اس کے والدین کسی ناگہانی میں پھنس سکتے ہیں۔ اس کی غیر موجودگی میں بھی اس کے والد مدرسے آئے اور اس کی جگہ انھوں نے اس کے ہم شکل کو وہاں موجود پایا تو انھیں پہچاننے میں ایک سیکنڈ کی بھی دیر نہیں لگے گی اس طرح اس کا یہ راز کہ وہ کہاں ہوتا ہے، کیا کر رہا ہے۔ ان سے چھپانا ممکن نہیں رہے گا۔

صنوبر انسان ہے اور ایک لڑکی ہے یہ جاننے کے بعد مجلس سے بھی پہلے اس کے والدین کا ری ایکشن اس کے بارے میں کیا ہوگا یہ تو وہ ہمیشہ سے جانتا ہے کہ اس کے والد پہلے اسے سمجھانے کی پوری کوشش کریں گے۔ اس کے بعد وہ یہ مقدمہ مجلس کے حوالے کر کے اس سے لاتعلقی کا اعلان کر دیں گے۔ تب تو ساری مجلس اس کی دشمن بن جائے گی اور ان کی دشمنی اسے کس قدر مہنگی پڑ سکتی ہے اس کا تو وہ اندازہ بھی نہیں لگا سکتا تھا اس لیے سلمان پوری طرح پریشان ہو چکا تھا۔ اس دنیا میں اگر کوئی اس کے خلاف نہیں ہوگا یا جس پر بھروسا اور اعتبار کیا جا سکتا ہے تو وہ اس کی ماں تھی جس نے مدرسے میں پڑھنے کے فیصلے میں بھی اس کا ساتھ دیا تھا اور اس کے باپ کے مخالفانہ ارادے کو بالآخر بدل دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ پتا نہیں اس کے اور صنوبر کے بارے میں جاننے کے بعد اس کی ماں کا ردعمل کیا ہوگا۔ کیا وہ اس بار بھی اس کا ساتھ دے سکے گی؟ یہ بات ایک سوال بن کر سلمان کے دل میں ترازو ہو گئی۔ اسے شک تھا کہ اس کی ماں اس صورت میں اس کا ساتھ نہیں دے سکے گی جب اس کے ابا ابراہیم اس سے لاتعلقی کا اعلان کر دیں گے۔ سلمان سوچتا رہا اور پریشان ہوتا رہا۔ جانے کتنا وقت گزر گیا مگر اسے ان سب پریشانیوں کا کوئی حل سجھائی نہیں دیا۔

جب کافی دیر گزر گئی اور سلمان گھر واپس نہیں گیا تو اس کا باپ ڈھونڈتا ہوا وہاں آ گیا۔ اس نے جو سلمان کو اس طرح پریشان دیکھا تو وہ سمجھ گیا کہ کیلاش کے ساتھ سلمان کی ضرور کوئی ایسی بات ہوئی ہے جس نے اسے اس قدر پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے۔

''کیا بات ہے سلمان..... کیلاش سے نے کوئی ایسی بات کی ہے جس نے تمہارے چہرے کی خوشی اور سکون چھین لیا ہے؟'' ابراہیم نے اپنے سپوت کو مخاطب کیا۔

''نہیں بابا'' سلمان نے جلدی سے مگر اطمینان بخش لہجے میں کہا ''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے میں تو یونہی کچھ سوچ رہا تھا۔''

''کیا سوچ رہے تھے میرے بچے..... کیا اپنے بابا کو نہیں بتاؤ گے؟'' ابراہیم نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو جانے کیوں سلمان بے ساختہ اپنے والد کے گلے سے لگ گیا اور ان کے جسم سے اٹھنے والی گرمی کو اپنے وجود میں جذب کرنے لگا۔ بیٹے کا اس طرح اس کے گلے لگنا ابراہیم کو بھی بہت اچھا لگا۔ پتا نہیں کب سے اس نے بھی سلمان کو ایسے گلے لگا کر پیار نہیں کیا تھا۔

''بابا پر پیار آ رہا ہے میرے بیٹے کو؟'' ابراہیم نے کہا تو سلمان کا دل چاہا کہ وہ ایک ہی سانس میں اپنی ساری پریشانی اپنے باپ کے گوش گزار کر دے۔ مگر وہ ہمت نہیں جتا پایا۔

''بابا کیا ایسا نہیں ہو سکتا آپ بھی میرے ساتھ وہاں انسانوں کی دنیا میں چل کر رہیں؟'' سلمان نے کسی ایسے جذبے کے زیر اثر یہ بات کہی جو خود اس کے اپنے اختیار میں بھی نہیں تھا۔ حسب توقع اس کے والد نے وہ ہی ردعمل کیا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے بیٹا! میں تو اب تمہیں بھی وہاں سے واپس بلانے کا سوچ رہا ہوں۔ اب تم نے کافی پڑھ لیا، اب اپنے لوگوں میں لوٹ آؤ۔ کیا تمہارا اب تک بھی پڑھ پڑھ کے دل نہیں بھرا اور پڑھنا ہے تو یہاں جو ہمارا جنات

کا مدرسہ ہے جہاں آغا صاحب درس دیتے ہیں باقی ان سے پڑھ لینا'' ابراہیم نے ہر ممکن کوشش کی کہ اس کے لہجے میں تختی کا ہلکا سا شائبہ تک نہ ہو۔

''نہیں بابا اب یہ نہیں ہوسکتا۔ مجھے انسانوں کی تعلیم ہی پوری کرنی ہے۔'' سلمان نے سوچا واضح اور دوٹوک الفاظ میں اپنا مدعا بیان کرے تاکہ اس کے باپ کو اس کے ارادوں کی کچھ نہ کچھ خبر ہوسکے۔

''ایسا لگتا ہے تمہارا انسانوں میں کچھ زیادہ ہی دل لگ گیا ہے اور اس دل لگی میں تم اپنی ماں کو بھی بھول چکے ہو جو تمہارے لیے دن رات پریشان رہتی ہے اور روتی رہتی ہے۔'' ابراہیم کو بیٹے کے جواب سے شدید مایوسی ہوئی ورنہ اس نے یہ بات اب واپس آجاؤ یونہی بلا ارادہ کہی تھی۔ شاید اس کا ابھی کہنے کا ارادہ نہیں تھا لیکن کہہ دی تو اسے توقع تھی اس کا بیٹا اس کی بات کا پاس رکھے گا اور تسلی کے لیے ہی سہی یہ ضرور کہے گا کہ بابا آپ فکر نہ کریں میں جلد لوٹ آؤں گا۔ لیکن سلمان نے ایسا کچھ نہیں کہا اس کے برعکس اس نے کم مگر فیصلہ کن انداز میں یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ مستقبل قریب میں اس کی واپسی کے کوئی امکان نہیں ہیں۔

''اچھا چھوڑو اس بات کو'' ابراہیم نے بیٹے کو پھر سے اپنے قریب کیا اور بولا ''یہ بتاؤ کیلاش کیا کہہ رہا تھا؟''

کیلاش سے ہونے والی ساری گفتگو بلا کم و کاست سلمان نے اپنے والد کے گوش گزار کردی۔ پوری بات سن کر ابراہیم کے چہرے پر فکر و تردد کی سیکڑوں لکیریں نمودار ہوگئیں۔ اسے بھی یہ لگنے لگا کہ اگر کیلاش نے اس کا پیچھا لے لیا تو سچ جاننے سے اسے کوئی روک نہیں سکے گا۔ سچ اس کے علم میں آنے کا مطلب ہے اس کے خاندان کی تباہی اسے اور اس کی بیوی کو اس سزا سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ پتا نہیں سلمان کو اس کے جرم کی کتنی کڑی سزا دی جاسکتی ہے۔ تب ہی اس کا ماتھا ٹھنکا اور اس نے سلمان کی طرف گہری گہری نظروں سے دیکھا اس کی سمجھ میں ساری بات آگئی کہ کیوں اس کا بیٹا اسے انسانوں کی دنیا میں چل کر رہنے کی صلاح دے رہا تھا۔ وہ ان سب آنے والی مصیبتوں پر غور و فکر کر چکا ہے اور اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کے والدین اور خود اس پر کیا قیامت ٹوٹ سکتی ہے۔ لیکن......!!!

ابراہیم ابھی اور سوچنا چاہتا تھا کہ اس کی بیوی بھی وہیں آگئی اور آتے ہی بولی۔

''میں نے آپ کو اپنے بیٹے کو بلانے بھیجا تھا لیکن آپ تو خود اس سے باتوں میں مصروف ہو۔ ابراہیم کیا آپ یہ بتانا چاہتے ہو کہ آپ ایک ماں سے بھی زیادہ محبت کرتے ہو۔ میں اِدھر انتظار کی آگ میں جل رہی ہوں اور اُدھر آپ ہو کہ واپس آنے کا نام ہی نہیں لے رہے.....!'' بیوی کی لمبی چوڑی تقریر سن کر ابراہیم ہنسنے لگا۔ اسے معلوم تھا اول تو سلمان کی ماں کو کبھی غصہ آتا نہیں تھا اور اگر آجاتا تو وہ اسی طرح بے تکان بولنے لگتی تھی۔

تینوں گھر آگئے اور دیر تک یونہی لایعنی سے باتیں کرتے رہے۔ اِدھر اُدھر کی اور سلمان کے بچپن کی باتیں۔ پھر سلمان اپنے کمرے کی طرف چلا گیا تو عجلت سے ابراہیم نے سلمان کی ماں سے کہا۔

''تم اگر سلمان کو انسانوں میں جانے سے روک سکتی ہو تو اچھا ہوگا۔ ایسا نہ ہوا تو ہم سب برباد ہوجائیں گے۔ باقی تفصیل میں تمہیں بعد میں بتادوں گا۔'' ابھی ابراہیم نے اتنی بات بھی پوری نہیں کی تھی کہ سلمان واپس آگیا۔

''ماں میرا ایک بربط کا ساز تھا وہ کہاں چلا گیا؟ کمرے میں تو نہیں ہے؟'' سلمان نے اپنی ماں کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تمہاری یادداشت ایسی تو نہ تھی۔ یاد نہیں تمہیں وہ تو تم نے اپنے دوست کنعان کو دے دیا تھا!'' ماں نے اسے یاد دلایا۔

''اوہ ہاں.... یاد آیا... آج میرا وہ ساز بجانے کو بہت دل چاہ رہا تھا۔ کنعان تو کسی اور علاقے میں چلا گیا تھا۔ پتا نہیں کہاں اس نے کبھی اپنی اطلاع بھی نہیں دی نہ ہی کبھی ملنے آیا!'' سلمان نے اس طرح کہا جیسے اسے کنعان کے ساتھ گزارا ہوا وقت یاد آرہا ہو۔

''جب سے آئے ہو چین سے بیٹھے ہی نہیں ہو۔ ورنہ میں تمہیں بتانے والی تھی۔ ایک ہفتہ پہلے کنعان واپس

آ گیا ہے۔ وہ مجھ سے ملنے بھی آیا تھا تمہارا پوچھ رہا تھا۔ میں نے اس سے وہ ہی کہہ دیا جو ہم سب سے کہتے ہیں۔ اس بار ویسے بھی تم دو ہفتے تک نہیں آئے۔ کافی لمبی غیر حاضری رہی تمہاری۔'' ماں نے اس کے دوست کی اطلاع دیتے ہوئے اس سے نہ آنے کا شکوہ بھی کیا۔

سلمان کو کنعان کے واپس آنے کی خوشی تو ہوئی مگر اس کی برجستہ خوشی کا احساس اس کے ہونٹوں پر آ کے دم توڑ گیا کیونکہ وہ سوچنے لگا اگر کنعان سے ملنے جاتا ہے تو اسے بھی غیر گھر سے غائب ہونے کے بارے میں بتانا ہوگا۔ پتا نہیں یہ کیا ہو رہا تھا ابھی تو اسے صنوبر کے دل میں تھوڑی سی جگہ بھی نہیں ملی تھی اور یہاں مصیبتیں تھیں کہ ایک پہ ایک آئے چلی جا رہی تھیں۔

''جاؤ اپنے دوست سے مل آؤ'' ابراہیم نے کہا تو اس کا جواب سلمان کے دینے سے پہلے ہی اس کی ماں بولی۔

''رہنے دیجئے جب سے وہ آیا ہے میرے پاس تو ٹھیک سے بیٹھا ہی نہیں۔ صبح مل لے گا۔'' ماں نے سلمان کو خود سے اور قریب کرتے ہوئے کہا۔''اب میں اپنے بیٹے سے باتیں کروں گی ڈھیر ساری باتیں۔''

''اچھا تم باتیں کرو میں ذرا دانیال سے مل کر آتا ہوں'' یہ کہہ کر ابراہیم باہر چلا گیا وہ دونوں ماں بیٹے کو جان بوجھ کر اکیلا چھوڑ کر گیا تھا تاکہ اس کی بیوی اپنے بیٹے سے اسے ہمیشہ کے لیے روکنے کی بات کر سکے۔

''اب بتاؤ میری جان تمہارا انسانوں میں اتنا دل کیسے لگ گیا کہ ماں کو ہفتوں کے لیے بھول جاتے ہو۔ میرے لیے تو ایک ہفتہ کاٹنا ہی مشکل ہوتا ہے اور تم ہو کہ اب تم نے دو ہفتوں کی غیر حاضری کرنا بھی شروع کر دی ہے۔'' ماں کے سوال پر سلمان خاموش رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ عجیب سی کشمکش اس کا جوار بھاٹا اس کے دل میں شور مچانے لگا۔ کیا کہے اور کیا نہ کہے اس کشاکش نے ایک قسم کی الجھن کی شکل اختیار کر لی۔ سلمان کی ماں مسلسل اپنے بیٹے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے بیٹے کی آنکھوں میں جو پریشانی در آئی تھی وہ صاف نظر آنے لگی۔ وہ یک لخت پریشان ہوگئی۔

''کیا بات ہے بیٹے! تمہیں میری بات نے بہت زیادہ پریشان کر دیا ہے۔ ضرور کوئی ایسی بات ہے جو تم اپنی ماں سے بھی چھپا رہے ہو۔!''

''ماں کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اور بابا میرے ساتھ وہاں چلو انسانوں میں؟'' طویل توقف کے بعد سلمان نے وہ ہی بات اپنی ماں سے بھی کہہ دی جو اس نے اپنے باپ سے کہی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کی ماں کیا ردعمل ظاہر کرتی ہے۔

''میرا بس چلے تو میں تمہیں کبھی یہاں سے جانے نہ دوں اور جو تم کہتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ انسانوں میں چلوں تو مجھے تو تمہارے لیے یہ بھی منظور ہے۔ تمہارے قریب رہنے کے لیے مجھے سب منظور ہے لیکن بیٹے!'' کہتے کہتے جیسے اس کی ماں رک سی گئی اور پھر بات بدل کر بولی۔

''مجھے وہ بات بتاؤ جس نے تمہیں اس طرح پریشان کیا ہوا ہے۔ کوئی ایسی بات ہے جو تم مجھ سے بھی کہتے ہوئے گہری گہری سوچوں میں ڈوب جاتے ہو۔''

''آپ نے اگر میرے ساتھ جانے پر تیار ہو جائیں میں تو میں آپ کو سب بتا دوں گا'' سلمان کو ماں کے جواب سے جو خوشی ملی تھی اس کے بہاؤ میں وہ یہ سب بول تو گیا مگر فوراً ہی اسے احساس ہوا کہ یہ ٹھیک نہیں ہوا۔ اس کی ماں اب اسے پوری بات جانے بغیر چین سے نہیں رہنے دے گی۔

''سب بتا دوں گا...... اس کا مطلب ہے کچھ ایسا ہے جو تم مجھ سے اور اپنے بابا دونوں سے چھپا رہے ہو؟''

''کہا نا آپ بس میرے ساتھ چلیں'' سلمان نے جیسے ضد کرنے کے سے انداز میں کہا۔

''مگر بیٹا یہ بات تمہارے بابا کبھی نہیں مانیں گے۔ ویسے بھی یہ بڑی انہونی بات ہے۔ جسے بھی معلوم ہوگی وہ ہم پر تھو تھو کرے گا کہ ہم اپنا مذہب اور قبیلہ چھوڑ کے انسانوں کی دنیا میں جا رہے ہیں۔ وہاں ہم رہیں گے کہاں

اور.....'' وہ کہتے کہتے پھر رک گئی۔ اس کی آنکھوں میں خوف عود کر آیا تھا۔
''اور کیا ماں... آپ کہتے کہتے کیوں رک گئیں؟'' سلمان کی بے چینی ہواؤں سے باتیں کرنے لگی۔
''اور یہ کہ تمہارے بابا یہ بات کسی قیمت پر نہیں مانیں گے۔ وہ مان بھی گئے تو سردار نہیں مانے گا۔ ممکن ہے اسے بغاوت سمجھا جائے اور قبیلے کی مجلس ہماری دشمن ہو جائے۔ ہمیں گرفتار کرلیا جائے اور پتا نہیں کیا کیا...... ہم برباد ہو سکتے ہیں، تباہ ہو سکتے ہیں۔ شاید ہماری گردنیں ماردی جائیں۔'' وہ سوچ سوچ کے بول رہی تھی۔ اس کی آواز میں خوف کی لرزش تھی اور یہ بات سلمان نے بھی محسوس کرلی تھی۔
''اگر ہم چپ چاپ رات کے اندھیرے میں نکلیں اور کسی کو ہمارے یہاں سے جانے کی کانوں کان خبر بھی نہ ہو تو کیا یہ ممکن نہیں ہے؟'' سلمان نے ماں کو ایک اور راستا دکھایا۔
''یہ ممکن تو ہے لیکن بیٹا یہ بہت بڑا فیصلہ ہے۔ قبیلے کی مجلس اسے بغاوت سے کم جرم قرار نہیں دے گی۔ وہ ہمیں ہمیشہ تلاش کرتے رہیں گے، چاہے ہم پاتال میں ہی کیوں نہ چلے جائیں۔ پھر اس طرح کا قدم اٹھانے کا کوئی تو جواز ہو۔ بھلا ہم ایسا کیوں کریں گے؟''
''کیوں کہ میں ایسا چاہتا ہوں ماں'' سلمان کی آواز غار کے سکوت میں ایسے ابھری جیسے کسی نے موت سے پہلے سرگوشی کی ہو۔
''وہ ہی تو میں پوچھ رہی ہوں۔ تم ایسا کیوں چاہتے ہو۔ ہم نے تمہاری ضد کی وجہ سے تمہیں وہاں پڑھنے کی اجازت دے تو دی ہے اب تم اور ایسا کیوں چاہتے ہو؟'' ماں کی تشویش بڑھتی جارہی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا بیٹا کہنا کیا چاہتا ہے۔
''وہ سب تو ٹھیک ہے ماں... آپ نے مجھے اجازت دی۔ مگر....''
سلمان کی زبان پھر رک گئی۔ اسے معلوم تھا جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے اسے سننے کے بعد اس کی ماں کو سکتہ ہوسکتا ہے۔ کوئی بھی قیامت اس گھر میں نازل ہوسکتی ہے اس لیے وہ کہتے کہتے رک گیا اور اس نے پھر سے اپنی باتوں کا رخ موڑ دیا۔
''ماں اگر میں واپس نہ آیا تو کیا تم میری جدائی سہہ لوگی؟'' سلمان کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ اس کی آواز میں جو سوز اور گداز یت تھی اسے محسوس کر کے اس کی ماں کا کلیجہ منہ کو آگیا۔
''میرے بچے ایسی بات کیوں کہتے ہو؟ تمہیں پتا ہے تمہارے بغیر تمہاری ماں جی نہیں سکے گی!'' وہ تڑپ کر سلمان سے چمٹ گئی۔
''تب ہی تو کہتا ہوں آپ میرے ساتھ چلیں، پر آپ ہیں کہ میری بات مان ہی نہیں رہیں'' سلمان باقاعدہ رو پڑا۔ ماں نے اسے روتے ہوئے دیکھا تو وہ جیسے لرز کر رہ گئی۔
''میرے بچے یہ تم رو کیوں رہے ہو۔ میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتی۔ مجھے اس طرح مت تڑپاؤ اور وہ بات بتادو جو کہنے کے لیے تمہارا دل بے چین ہے۔''
''مجھ سے کچھ مت پوچھیں ماں... کچھ مت پوچھیں... بس اتنا کریں کہ میں اگر واپس نہ آؤں تو بابا کو میرے پیچھے مت بھیجے گا۔'' سلمان کی آنکھوں میں آنسو اب بھی موجود تھے۔
سلمان کی ماں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے بیٹے کو کیا ہوتا جارہا ہے۔ وہ اس نے ہمیشہ کی جدائی کیوں مانگ رہا ہے۔ وہ کیوں واپس نہیں آنا چاہتا۔ ایسی کون سی مجبوری ہے جو اسے اپنے لوگوں اور اپنے ماں باپ تک سے دور رہنے پر مجبور کررہی ہے۔
وہ کیا بات ہے جو اندر ہی اندر اسے توڑے ڈال رہی ہے۔ مگر اس کے لبوں پر نہیں آرہی۔ پھر اسے ابراہیم کی یہ بات یاد آئی کہ سلمان کو واپس جانے سے روک سکتی ہو تو روک لو۔ نہیں تو ہم برباد ہو جائیں گے۔ بڑی تباہی آئے گی۔

اب جو اس نے ابراہیم کی باتوں پر غور کیا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ تو ابراہیم کی باتوں کو ایسے ہی سمجھی جیسے وہ سلمان کو روکنے کے لیے کچھ کہہ رہا تھا جو اتنا اہم نہیں تھا۔ مگر یہ تو ضرور کوئی ایسی بات ہے جو بہت اہم ہے وہ سلمان کو واپس جانے سے روکنا چاہتا ہے اور ایسا وہ بیٹے کے پیار سے مجبور ہو کر نہیں بلکہ اس کی زندگی کی خاطر کرنا چاہتا ہے۔

''اوہ تو میں اب سمجھی!'' بے خیالی میں اس کے منہ سے نکل گیا۔ سلمان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''اب کیا سمجھیں آپ؟'' سلمان نے پوچھنے پر اس کی ماں الجھ گئی کہ ابراہیم والی بات اسے کیسے اور کن لفظوں میں بتائے مگر اسے لگا کہ سلمان کو بتا دینا ہی ٹھیک ہوگا۔

''تمہارے بابا جانے سے پہلے مجھ سے کہہ کر گئے تھے میں تمہیں واپس جانے سے روک لوں ہمیشہ کے لیے۔ پہلے میں سمجھی کہ وہ ایسے ہی کہہ رہے ہیں جیسے ہمیشہ کہتے ہیں۔ حالانکہ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر سلمان نہ رکا تو ہم برباد ہو سکتے ہیں لیکن میں تب بھی کچھ نہیں سمجھی تھی لیکن اب تمہاری باتوں کو جاننے کے بعد میری سمجھ میں آرہا ہے کہ وہ تمہیں جانے سے کیوں روکنے چاہتے ہیں۔''

اتنا سب کہہ کر وہ چپ ہو گئی اور اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے اپنی بے چینی کو ظاہر کرنے لگی۔ پھر یکا یک اس کے پاؤں رک گئے۔

''جو بات تم مجھ سے اپنی ماں سے کہتے ہوئے ڈر رہے ہو۔ کیا وہ بات تمہارے بابا کو معلوم ہے؟'' ماں کے اس طرح اچانک پوچھے گئے سوال پر سلمان نے آنکھیں کھول کر ماں کو دیکھا اور بولا۔

''نہیں......''

''تو پھر وہ کس خوف، کس بربادی کا ذکر کر رہے تھے۔ جو تمہارے واپس جانے سے ظہور میں آسکتی ہے؟'' ماں کی الجھن میں اور اضافہ ہونے لگا یعنی ایک پریشانی کا بم بیٹے کے پاس اس کے دل میں چھپا ہوا تھا اور ایک بم اس کے شوہر کے پاس بھی تھا۔ دونوں کا تعلق تو سلمان سے ہی تھا اور سلمان اسے کچھ بھی صاف صاف نہیں بتا رہا تھا۔ آخر اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ کیسے وہ اپنے بیٹے سے اصل بات پتا کرے۔ یہی سوچ سوچ کر اس کی کشمکش اور پریشانی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔

''تو کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔ تم اپنی ماں کو نہیں بتاؤ گے کہ تمہارے دل میں کیا ہے اور وہ کون سی بات ہے جس نے تمہیں اس طرح پریشان کیا ہوا ہے؟'' سلمان کی ماں نے سوچ لیا تھا کہ اگر اب سلمان نے اسے اصل بات نہیں بتائی تو وہ اس سے ناراض ہو جائے گی پھر شاید سلمان کا دل نرم ہو جائے اور وہ اصل بات بتانے پر تیار ہو جائے۔

''میں اتنا جانتی ہوں۔ تم جو بات مجھ سے اور اپنے بابا سے چھپا رہے ہو وہ بھی ہم سب کو تباہ کرنے والی ہے اور جو تمہارے بابا کا کہنا ہے کہ اگر تمہیں جانے سے نہ روکا گیا تب بھی ہم برباد ہو جائیں گے یعنی دونوں ہی صورتوں میں تباہی ہمارا مقدر بن چکی ہے اور شاید اس سے بچنے کا کوئی راستا نہیں ہے۔'' ماں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

سلمان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا جواب دے.. اس لیے چپ رہا۔

''بس ایک ہی راستا ہے اور وہ یہ کہ تم اگر انسانوں میں نہ جاؤ تو سب کچھ پہلے کی طرح ٹھیک ہو سکتا ہے؟'' ماں اس کے چہرے کے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ ''تو کیا تم اپنی ماں اور اپنے باپ کے لیے ایسا نہیں کر سکتے کہ اپنی اس بے کار کی ضد سے باز آجاؤ؟''

''کر سکتا ہوں...... لیکن....؟''

''لیکن کیا.. کر تو سکتے ہو نا؟'' وہ چیخ ہی تو پڑی۔

''آپ کو شاید میری بات کا یقین نہیں آئے گا۔ مگر یہاں رہ کر میں زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ بہت جلد مر جاؤں گا۔ اگر آپ کو یہ منظور ہے میری موت تو ٹھیک ہے، میں نہیں جاؤں گا۔'' سلمان نے جیسے کہہ تو دیا مگر اسے ایسا لگنے لگا کہ یہ سب اس کے اختیار سے باہر ہے۔ وہ چاہے بھی تو اپنے قدموں کو اس دنیا میں جانے سے نہیں روک

سکے گا جہاں صنوبر رہتی ہے۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو بیٹے؟''

''ٹھیک کہہ رہا ہوں ماں۔ صرف آپ ہیں جو میری بات سمجھ سکتی ہیں۔'' سلمان نے ماں کے سینے پر سر رکھ دیا۔ وہ اس کے گھنے اور لمبے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگی اب وہ باقاعدہ رو رہی تھی۔

''کاش تم مجھے اپنے دل کا حال سنا سکتے میرے بچے۔ کاش تم اپنی ماں کو قابلِ اعتبار سمجھتے اور مجھ سے نہ چھپاتے۔'' وہ بے اختیار بڑبڑانے لگی۔

''دنیا میں سب سے زیادہ اعتبار میں آپ پر ہی کرتا ہوں ماں۔ آپ کو دکھ سے بچانے کے لیے میں آپ کو نہیں بتانا چاہتا تھا لیکن اب میرے لیے اس بات کو اپنے سینے میں دبائے رکھنا ممکن نہیں ہے'' وہ اپنی ماں سے الگ ہوا اور دور جا کے کھڑا ہو گیا۔

''میں ایک انسان لڑکی سے عشق کرتا ہوں.... اور اس کے بنا زندہ نہیں رہ سکتا سمجھیں تو وہ ہی میری روح ہے۔'' مسمیریزم کے انداز میں سلمان نے اپنی بات کہی تو اس کی حالت ایسی ہو گئی جیسے اس کے جسم سے روح نکل کر پرواز کر چکی ہو۔

''اس کے عشق کا زہر میری رگوں میں، میری سانسوں میں اور میرے سارے وجود میں سرایت کر چکا ہے ماں۔''

''زہرِ عشق''

سلمان کی ماں نے ایسے کہا جیسے صدیوں کی پرانی بھٹکتی ہوئی آتما کی سرگوشی گونج کے خاموش ہو گئی ہو۔

''لیکن ماں آپ یہ بات کسی کو نہیں بتائیں گی...... بابا کو بھی نہیں.....!'' ماں نے بیٹے کی طرف ایک نظر بے یقینی سے دیکھا اور وہاں سے چلی گئی۔

☆......☆......☆

صنوبر آج سارے دنوں سے زیادہ اداس تھی۔ اس اداسی کے بارے میں جاننے کی کوشش سلمان نے بھی کی تھی مگر وہ اس کا پتا نہیں چلا سکا تھا۔ اپنے پاپا کے ساتھ وہ اسکول آ تو گئی تھی مگر اسے اسکول میں طاری خاموشی ایسے لگنے لگی جیسے کسی کی موت پر سناٹا چھا جاتا ہے... ایسا آج کیا ہوا ہے..: اس کا دل کلاس میں جانے کو نہیں چاہ رہا تھا... وہ لان کی طرف آ نکلی اور وہیں ایک بینچ پر دھیرے سے ٹک گئی۔

آس پاس درختوں کی سرسراہٹ بھی جیسے رک سی گئی تھی۔ دن پوری طرح چڑھ چکا تھا لیکن یہاں اب بھی ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی ڈراؤنی رات نے سایا کیا ہوا ہے۔ اس کے دل کی دھڑکنیں ڈوبنے لگیں۔ اسے ایسا لگنے لگا جیسے اس کی سانسوں کا ردھم بگڑ رہا ہے۔ یوں اچانک اسے کیا ہوا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک تو وہ صرف اداس تھی جو وہ پچھلے کئی مہینوں سے تھی لیکن ایسی کیفیت اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کا دل چاہنے لگا وہ یہاں سے اٹھ کر بھاگ جائے۔ مگر کہاں؟ سکون کی خاطر اس نے کچھ دیر کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اسی وقت اس کے بہت قریب ایک سرگوشی ابھری....

''صنوبر..........!!!

صنوبر..........!!!

آنکھیں کھولو دیکھو میں آ گیا ہوں......!

صنوبر نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں جیسے کوئی خواب ہے جس سے اسے بڑی محبت سے جگایا جا رہا ہے۔ حیرت سے صنوبر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کے ہونٹ بھی اسی حالت میں کھلے ہوئے تھے جیسے......!!!

(ایک جن اور آدم کی محبت لیے، اسرار بھری عشق کی دنیا میں لے جانے والے سطر سطر زہرِ عشق لہو میں دوڑاتے، اس ناول کی اگلی کڑی ماہ اکتوبر میں پڑھیے)

# مسئلہ یہ ہے

## خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر/تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپرد ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ **300/=** روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے منسلک ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات تو کُپن منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)..... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)..... منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)..... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

**C-88 II۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی**

بچو! اللہ تم سب کو اپنی امان میں رکھے۔ اولاد کی خوشیاں دکھائے اور ہر ناگہانی سے محفوظ رکھے۔ میں یہاں ایک اہم بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ بچوں کے مسائل ایسے ہوتے ہیں جن کا شائع کرنا ان کے حق میں بہتر نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ بچی کہانیاں گھروں میں جاتا ہے۔ خواتین اور بچیاں پڑھتی ہیں۔ لہٰذا کسی طور بھی مناسب نہیں کہ ایسا کوئی خط شائع کیا جائے جس کا متن اخلاقی تنزلی کی نشاندہی کرتا ہو۔ لہٰذا ایسے بچے مجھے خط لکھتے وقت جوابی لفافہ ضرور ارسال کریں تاکہ براہ راست جواب دیا جاسکے۔ میں اپنے پڑھنے والوں کو نصیحت کروں گا کہ سورۂ الم نشرح، سورۂ ملک، آیت الکرسی اور الحمد شریف کا بہت ورد کیا کریں۔ جس دور میں ناگہانی اموات زیادہ ہو جائیں ایسے میں رب العزت سے خیر کی بہت دعا کرنی چاہیے۔ استغفار کی تسبیح ہر وقت کریں اور صدقہ خیرات سے ہاتھ نہ روکیں۔ صدقہ روکنے والوں کا رزق روک لیا جاتا ہے۔ اللہ ہم سب پر اپنا کرم رکھے۔ جو والدین بچیوں کی شادیوں کو لے کر پریشان ہیں جہاں رزق کی تنگی کی وجہ سے ناچاقیاں ہیں، میاں بیوی میں تعلقات کشیدہ رہتے ہیں صحت کے مسائل ہیں اللہ اپنے فضل و کرم سے سب کے لیے آسانیاں پیدا کرے اور دلوں میں ایک دوسرے کے لیے نرمی پیدا کرے۔ اللہ ہماری دعائیں اسی وقت قبول فرمائے گا جب ہمارے دل نرم ہوں گے۔ کسی کی بھی تکلیف پر جب آنکھ سے آنسو بہتے ہیں۔ تب اللہ متاثرہ شخص کی بھی تکلیف رفع فرماتا ہے اور اس پر دکھی ہونے والے کے لیے بھی آسانیاں پیدا کرتا ہے۔ اللہ ہمیں اچھا اور نیک انسان بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

☐ گل رانا۔ شہتاب گڑھ

☆ سلام بابا جی! میں نے پہلے بھی بہت بار مسئلے بھیجے مگر بے کار چلے گئے۔ میرے تین مسئلے ہیں۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ تعویذ گندے کونے والے مکان میں رہنے والی بوڑھی عورت بہت سال قبل پھینکتی تھی، جس کی وجہ سے بہت مسئلے ہوئے۔ ہر وقت گندی چیزیں، مثلاً گوبر، گندی غلاظت اور ہر وقت دھاگے تعویذ ملتے تھے۔ کیا وہ عورت اب بھی کرتی ہے؟ اس عورت کی وجہ سے مسائل کا ہمیشہ سامنا رہا۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ مکان میں ہر وقت بہت زیادہ چوہے آتے رہتے ہیں۔ کوئی حل بتایئے جو اسم مبارک۔ تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ ایک قریبی عورت ہر وقت، ہمارے خلاف چالیں اور گندے عمل کرتی ہے۔ وہ ہر وقت ہمارے لیے مصیبت کھڑی کرتی رہتی ہے۔

☆ بیٹی! اللہ سے دعا کیا کرو کہ وہ جادو کرنے والوں سے بچائے۔ سنا تھا زمانہ جاہلیت میں یہ خرافات تھیں مگر اس دور میں تقریباً ہر دوسرا شخص دوسرے کو زیر کرنے کے لیے ایسے ہی ہتھکنڈے کررہا ہے۔ تم نماز کی پابندی رکھو۔ گھر میں سورج کی روشنی کا اہتمام رکھو۔ بعد نماز عشاء ایک بار سورۂ ناس اور سورۂ فلق پڑھو اور دعا کرو۔ حسب استطاعت صدقات و خیرات ضرور کرو، کرم ہوگا۔

☐ محسن شمیم۔ راولپنڈی

☆ بیٹے محسن! تم نے نیکی کے کام میں اپنا حصہ ڈالا، اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا۔ اور تمہیں ہمیشہ

## اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: C II-88۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 35893122 - 021-35893121

پریشانیوں سے دور رکھے گا۔

□ رضوانہ یار۔ U.K

☆ بابا جی! امید ہے اچھے ہوں گے میں سچی کہانیاں کی خاموش قاری ہوں۔ مگر آپ کا کھلا خط دیکھ کر خط لکھنے پر مجبور ہوں۔ ہم اپنے وطن سے دور رہتے ہیں اسی لیے ہر دکھ پر دل بہت دکھتا ہے۔ جتنی دھوکے بازی پاکستان میں ضرورت مندوں کے نام پر ہوتی ہے شاید دنیا میں کہیں نہیں ہوتی مگر میں آپ کو اور آپ کے ادارے کو جانتی ہوں اسی لیے چاہتی ہوں آپ کے ادارے کے لیے کچھ ہدیہ کردوں۔ مجھے طریقہ بتادیں کہ کہاں رابطہ کروں۔

بیٹی رضوانہ! اللہ تمہیں بے حساب خوشیاں عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ تم سچی کہانیاں کے دفتر فون کرکے معلومات حاصل کرسکتی ہو اور کس مد میں مدد کرنا چاہتی ہو ضرور بتاؤ۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔

□ ببرک شاہ۔ **KPK**

o بابا جی! السلام علیکم! میں کافی عرصے سے آپ کا کالم پڑھ رہا ہوں۔ آپ جس طرح دکھی انسانوں کی پریشانیاں دور کرتے ہیں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ ہمیشہ اسی طرح خلق خدمت کرتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ ضرور اس کا صلہ دے گا۔ بابا جی! میں آپ کے پاس ایک مسئلہ لے کر حاضر ہوا ہوں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں ایک اسٹوڈنٹ ہوں اور 9th کلاس میں پڑھتا ہوں۔ میں پہلی کلاس سے 6th تک اول نمبر آتا رہا لیکن 7th اور 8th میں صرف پاس آیا اور اب 9th کلاس میں آ گیا ہوں۔ پتا نہیں اب مجھے کیا ہوگیا ہے کہ پڑھائی میں بالکل ہی دل نہیں لگتا؟ پتا نہیں ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ کلاس میں بھی اگر ٹیچر کچھ سمجھاتے ہیں تو دھیان کہیں اور ہوتا ہے۔ جب ٹیچر کوئی سوال کرتے ہیں تو سوائے خاموشی اور نفی کے کوئی جواب نہیں ہوتا۔ اس پر بہت شرمندگی ہے۔ بابا جی! میں چاہتا ہوں کہ میں پھر سے پڑھائی میں آگے ہوجاؤں۔ ہمارے خاندان میں صرف ایک میں ہی اسکول میں پڑھتا ہوں اور باقی سب کچھ نہ کچھ کام کرتے ہیں اور اسی لیے میں گھر پر کسی سے مدد نہیں لے سکتا۔ ہمارے گھر کے مالی حالات بھی بالکل ٹھیک ہیں ورنہ میں کام کرتا رہتا۔ جب تک میں کام کرتا تھا مجھ سے سب لوگ اچھی طرح پیار محبت سے ملتے تھے اور پھر جب میں نے کام چھوڑ دیا تو اس طرح ملتے ہیں جیسے میں کوئی بے کار شئے ہوں۔ میں کیا کروں بابا جی؟ آپ مجھے آسان سا کوئی بھی وظیفہ بتادیجیے تاکہ میں ہر امتحان میں اول نہ سہی دوسرا یا تیسرا نمبر ہی آجاؤں۔ میں آپ کو صرف دعا ہی دے سکتا ہوں بابا جی! مہربانی ہوگی میرا یہ مسئلہ حل کردیجیے۔

☆ بیٹے ببرک! اللہ تمہیں کامیابی عطا فرمائے۔ تمہارے خط سے ملتا جلتا خط شمارے میں شائع ہو رہا ہے اس کو غور سے پڑھو اور عمل کرو۔ انشاء اللہ ضرور کامیابی ہوگی۔

□ سعدیہ۔ گمبٹ

☆ بیٹی سعدیہ! تمہیں سب نے ایسا اس لیے کہا کہ قصور تمہارا نہیں ہے تم ایک بہت اچھی ماں بیوی اور بیٹی ہو مگر کیا کیا جائے اگر دوسرا شخص ذہنی اور نفسیاتی مریض ہو؟ احساسِ کمتری میں مبتلا مرد ہو یا عورت وہ زندگی میں ناسور کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں جانتا ہوں یہ کہنا بہت سہل ہے مگر بیٹی! بعض اوقات مشکل راستے پر چل کر ہی انسان کامیاب ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو گھر بچوں اور اپنی ذمے داریوں میں مشغول کرلو۔ رونا بالکل ترک کردو ہاں جب اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہو تو خوب دل کی بھڑاس آنسوؤں کی صورت میں نکال لیا کرو۔

□ نسرین رانا۔ چک جھمرہ

o محترم بابا جی! السلام علیکم! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری منگنی تو اچھے گھروں میں ہوتی ہے لیکن شادی کے قریب آکر ٹوٹ جاتی ہے۔ ایسا تین بار ہوا ہے اور اب کی بار میں بہت پریشان ہوں۔ میرا کہیں شادی کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ کچھ دن پہلے میری منگنی گجرات کے پاس ہی کسی قصبے میں ہوئی تھی۔ یہ شادی وٹے سٹے کی تھی۔ نکاح سے ایک دن پہلے رات کو میری ہونے والی بھابی کسی مرد کے ساتھ بھاگ گئی۔ اس طرح یہ منگنی ٹوٹ گئی ہے لیکن اس منگنی کے ٹوٹنے کا مجھے بہت دکھ ہے۔ اب میں کئی امیدیں لے کر آپ کے در پر حاضر ہوں۔ آپ

پلیز میری مدد کریں۔

☆ بیٹی نسرین! اللہ تعالیٰ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نماز فجر اور عصر کے بعد سورۃ احزاب آیت 33 ایک سو ایک ایک سو ایک بار پڑھو اور دعا کرو۔ اللہ تعالیٰ بڑا رحیم و کریم ہے۔ ضرور کرم ہوگا۔

□ چمن۔ شانگلہ

○ بابا جی! السلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کو پیارے حبیبؐ کے صدقے میں اس خدمت کا اجر دے اور ہماری پریشانیاں اللہ تعالیٰ عزوجل اپنے حبیبؐ کے صدقے' آپ کی دُعاؤں سے دور فرمائے۔ میں بڑی امید سے خط لکھ رہی ہوں۔ میرا مسئلہ میرے اپنے گھر کا ہے۔ بظاہر میرا خاندان خوش حال ہے مگر کچھ پریشانیاں گھیرے ہوئے ہیں۔ میری تین بیٹیاں جن میں دو بیٹیاں شادی کے قابل ہیں اور دونوں بیٹے بھی شادی کے قابل ہیں مگر دیر پر دیر ہو رہی ہے اور کاروبار بھی اتنا نہیں چلتا نہ برکت ہے کیونکہ ہر وقت گھر میں لڑائی جھگڑا رہتا ہے۔ میرے اپنے بچے تو چال چلن میں نیک ہیں اور نمازی بھی مگر مجھے میری دیورانی چین نہیں لینے دیتی ہے۔ ہر وقت لڑائی کرنے پر تلی رہتی ہے۔ میرے شوہر کے ساتھ بھی کئی مرتبہ بدتمیزی سے پیش آ چکی ہے۔ اگر میں صبر کروں تو بچے کہتے ہیں کہ آپ ڈرتی ہیں۔ میں جتنی صلح کی کوشش کروں' اس کے بچوں سے پیار کروں' ان کو کپڑے یا پیسے دوں' واپس کر دیتی ہے۔ ہماری کوئی خوشی ہو یا ہماری کوئی تعریف کرے تو شریک بھی نہیں ہوتی۔ ہم تو ذہنی طور پر بہت پریشان رہنے لگے ہیں۔ میرے خاوند کا ٹرانسفر بھی رکا ہوا ہے۔ میری چھوٹی بیٹی کے گردے میں پتھری ہے۔ برائے مہربانی میرے مسئلے حل کر کے شکریہ کا موقع دیں۔ میرا خط ضرور شامل کریں۔

☆ بیٹی چمن! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ اس معاملے کو جتنی اہمیت دو گی' اتنی تکلیف ہوگی۔ نظر انداز کرو اور اپنے گھر کے معاملات کو درست رکھو۔ کسی کی وجہ سے گھر کا ماحول خراب ہو تو وہ تمہاری کمزوری ہوگی۔ میل ملاپ کم رکھو اور نماز فجر اور عشاء کے بعد 21-21 بار سورۃ الناس پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ امینہ گل۔ کوہاٹ

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! ربِ کریم آپ پر اپنی رحمتوں کا سایہ فرمائے۔ ''سچی کہانیاں'' میں آپ لوگوں کے مسائل حل فرماتے ہیں۔ ایک مسئلہ میرا بھی ہے کہ میرے چہرے پہ کالا رداں ہے جس کی وجہ سے چہرہ خراب لگتا ہے۔ برائے کرم کوئی ایسا علاج بتائیں جس سے یہ ختم ہو جائیں اور میرے چہرے کو کوئی نقصان بھی نہ ہو۔ میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں گی۔ مارچ کے شمارے میں میرے مسئلے کا حل بتا دیں' آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔

☆ بیٹی امینہ! تمہارا مسئلہ ایسا کوئی سنگین نہیں' کسی بھی اچھے پارلر سے رابطہ کرو۔

□ نبیہ طارق۔ لاہور

☆ بیٹی نبیہ! جب تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہے تو پھر پابندی کے ساتھ وِرد کرو۔ بچوں پر الحمد شریف اور چاروں قُل پڑھ کر ضرور دَم کیا کرو اور حسب استطاعت صدقہ ضرور نکالو۔ انشاءاللہ' ضرور کرم ہوگا۔

□ شہروز۔ وزیرآباد

○ بابا جی! السلام علیکم! آپ خیریت سے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ سے دُعا گو ہیں کہ آپ کی عمر دراز کریں اور آپ کو ہر تکالیف سے بچائے۔ (آمین!) بابا جی! میں نے آپ کو 3 ماہ پہلے خط لکھا تھا جس میں آپ نے میرے لیے اور میری بہن کے لیے تعویذ بنانے کو کہا تھا اور آپ نے تفصیل مانگی تھی۔ اس سے پہلے میں نے آپ کو کئی خط لکھے اور تفصیل بھی۔ بابا جی! میری بہن کی شادی ہوئے 9 سال ہو گئے مگر ابھی تک کوئی اولاد نہیں ہوئی جس کی وجہ سے اسے اپنے سسرال میں بڑی تکلیف اٹھانی پڑ رہی ہے۔ بابا جی! نہ میری ماں ہے نہ باپ۔ میری بہن کی شادی پھوپھی کے لڑکے سے ہوئی ہے۔ میرے بڑے بھائی نے انہیں سمجھایا بھی مگر وہ ان سے لڑائی کر بیٹھے جس کی وجہ سے وہ اور بھی زیادہ تکلیف دیتا ہے۔ بابا جی! اس کا کئی جگہ علاج کروایا مگر کوئی فرق نہیں

پڑا۔ مولوی، حکیموں اور ڈاکٹروں کو بھی دکھایا۔ مولوی یہ کہتے ہیں اس پر اوپر کا سایہ ہے لیکن ڈاکٹروں نے اسے کوئی بیماری نہیں بتائی۔ بابا جی! آپ سے گزارش ہے کہ آپ اس کے لیے اچھا سا تعویذ بنا دیں۔ بابا جی! میری بہن نہ کچھ کھاتی ہے۔ اکثر سوچتی رہتی ہے جس کی وجہ سے سوکھ کر کانٹا ہوگئی ہے۔ اگر آپ اس کی یہ تکلیف دور کردیں آپ کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا۔ بابا جی! میرا مسئلہ بھی ہے کہ مجھے لاہور آئے ہوئے 7 سال ہوگئے ہیں مگر کچھ نہ بنا سکا۔ کوئی کام کرتا ہوں تو نقصان ہو جاتا ہے۔ بابا جی! آپ نے میرے لیے بھی تعویذ بنانے کو بھی کہا تھا۔ بابا جی! ایک سال پہلے میں بہت بیمار ہوگیا تھا۔ کبھی مجھے خوابوں میں عجیب وغریب چیزیں نظر آتی تھیں۔ میں نے آپ کو خط لکھا۔ میں نے اس میں تفصیل بھی لکھی تھی اور آپ نے وظیفہ دیا تھا۔

☆ بیٹے شہروز! اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ سب سے پہلے نماز کی پابندی کرو۔ بعد نمازِ عشاء ایک بار سورۃ جن ترجمے کے ساتھ پڑھو اور دعا کرو۔ بہن سے کہو سورۃ النساء آیت 89، نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 11-11 تسبیح پڑھے اور دعا کرے۔ مدت 41 دن ہے۔

☐ نغمہ۔ بھمبیر

○ محترم بابا جی! آداب! اللہ آپ کو صحت دے۔ (آمین!) محترم بابا! میں اپنا مسئلہ لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ خدا کے لیے اس کا حل بتا کر مجھے ذہنی اذیت سے نجات دلائیے۔ مسئلہ یہ ہے کہ میرے ذہن پر ایک جمود ہے میرے اندر لوگوں کا خوف ہے میں کسی کو ڈانٹ بھی نہیں سکتی ہوں میں بزدل نہیں ہوں میں حق بات کہنا چاہتی ہوں مگر وقت پر میرے ہونٹ سل جاتے ہیں میں خاموش ہو جاتی ہوں۔ میں ایک چھوٹے سے بچے کو بھی نہیں ڈانٹ سکتی ہوں۔ بابا جی! میں اندر ہی اندر کڑھتی رہتی ہوں کہ میرے اندر اس قدر برداشت کیوں ہے؟ میرا ذہن وقت پر کام نہیں کرتا ہے بعد میں معاملہ میری سمجھ میں آتا ہے۔ خدا کے لیے کوئی ایسی دعا مجھے پڑھنے کو بتائیں کہ میں حق بات کہنا چاہوں تو بلا خوف کہہ دوں۔ میں غلط بات برداشت نہ کروں فوراً غلط بات کا response دوں۔ میرے اندر لوگوں کا خوف ختم ہو جائے۔ میرے ذہن کا جمود ٹوٹ جائے میری خاموشی ختم ہو جائے۔

☆ بیٹی نغمہ! یہ بات دماغ سے نکال دو کہ یہ بدعملیات ہیں بلکہ تم میں خود اعتمادی کی بہت کمی ہے۔ لوگوں سے ملا جلا کرو اچھی کتب کا مطالعہ کرو اور رات کو سونے سے قبل 7 بار سورۃ فلق پڑھ کر اپنے اوپر دَم کرلیا کرو۔ کچھ نہ کچھ رقم ضرور خیرات کیا کرو۔ یہ عمل انسان کو بہت سی مشکلات سے بچاتا ہے۔

☐ عمرانہ۔ حاصل پور

☆ بیٹی عمرانہ! دنیا میں عزت چاہتی ہو تو نماز کی پابندی بہت ضروری ہے۔ کوئی شخص بھی کند ذہن نہیں ہوتا بس جب توجہ کم ہو تو پھر وہ بات یاد نہیں رہتی۔ جن باتوں میں تمہیں کوئی دلچسپی نہ ہو وہ بھی توجہ سے سنا کرو۔ جس کام سے بددل ہو اس کو بھی نامکمل مت چھوڑو۔ بکثرت یَاعَظِیْمُ کا ورد کیا کرو۔ رات 5-6 بادام پانی میں بھگو دیا کرو اور نہار منہ اچھی طرح چبا کر کھالو۔ یہی عمل بھتیجی کو کراؤ۔ انشاء اللہ خود فرق محسوس کرو گی۔

☐ کرن بصیر۔ اسلام آباد

☆ بیٹی کرن! نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ تمہارا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے اور وہ تم نے خود کیا ہے۔ ایک وقت میں ایک شخص ہی غصہ ور ہو تو بات سنبھلنے کی امید ہوتی ہے۔ اگر دونوں فریقین دست و گریباں رہیں تو یہ مناسب نہیں۔ ہمارے معاشرے میں بہرحال عورت کو ہی قربانی دینی پڑتی ہے۔ میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ نماز کی پابندی رکھو اور جس قدر ممکن ہو یَاحَافِظُ کا ورد کیا کرو۔

☐ حشمت۔ ٹنڈو آدم

○ محترم بابا جان! السلام علیکم! کئی سال سے میں ''سچی کہانیاں'' پڑھ رہی ہوں مگر خط لکھ نہ سکی۔ میرا پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ میری شادی کو 18 سال ہوگئے ہیں۔ پہلے میرے شوہر کریانے کی دکان کرتے تھے مگر گھریلو مسئلے کی وجہ سے وہ دکان چھوڑنا پڑی پھر وہ سرکاری محکمے میں کلرک ہوگئے۔ بابا جی! میرے پانچ بچے ہیں۔ میرا

مہینے کا آخرا تنا پریشان کن گزرتا ہے کہ بیان نہیں کر سکتی۔ دوسرا کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر کر نہیں پاتے۔ کئی رکاوٹیں حائل ہو جاتی ہیں۔ مہربانی کر کے مجھے کوئی وظیفہ بتا دیں جس سے ہماری پریشانی دور ہو جائے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میری چار لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے۔ بابا جی! میں چاہتی ہوں کہ وہ پڑھ لکھ کر کسی قابل بن جائیں لیکن ان کی پڑھائی میں دلچسپی بہت کم ہے۔ بابا جی! میں نماز پڑھتی ہوں۔ بچیاں بھی پڑھتی ہیں مگر میری فجر کی نماز اکثر قضا ہو جاتی ہے جس کا مجھے بہت ملال ہوتا ہے۔ کسی نے میرے شوہر کو نماز فجر کے بعد سورۃ رحمٰن اور عشاء کے بعد سورۃ واقعہ پڑھنا بتایا تھا' میں وہ پڑھتی ہوں۔

☆ بیٹی حشمت! اللہ تعالیٰ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ سورۃ رحمٰن پڑھنا جاری رکھو۔ بچوں پر الحمد شریف اور چاروں قل پڑھ کر ضرور دَم کر دیا کرو۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔ اللہ تعالیٰ حامی و ناصر ہو۔

□ عالیہ خان۔ ڈی جی خان

☆ بیٹی عالیہ! جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا' وہ اتنا برا ہے کہ میرے پاس الفاظ بھی نہیں۔ بہرحال بیٹی! تم معصوم ہو' بے قصور ہو' میں تمہیں یہی نصیحت کروں گا کہ اپنی صحت پر توجہ دو۔ نماز پابندی سے پڑھو۔ ہر وقت باوضو رہو۔ بیٹی! جس قدر پڑھ سکو سورۃ اخلاص پڑھو اور دُعا کرو۔ ماضی کو بھولنے کی کوشش کرو۔ جو چیز تکلیف دہ ہو اس کو یاد رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ زندگی ایک بار ہی ملتی ہے۔ اگر کسی کی وجہ سے عذاب حصے میں آتے ہیں تو تم خود خوشیاں تلاش کرو۔ ماں سے بھی کچھ مت کہو۔ بس آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔

□ رمیز۔ میرپور خاص

○ پیارے بابا جی! السلام علیکم! ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں آپ کا کالم ''مسئلہ یہ ہے'' پڑھا۔ میں آپ کو پہلی دفعہ خط لکھ رہا ہوں اس امید کے ساتھ کہ آپ میرے خط کا جواب ضرور دیں گے۔ بابا جی! میرے چار بھائی ہیں۔ میرا بڑا بھائی دس سال سے بے روزگار ہے اور اس سے چھوٹا بھائی بھی جس کی وجہ سے میرے والدین بہت زیادہ پریشان ہیں۔ بڑے بھائی کی ہم نے شادی بھی کر دی ہے مگر اس کی بیوی بھی اس کے ساتھ نہیں رہتی۔ آج کل ہمارے حالات بہت زیادہ پریشان کن ہیں۔ بڑا بھائی کچھ عرصے سے پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہے اور کبھی کبھی تہجد کی بھی نماز پڑھتا ہے اور نماز میں پوری پوری رات روتا رہتا ہے مگر پتا نہیں اللہ تعالیٰ کو کیا منظور ہے؟ بابا جی! میرے والدین چاہتے ہیں کہ وہ ہانگ کانگ چلا جائے مگر سات آٹھ مہینے ہو گئے ہیں' کوئی کام نہیں بن رہا۔ کوئی وظیفہ بتایئے کہ بڑا بھائی باہر چلا جائے اور اسے وہاں نوکری مل جائے۔

☆ بیٹے رمیز! اللہ تعالیٰ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ (آمین!) اللہ تعالیٰ اپنا کرم کب کر دے' کوئی نہیں جانتا۔ اسی طرح خوب گڑگڑا کر دُعائیں مانگو۔ جو تمہارے حق میں بہتر ہوگا' وہ ضرور ہوگا۔ بھائیوں سے کہو کہ نماز کی پابندی کریں اور والدین کی خدمت کریں اور جدوجہد جاری رکھیں۔ یہی کافی ہے۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔

□ ثناء۔ کراچی

☆ بیٹی ثناء! تمہارے مسئلے کا حل صرف تعویذ میں ہے۔ جوابی لفافہ ارسال کر کے یا ''سچی کہانیاں'' کے دفتر فون کر کے تفصیل معلوم کر لو۔

□ فرح۔ لاہور

☆ بیٹی فرح! اللہ تمہاری حاجات قبول فرمائے۔ بھائی سے کہو' باہر جانے کے لیے گھر بیچنا مناسب نہیں' ہاں' ویسے ضرور کوشش کرے۔ آگے بڑھنے میں کوئی حرج نہیں اور بیٹی! تم بھی مایوس مت ہو۔ اللہ سب بہتر کرے گا۔ نماز کی پابندی رکھو اور نمازِ فجر اور عشاء کے بعد سورۃ آلِ عمران آیت 17' 1100-1100 بار پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ خالدہ۔ کوٹ ادو

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! جب سے میری شادی ہوئی ہے' میں نے تکلیف اور پریشانی ہی دیکھی ہے۔ میرا پہلے بیٹا ہوا تھا جو کہ مر گیا اور اس کے بعد 7-6 بیٹیاں ہوئیں جن میں سے 4 زندہ ہیں۔ چار میں سے تین کی شادی ہو گئی ہے اور ایک ابھی پڑھ رہی ہے۔ اس زمانے

سے اب تک میرے شوہر نے کچھ کام کاج نہیں کیا۔ بابا جی! جوانی میں تو مجھے کچھ پتا نہیں چلا' اِدھراُدھر کام کاج کر کے گھر کی ضرورتیں پوری کرلیا کرتی تھی اور شوہر بھی مجھے مار پیٹ کر مجھ سے پیسے لے لیا کرتا تھا۔ اب بھی میرا شوہر کام نہیں کرتا ہے۔ میں پانچ سال تک اپنی بیٹی کے پاس رہی ہوں' اب اس سے علیحدہ ہوئی ہوں۔ وہ صبح گھر سے نکل جاتا ہے اور رات کو 4-3 بجے تک آتا ہے۔ گھر کا سارا سامان بک چکا ہے۔ بابا جی! میں بہت پریشان ہوں۔ کبھی سوچتی ہوں اس سے علیحدہ ہوجاؤں۔ یسین شریف میں مکمل روزانہ پڑھتی ہوں۔ آپ مجھے کوئی آسان سا وظیفہ بتائیں جو میں پڑھ سکوں۔ نماز پابندی سے پڑھتی ہوں۔ تمام عمر آپ کو دعائیں دوں گی۔

☆ بیٹی خالدہ! اب بہت دیر ہوچکی ہے' علیحدگی کا فیصلہ درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ تمہاری ذمے داریاں خوش اسلوبی سے مکمل فرمائے۔ نماز عشاء کے بعد 33 بار سورۃ اللھب پڑھو اور دعا کرو۔ کرم ہوگا۔ مدت 3 ماہ ہے۔

□ خالد۔ کراچی

o محترم بابا جی! السلام علیکم! میں آپ کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں' کم ہے کیونکہ ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد میں نے آپ سے رجوع کیا تھا اور اپنی کامیابی کے لیے وظیفہ منگوایا تھا۔ وظیفہ مکمل ہونے کے بعد ایک ماہ کے اندر اندر نہ صرف مجھے سعودیہ کا ویزہ مل گیا ہے بلکہ جس لڑکی کے ساتھ میں شادی کرنا چاہتا تھا' اس کے والدین نے بھی میرا رشتہ قبول کرلیا ہے حالانکہ وہ کھاتے پیتے لوگ ہیں اور میں ایک غریب آدمی ہوں۔ انشاء اللہ اگلے سال جب میں چھٹی پر آؤں گا تو میری شادی ہوجائے گی۔ آپ کا بہت بہت شکریہ بابا جی!

☆ بیٹے خالد! میں بار بار کہتا ہوں' میرا شکریہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس مہربان آقا کا شکر ادا کرنا ضروری ہے جو مانگنے والوں کی دُعا میں قبول کرتا ہے۔ نماز کی پابندی جاری رکھنا اور حسب توفیق خیرات بھی دیتے رہنا۔

□ صالحہ منیر۔ فیصل آباد

o السلام علیکم! محترم بابا جی! میں نے 8 تاریخ کو خط لکھا' اتنا ذہن خراب ہوگیا ہے' ٹینشن کی وجہ سے پتا بھی نہیں لکھا۔ برائے مہربانی میرے دونوں مسئلوں کے لیے کوئی تعویذ یا وظیفہ دے دیں۔ خدا کے واسطے' اپنی بیٹی سمجھ کر میرے دونوں مسئلوں کا حل بتادیں۔ ایک میرے بھائی کا ہے جو ہمارے ساتھ جانوروں کا سلوک کرتا ہے۔ دوسرا میرے خاوند کا ہے جو ہے ہی نشئی جو ہر قسم کا نشہ نہیں چھوڑتا۔ میرے دو بچے ہوگئے ہیں جن کا کوئی سہارا ہی نہیں۔ میرا بھائی شاہد فاروق جو باہر سے آ ہی نہیں رہا ہے' آپ کے وظیفے سے ٹھیک ہوگیا تھا۔ اب ویسا ہی بگڑ گیا ہے' نہ پاکستان آتا ہے اور نہ شادی کا نام لیتا ہے۔ دُعا کریں کہ وہ ہم ماں' بہن کا اچھا بھائی اور اچھا بیٹا بن جائے اور اللہ کے واسطے' شادی کرلے۔ میرے خاوند کا نشہ کر کر کے ذہن ہی خراب ہوگیا ہے۔ وہ کوئی کام بھی نہیں کرتا اور نہ میری اور بچوں کی ذمے داری اُسے قبول ہے۔ اللہ کے واسطے' اس کے حبیبؐ کے واسطے' میری مدد کریں۔

☆ بیٹی صالحہ! اللہ تمہارے حال پر رحم فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ ہر نماز کے بعد 3 تسبیح پڑھو۔ ''اَللّٰھُمَّ ھَدِی میرا شوہر'' پھر دُعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ اُم ہانی۔ سکھر

o محترم بابا جی! السلام علیکم! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری منگنی میری پھوپی کے بیٹے سے ہوئی ہے اور بھائی کی ماموں کی بیٹی سے۔ ہم دونوں اس منگنی سے خوش نہیں ہیں کیوں کہ یہ منگنی میری چھوٹی پھوپی نے ضد میں آ کر کروائی ہے۔ میں ایک دوسرے لڑکے کو پسند کرتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ میری منگنی ٹوٹتے ہی میرا رشتہ ان لوگوں کے گھر سے آئے اور رشتہ میرے گھر والے قبول کرلیں۔ آپ وظیفہ کم مدت کا دیجیے گا۔

☆ بیٹی اُم ہانی! رشتے صرف اس بنیاد پر نہیں توڑے جاتے کہ پسند نہیں ہیں۔ لڑکے کی بھی اتنی ہی عزت ہوتی ہے جتنی لڑکی کی۔ بلاوجہ کسی کو بے عزت کرنا مناسب نہیں۔ میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔

□ صبا۔ رحیم یار خان

o جناب باباجی! آداب وسلام! آپ کو یاد ہوگا کہ تقریباً تین ماہ پہلے میں نے آپ سے براہِ راست وظیفہ منگوایا تھا۔ میں اپنے شوہر کی بے راہ روی اور مار پیٹ سے عاجز آچکی تھی مگر خدا کا شکر ہے کہ اب وہ سدھر گئے ہیں۔ انہوں نے بری عادتیں چھوڑ دی ہیں۔ مار پیٹ بھی نہیں کرتے اور سب سے بڑی بات یہ کہ بچوں سے پیار کرتے ہیں اور گھر کا پورا خرچہ دیتے ہیں۔ آپ نے اطلاع دینے کو کہا تھا' سو اطلاعاً عرض کر رہی ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کارِ خیر کا نیک اجر دے۔

☆بیٹی صبا! اللہ تعالیٰ تمہیں شاد و آباد رکھے۔ بیٹی! مجھے تمہارا خط یاد ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ خودکشی کے لیے سوچنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ زندگی تو اسی ذاتِ پاک کی امانت ہے جو ساری کائنات کا مالک ہے۔ نماز کی پابندی برقرار رکھنا اور بچوں کو بھی نماز کی تلقین کرنا۔

□ ماریہ ناز۔ ایبٹ آباد

o محترم باباجی! السلام علیکم! ہم آٹھ بہن بھائی ہیں۔ والد ریٹائرڈ ہیں۔ ہم سب تعلیم یافتہ ہیں۔ دو بھائی اور دو بہنیں بڑی ہیں لیکن ہم چاروں بے روزگار ہیں۔ بہت کوشش کے باوجود کہیں نوکری نہیں ملتی اس لیے گھریلو حالات خراب ہیں اور ہر وقت لڑائی جھگڑا رہتا ہے۔ کوئی ایسا آسان وظیفہ عنایت فرمائیں کہ ہمیں اچھی پوسٹ پر نوکری مل جائے اور گھریلو حالات درست ہو جائیں۔ میری بڑی بہن کی دو سال پہلے شادی ہوئی تھی۔ شادی سے پہلے بھی لڑائی جھگڑے ہوتے رہے۔ بہنوئی جو کہ ایک فراڈ وکیل ہے اور جس نے بڑے بڑے لوگوں کو دھوکا دے رکھا ہے' اس نے جادو والا پانی پلا کر 30 ہزار روپے بھی لے لیے اور شادی بھی کر لی۔ شادی کے بعد آدھا سامان بیچ دیا اور آدھا اپنی ماں کو دے دیا۔ میری بہن کو ہمارے پاس چھوڑ کر خود کراچی چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد اس کی بیٹی ہو کر فوت ہو گئی۔ بہن کی طویل بیماری کے اخراجات بھی ہم نے خود برداشت کیے۔ اب ڈیڑھ سال سے نہ بہنوئی لینے آتا ہے نہ ہی کوئی خرچ دیتا ہے اور نہ رکھتا ہے۔ چونکہ میرے بہنوئی نے والدین کی مرضی کے بغیر شادی کی تھی اس لیے ان کے والدین کا رویہ حد سے زیادہ خراب ہے۔

☆بیٹی ماریہ! حالات اچھے اور برے انسان کی حد تک خود کرتا ہے۔ درست سمت میں کوشش کرو۔ ضروری نہیں ہے کہ نوکری ہی کرو۔ گھر بیٹھے بھی مثبت کام کر سکتی ہو۔ بچوں کو ٹیوشن دو پھر جب کوئی دوسری صورت نظر آئے تو وہاں بھی کوشش کرو۔ فیصلہ تمہاری بہن کو خود کرنا ہوگا۔ اگر وہ سمجھتی ہے کہ ساتھ رہنا ممکن نہیں تو علیحدگی اختیار کر لے۔ نماز عصر اور نماز عشا کے بعد سورۃ جن آیت 27' 99-99 بار پڑھو اور دعا کرو۔ مدت 2 ماہ ہے۔

□ ثمرین۔ باغ

o محترم باباجی! السلام علیکم! میں بہت امید لے کر آپ کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کر رہی ہوں۔ باباجی! میں بہت مشکلات کا شکار ہوں۔ ہم دو بہنیں ہیں۔ میری بڑی بہن طلاق یافتہ ہے اور میری بہن کے ساتھ یہ حادثہ صرف میرے والد کی وجہ سے ہوا ہے' وہ کوئی کام نہیں کرتے۔ اچھی صحت ہونے کے باوجود اپنے آپ کو بیمار ظاہر کرتے ہیں۔ ہر وقت امی سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ اب میری بہن ایک کمپنی میں ملازمت کرتی ہے اور ہم لوگوں کا پیٹ پالتی ہے مگر میرے باپ کو ذرا سی بھی غیرت نہیں ہے۔ سارے خاندان والے ہم پر باتیں بناتے ہیں۔ میں لوگوں کی طنز بھری نگاہوں کو برداشت کر کر کے بھی تھک گئی ہوں۔ ہر کوئی ہمیں اس بات کا طعنہ دیتا ہے کہ بہن کے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں۔ میں اس گھر کے جہنم سے نکلنا چاہتی ہوں لیکن میری شادی بھی نہیں ہو رہی۔ کوئی بھی رشتہ آتا ہے تو سب سے پہلے یہی پوچھا جاتا ہے کہ باپ کیا کرتا ہے؟ لیکن ہمارے پاس تو اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے۔ ہم لوگ اتنا جہیز بھی نہیں دے سکتے۔ کوئی ایسا کلامِ الٰہی بتائیں کہ میرا کسی شریف اور پڑھے لکھے گھرانے سے رشتہ آئے اور میری شادی ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے گا۔ شکریہ۔

☆بیٹی ثمرین! اللہ تعالیٰ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ تمہارا خط پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو وہ ضرور کرم کرے گا۔ نماز عشاء کے بعد یامتعالی کا

# قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے بابا جی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

وردکرو 11 تسبیح پھر حاجت بیان کرو۔ یہ وظیفہ 41 روز کرو۔ بہت اسباب پیدا ہوں گے۔

□ عبدالرزاق۔ سیہون

○ عزیز بابا جی! السلام علیکم! میں ایک شادی شدہ بے روزگار 28 سالہ نوجوان ہوں۔ اپنے والدین کے ساتھ رہتا ہوں۔ میرا اور میرے والد کا بھی کوئی کاروبار نہیں ہے' کاروبار ختم ہوگیا۔ اب تو سر پر قرضے کا بوجھ بھی ہے۔ آپ سے التماس ہے کہ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ خدائے بزرگ و برتر اپنی رحمت اور کرم سے روزگار یا کوئی کاروبار عطا کردے۔ اللہ تعالیٰ کے کرم سے نماز تو میں پڑھتا ہوں مگر عبادت میں دل نہیں لگتا۔ اگر آپ کسی کامل ولی اللہ کو جانتے ہوں جن کے ہاتھ پر میں بیعت کر کے اپنے اللہ تعالیٰ کو راضی کرلوں تو کسی ایسے اللہ تعالیٰ کے بندے کا پتا ضرور دیں۔

☆ بیٹے عبدالرزاق! کوئی انسان کسی دوسرے انسان پر احسان نہیں کرسکتا ہے۔ ایک دوسرے کی مدد کرنا ہی انسانیت ہے۔ پروردگار اپنے بندوں سے بہت محبت رکھتا ہے۔ تم صرف اس پاک ذات سے مدد مانگو وہ ضرور کرم کرے گا۔ نماز کی پابندی رکھو اور نماز فجر اور عشاء کے بعد سورۃ الزمر آیت 49' 71-71 بار پڑھو اور دعا کرو۔ نماز ادا کرنے سے قبل دعا کیا کرو کہ رب العزت! میری نیت صرف تیری رضا حاصل کرنا ہی ہے۔ تو میرے سجدے قبول فرما' دین اور دنیا لے کر چلنا ہی کامیابی ہے۔ وقت ضائع مت کرو اور جدوجہد جاری رکھو۔ مجھے 2 ماہ بعد مطلع کرو۔

□ ارمان علوی۔ کوئٹہ

☆ بیٹے ارمان! والدہ سے کہو کہ اس عمل کو اپنی عادت میں شامل کریں۔ جب جب یاد آئے اپنے اوپر سورۃ الناس پڑھ کر دم کرلیا کریں۔ تعداد کی قید نہیں ہے۔ والد سے کہو کہ نماز فجر کے بعد ایک بار سورۃ رحمٰن ضرور پڑھیں' یہ اتنی مبارک سورۃ ہے کہ اس کو تو ویسے بھی ہر مسلمان کو کم از کم ایک بار ضرور پڑھنا چاہیے۔ مدت 3 ماہ ہے۔ نماز کی پابندی بہت ضروری ہے۔

☆☆.....☆☆

# ہائیڈ پارک

ڈی خان

زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ، جسے قارئین کے بھیجے
گئے منتخب مراسلوں اور اقتباسات سے سجایا جاتا ہے۔

## حضرت آدم کو سجدہ

☆ حضرت آدم کو سب سے پہلے حضرت جبرائیلؑ نے سجدہ کیا۔

☆ دوسرے نمبر پر سجدہ کرنے والے حضرت میکائیلؑ ہیں۔

☆ تیسرے نمبر پر سجدہ کرنے والے حضرت اسرافیلؑ ہیں۔

☆ چوتھے نمبر پر سجدہ کرنے والے حضرت عزرائیلؑ ہیں۔

☆ پانچویں نمبر پر تمام فرشتوں نے مل کر سجدہ کیا۔

مرسلہ: رانا حبیب الرحمن۔ سینٹرل جیل لاہور

## ...

☆ اہل علم کی آزمائش اس کے کثرت علم سے نہیں ہوتی بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ فتنہ انگیزوں سے کس طرح بچنا چاہیے۔

☆ اس دنیا میں سب سے مہنگی اور قیمتی چیز آزادی ہے۔ جس کی انسان نے ہر موڑ پر اس کی پوری قیمت ادا کی ہے۔

☆ ہماری زندگی اُس پینڈولم کی مانند ہے جو کہ آنسوؤں اور قہقہوں کے مابین جھولتا ہے۔

☆ آنکھیں دنیا کے تمام عجائبات کا نظارا کرتی ہیں اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتیں۔

☆ جب تک آپ نسل انسانی کو جذبہ حب الوطنی سے نجات نہیں اس کا خواب خواب ہی رہے گا۔

☆ اگر تم بیس برس میں خوبصورت نہیں، 30 برس میں طاقتور نہیں، 40 میں دانا نہیں اور 50 برس کی عمر میں دولت مند نہیں تو کبھی خوبصورت، طاقتور، دانا اور دولت مند ہونے کی اُمید نہ کرنا۔

☆ اپنی نظر میں وسعت پیدا کرو زندگی آسان ہو جائے گی۔

مرسلہ: مسز نگہت غفار۔ کراچی

## دعاؤں میں یاد رہنے والے لوگ

کچھ لوگ لاکھ بھلانے سے بھی نہیں بھولتے وہ کون لوگ ہیں۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو ایک تو اچھے ہوتے ہیں۔ ایک بہت ہی اچھے ہوتے ہیں۔ اچھے لوگ ہمیشہ اچھائی سے پیش آتے ہیں۔

کچھ لوگ برے ہوتے ہیں اور کچھ لوگ برے ہوتے ہیں۔ بُرے لوگ ہمیشہ ہر کسی سے برائی سے پیش آتے ہیں۔ یہ دونوں لوگ نہیں بھولتے۔ اچھے لوگوں کو لوگ یاد کر کے دعا دیتے ہیں اور برے لوگوں کو یاد کر کے لوگ بد دعائیں دیتے ہیں۔ ہمیشہ اچھے بن کر رہو۔ لوگ آپ کو دعا دیں بد دعا ہر گز نہ دیں۔

حسن خیال: راشد لطیف صبرے والا۔ ملتان

## نعت رسول مقبول ﷺ

نبیؐ کا نام لینے سے ستارے جھوم اُٹھتے ہیں
سمندر رقص کرتے ہیں کنارے جھوم اُٹھتے ہیں
محمد الرسول اللہ کو بس اک بار کہنے سے
سماں بھی مہک جاتا ہے نظارے جھوم اُٹھتے ہیں
بلالؓ سوز میں جب بھی کوئی احمدؐ پکارے تو

ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ پیارے جھوم اُٹھتے ہیں
مدینہ پاک کی گلیوں کا جب بھی ذکر آتا ہے
تو دل تب ہی تمہارے اور ہمارے جھوم اُٹھتے ہیں
کبھی یٰسین، کبھی طٰہٰ کہا قرآن میں رب نے
ثنائے مصطفیٰ میں تو سپارے جھوم اُٹھتے ہیں
دعائے محسنِ انسانیت کا مان ہے ہر دَم
کبھی تو ہم سے بھی عصیاں کے مارے جھوم اُٹھتے ہیں
نبیؐ کی نعت لکھنے کا یہ عاکف تم صلہ دیکھو
جو پڑھتے اور سنتے ہیں وہ سارے جھوم اُٹھتے ہیں

شاعر: عاکف عثمان عاکف۔ اوکاڑہ

## تم میری ہو

جب سے یہ نظر میری تجھ سے ملی
میرے دل نے یہ بات مجھ سے کہی
تھی جس کی تلاش میں تُو صدیوں سے
ہاں وہی چیز لگی ہے میرے دل کو بھلی
تیرے آنے سے یہ سونا سا آنگن میرا
ہو گئی اس کی بھی وادی ہری
تجھے آئے گا جس لمحے میرا خیال
وہ لمحہ ہوگا میرے لیے اک قیمتی گھڑی
نہیں معلوم تیرا ساتھ ملے گا یا نہیں
زندگی ہے میری دوراہے پہ کھڑی
تجھے ملنے کی آس رہتی ہے دل میں
نہ جانے کب مہرباں ہوگی وہ گھڑی
یہ سوچ کر رکھا ہے دل پہ قابو
میرا اظہار ہی نہ بن جائے رسوائی تیری
ساتھ چاہتی ہوں تیرا عمر بھر کے لیے
ادھوری ہے بن تیرے ہر خوشی میری
ادھوری ہے تیرے بن یہ زندگی میری

شاعرہ: عاصمہ کوثر۔ چیچہ وطنی

## ہم

ہم صرف اس وقت خوش رہ سکتے ہیں جب ہم مقدر پر شاکر ہو جائیں اور آگے کے لیے بہترین راہ اور وسیلے ڈھونڈیں۔ دوسروں کی ناطیوں کو نظر انداز کرنے کی طاقت پیدا کرلیں۔ جب ہم خوشیوں کو باہر نہیں اپنے اندر کھوج لیں۔ جب ہم حوصلہ پیدا کرلیں دوسروں کو خوش رکھنے کا۔ جب ہم دوسروں کے ہونٹوں پر ہنسی سجائیں گے تو آنسو خودبخود ہماری آنکھوں کا راستہ بھول جائیں گے۔

حسنِ خیال: یاسمین اقبال۔ سنگھ پورہ، لاہور

## احمقانہ سوال

ایک مقدمے میں جرح کے دوران وکیل صفائی نے گواہ سے پوچھا۔

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ تم مقام واردات سے کتنے فاصلے پر تھے؟''

گواہ نے جواب دیا..... ''جی ہاں جناب! میں مقام واردات سے تین میٹر، پندرہ اعشاریہ سات سینٹی میٹر کے فاصلے پر تھا۔''

وکیل نے حیرت سے پوچھا۔ ''لیکن تم نے اس قدر صحیح اندازہ کیسے قائم کیا؟''

گواہ بولا۔ ''مجھے معلوم تھا کہ کوئی نہ کوئی بے وقوف مجھ سے اس قسم کا احمقانہ سوال ضرور کرے گا، اس لیے میں نے پہلے ہی ناپ لیا تھا۔''

مرسلہ: کاشف عبید کاوش۔ بٹہ موری، بٹ گرام

## ہجرت

چڑیا نے گھر باندھ لیے ہیں
پیروں میں پر باندھ لیے ہیں
کیسے اڑ اڑ جائے رے چڑیا
ہجرت کیوں کر پائے رے چڑیا

شاعر: علی حسنین تابش۔ چشتیاں

## نیکی

نیکی کا مفہوم یہ ہے کہ ہر کام کا مقصد نیک ہو۔ صرف خدا کو یاد کرنا نیکی نہیں اس کے بتائے ہوئے راستوں پر مسلسل چلتے جانا نیکی ہے۔ نیکی وہ ہے جو ہر ذی نفس کے ساتھ کی جائے۔ حاجت روائی سب سے بڑی نیکی ہے۔ نیک لوگ وہ ہوتے ہیں جو نیکی کرتے ہیں۔ وہ لوگ نہیں ہوتے جو نماز، روزہ اور حج

تو بجالاتے ہیں مگر سچ کے موقع پر سچ نہیں بولتے اور جھوٹے اور مکار کا ساتھ دیتے ہیں۔ منشیات فروش اور جوا باز کی حمایت کرتے ہیں۔ زناکار سے دوستی بناتے ہیں اور قاتل کے یار، غاصب سے دوستی رکھتے ہیں۔ خدا کے حکم کو ماننا اور اُس پر عمل کرنا نیکی ہے صرف عمارتوں کا رنگ اور عباؤں، قباؤں کے سائز نیکی کی ضمانت نہیں دے سکتے۔ ماتھے پر سجدوں کے نشان نیکی کی سند نہیں۔ مخلوق خدا سے محبت اور ان کی خدمت ہے۔ انتشار پھیلانے والا فرقہ واریت کا حامی اور دہشتگردوں کی حمایت کرنے والا کبھی نیک نہیں ہو سکتا۔ نیکی وہ ہے جو آپ کو نیک بنادے۔

(قلب حسین وڑائچ کی کتاب آوازِ نفس، سے
ممتاز احمد۔ سرگودھا کا انتخاب)

## سچی بات

اگر کوئی آپ کو دیکھ کر دروازہ بند کردے تو تو یاد رکھو۔ کنڈی دونوں طرف ہوتی ہے۔ تم دوسری طرف سے لگا کر بھاگ جاؤ۔

مرسلہ: ارم خان۔ ڈی جی خان

## [illegible] رکھا کر

تم تو ہو حسن کا بے مثال پیکر
تو اپنے چہرے پر نقاب رکھا کر۔
میرے لیے جو جاگ کر گزاری تھی۔
یاد سے ان راتوں کا حساب رکھا کر
جب خدا نے چاہا ہم مل جائیں گے
تو اس طرح نہ دل کو بے تاب رکھا کر
بکھری زلفیں، روتی آنکھیں، کپکپاتے ہونٹ
تو اس طرح نہ اپنی حالت خراب رکھا کر
اگر کچھ پڑھنے کا شوق ہے جاناں
اپنے پاس عامر جٹ کی کتاب رکھا کر

شاعر: ایم وکیل عامر جٹ۔ ساہیوال

## [illegible]

اُف کچھ مت پوچھیں کیا حالت ہوئی۔ میٹرو بس.....اور یہ تو ہونا ہی تھا۔ بہت شوق جو تھا میٹرو بس میں بیٹھنے کا سو بیٹھ گئے یہ سوچ کر کہ بیس روپے میں سفر کریں گے مگر جو ہم پہ گزر گئی وہ ہم جانتے ہیں۔

پہلے تو دس ہزار سیڑھیاں چڑھنا پڑیں پھر کہیں جا کر میٹرو بس کے دیدار ہوئے۔ چمکتے سرخ رنگ میں یہ بس کچھ الگ ہی دکھ رہی تھی۔ اچانک سے ایک شیشے کا دروازہ کھلا اور ہم میٹرو کے اندر۔ اُف مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہمیں لیے آگے بڑھی۔

سانس لینا محال تھا اتنا رش تھا۔ ترسے ہوئے پاکستانی سب سوار تھے اس بس میں۔ اور جب ہمارا اسٹاپ آیا تو ہم اپنے ہینڈ بیگ سے جدا ہو چکے تھے۔ بال بکھر کر کاندھوں پر اٹھکیلیاں کر رہے تھے مطلب حسین ترین پونی غائب خیر ایک تو رحم دل خاتون نے ہمارا ہینڈ بیگ واپس کر کے شکریہ کا موقع دیا۔ ہونٹوں پر بس یہ ایک ہی بات تھی۔ ''بڑے بے آبرو ہو کر تیسرے کوچے سے ہم نکلے۔''

مرسلہ: عظمیٰ شکور۔ اسلام آباد

## دلہن کے لیے قیمتی باتیں

☆ پہلے پانچ سال شوہر کے نام کردیں۔
☆ شوہر کا گھر واپسی پر استقبال کریں۔
☆ شوہر کو ماں باپ سے دور نہ کریں۔
☆ شوہر کی کمائی کو نصیب سمجھ کر قبول کریں۔
☆ میکے جانے کا شوہر کی رضامندی سے وقت اور دن مقرر کرلیں۔
☆ دوسری عورتوں سے اپنا موازنہ ہرگز نہ کریں۔
☆ اپنے مسائل میکے میں بیان نہ کریں۔

حسن بیان: انعم شہزادی۔ گجرات

## ذرا مسکرائیے

☆ بیوی: تم اتنی دیر سے بچے کو بھی چپ نہیں کروا سکے۔
شوہر کہتا ہے کہ گدھے پر سواری کروں گا۔ اب یہ ضد میں کہاں سے پوری کروں۔''
بیوی: ''بولی کمال ہے تمہاری پیٹھ پر بیٹھنے کو کہتا ہے۔ بٹھالو ناں۔''

☆......☆......☆

☆ ایک صاحب کی شادی ہوئی۔رات کو انہوں نے اپنی دلہن کو دیکھا جو میک اپ کی وجہ سے بڑی حسین معلوم ہورہی تھی۔رات کے کسی پہر دلہن چہرہ دھو کر سوگئی۔صبح شوہر اٹھے تو اپنی بیوی کو دیکھ کر بولے۔"...... بیٹے اپنی لڑکی کو بھیج دیجیے۔"

☆......☆......☆

☆ ایک شوہر نے باتوں باتوں میں اپنی بیوی سے کہا۔تم بے حد خوبصورت ہو۔لیکن اتنی عقل سے کوری ہو۔پتانہیں ایسا کیوں ہے؟

بیوی نے کہا۔"وجہ صاف ظاہر ہے کہ خدا نے مجھے خوبصورتی اس لیے دی ہے کہ تم مجھ سے شادی کر سکو اور عقل سے کورا اس لیے رکھا ہے کہ میں تم سے شادی کرسکوں۔"

مرسلہ:عبدالقیوم خان۔میر پور خاص

## میرے احباب

میرے احباب اداکار بنے پھرتے ہیں
چہرے پر محبت کا نقاب لیے پھرتے ہیں
اپنائیت کا جعلی کاروبار کرتے ہیں
مگر پیٹھ پیچھے کاری وار کرتے ہیں
غرض کا ہے یہاں بازار گرم
پھر ایک نئے مقصد کے لیے چال چلتے ہیں
خلوص کا نقاب کر کے فریب کا وار کرتے ہیں
لہجے کو ہمدرد بنا کر طنز کے وار کرتے ہیں
دلوں سے کھیل کھیلتے ہیں
میرے احباب اداکار بنے پھرتے ہیں

شاعرہ:فرح انیس۔کراچی

## سیاچن

سیاچن دنیا کا سب سے بلند وبالا برفانی میدان جنگ ہے۔جہاں ہر چیز آناً فاناً جم جاتی ہے۔سیاچن کی برفیلی زمین اور انتہائی سرد ہوائیں پاکستانی اور بھارتی فوجیوں کی سب سے بڑی دشمن ہیں۔قارئین یہ جان کر حیران ہوں گے کہ تقریباً 90 فیصد فوجی میدان جنگ میں نہیں بلکہ شدید سردی اور بے رحم سردی کے ہاتھوں لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔آپ وہاں پیاز نہیں کاٹ سکتے۔کیونکہ اس کے اندر پانی جم جاتا ہے۔انڈے اس طرح جم جاتے ہیں جیسے وہ سمندری پتھر ہوں، "ٹوتھ پیسٹ" جم کر فولاد بن جاتے ہیں اور اس طرح خوردونوش کی بیسیوں اشیاء بھی۔البتہ Kerosine (مٹی کا تیل) اور شراب نہیں جمتے!

بھارت اور پاکستان کو اس غیر آباد، ویران اور برف سے ڈھکے ہوئے میدان جنگ پر فوجیوں کی دیکھ بھال اور خوردونوش کے لیے کروڑوں روپے روزانہ خرچ کرنے پڑتے ہیں۔

مرسلہ:ریاض حسین تبسم چوہان۔فیصل آباد

## نظر کرم

اگر نظر کرم ہو تو میرا اک کام کر دینا
تم اپنے دل کا سرمایہ ہمارے نام کر دینا
میں تم سے پیار کرتی ہوں، یہ اب اقرار کرتی ہوں
ضرورت گر پڑی مجھ کو تو میں کچھ اور مانگوں گی
نہ رب سے جان مانگوں گی، نہ کچھ پہچان مانگوں گی
مری بس یہ گزارش ہے تمہارا ساتھ مانگوں گی
اگر ناراض کردو گے میں تم سے روٹھ جاؤں گی
کہ میں اک خاص لڑکی ہوں بہت حساس لڑکی ہوں
مرا دل ٹوٹ جائے گا، کبھی جڑنے نہ پائے گا
اگر تم مان جاؤ گے، خوشی سے جھوم جاؤں گی
گلے میں ڈال کر بانہیں تمہیں اپنا بناؤں گی
اگر نظر کرم ہو تو مرا یہ کام کردینا

شاعرہ:فریدہ جاوید فری۔لاہور

## اہم کام

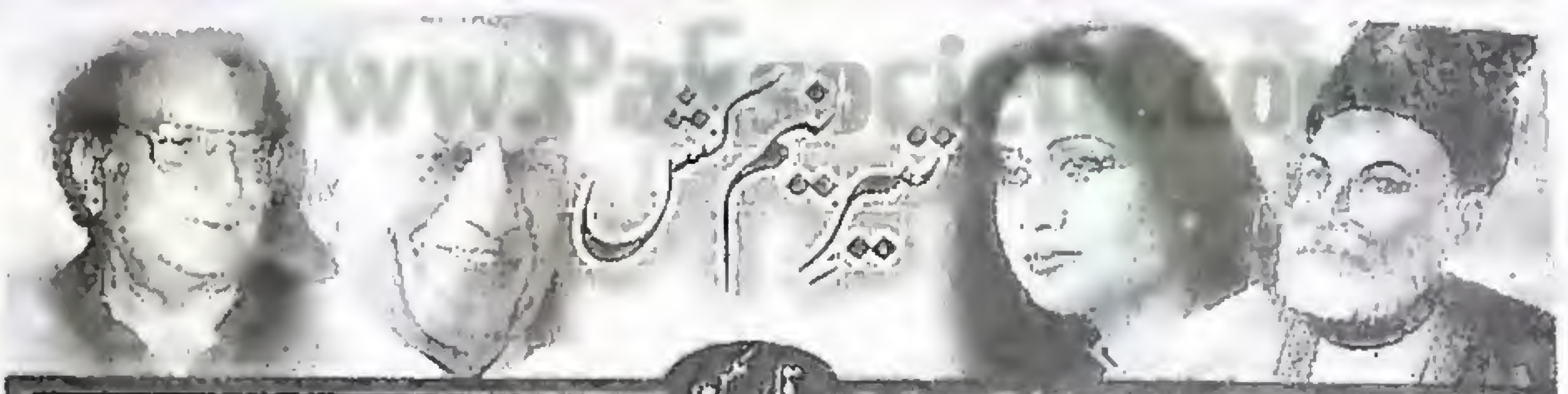
ایک سیاسی لیڈر جلسے میں تقریر کر رہے تھے۔وقفہ وقفہ سے ان کی پارٹی کا ایک کارکن ٹین کا ڈبہ زور زور سے پیٹنے لگتا۔

آخر تنگ آ کر لیڈر نے اُسے ڈانٹ پلائی۔

"بدتمیز...... یہ کیا حرکت ہے؟"

کارکن بولا۔"شاید آپ غور نہیں کر رہے، سارا مجمع اونگھ رہا ہے اور میں انہیں مسلسل جگائے رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

مرسلہ:محمد جواد۔اسلام آباد



قارئین

اپنی سخن فہمی کو آزمایئے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یاد رہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں
نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

انعام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک سچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا۔



اشفاق شاہین۔ کراچی

رفتہ رفتہ میرے ہاتھوں سے لکیریں اڑ گئیں
قسمتوں کے بھید مٹی میں بھی پوشیدہ نہ تھے

ملائکہ حریم۔ اوکاڑہ

درِ زنداں پہ دستک! آہستہ میری جان
دیوانے سو رہے ہیں شب غم گزار کر

منشی محمد عزیز میئے۔ لڈن ضلع وہاڑی

اس نے جب پلکوں کو جنبش دی عدم
رائیگاں سب گفتگو کے فن گئے

فرح انیس۔ کراچی

دل ہے یا شہر خموشاں
جب دیکھو ویران پڑا رہتا ہے

عبدالقیوم۔ آدم ٹاؤن میرپور خاص

کچھ نہیں مانگتا شاہوں سے یہ گدا تیرا
اس کی دولت ہے فقط نقشِ کفِ پا تیرا

مسز نگہت غفار۔ کراچی

حدِ ادراک سے آگے تھی تیرے قرب کی شام
ڈھونڈنے تجھ کو کہاں چاند ستارے جاتے تجھ سے
منسوب ہوئے ہیں تو یہ حسرت ہی رہی
ہم کبھی اپنے حوالے سے پکارے جاتے

یاسمین اقبال سنگھ پورہ۔ لاہور

دشمن ہے دل میں رہتا ہے جان کی طرح
اس اتر گیا ہے سرطان کی طرح

نزاہت افشاں۔ مہورہ، فتح جنگ، لاہور

میرے نصیب میں بنجر زمیں کی رکھوالی
کنویں اُداس میرے، کھیت بے ثمر میرے

ماہین فاطمہ۔ اوکاڑہ

لذت آوارگی بھی اس قدر محتاط تھی
گھر کی ویرانی کو پہلے باخبر کرنا پڑا
ہائے وہ لمحہ کہ جس میں اُس سے ملنا تھا سلیم
ہم کو وہ لمحہ بھی اب وقفِ ہنر کرنا پڑا

ثمینہ ناز۔ اورنگی کراچی

دل کے رونے کا انداز نرالا دیکھا
آنکھ ہے خشک مگر دل میں چھالا دیکھا
صبح ہونے کو تو ہوتی ہے مگر پھر کیوں
اپنے گھر میں ہے اندھیرا، نہ اجالا دیکھا

سدرہ انور علی۔ جھنگ صدر

سنو! کیسے پڑھتے ہیں جنازہ ان کا؟؟
وہ خواب جو سینے میں مر جاتے ہیں

عظمیٰ شکور۔ اسلام آباد

کس لیے جیتے ہیں ہم، کس کے لیے جیتے ہیں
بارہا اپنے سوالات پہ رونا آیا

ممتاز احمد۔ سرگودھا

چین راتوں کو راحت نہیں ہے
بے مجھے پھر بھی اس سے شکایت نہیں ہے

میں حق اپنا اس پر جتاؤں تو کیسے
وہ چاہت ہے میری وراثت نہیں ہے

ارم خان۔ڈی جی خان

توڑنا ہے تو میرے خوابوں کو کچھ اس طرح توڑ اے تقدیر
کہ پھر میری آنکھیں کبھی خواب دیکھنے کا عذاب نہ دیکھیں

پری زاد جہاں۔سیالکوٹ

بازار دل اِک عجیب شے ہے
کبھی تو رہ جائے!
اور کبھی سرِعام بک جائے گے

اشعر عتیق۔کراچی

تیرے خیال تیری آرزو کے بعد
ٹھہر نہ سکا نگاہوں میں کوئی بھی عالم

تسنیم ندیم۔گجرات

الٹے الٹے مطالبات نہ کر
زندگی اس قدر رئیس نہیں۔

شمائلہ اختر۔لاہور

خدا نصیب کرے ان کو دائمی خوشیاں
عدم وہ لوگ ہیں جو ہم کو اُداس رکھتے ہیں

بشریٰ۔لاہور

ناموں کا اک ہجوم سہی میرے آس پاس
دل ایک نام سن کے دھڑکتا ضرور ہے

نوشین امجد۔لاہور

ہائے وہ اشک جنہیں حسن کی خودداری نے
مسکراتی ہوئی آنکھوں میں چھپا رکھا ہے

منیبہ منیر۔اوکاڑہ

غنیمت ہے اس دور ہوس میں
ترا آنا بہت دشوار بھی ہے

کرن شہزادی۔راولپنڈی

بات ہی اول تو وہ کرتا نہیں مجھ سے کبھی
اور جو بولے ہے کچھ منہ سے تو شرمایا ہوا

صبیحہ امتیاز۔سیالکوٹ

ہجر کے صحرا میں یہ دامن نہیں ملے گا پھر
رُک رہی ہے کیوں؟ برس لے چشم دریا آشنا

سردر خان۔کشمیر

طلب میں ہم سفری کی لگن کہاں پھر بھی
پکار لیں گے اگر کوئی آس پاس ہوا

زبیدہ اکرم۔شہداد کوٹ

میں روتا رہا اور بہاروں کے رنگ
نکھرتے گئے اور دن گزرتے گئے

کاشف عبید کاوش۔بٹہ موڑی بٹ گرام

ہم خوشبو کے سوداگر ہیں، سودا سچا کرتے ہیں
جو گاہک پھولوں جیسا ہو ہم بن داموں بک جاتے ہیں
شہر دفا کے لوگو تم حال بھلا کیا جانو گے
ہم دل کی چوٹ چھپاتے ہیں، آنسو تک پی جاتے ہیں

نگین خلیل۔ملتان

پہنچا ترے مکان پہ دستک دے نہ سکا
خواہش، کسی اصول کی چوکھٹ پہ مر گئی

☆☆......☆☆

میرا یہ پسندیدہ شعر ''سچی کہانیاں'' کی نذر ہے

نام:
پتہ:

کوپن برائے



ستمبر 2015ء